جنگِ آزادی

۱۸۵۷ء

یعنی

تحریک ۱۸۵۷ء کے مکمّل و مستند تاریخی حالات اور نتائج

مع پیش لفظ و تعارُف

از

ڈاکٹر تاراچند (ممبر پارلیمنٹ)

(سابق سفیر ہند برائے ایران)

و

ڈاکٹر کے۔ ایم۔ اشرف

(صدر شعبۂ تاریخ کروڑی مل کالج دہلی یونی ورسٹی)

مکتبہ برہان اُردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

"آج سے ایک سو سال بعد یقیناً ایک دن ایسا آئے گا جب کہ غدر کے متعلق تمام واقعات اور ہندوستانی روایات کا سختی سے احتساب کیا جائے گا اور اس پر تعصب یا پروپیگنڈے کی حیثیت سے نہیں بلکہ خالص تاریخی اعتبار سے نظر ڈالی جائے گی جس کے بعد وہ ایک مستند صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے گا یقیناً غلامانہ زندگی کی یہ ایک نہایت ہی خوف ناک کہانی ہوگی"۔

ایڈورڈ تھامپسن

والہانہ عقیدت اور احترام کے ساتھ

وطن کی جنگِ آزادی کے دو مایۂ ناز جہاد پیشہ رہنماؤں

یعنی

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ

اور

نیتاجی سبھاش چندر بوس

کے نام

شورشِ عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خوابِ ناز میں

۱۸۵۷ء

"افراد کی قربانی اور موت سے قومیں زندہ ہوتی ہیں اگر میں کل اپنے ملک کو زندہ دیکھنا چاہتا ہوں تو مجھے آج اس کے لیے مر جانا ہوگا تاکہ میرا وطن آزادی اور عظمت سے ہم کنار ہو سکے"۔

سبھاش چندر بوس

"دنیا کو ہمارے ارادوں کے بارے میں شک رہے ہوں مگر ہمیں اپنے فیصلوں کے بارے میں کبھی شک نہیں گذرا ...... وقت کا کوئی الجھاؤ، حالات کا کوئی اتار چڑھاؤ، معاملوں کی کوئی الجھن ہمارے قدموں کا رخ نہیں بدل سکتی۔ ہمارا فرض ہے کہ ہندوستان کے قومی مقصد کی راہ میں قدم اٹھائے بڑھے جائیں"۔

ابوالکلام آزاد

پیش لفظ

جناب ڈاکٹر تاراچند ممبر پارلیمنٹ

(سابق سفیر ہند برائے ایران)

۱۸۵۷ء کے انقلاب کی صد سالہ یادگار منانے کے سلسلے میں بہت سی کتابیں اور مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان اور بیرونی ممالک میں اس موضوع سے کس قدر دلچسپی ہے۔ تصانیف میں انقلاب کی نوعیت اور ماہیت کے متعلق مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔ بعض مورخین نے یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ یہ انقلاب محض ایک فوجی تحریک یا سپاہیوں کا غدر تھا۔ دوسری طرف کچھ مصنفین سمجھتے ہیں کہ یہ قومی تحریک یا ملی احساس کا مظاہرہ تھا۔ اسی قسم کے اور بھی کئی نظریے تھے۔ ان سب تحریروں کے باوجود ۱۸۵۷ء کی اہمیت اور ہمہ گیری کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے متعلق مزید لکھنے کی گنجائش نہیں یا اس سلسلے میں اُن تمام مختلف خیالات اور نظریات کا بہ خوبی جائزہ لیا جا چکا ہے جو ہندوستانی یا دیگر زبانوں میں اس وقت تک پیش کیے جا چکے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے واقعات ہندوستان کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ا
ایک دور کا خاتمہ ہوتا ہے، اور نئے دور کی ابتدا ہوتی ہے۔ جس دور کا خاتمہ ہوتا ہے و
ہندوستان کی تاریخ کا ایک نہایت شاندار دور تھا جس کی عظمت و شکوہ کا چار دانگ
عالم میں شہرہ تھا۔ بدقسمتی سے اس دور کے آخری قرن نے سلطنت مغلیہ کے انحطاط ا
ادبار کا افسوسناک منظر دیکھا۔ سلطنت کے آخری تاجدار کی زندگی ہندوستان کی دردناک
بے بسی کا نمونہ تھی۔ لیکن جس جذبے نے بہادر شاہ کو ۱۸۵۷ء کی تحریک کا علم بردا
ہونے پر مجبور کیا وہ قابل قدر تھا۔ بہادر شاہ کے پاس نہ مال و دولت تھی نہ سپاہ۔ مغلیہ
سلطنت کے تمام صوبے دار خود مختار بن چکے تھے اور انگریزی کمپنی جسے بنگال بہار او
اڑیسہ کی دیوانی کا عہدہ عطا ہوا تھا برسرِ پرخاش تھی۔ یہ بادشاہ کو اپنے موروثی حقوق
سے دست بردار کرنے پر تلی تھی۔ غیرت کا تقاضا تھا، اور قانون کا حکم، کہ نافرماں بردار و
کی گوشمالی کی جائے۔ ایک غیر قوم نے ہندوستان کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھا کر ملک
پر تسلط جمانے کا موقع حاصل کر لیا تھا۔ وہ ہندوستان کی دولت کو ہر جائز و ناجائز طریقے
سے سمیٹ کر انگلستان بھیجنے میں مستعدی کے ساتھ مشغول تھی اور اس کی نخوت و رعونت
اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ ہندو مسلمان کے مذہب کا احترام اس کے دلوں سے اٹھ گیا تھا
ہندوستان کے قانونی رئیس اور بادشاہ کی حیثیت سے بہادر شاہ کا فرض تھا نافرمانوں کو
سزا دینا اور ناخواندہ مہمانوں کو ملک سے بدر کرنا۔ اس لیے جس وقت ہندوستانی سپاہیوں
نے کمپنی کے خلاف قدم اٹھایا، دہلی کے بادشاہ نے حق شناسی کا ثبوت دیا۔ لیکن
ہندوستان کی قسمت میں ابھی غلامی لکھی تھی۔ تحریک ناکام یاب رہی اور ہندوستان
غیروں کی حکومت سے آزاد نہ ہو سکا۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے ماحول اور حقایق پر غور کرتے ہوئے اس وقت کی نزاکتوں اور دشواریوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تمام ملک اور سب ہندوستانی بہ یک وقت انقلابیوں کے ساتھ انگریزوں کے برخلاف قدم بہ قدم نہیں چلے اور بہت سے ہندوستانی راجوں اور نوابوں نے انگریزوں کی حمایت کی۔ باوجود اس کے ملک کا تین چوتھائی حصہ انقلاب کے کشت وخون کا میدان تھا، انقلاب کا اثر ملک کے دور دراز علاقوں میں پھیلا۔ ہمارے کئی مورخوں نے یہ دکھلانے کی بھی کوشش کی ہے کہ اس واقعے کے دوران میں ہندو مسلمان دوش بہ دوش نہیں تھے اور ان کے درمیان نا اتفاقی تھی۔ لیکن جہاں تک واقعات کا صحیح جائزہ لیا جا سکتا ہے یہ بات قابل قبول نہیں ہو سکتی۔

انقلاب کی ناکامی کے کئی سبب تھے۔ قومیت کے جذبے کا فقدان، علم وصنعت یعنی سائنس اور تکنیک کی کمی۔ ۱۸۵۷ء کی آگ دب گئی، لیکن اس کی چنگاریاں خاموش نہیں ہوئیں۔ دراصل یہ اُسی وقت کے بوئے ہوئے بیج کا درخت ہے جو ۱۹۴۷ء میں پھل لایا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات سے سبق حاصل کر کے باہمی اتحاد اور سمجھوتے کی طرف پوری توجہ دیں اور ان غلطیوں اور ناعاقبت اندیشیوں کے پھر سے شکار نہ بنیں جن کی وجہ سے سو سال پہلے ہمارے آبا و اجداد کو ناکامیابی اور ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔

یہی نظریہ خورشید مصطفےٰ رضوی نے اپنی تصنیف "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء" میں پیش کیا ہے۔ شاید اس مضمون پر یہ اردو کی پہلی تصنیف ہے جس میں بلا تعصب مذہب و ملت اس انقلاب کی صحیح کہانی بتلائی گئی ہے۔ ان کی تصنیف کی نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے بہت کاوش کے ساتھ تمام اُن کتابوں اور مضامین کا، جو ہمیں

دست یاب ہو سکتے ہیں بہ غور مطالعہ کیا ہے۔ اِن کی معلومات وسیع ہیں اور ان کی نظر گہری۔ ۱۸۵۷ء کے تمام پہلوؤں کا اور واقعات کے جزو وکُل کا احاطہ کیا ہے۔ کتاب کو دل چسپ اور مفید بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اردو کے تاریخی لٹریچر میں یہ کتاب ایک قابل قدر اضافہ ثابت ہو گی۔

۱۰ر اپریل ۱۹۵۸ء

تاراچند

تعارف

جناب ڈاکٹر کے۔ ایم اشرف

۱۸۵۷ء کا انقلاب یوں بھی ہماری سماجی اور سیاسی زندگی کی ایک فیصلہ کن منزل ہے اور اس پر قلم اٹھانے کے لیے کسی مصنف کو معذرت پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ حسنِ اتفاق کہ امسال ۱۸۵۷ء کی صد سالہ یادگار کے موقعے پر حکومت ہند اور دوسری اسٹیٹ گورنمنٹوں کے علاوہ بعض علمی حلقوں اور دیگر مصنفوں کی جانب سے تحریک ۱۸۵۷ء پر مقالے اور مضامین شایع ہوئے بلکہ روس اور انگلستان میں بھی علمی حلقوں نے ہماری جنگ آزادی اور بالخصوص ۱۸۵۷ء کی جدوجہد پر تبصرہ کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر البتہ کسی قدر حیرت ہوئی کہ ہندوستان میں صرف یہی نہیں کہ ہماری تصنیفوں کے مآخذ آج بھی انگریزوں کی مرتب کردہ یادداشتیں اور تاریخیں ہیں بلکہ ہمارا نقطۂ نظر بھی برطانیہ نواز ہے اور ہمارے ممتاز مورخین یہ کہنے میں پس و پیش کرتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک ہماری جنگ آزادی کا پہلا اعلان تھا۔ مسٹر سین اور ماجومدار جیسے چوٹی کے مورخین نے یہ بھی لکھا کہ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں 'وہابی' علمار نے شرکت نہیں کی حالاں کہ خود سرکاری بیانات سے اس کا جگہ جگہ اظہار ہوتا ہے کہ 'مجاہدین' ہر شہر میں پیش پیش تھے! میں مختصراً یہ عرض کرنے میں حق بہ جانب ہوں کہ مسٹر ساورکار کے بعد تا حال کسی ہندوستانی مورخ

کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اس جدّ و جہد آزادی کی مفصل اور مسلسل تاریخ ہندوستانی نقطۂ نظر سے اور ہندوستانی مآخذ کی مدد سے مرتب کرتا۔ اب البتہ ہمیں اس فریضے کی طرف توجہ ہوئی ہے اور مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ عزیزی خورشید نے اردو زبان میں یہ کتاب لکھ کر اس کی ابتدا کی ہے۔

میں اس "نقشِ اول" کو کام یاب قرار دوں گا اس لیے کہ اس میں انقلاب ۱۸۵۷ء کے واقعات کی تفصیل کے علاوہ کمپنی کے دور کا سیاسی پس منظر اور جنگ ۱۸۵۷ء کے محرکاتِ عمل بھی ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ اس سلسلے میں نوجوان مصنف نے غیر معمولی کاوش سے کام لیا ہے اور دہلی، لکھنؤ، کانپور، جھانسی، بریلی کے علاوہ مراد آباد امروہہ اور چھوٹی چھوٹی بستیوں کے معرکوں کی جیتی جاگتی تصویریں کھینچ دی ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ اردو، بلکہ ہندی زبان میں بھی ان کا مقالہ ۱۸۵۷ء کے ادب میں ایک گراں بہا اضافہ ہے۔ صاف اور سلیس زبان، واقعات کا تسلسل اور فراوانی، ایک مرتب اور مربوط داستان۔

میری مسرت اور خوشی کا ایک ذاتی پہلو بھی ہے۔ اس لیے کہ عزیزی خورشید کے والد مرحوم (سید انیس الدین احمد رضوی امروہوی) علی گڈھ یونی ورسٹی میں میرے عزیز ترین دوستوں میں سے تھے اور میں اُن کے مذاقِ تاریخ اور علم دوستی کی بڑی قدر کرتا تھا۔ میں اس ہونہار اور علم دوست مصنف کو ان کی پہلی اور کام یاب کوشش پر دلی مبارک باد دیتا ہوں مجھے یقین ہے کہ وطن میں اُن کی یہ علمی خدمت قدر دانی اور ہمت افزائی کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔

نیاز کیش

محمد اشرف

دہلی، ۳۱ اگست ۱۹۵۷ء

حرفِ آغاز

جناب مولانا سید محمد میاں (ناظم جمعیۃ علمائے ہند)

ناکامی ایک طرح کی موت ہے۔ مرنے والا اپنی صفائی پیش نہیں کرسکتا، خصوصاً ایسی صورت میں کہ قلم دستِ قاتل میں ہو اور مسندِ عدالت اس کے زیرِ پا ہو جس کا دامن خونِ شہداء سے تر ہو۔ ۱۸۵۷ء کا جہادِ حریت تاریخ حُبِ وطن کا ایک زریں باب ہے مگر اس کو غدر کہا گیا۔ اور غدر بھی وحشیانہ غدر۔

نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ اسی حالت میں گذر گیا کہ جو حقیقت شناس اس الزام کی تردید کرسکتے تھے وہ دم بہ خود تھے۔ یا فرمانی طاقت کے ہم نوا بن گئے تھے جن دماغوں کی نشو و نما اس عرصے میں ہوئی اُن کے تصورات اسی سانچے میں ڈھلے اور ایک غلط الزام کو حقیقت سمجھنے لگے۔

مگر سچائی اَمٹ ہے۔ اس پر پردہ ڈالا جاسکتا ہے، اس کو فنا نہیں کیا جاسکتا شہیدانِ وطن کا خونِ ناحق بھی رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ابھی پچاس ساٹھ سال گذرے تھے کہ برطانوی اقتدار کا آفتاب نقطۂ استواء سے ڈھلنا شروعِ ہوا، حقیقت کی سوکھی ہوئی روشنائی میں نمی پیدا ہوئی اور حقیقت نگار قلم صاف صاف تو نہیں،

البتہ "گفتہ آید در حدیثِ دیگراں" کے انداز میں اصلیت کا پتہ دینے لگے اور منتشر طور پر وہ چیزیں سامنے آنے لگیں جو تحقیق طلب کی کدو کاوش کو نتیجہ خیز بنا سکتی ہیں مگر آزادی کی جنگ جاری تھی اور وہ صالح اور حقیقت پسند دماغ جو تحقیق و تفتیش کے جدید آلات سے دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی کرکے سب کے سامنے رکھ سکتے تھے جنگ آزادی میں مصروف تھے۔

خدا خدا کرکے آزادی کی جنگ ختم ہوئی اور اس کے دس سال بعد ۱۸۵۷ء کی صد سالہ یادگار منانے کا شور بلند ہوا۔ اب ہند و پاکستان کی آزاد حکومتوں کا فرض تھا کہ جس طرح اجنبی اقتدار نے محبِ وطن شہیدانِ حریت کو نمائشی عدالتوں کے ذریعے مجرم اور ملزم گردانا تھا آج سرکاری طور پر اُن الزامات کی تحقیق کی جاتی کہ کیا واقعی ان پاک باز شہیدوں نے غدر کیا تھا۔؟ کیا اتنی بڑی لڑائی کا بیڑا اٹھا لینے کے بعد بھی سر میدان اُن کی حرکتیں بزدلانہ اور طفلانہ ہی رہی تھیں۔؟ کیا انھوں نے بلا وجہ بزدلانہ جوش میں عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا تھا۔ کیا نانا صاحب جیسے جرنیلوں نے پناہ دینے کے بعد پُر امن انگریزوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔؟ ضرورت تھی کہ تمام سرکاری ذرائع کام میں لاکر ان الزامات کے متعلق ایک تاریخی فیصلہ کیا جاتا۔

یہ فرض ہند یونین کی سرکار پر زیادہ اہمیت کے ساتھ عاید ہوتا تھا کیوں کہ اس کے بیشتر ارکان وہ ہیں جو جنگ آزادی کے شہ سوار رہ چکے ہیں۔ مگر تعجب ہوتا ہے کہ تعمیر و ترقی کی سیکڑوں اسکیمیں تصنیف کرنے والے اس طرف کیوں نہیں متوجہ ہوئے۔

بہر حال ارباب قلم نے اس موضوع کو نظر انداز نہیں کیا اور گذشتہ سال میں ہزاروں صفحات کی کتابیں لکھی گئیں۔ اخبارات نے اپنے شان دار نمبر نکالے اور ۱۹۵۷ء میں ۱۸۵۷ء کو

زندہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر تحقیق و تفتیش کا فرض جذبات اور ولولوں سے انجام نہیں پاتا اور جذبات کو تحقیق کا آلہ کار بنایا جائے تو وہ خرابی لامحالہ پیدا ہو جاتی ہے جو ہندو پاکستان سے شائع ہونے والے بیش تر اخبارات اور تصانیف میں رونما ہوئی۔ حال آں کہ ۱۸۵۷ء کے جہادِ حرّیت کا دامن فرقہ واریت کی آلودگی سے بالکل صاف تھا۔

اس وقت یہ کتاب جو آپ کے پیش نظر ہے، اس کا حق رکھتی ہے کہ اس سلسلے میں مرتب ہونے والی تمام تصانیف میں بہتر قرار دی جائے۔ اس میں صرف داستان نہیں دہرائی گئی بلکہ تحقیق سے کام لے کر اسباب، وجوہات، کارناموں اور اُن کے نتائج کو پوری احتیاط اور سنجیدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ الزامات کی تردید بھی محققانہ کی گئی ہے۔ تعصّب اور فرقہ واریت سے اس کا دامن پاک ہے اور ظالم و مظلوم، اقدام و دفاع، شکست و فتح کے تذکروں میں اعتدال و توازن سے کام لیا گیا ہے۔

نوجوان مصنف خورشید مصطفےٰ صاحب بھی مستحق مبارک باد ہیں اور ادارہ ندوۃ المصنفین جو اس کی اشاعت کا ذمّہ دار ہے، وہ بھی مستحق تحسین و تبریک ہے کہ اس کی اشاعت کا معیار جس طرح اور تصانیف میں بلند رہا ہے یہاں بھی اس کی بلندی برقرار ہے بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ سر بلند ہے۔ البتہ طبقۂ علماء کا تذکرہ اس تصنیف میں اگرچہ عام تصانیف سے بہتر اور مکمل طور پر کیا گیا ہے مگر تاہم کچھ گوشے تکمیل طلب باقی رہ گئے ہیں جس میں مصنّف کا قصور نہیں بلکہ قصور حالات کی کروٹ کا ہے۔

محمد میاں

مقدّمہ

اس واسطے چھیڑا ہے پروانوں کا افسانہ
شاید ترے کانوں تک پیغام عمل جائے

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج میں اپنے اُس قومی فرض سے سبک دوش ہو گیا جس کا محبّی جناب بھائی نثار احمد فاروقی کے مشورے پر گذشتہ سال بیڑا اٹھایا تھا۔ اس کتاب کی تیاری میں کس قدر محنت کرنا پڑی، اور کتنا خون پانی کیا گیا ہے، یہ تو اس کے مطالعے سے ہی اندازہ ہو سکے گا لیکن کتاب میں اگر کچھ خوبیاں اور حُسن ہے تو اس کا سہرا نثار صاحب کے سر ہے اور اس قومی خدمت کا کریڈٹ یقیناً ان ہی کی ذات کو ملنا چاہیئے کہ انھوں نے مجھ جیسے ناکارہ شخص سے یہ عظیم کام لے لیا۔

تحریک ۱۸۵۷ء پر جو کتابیں لکھی گئیں، ان میں سے اکثر میری نظر سے گذری ہیں اور میں نے حیرت سے دیکھا کہ اول تو کوئی کتاب ان حالات پر قومی نقطۂ نظر سے روشنی نہیں ڈالتی، دوسرے یہ کہ نہ صرف اردو بلکہ ہندی اور انگریزی میں بھی ایسی کوئی کتاب موجود نہیں جو تحریک پر پوری ترتیب و تسلسل کے ساتھ اس کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہو۔ چناں چہ اسی چیز نے مجھے اور بھی اس طرف متوجہ کیا کہ ملک کی پہلی اور سب سے بڑی تحریک آزادی کے حالات

سلیس اردو میں مرتب کر کے پیش کیے جائیں اور وہ تمام گھناؤنے پردے چاک کر کے جو انگریزوں نے اس عدیم المثال جدوجہد پر ڈال رکھے تھے، اصل واقعات کو نکھارا جائے تاکہ دنیا کو اندازہ ہو سکے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت جسے انگریز مورخین "فوجی بغاوت" یا "غدر" کہہ کر چاند پر خاک ڈالتے رہے ہیں، دراصل غیور فرزندانِ وطن کی خوں ریز اور دلیرانہ جنگِ آزادی تھی — دین اور دیش کے متوالوں کا سرفروشانہ جہاد تھا۔

یہ سوال بدقسمتی سے کافی زیر بحث رہا کہ تحریک ۱۸۵۷ء دراصل فوجی شورش تھی یا قومی جنگ، اور چوں کہ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس لیے اس تفصیل میں جانا ضروری نہیں، حالات کا مطالعہ خود ہی بتا دے گا کہ جنگ کی نوعیت کیا تھی، کن جذبات اور صلاحیتوں کے مالک رہنماؤں نے کن وجوہات کی بنا پر اس میں حصہ لیا اور ملک کے کس قدر طویل و عریض رقبے پر ایک ہی زمانے میں خفیہ انقلابی سرگرمیوں کے بعد میدان تیار کر کے بغاوت شروع کی گئی۔ لیکن حیرت تو یہ ہے کہ ہندوستان میں ہی ایک ایسا تاریخ داں طبقہ موجود ہے جو جنگ کی قومی نوعیت اور باغیوں کے جذبۂ آزادی سے انکار کرتا ہے۔ نہ معلوم اس طبقے کے ذہن میں جنگِ آزادی اور قومی جدوجہد کی کیا تعریف پوشیدہ ہے، بہ قول ایڈیٹر صاحب روزنامہ "الجمعیۃ"۔

"جنگِ آزادی کسی ہتھیار کا نام نہیں بلکہ اُس جذبے کا نام ہے جو حب الوطنی کی آگ لگائے، غیر ملکی حکمرانوں سے نجات حاصل کرنے کا ولولہ پیدا کرے اور اِس مقصد کی خاطر جان و مال کی قربانی کے لیے عوام کو دعوت دے"۔

پھر، اگر یہ جذبہ بغاوت کے ہر پہلو اور ہر رخ پر نمایاں نظر آتا ہے، اور یقیناً آتا ہے — جس کا اعتراف یہ مورخ (آر، سی، مجمدار) بھی اِن الفاظ میں کرنے پر مجبور ہے۔ (۲)

"۱۸۵۷ء کی جدوجہد یقیناً ہندوستان میں برطانوی راج کے خلاف تاریخ میں پہلا، سب سے بڑا اور وسیع پیمانے پر پھیلی تصور کی جائے گی۔ اس جدوجہد نے بے شک اُس قومی تحریک آزادی کو ابھارا جو نصف صدی بعد شروع ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت نے آیندہ تحریکوں کو حرکت دی اور اس میں حصہ لینے والوں کو ہمت عطا کی..... بغاوت ۱۸۵۷ء کی یاد نے شاید انگریزی راج کو بہ نسبت بغاوت کے زیادہ نقصان پہنچایا"۔ (۲۲۴)

تو پھر اس تحریک کو سب سے بڑی اور پہلی جنگِ آزادی کہنے سے کیوں انکار ہے؟۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگ کہیں کہ ان لوگوں کا ذریعۂ معلومات اور مآخذ صرف انگریزوں کا فراہم کردہ مواد ہے مگر مجھے پھر بھی تعجب ہو گا کیوں کہ انگریز مورخین کی کتابیں دیکھئے تو یہ لوگ اپنی تمام غلط بیانیوں اور الزام تراشیوں کے باوجود نہ صرف انقلابی رہنماؤں کی فوجی قابلیتوں اور جنگی صلاحیتوں کا لوہا ماننے پر مجبور نظر آتے ہیں بلکہ جنگ کی قومی نوعیت کا اظہار بھی دبے الفاظ میں کر جاتے ہیں۔ لارڈ کیننگ تک اس کو منتشر شورش کی بجائے منظم بغاوت کہتا تھا جو مذہبی مقاصد کی بنیاد پر بھڑکائی گئی ہے اور یہ حالات اس نے انڈین ہوم منسٹر کو تحریر کیے[1]۔ ڈسرائیلی (DISRAELY) اس نتیجے پر پہنچا کہ "یہ غدر" نہیں بلکہ قومی بغاوت ہے اور فوجی سپاہی صرف اس کا ایک عملی جز ہیں[2]۔

حالات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہو گا کہ نہ صرف عوام ملک کے گوشے گوشے

---

1. Kaye, Vol. I, p, 616

2. Symposium, p 121

میں متحد نظر آتے ہیں بلکہ ان کی بہادری اور جاں بازی کی مثالیں بھی ایسی ہیں کہ جو تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھی جائیں گی۔ دہلی ہی کو لیجئے جہاں انتہائی بدنظمی اور انتشار کا عالم ہے، غداری اور دغابازی اس قدر عروج پر ہے کہ احسن اللہ اور محبوب علی اور زینت محل کا دامن بھی پاک نہیں، مگر سرفروش انقلابی ہیں کہ روزانہ صبح کو انگریزی فوجوں سے جنگ آزما ہونے کے لیے فوجی ترتیب کے ساتھ نکلتے ہیں اور دن بھر کی لڑائی کے بعد دن چھپے واپس آتے ہیں — ایک دو دن نہیں، پورے چار مہینے تک متواتر ——! اور وہ بھی جون جولائی اگست کی قیامت خیز تپش، لو اور گرمی میں — اُن کو تنخواہیں نہیں ملتیں، اُن کو کھانا نصیب نہیں ہوتا، تن پہ کپڑا نہیں، بدقماش مغل شہزادے اُن کے نام پر لاکھوں روپیہ مہاجنوں سے لے کر خود کھا جاتے ہیں مگر آزادیٔ وطن کے متوالے انقلابی اس کی پروا نہیں کرتے اور ۱۴ ستمبر تک پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کر کے دشمن کو ناکوں چنے چبوا دیتے ہیں — پھر کانپور، اودھ اور روہیلکھنڈ وغیرہ کو دیکھیے تو دہلی کی جاں بازی بھی ماند ہو کر رہ جائے گی، بنگال، بہار وغیرہ پر نظر ڈالیے تو اسّی سال کا بڈھا کنور سنگھ دشمن سے مقابلہ کرنے میں جواں مردوں سے بازی لے گیا —— گورنر بنگال اپنی رپورٹ میں نہ کہتا تو شاید مشکل سے یقین آتا کہ بعض جگہ تو یہ دلیرانِ وطن فقط تیر و کمان لے کر توپوں اور بندوقوں کے منہ آ رہے ہیں —

مضحکہ اور قطرۂ شبنم کا انگاروں کے ساتھ!

دہلی اور لکھنؤ کا انتظام حکومت انقلابی ہاتھوں میں آتا ہے تو موجودہ دور کی جمہوریت اور پرجا راج کی جھلک نظر آتی ہے۔ ادنیٰ انقلابیوں کے جذبات کا اندازہ اس عرضی سے لگایا جا سکتا ہے جو پیادہ رجمنٹ کے ایک سپاہی بھوانی سنگھ نے بہادر شاہ کو بھیجی اور

درخواست کی کہ

"میگزین کے عملے کو کام پر لگانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہر شخص سے اس کی جائے قیام پوچھ لیا جائے اور اس کے بیان کی تصدیق اُس جگہ جا کر کر لی جائے یا وہ کسی کی ضمانت دے اور اس کا پورا پتہ ہمیشہ دفتر میں موجود رہے، پھر اسے کام پر لگانا چاہیے ...... اگر بغیر پوچھ گچھ کام پر لگایا جائے گا تو دشمن کے جاسوس بھی شامل ہو جائیں گے اور بہت نقصان اٹھانا پڑے گا۔ علاوہ ازیں صرف مزدوروں کی جانچ اور دیکھ بھال کے لیے میگزین میں ایک افسر اور محرر رکھا جائے اور صبح شام جانچ ہو کر کوئی دشمن کا جاسوس تو نہیں آگیا ہے" [1]

مردوں کے دوش بہ دوش ملک کی عورتیں بھی نظر آتی ہیں، چناں چہ نہ صرف بیگم حضرت محل اور رانی جھانسی کی تلواریں میدان جنگ میں کوندتی ہیں بلکہ ٹکاری اور رام گڑھ کی رانیاں کان پور کی عزیزن اور میرٹھ کی عورتیں بھی جذبۂ آزادی سے سرشار ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ چند سرکش فوجیوں کی بغاوت تھی تو دنیا کے کس قانون کی رو سے ان "سرکش فوجیوں" کے جرم کی سزا لاکھوں بے گناہ عوام کو دی گئی؟۔ کیوں معصوم دیہاتیوں تک کے گاؤں راکھ کر دیے گئے؟۔ کیوں بے گناہ عورتیں، بچے اور بوڑھے چنگیزی مظالم کا نشانہ بنے؟ —— فوجی بغاوتیں تو اس سے پہلے بھی ہو چکی تھیں، کیا کبھی اُس وقت بھی عوام پر ایسے لرزہ خیز مظالم توڑے تھے، جن کے ماتم سے دنیائے انسانیت کبھی فارغ نہ ہو سکے گی اور جن کی مثال بربریت کی تاریخ میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔

صوبہ پنجاب نے تحریک میں نسبتاً کم حصہ لیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو یہاں بغاوت کو اٹھنے سے پہلے ہی کچل دیا گیا اور ہتھیار چھین لیے گئے دوسرے اُس وقت پنجاب پر

[1] غدر کے فرمان

انگریزوں کا تسلط ہوئے زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا اور اس لیے وہاں کے عوام انگریزی راج کی "عنایتوں" سے زیادہ واقف نہ تھے۔ پھر بھی اُن میں اپنے ہم وطنوں کی ہم دردی اور [illegible] دشمنی کی بنا پر آزادی کے جذبات موجود تھے۔ لیکن ملک کی آئندہ تحریکوں میں فرزندان پنجاب نے نہ صرف اس کمی کی تلافی کر دی بلکہ دوسروں کے لیے مثال بن گئے۔ یہ بھی عام طور پر کہا جاتا ہے کہ سکھوں نے اس دوران میں انگریزوں کا ساتھ دیا اس کی چند وجہیں تو پنجاب کے حالات میں بیان کی گئی ہیں لیکن مجموعی طور پر یہ کہنا غلط ہے کہ سکھوں نے تحریک میں حصہ لیا کیوں کہ دہلی کی انقلابی فوج میں ایک پوری سکھ رجمنٹ موجود تھی جس کے افسران کے نام جنرل بخت خاں کی طرف سے ۲۲ اگست ۱۸۵۷ء کو یہ فرمان جاری ہوا کہ

> "اعلیٰ حضرت نے ابھی ہمارے عالی جناب کو طلب کر کے ارشاد کیا کہ سکھوں کی رجمنٹ پر انہیں بہت اعتماد ہے اور وہ بہت مردانگی کے جوہر دکھائے گی اس لیے تمہیں لکھا جاتا ہے کہ اس حکم کو پڑھتے ہی فی الفور پانچ کمپنیاں لے کر شام گیر ہو کے (جمنا کے دوسرے کنارے) پر چلے جاؤ" [1]

اس کے علاوہ لدھیانہ کے سکھ عوام انقلابی صفوں میں شامل تھے۔ بنارس میں سکھ فوجیوں نے انقلابیوں کے ہمراہ گوروں کا مقابلہ کیا ہے۔ جن سکھوں نے انگریز فوجوں کا ساتھ دیا اس کی ایک بڑی پنجابی ریاستوں کا طرز عمل تھا جنھوں نے اپنی تمام فوجیں (جو زیادہ تر سکھ تھیں) انگریزوں کی مدد کو بھیج دیں ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ سکھ جیسا بہادر اور جنگ جو فرقہ جس نے پنجاب کی جنگوں میں دشمنان وطن کو دن میں تارے دکھائے تھے اور وطن کی

---

[1] "غدر کے فرمان" / ۱۰۹

پکار پر لبیک نہ کہے اور انقلابی جد و جہد میں پیچھے رہ جائے۔

اردو میں ۱۸۵۷ء پر جتنی کتابیں حال ہی میں شایع ہوئیں ان میں زیادہ تر ناول ہیں، اور جو تاریخی اعتبار سے روشنی ڈالتی ہیں وہ ہر لحاظ سے مکمل نہیں کہی جا سکتیں، اُن میں کچھ نہ کچھ خامی نظر آتی ہے۔ انگریزی میں صرف ایک مسٹر ساورکر کی کتاب ایسی ہے جو ہندوستانی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔ اگرچہ اس کتاب میں بھی واقعات کو ترتیب سے بیان نہیں کیا گیا اور بعض جگہ ضروری تفصیل چھوڑ دی گئی ہے، تاہم یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ صرف اسی کتاب اور اس کے طرز بیان نے مجھ پر سب سے زیادہ اثر ڈالا۔ چناں چہ زیر نظر کتاب میں اگر کہیں کہیں یہ رنگ جھلک جائے تو تعجب نہیں، حال ہی میں کئی کتابیں اور بھی آئی ہیں، جن میں ڈاکٹر سین کی تصنیف قابل قدر اور بڑی حد تک مکمل ہے۔ مسٹر ہری پرشاد چٹوپادھیائی کی کتاب میں بھی بڑا قیمتی مواد نہایت جاں فشانی سے یک جا کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر کے۔ کے دتہ نے کنور سنگھ اور امر سنگھ کی ایک مبسوط سوانح حیات لکھی ہے۔

ایک اور بات یہاں صاف کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس کتاب میں اکثر جگہوں پر تحریک شاہ ولی اللہؒ کو "تحریک ولی اللہی" یا بعض جگہ مثلاً سرحد کے بیان میں "تحریک سید احمد شہید" لکھا گیا ہے۔ بعض حلقوں میں یہ اختلاف ہے کہ اس تحریک کو حضرت شاہ ولی اللہؒ سے موسوم کیا جائے یا سید صاحب سے اگرچہ اس مسئلے پر روشنی ڈالنے کا یہ موقع نہیں، مگر اتنا ضرور ہے کہ یہ تحریک حضرت شاہ ولی اللہؒ سے مناسبت اور رابطہ ضرور رکھتی تھی اور تحریک کے افراد اُن ہی کے خیالات و عقاید سے متاثر رہے ہیں؛ چناں چہ جیسا کہ جناب ڈاکٹر اشرف نے ایک مضمون میں لکھا ہے حکیم اجمل خاں، مولانا عبید اللہ سندھی اور غلام سرور جیسے حضرات اپنے کو "ولی اللہی" کہلانا پسند کرتے تھے

میرا مقصد یہاں صرف اتنا ہے کہ حالات کے بیان میں جہاں کہیں ذکر آیا ہے وہاں تحریک ولی اللّٰہی اور تحریک سید احمد شہید سے مراد وہ جماعت ہے جس کے مجاہدین "آزادیٔ وطن کے لیے ۱۸۵۷ء سے بھی بہت پہلے سے سرگرم عمل تھے اور جن کو انگریزوں نے "وہابی" کہہ کہہ کر اس لیے بدنام کیا ہے کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں تمام ملک میں منظم طریقے سے نمایاں حصہ لیا اور اس کے بعد بھی اپنی کوششیں جاری رکھیں۔

تمنا تو یہ تھی کہ ۱۰ مئی ۱۹۵۷ء کو جب ملک اپنی سو سالہ جد و جہد کو یاد کرے تو یہ کتاب عام ہاتھوں میں پہنچ کر پوری طرح معلومات بہم پہنچائے مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا پھر یہ کوشش رہی کہ ۱۴ اگست ۱۹۵۷ء کو جب سرکاری طور پر تمام ملک ۱۸۵۷ء کی یاد منائے تو تاریخ کے اس زرین اور خونی باب کو یاد کرنے سے پہلے ہم ان حالات و واقعات سے پوری طرح آگاہ ہو جائیں۔ یہ کوشش بھی ناکام رہی لیکن بہرحال بغاوت ۱۸۵۷ء ہماری تاریخ آزادی کا ایک ایسا باب ہے جس کی اہمیت کبھی کم نہیں ہو سکتی اور آنے والی نسلیں ہمیشہ اُن جاں بازوں کو یاد کر کے فخر و ناز کریں گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ یہ واقعات اور اُن کی اہمیت پوری طرح اُجاگر کی جائے اور فرزندان وطن کو آزاد ہندوستان کی تعمیر و ترقی کے لیے آمادۂ عمل کیا جائے۔

مجھے ہی نہیں، بلکہ ہر ذی علم اور محب وطن کو حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور ان کے ادارے "ندوۃ المصنفین" کا ممنون ہونا چاہیے جنھوں نے علمی، مذہبی اور قومی خدمت کو اپنا شعار بنا کر ایسی کتابیں پیش کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ان کی بلند پایہ خدمات محتاج بیان نہیں۔

میں اپنے محترم بزرگ ڈاکٹر اشرف کا بہت ممنون ہوں جنھوں نے نہ صرف

میری درخواست کو قبول فرما کر تعارف تحریر فرمایا بلکہ مصروفیت کے باوجود مسودہ دیکھنے کے بعد اپنے قیمتی مشوروں اور ہدایات سے مستفیض ہونے کا موقع دیا۔ آخری حصہ "نتائج اور اثرات" آپ ہی کی تجویز پر سپردِ قلم کیا گیا ہے۔ اسی طرح محترم ڈاکٹر تارا چند (ایم۔پی) نے اپنی مصروفیات میں سے میرے لیے وقت نکالا، نہ صرف پوری کتاب کو از اول تا آخر ملاحظہ فرمایا اور اس میں ترمیم و اضافے کیے، بلکہ پیش لفظ بھی تحریر فرمایا حضرت مولانا سید محمد میاں نے اپنے مفید مشوروں اور گراں قدر قیمتی رائے سے نوازا۔ حضرت مولانا نسیم احمد فریدی مدظلہٗ کی مشفقانہ عنایات اور مشوروں سے بھی میں نے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ محترمی سید محمد میاں رضوی (صدر میونسپل بورڈ امروہہ) اور جمال احمد رضوی نے بعض کتابیں مجھے فراہم کیں۔ میں ان حضرات کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔

اس حقیر تصنیف کو اُس بے پایاں عقیدت و احترام کی بدولت جو کہ میں اِن دونوں ہستیوں سے رکھتا ہوں، حضرت مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ اور نیتاجی سبھاش چندر بوس کے نام سے منسوب کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں، اس دلی آرزو اور تمنا کے ساتھ کہ پروردگارِ عالم ہمیں اُن جیسا جذبۂ عمل، کردار، اور حب الوطنی عطا فرمائے۔

خورشید رضوی

علی جان منزل امروہہ

ترتیب

باب ۱ ———— پس منظر ————

باب ۲ ———— چنگاریاں ————

حکومت کا گھمنڈ۔ دیسی سپاہ سے برتاؤ۔ سولی عہدی کے جھگڑے۔ دیگر اسباب۔ پیشین گوئیاں اودھ کا الحاق۔

باب ۳۔ —— طوفان کی آمد آمد ——

بغاوت کی علامتیں (۱۱۷ - ۱۳۴)

پٹنہ میں سازش۔ خطرے کا احساس۔ اعلانات۔ پُر اسرار چپاتیاں۔ خفیہ کارروائیاں۔ عظیم اللہ خاں۔ سرگرمیاں تیز۔ کنول کا پھول۔

مختلف بغاوتیں۔ (۱۳۵ - ۱۴۳)

مالابار وغیرہ۔ آسام اور اڑیسہ۔ دیگر مقامات پر۔ فوجی شورشیں۔ بغاوت ویلور۔ شورش کے آثار۔

سُلگتی آگ پر تیل (۱۴۴ - ۱۵۱)

چکنے کارتوس۔ گائے اور سور کی چربی۔ راز کھلتا ہے۔ کارتوس نہیں لیں گے۔ منگل پانڈے۔ جذبۂ بغاوت۔

باب ۴۔ —— شعلے ——

میرٹھ (۱۵۵ - ۱۶۴)

اچانک اور قبل از وقت۔ دس مئی۔ مارو فرنگی کو۔ میرٹھ کے آس پاس۔ سہارن پور اور رڑکی بلند شہر، مظفر نگر۔

دہلی (۱۶۵ - ۲۰۸)

انقلابی سپاہی بہادر شاہ کے سامنے۔ میگزین پر حملہ۔ انگریزوں کی ناکامی۔ قتل۔ مصیبت زدہ انگریز۔ انگریزی فوج۔ ہنڈن پر جنگ۔ انگریزوں کی چال۔ انقلابیوں کی بہادری۔ جنگِ پلاسی کی یاد۔ انگریزوں کو مدد۔ جنرل بخت خاں۔ بخت خاں کا انتظام۔ انگریزوں کو شکست۔

سپاہیوں کا جوش۔ لارنس کی تقریر۔ فیض آباد۔ قرب وجوار میں۔ چنہٹ۔ برجیس قدر۔ جیوالک لکھنؤ میں جنگ۔ دوبارہ حملہ۔ کان پور پر انقلابی پرچم۔ مقابلے۔ امبرپور کے بہادر سپوت۔ مولانا احمد اللہ کی سرگرمیاں۔ مولانا زخمی۔ جاں باز برہمن۔ مولانا پھر میدان میں۔ لکھنؤ کی شکست بیگم حضرت محل کی شرافت۔ گوریلا جنگ۔ مولانا کا پلان۔ بہادر نرایت سنگھ۔ لکھنؤ کی جاں بازی اٹاوہ کا مقابلہ۔ اودھ کے جاگیر دار۔

روہیل کھنڈ (۳۰۰ - ۳۱۳)

بریلی میں بغاوت۔ بخت خاں کی روانگی۔ رام پور۔ مراد آباد۔ بخت خاں کی آمد۔ شہزادہ فیروز امروہہ۔ نواب مجو خاں۔ بجنور۔ بدایوں۔ بریلی میں فساد کی کوشش۔

اودھ اور روہیل کھنڈ کی آخری جنگیں (۳۱۴ - ۳۲۹)

جذبۂ آزادی۔ بہادر بینی مادھو۔ بریلی میں جنگ۔ غازیوں کی جواں مردی۔ مولانا احمد اللہ پھر شاہ جہاں پور میں۔ احمد اللہ بادشاہ۔ شہزادہ فیروز سندیلہ میں۔ راجہ پوائن کی غداری، مولانا کی شہادت۔ شہادت کے بعد۔ جوش انتقام۔ بیگم اودھ کا مجاہدانہ اعلان۔

صوبہ بہار (۳۳۰ - ۳۶۳)

خفیہ تیاریاں۔ کنور سنگھ۔ جمعدار وارث علی۔ مولوی علی کریم۔ پٹنہ میں بغاوت۔ سازش کا انکشاف۔ رانا کنور سنگھ میدان میں۔ رانا امر سنگھ۔ جودھ سنگھ۔ رانی ٹکاری۔ امر سنگھ پھر سہسرام میں۔ کنور سنگھ اعظم گڈھ میں۔ بنارس کے قریب۔ انگریزوں کو شکست۔ امر سنگھ جگدیش پور میں۔ کنور سنگھ گنگا پر۔ کنور سنگھ زخمی۔ انگریزوں کو شرمناک شکست۔ کنور سنگھ کا انتقال۔ باغیوں کی جرات وہمت۔ فتح سنگھ۔ سراسیمہ انگریز۔ گیا پھر گیا۔ امر سنگھ غائب۔ کمانڈر نبی بخش خاں۔ دوسرے علاقے۔ جودھ سنگھ کے ساتھی۔ بھاگل پور۔ راج شاہی۔ قومی بغاوت۔

بنگال اور آسام (۳۶۴ - ۳۶۹)

کلکتہ۔ دوسرے علاقے۔ بردوان ڈویژن۔ منی رام دتا۔

باب ۵ - سرفروشی

راجہ بینی مادھو۔ دیوان حکمت اللہ۔ راجہ ہنومنت سنگھ۔ آغا مرزا۔ محمد شفیع۔ احمد خاں کھرل۔ فضل علی۔ عظیم بیگ۔ سرنام سنگھ۔ نشان سنگھ۔ راجہ جے لال سنگھ۔ رسول بخش کاکوری۔ ہری کرشن سنگھ

تحریک ۱۸۵۷ء کے روح رواں۔ (۴۵۱ - ۴۷۲)

برہمنوں کی کوششیں۔ علماء کا جذبہ۔ مولانا فضل حق خیرآبادی۔ حضرت حاجی امداد اللہ۔ مولانا محمد قاسم۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی۔ مولانا اسحاق۔ مولوی وہاج الدین۔ مفتی عنایت احمد مولوی رضی اللہ۔ شاہ غلام بوسن۔ مولوی کفایت علی کافی۔ مولانا یحییٰ علی۔ مولانا عنایت علی۔ مولانا فیض احمد۔ مولانا سید عالم علی۔ مولوی علاؤالدین۔ مولانا مظہر اور مولانا منیر۔ مولانا جلیل۔ مولوی واعظ الحق مولانا عبدالقادر۔ سید محمد امین غازی۔

باب ۶ ــــــ ناکامی اور انتقام ــــــ

انتقام۔ (۴۷۵ - ۴۹۰)

دہلی میں قیامت۔ ہم نادر شاہ سے بازی لے گئے۔ والیان ریاست۔ مظالم کی انتہا۔ پرانی تاریخی عمارتوں سے انتقام۔ عبادت گاہوں کا حشر۔ مختلف مقامات پر۔ مولانا فضل حق کی زبانی۔ وحشیانہ ظلم۔ بے کس عورتیں۔ بچوں کو پھانسی۔ کئی سال بعد۔

ناکامی۔ (۴۹۱ - ۵۱۴)

بغاوت کی نوعیت۔ سرسری جائزہ۔ قومیت کا احساس۔ انگریزوں کی رائے۔ ناکامی کیوں۔ ننگ وطن مغل خاندان۔

باب ۷ ــــــ نتائج اور اثرات ــــــ

بیرونی دنیا میں گونج (۵۱۷ - ۵۲۹)

فرانس۔ روس۔ اٹلی۔ امریکہ۔ چین۔ انگلینڈ۔ ایران۔

ضمیمے

حوالے

گذارش

جن علاقوں کے حالات مل سکے۔ اس کتاب میں مختصراً شامل کر دیئے گئے لیکن اگر کہیں کوئی ضروری تفصیل رہ گئی ہے یا کسی جگہ کے واقعات نہیں آسکے تو براہ کرم یہ مفصل اور مستند حالات اور دستاویزیں (یا اُن کی نقلیں) ادارہ ندوۃ المصنفین اردو بازار دہلی کے پتے پر ارسال کی جائیں اور یا مصنف کے پتے (علی جان منزل امروہہ) پر بھی بھیجی جائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں ان پر غور کیا جا سکے۔

۱
پس منظر

"کمپنی والوں کی جنگ سپاہیوں کی جنگ نہ تھی بلکہ
تاجروں کی جنگ تھی، ہندوستان کو انگلستان نے
اپنی تلوار سے فتح نہیں کیا بلکہ خود ہندوستانیوں
کی تلوار سے، رشوت، سازش اور حد درجے
کی دورخی پالیسی پر عمل کر کے ایک جماعت کو
دوسری سے لڑا کر اُس نے یہ ملک حاصل کیا"

——— مسز اینی بیسنٹ

باب اوّل

سراج الدولہ اور جنگِ پلاسی

> ۲۳ جون ۱۸۵۷ء کو جنگ پلاسی کی سَو سالہ یاد منائی گئی
> اور باغیوں نے اعلان کیا کہ "آج ہم پلاسی کا بدلہ لیں گے۔"

۱۸۵۷ء کی انقلابی تحریک کے حقیقی اسباب جاننے کے لیے ہمیں سو سال پیچھے دیکھنا ہوگا۔ اس کے پس منظر پر غور کیا جائے تو ۲۳ جون ۱۷۵۷ء ہی وہ تاریخ تھی جہاں سے اِن واقعات کی کڑیاں شروع ہوتی ہیں۔ چونکہ پلاسی کی یہ جنگ نہ صرف اس ملک گیر بغاوت کو سمجھنے کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے بلکہ ہندوستان کی تاریخ میں دورِ غلامی کی ابتدا بھی ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تاکہ آنے والے واقعات پوری طرح روشنی میں آسکیں۔

انگریز تاجر جب سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں اس ملک میں آئے، اُن کا ذہن برابر سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں مصروف تھا اور وہ اسی تاک میں اپنے دن گزارتے تھے کہ کسی طرح ملکی حکمرانوں اور باشندوں کے اختلافات کو ہوا دے کر اپنا مقصد حاصل کیا جائے۔ کلائیو سے لے کر ماونٹ بیٹن تک پُرفریب سرگرمیوں اور سازشوں کی ایک طویل داستان ہے جس کے گہرے نقوش آج بھی ہندوستان کے دامنِ سیاست پر موجود ہیں۔

جنگ کے اسباب

صوبہ بنگال کے آزاد حکمراں علی وردی خاں نے اپنے نواسے سراج الدولہ کو جانشین کیا تھا وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی بدنیتی سمجھ چکے تھے چنانچہ سراج الدولہ کو وصیت کی کہ انگریزوں کو فوج رکھنے یا قلعہ بنانے کی اجازت نہ دینا۔ جب ۱۷۵۶ء (اپریل) میں سراج الدولہ تخت نشین ہوا تو انگریزوں نے رسمی تحفے بھی نہ بھیجے وہ اس کے خلاف سازشوں میں معروف تھے۔ اس کی اجازت کے بغیر ہی کلکتے کے قلعے کی مرمت شروع کر دی اور پھر نئے قلعے تعمیر ہونے لگے، مورچے بننے لگے اور بعض بھاگے ہوئے مجرموں کو پناہ دی گئی جن میں ڈھاکے کے دیوان کا بیٹا بھی شامل تھا۔ ادھر وہ شوکت جنگ کو بغاوت پر آمادہ کر رہے تھے۔ اپنی نرم دلی اور نیک طینتی کے جواب میں انگریزوں کی ان بڑھتی ہوئی فریب کاریوں سے مجبور ہو کر نواب نے بنگال کو ان شوریدہ سروں سے پاک ہی کرنے کا فیصلہ کر لیا اور جون ۱۷۵۶ء میں انھیں شرارتوں کا مزہ چکھا کر کلکتے سے نکال دیا۔ "اس وقت اگر وہ چاہتا تو ہر انگریزی بولنے والی زبان کاٹ کر پھینک دیتا مگر شریف سراج نے برطانوی چراغِ حیات بجھانے کی کوشش نہ کی"[1] ـــــ اتنا ہی نہیں، بلکہ انگریز باغی جو قید ہو کر آئے ان کی جاں بخشی کر دی۔ یہ لوگ اس سلوک کے مستحق نہ تھے اور آگے چل کر انھیں آستین کے سانپوں نے نواب کی اس رحم دلی کا یہ بدلہ دیا کہ اس کے دربار میں سازش کے جال پھیلائے۔ کلکتے سے بھاگتے وقت انگریزوں نے مظلوم شہریوں کے مکانات نذرِ آتش کر دیے۔ کلائیو مدراس میں مقیم تھا۔ جب اُس کو اس واقعہ کی خبر ملی تو تیاریاں شروع کیں۔ مگر "تیاریاں" کیا ہو سکتی تھیں؟ ـــــ ایک طرف انگریز

---

[1] باری:۔ کمپنی کی حکومت ص ۲۲۰

تاجروں کی کمپنی اور دوسری طرف نواب سراج الدولہ ـــــ راجہ بھوج اور گنگوا تیلی والا معاملہ تھا ـــــ لہذا نواب کے دربار میں سازشوں کے جال بچھائے گئے۔ رشوتیں دی گئیں، تخت کے لالچ اور حکومت کے وعدے ہوئے۔ دسمبر ۱۷۵۶ء میں کلائیو اپنی فوج لے کر آیا۔ ڈم ڈم کے قلعہ دار مانک چند کو رشوت دے کر پہلے ہی ملایا جا چکا تھا۔ صرف آدھ گھنٹے کی نمایشی جنگ کے بعد قلعہ پر قبضہ ہو گیا (۲۹ر دسمبر)۔ پھر کلکتے کا قلعہ بھی دوبارہ کمپنی کے قبضہ میں آگیا۔ جہاں تمام ساز و سامان اسی طرح محفوظ تھا جیسا وہ چھوڑ گئے تھے اور اس سامان کی حفاظت سراج الدولہ کے حکم سے ہو رہی تھی۔ اسی طرح جب قاسم بازار پر نواب نے قبضہ کیا تھا تو کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا بلکہ صرف سامان جنگ لے لیا گیا تھا ـــــ یہ تھی سراج الدولہ کی شرافت اور نیک دلی ـــــ مگر جب کلکتے پر قبضے کے بعد کلائیو فوج لے کر ہگلی پر چڑھ دوڑا جہاں نواب کی فوجی قوت کمزور تھی تو وہاں سات دن تک بے گناہوں کا خون بہایا گیا (۱۲ر تا ۱۸ر جنوری، ۵، ۶ء) ان کا مال و اسباب لوٹا اور جلایا گیا، انگریزی فوجوں نے بازاروں میں بھی لوٹ مار مچائی اور بے گناہوں کے خون سے کوچہ و بازار رنگین بنا دیئے، نالیوں تک میں خون بہہ رہا تھا ـــــ اُس کے مقابلے میں یہ انگریزوں کی بربریت اور استبداد کا نمونہ تھا ـــــ اس کے باوجود سراج الدولہ نے امیر البحر واٹسن کو لکھا ـــــ

> آپ نے ہگلی پر قبضہ کرنے کے بعد میری رعایا کے مال و اسباب کو لوٹا، یہ حرکات سوداگروں کے لیے ٹھیک نہیں، میں ہگلی کے قریب پہنچ رہا ہوں۔ ان امور کے باوجود اگر آپ صلح پر راضی ہیں تو ایک نمایندہ میرے یہاں بھیج دیں، میں کمپنی کو پہلی سی مراعات دینے کو تیار ہوں"۔

مگر انگریز تو سراج الدولہ کو مٹانے پر کمربستہ تھے چناں چہ کلائیو نے اپنے دو نمائندے بظاہر توصلح کی بات چیت کے لیے بھیجے لیکن دراصل نواب کی فوجی قوت اور پوشیدہ رازوں کا پتا لگانا مقصود تھا۔ یہ دونوں جاسوس رات کے وقت چپکے سے اٹھ کر آتے اور کلائیو کو سارا حال بتا دیتے۔ ۴ر فروری کو صبح چار بجے اچانک کلائیو نے اُسی خیمے پر حملہ کیا جہاں کمپنی کے جاسوسوں نے سراج الدولہ کو دیکھا تھا اتفاقاً وہ اس وقت وہاں موجود نہ تھا اور اس طرح بال بال بچ گیا۔ دن کی روشنی نمودار ہونے پر کلائیو کی یہ "فوج" واپس چلی آئی مگر سراج الدولہ کے سپاہیوں نے بھی اچھی خاصی مرمت کر دی۔

سازشیں

۹ر فروری ۱۷۵۷ء کو کمپنی اور سراج الدولہ کے درمیان عہد نامہ ہو گیا کلائیو کی بدنیتی کا اندازہ لگانے کے لیے یہ خط کافی ہے جو اُس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی سلیکٹ کمیٹی کو لکھا۔

> "ابھی کیا بگڑا ہے، نواب سے بہت سی شرطیں منظور کرائی جا سکتی ہیں بشرطیکہ نواب کے دربار میں ایک ایسا شخص سفیر مقرر کر دیا جائے جو نہایت ہوشیار ہو اور اس ملک کی زبان و معاشرت سے واقفیت رکھتا ہو۔ اس کے ذریعہ نئی شرطیں بھی منظور کرائی جا سکتی ہیں اور بہت سے خفیہ کاموں میں بھی اس سے مدد مل سکتی ہے"۔[۵]

چنانچہ اس کام کے لیے واٹس مقرر ہوا اور وہ دربارِ سراج میں غداری اور سازش کا جال بُننے کے لیے رہنے لگا۔ یہ وہی واٹس تھا جس کی نواب نے جاں بخشی کر دی تھی۔

---

[۵] صادق صدیقی: سراج الدولہ/ ۳۰۲-۳۰۸، سندر لال: بھارت میں انگریزی راج / ۲، ۷

اب انگریزوں کو ڈر کاہے کا تھا، سازشیں مکمل ہو چکی تھیں۔ لہٰذا معاہدے کی خلاف ورزی کرکے ۲۳ر مارچ کو چندر نگر پر حملے کا ارادہ کیا جو فرانسیسی بستی تھی۔ فرانسیسیوں کی شکایت پر نواب نے لکھا۔

"..... معلوم ہوتا ہے جو صلح ابھی حال ہی میں ہمارے درمیان ہوئی ہے تم اسے توڑنا چاہتے ہو"۔

مگر اس پر بھی جب انگریزی جنگی جہاز فرانسیسی کوٹھیوں کے سامنے پہنچے تو نواب نے پھر لکھا:

"ہم نے کل ہی مراسلہ بھیجا ہے جو پہنچ گیا ہوگا۔ ہمیں فرانسیسی وکیل نے اطلاع دی ہے کہ تمھارے پانچ یا چھ نئے جنگی جہاز ہگلی میں آئے ہیں اور مزید آنے کی اطلاع ہے ..... اتنی سنجیدگی سے صلح کرکے فوراً ہی جنگ کردینا کیا مناسب ہو سکتا ہے؟..."

انگریز افسران نے نہایت بے رخی سے اس کا جواب دیا کیونکہ وہ اپنا جال بچھا چکے تھے۔ انگریز مورخ ژین لا لکھتا ہے:

"واٹش نے مرشدآباد میں رشوتوں اور جھوٹے وعدوں کا بازار گرم کر رکھا تھا، نواب کے تمام افسروں ..... یہاں تک کہ خواجہ سراؤں تک کو انگریزوں کا طرف دار بنا دیا تھا"۔

واٹش نے یہ کام مکمل کرکے ۲۶ر اپریل کو کلائیو کو اطلاع دی کہ میر جعفر کو بھی اُس نے غداری پر تیار کر لیا ہے۔ کلائیو نواب کو تو نرم و شیریں الفاظ میں خط لکھتا رہا مگر واٹش کو لکھا کہ میں عنقریب فوج لے کر پہنچوں گا۔ ۴ر جون کو واٹش ایک زنانی پالکی میں بیٹھ کر آدھی رات کے وقت میر جعفر کے محل میں گیا اور اس سے عہد نامہ اور شرائط وغیرہ مکمل کرائیں۔ اس سازش میں میر جعفر کے علاوہ دُرلب رام، یار لطف خاں اور جگت سیٹھ وغیرہ شریک تھے اور کچھ معاملات امی چند

کے ذریعہ طے ہو رہے تھے جس کو انگریزوں نے لالچ دیے اور جھوٹے وعدے کیے تھے اور اس نے اپنی تھیلیوں کے منہ کھول دیئے تھے اس طرح ان سازشوں میں امی چند کا لاکھوں روپیہ خرچ ہوا جب معاملات طے ہو گئے تو غداروں کی اس ٹولی کے سردار میر جعفر نے کلایئو کو اطلاع کی۔ ایواس (IVAS) لکھتا ہے۔

"۱۲ر جون کو میر جعفر اور دیگر غداروں نے اطلاع دی وہ سب کام درست کر چکے ہیں قرعہ ٹھیک پڑے گا اور ۱۳ر جون کو تمام فوج نے کوچ کیا"۔[۵]

جنگ کا آغاز

۲۳ر جون کو بھاگیرتی ندی کے کنارے موضع پلاسی میں جنگ ہوئی تو نواب کی فوج کا بڑا حصہ جو میر جعفر، دُرلب رام، اور یار لطف خاں کی زیر کمان تھا عین وقت پر علیحدہ ہو گئے اور صرف مہاراجہ موہن لال، میر مدن اور فرانسیسی افسر سان فریز مع تھوڑی سی فوج کے مقابلہ پر رہ گئے۔ مگر اس تھوڑی سی فوج نے بھی کلایئو کی فوج کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ میر مدن اور موہن لال انگریزی توپ خانے کے قریب جا پہنچے۔ انگریزی فوجیں پسپا ہونے لگیں اور ایک آم کے باغ میں پناہ لی۔ کلایئو یہ دیکھ کر میر جعفر کے نمائندے پر برس پڑا۔۔۔۔۔

"تمہارے آقا نے تو کہا تھا کہ فوج اور سپہ سالار سب سراج الدولہ سے بگڑ گئے ہیں اور لڑائی شروع ہوتے ہی اس کا کام تمام کر دیں گے مگر مجھے تو اس کے برعکس نظر آتا ہے"۔

بد قسمتی سے اس دن سخت بارش ہوئی جس سے نواب کا تمام بارود بیکار ہو گیا۔ پھر بھی حملہ

---

[۵] محمد عمر: سراج الدولہ / ۲۰۸ (یہ حالات زیادہ تر اسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔)

جاری رہا۔ لیکن عین اس وقت کہ جب بہادر میر مدن انگریزوں کے سر پر پہنچ چکا تھا ایک گولے سے زخمی ہو کر شہید ہو گیا۔ میر مدن کی شہادت نے نواب کو دل شکستہ کر دیا، شام ہو چکی تھی مگر بہادر موہن لال برابر موت کی طرح انگریزوں کے سر پر مسلط تھا اور قریب تھا کہ قسمت کا فیصلہ ہو جائے کہ غدار میر جعفر نے اسی وقت سراج الدولہ کو یقین دلایا کہ صبح کو وہ جنگ شروع کرے گا اور اس وقت فوج کو واپس بلا لیا جائے۔ دوسری طرف انگریزوں کو حملہ جاری رکھنے کی تاکید کر دی تھی ——— "اس وقت موہن لال دشمن سے گھمسان کی جنگ کرتا تھا، اس کا توپ خانہ قہر کی گولہ باری کر رہا تھا، سپاہیوں کی گولیوں کی بارش ہو رہی تھی عین اس وقت اسے جنگ بند کر کے لوٹ آنے کا حکم ملا اُس نے جواب دیا کہ یہ وقت واپسی کا نہیں ہے جنگ اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ جو کچھ ہونا ہے ابھی ہو جائے گا۔ نواب نے پھر میر جعفر سے پوچھا اس نے کہا "میں نے صحیح مشورہ دیا ہے آگے جو حضور کی مرضی" ———

سراج الدولہ اس ہراسانی میں میر جعفر کی طرف سے مایوس ہو کر موہن لال کو حکم پر حکم بھیجنے لگا کہ وہ واپس آجائے آخر مجبور ہو کر موہن لال نے حکم کی تعمیل کی، موہن لال کی پسپائی کا اثر بہت برا پڑا۔ جہاں جس کے سینگ سمائے نکل گیا اور کیمپ بالکل خالی ہو گیا[1] (۲۳ر جون ۱۷۵۷ء مطابق ۵ رشوال ۱۱۷۰ھ)۔

جنگِ پلاسی کی یاد

یہ تھا اس فیصلہ کن جنگ کا خاتمہ اور ملک کی غلامی کا آغاز۔ جسے ہندوستان کے غیور فرزندوں نے اپنی قومی شکست قرار دیا۔ جس کی یاد وہ ہر سال پلاسی کے میدان میں جمع ہو کر مناتے رہے اور جس کا بدلہ لینے

---

[1] محمد عمر / ۱۹۹

کے لیے وہ اتنے بے قرار تھے کہ ۲۳ جون ۱۸۵۷ء کو پورے سو سال بعد بھی اس اعلان کے ساتھ میدان میں آئے کہ

"آج ہم پلاسی کا بدلہ لیں گے"

قدرت نے ہندوستان کی قسمت میں مزید نوے سال کے لیے غلامی لکھ دی، مگر ۱۸۵۷ء کے حالات دیکھیے تو پتہ چلتا ہے کہ ان بہادروں نے انگریزی خون کے چھینٹوں سے اس ملک کے چپے چپے کو لالہ زار بنا کر اپنی قومی بے عزتی کا بدلہ لے لیا اور پھر غداری اور دغابازی کے ان سیاہ دھبوں کو بھی ——— جو جنگ پلاسی نے قوم کے دامن پر لگائے تھے ——— اپنے خون سے دھو کر آزادیٔ وطن اور حفاظت دین کی خاطر پروانہ وار نثار ہو گئے ——— مگر

کہ شب ہندوستاں آید بہ روز

مُرد جعفر، زندہ روحِ او ہنوز

انجام پلاسی کی جنگ کے بعد سراج الدولہ کو گرفتار کر کے کلائیو کے اشارے پر میرن نے نہایت دردناک طریقے پر قیمہ قیمہ کرا دیا۔ اس کی لاش کو تمام شہر میں ہاتھی پر رکھ کر پھرایا گیا جس کے ہمراہ ہزاروں انسانوں کی آہ و زاری نے آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ راجہ موہن لال وغیرہ کو بے حد تکلیف دے دے کر قتل کیا گیا۔ لیکن اس کے بعد ان غداروں سے بھی قدرت نے عبرت ناک انتقام لیا جس کی تفصیل تو ہمارے لیے غیر ضروری ہے مگر مختصراً اتنا سن لیجیے کہ میر جعفر جذام کے مرض میں مبتلا ہو کر نہایت ذلت و خواری سے مرا میرن پر بجلی گری، جگت سیٹھ اور راجہ درلب کو میر قاسم نے غرق کیا، کلائیو نے خودکشی کی اور امی چند پاگل ہو گیا۔

سراج الدولہ سے عوام کو جو بے پناہ عقیدت و محبت تھی اس کا اندازہ نہ صرف مرشد آباد کے کہرام سے ہوتا ہے۔ بلکہ جب یہ اندوہناک خبر عظیم آباد (پٹنہ) پہنچی تو راجہ رام نرائن صوبہ دار عظیم آباد نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور دیوانہ وار بازار میں روتا پھرتا تھا، اس کے پیچھے بے پناہ ہجوم نے کہرام مچا رکھا تھا، سارا شہر ماتم کدہ بن گیا، کوئی آنسو بہاتا اور کوئی سینہ پیٹتا تھا، رام نرائن روتے میں یہ شعر پڑھتا جاتا تھا۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری [1]

بیر بھوم کے جاگیر دار نواب بدیع الزماں کو جب خبر ملی تو وہ فقیرانہ لباس پہن کر جنگل کی طرف نکل گیا [2]

---

[1] میر حسن: تذکرہ شعرائے اردو/ ۱۷۳- لیکن "تذکرہ مسرت افزا" مصنفہ ابو الحسن امر اللہ الہ آبادی مخطوطہ برٹش میوزیم میں یہ شعر مشتاق بنارسی کے نام سے دیا گیا ہے اور ردیف "ویرانے پہ کیا گزرا" ہے جو اس عہد کا عام محاورہ تھا۔ دیوانِ یقین مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ میں یقین کی غزل بھی اسی زمین میں موجود ہے اس میں بھی "گزرا" ہی لکھا گیا ہے۔

[2] محمد عمر/ ۲۴۹

بنگال کی المناک تباہی

میر جعفر

بنگال پر انگریزی حکومت مسلط ہونے کے بعد پہلے کلائیو نے میر جعفر کو تخت نشین کیا جسے بنگال کے عوام "کلائیو کا گدھا" کہتے تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں لوٹ مار کی بدولت نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ فوج بھوکوں مرنے لگی اور اس فاقہ کش فوج نے ایک بار تو میر جعفر کے محل کا محاصرہ تک کر لیا۔ اس بدحالی کی وجہ یہ تھی کہ میر جعفر کے تخت نشین ہوتے ہی انگریزوں کے مطالبات شروع ہو گئے۔ تین یا چار کروڑ پر تو سازش کے وقت معاملہ طے ہوا تھا اس کے علاوہ ڈیڑھ کروڑ بطور تاوانِ جنگ اور تقریباً اتنا ہی افسران کو بطور انعام۔ پھر تقریباً تیس لاکھ روپیہ کمپنی کے بڑے عہدہ داروں کو نذرانے کے طور پر دینے کا مطالبہ ہوا مگر بنگال کے خزانے میں اتنا روپیہ کہاں تھا کہ وہ کمپنی کے ہوس کاروں کا پیٹ بھر سکتا؟۔ کچھ علاقے رہن رکھے گئے۔ کلکتے کے جنوب کی اراضیات پر بھی قبضہ کیا گیا۔ جن کا سالانہ لگان ۲۲۲۹۵۱ روپیہ تھا۔ پٹنے کی شورے کی تجارت پر کلائیو نے قبضہ کر لیا۔ میر جعفر سے سولہ لاکھ روپیہ نقد وصول کیا۔ پھر جب عظیم آباد کے صوبے دار رام نرائن نے بغاوت کی تو کلائیو نے صلح کرائی اور اس کا معاوضہ سات لاکھ وصول کیا۔ اورمی لکھتا ہے:

"۲۶ جولائی ۱۷۵۷ء کو ۲۰۰، ۱۶۶۶، ۲ روپیہ کمپنی کو وصول ہوا۔ یہ روپیہ سات سو صندوقوں میں بند تھا اور ایک سو کشتیوں میں لد کر آیا۔ انگریزوں نے اس قدر روپیہ کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا"۔

علاوہ ازیں کلائیو نے ایک جاگیر زبردستی حاصل کی جس کی سالانہ آمدنی ۰۰۰۰، ۱۹۵ روپیہ تھی[1] میر جعفر کے بعد اس کے داماد میر قاسم کو نواب بنادیا گیا جس نے اپنی بیگمات کے زیور تک نوچ کر کمپنی کے قدموں میں ڈال دیئے۔ مطلب نکل جانے کے بعد انگریزوں نے اس سے ذاتی جھگڑے شروع کر دیئے میر قاسم کے اندر غیرت و حمیت کا مادہ موجود تھا اس نے ملکی تاجروں کو تباہ ہوتا دیکھ کر ان کے محصول بھی معاف کر دیئے۔ مگر لالچی انگریز تاجر چراغ پا ہو کر جنگ پر آمادہ ہو گئے چنانچہ پٹنہ پر حملہ میں شکست کے بعد پرانی چال کھیلی۔ یہاں میر جعفر کا پارٹ میر قاسم کے سردار نجف خاں نے ادا کیا اور اسی کی رہبری میں انگریز رات کی تاریکی میں ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں نواب کا لشکر توپوں کی زد میں تھا۔ اس شب خون میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور میر قاسم کی فوج کا شیرازہ بکھر گیا[2] (بمقام اودانالہ ۱۷۶۳ء) اس کے بعد بکسر کی جنگ کا بھی سازشوں کی بدولت یہی انجام ہوا اور شاہ عالم انگریزوں کی پناہ میں آگیا، مغلیہ سلطنت آخری سانس لینے لگی انگریزوں نے میر جعفر کو دوبارہ نواب بنا کر لاکھوں روپیہ وصول کیا اور اس کے بعد اس کے بیٹے نجم الدولہ کو "کٹھ پتلی" بنا کر بیس لاکھ روپیہ وصول کیا۔ مارش مین لکھتا ہے۔

"بڑی بڑی خطیر رقموں کا مطالبہ نہایت ظالمانہ ذرائع کے ساتھ کیا جاتا تھا اور

---

[1] محمد عمر / ۱۴۱ [2] ۵۲ ہاشمی تاریخ ہند

اس کی تعمیل کے لیے بہت تھوڑا وقفہ دیا جاتا تھا۔ عام اخلاق کے تمام اصولوں کو ٹھکرا دیا جاتا تھا"۔

بعد میں کلائیو کے اشارے پر نجم الدولہ کو زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ مگر بنگال میں جو اقتصادی تباہی مچی اس پر ایک نظر ڈالنا بطور مثال اس لیے ضروری ہے کہ پورے ملک کی تباہی کا ایک نقشہ سامنے آجائے۔

کنگال بنگال

کمپنی نے ۱۷۶۵ء میں بہار بنگال اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل کرتے ہی ان علاقوں سے اپنے مقابل دوسرے یورپین تاجروں کو نکال کر تجارت وغیرہ پر قبضہ جما لیا جس سے کمپنی کے تو وارے نیارے ہو گئے مگر عوام کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی ایڈم اسمتھ اس کے متعلق لکھتا ہے۔

"مخصوص سوداگروں کی ایک ٹولی کی حکومت شاید دنیا میں حکمرانی کی بدترین مثال ہے۔ آج تک کوئی حکمران اپنی سلطنت کی اصلاح اور خرابیوں کی طرف سے یا اپنی رعایا کی خوش حالی یا بدحالی کی طرف سے اس حد تک مکمل طور پر بے پروا نہیں ہوا، اور نہ کبھی ہو سکتا ہے جیسا کہ اس تاجر ٹولی کے اکثر مالکان ہیں اور انہیں یقیناً ایسا ہونا بھی چاہیے"[1]

اسی طرح ایک اور انگریز ولیم بولٹس کی رائے تھی کہ:۔

---

1. "The wealth of nations": V. IV Chapter VII (Symposium)

"اگر کمپنی کو اس کے موجودہ نظام پر عمل کرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا تو نہ صرف وہ تباہ ہو گی بلکہ بنگال میں ہمارے مقبوضات مفلس اور قلاش ہو جائیں گے" [1]

دیوانی حقوق حاصل ہونے کے پہلے ہی سال ۶۶-۱۷۶۵ء میں لگان ۱۴۰۰۰۰۰ پونڈ کر دیا گیا جو کہ اس سے پہلے یعنی ۶۵-۱۷۶۴ء میں ۸۱۱۰۰۰ پونڈ تھا [2] چنانچہ جنگ پلاسی کے بعد ہی سے یہ لوٹ انگلستان کو سیراب کرنے لگی تھی ایک سرسری اندازے کے مطابق جنگ پلاسی سے جنگ واٹرلو تک (تیس چالیس سال) ہندوستان سے پندرہ ارب روپیہ انگلستان جا چکا تھا [3]

کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرز کے لئے بھی ان کے مقبوضات "سامان تجارت" سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے۔ ۱۷۶۰ء میں زمیندار کی طرف سے ٹیکس ادا نہ ہونے کی صورت میں زمین قرق کر لینے یا بحق سرکار فروخت کر دینے کا اختیار دیا گیا۔ کے (Kaye) کہتا ہے۔

---

1. "Consideration on Indian affairs," preface
   Symposium—6

2. Wadia and Merchant—"our Economic Problem"—279 , Symposium—9

3. کمپنی کی حکومت / ۳۸۴

"اس نئے نظام سے وہ لوگ جو وسیع قطعات زمین کے مالک تھے، کچی جھونپڑیوں

کے کرایہ دار اور چند کھانے پکانے کے برتنوں کے مالک رہ گئے"۔ ۱ ؎

اتنا ہی نہیں، بلکہ ـــــ "کمپنی کے ملازموں نے بنگال کی تجارت کو تباہ و برباد کرنے کے بعد حصول محصولات کا ایسا طریقہ ایجاد کیا جس کے بیان سے روح لرز جاتی ہے، جس کا تذکرہ بدن میں کپکپی پیدا کرتا ہے ـــ الم ناک داستان جو صرف اشکوں کی روانی ہی میں سنی جا سکتی ہے ... ... ان بے پناہ مظالم نے بنگالی تجارت صنعت اور زراعت کو

ناقابلِ عمل برباد اور ویران کر دیا"۔ ۲ ؎

"دستکاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم"

بنگال کی صنعتی بربادی کی داستان بھی انتہائی دردناک ہے۔ جس کی صنعت و حرفت اور خصوصاً کپڑے کی صنعت دور دور مشہور تھی ڈھاکہ کی ململ تو آج تک روایتی طور پر مشہور ہے۔ ایک انگریز برلنس کی زبانی بھی سنیئے کہ

"بعض کپڑے تو ایسی حیرت انگیز نفاست سے تیار ہوتے ہیں کہ پرستان کے

بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں"۔ (۱۶۶۳ء میں)

یہ نفیس کپڑے انگلینڈ میں اس قدر مقبول ہوئے کہ وہاں کی تجارت خطرے میں پڑ گئی۔ چنانچہ پارلیمنٹ میں قانون پاس کیے گئے جس سے ہندوستانی کپڑے کا استعمال نہ صرف

---

1. Kaye's History :V. 1—157
   Symposium—9

۲ ؎ کمپنی کی حکومت / ۱۰۰

ممنوع قرار پایا بلکہ جرم سمجھا جانے لگا۔ ۱۷۶۶ء میں ایک عورت پر دو ہزار پونڈ جرمانہ ہوا کیونکہ اس کا رومال، ہندوستانی کپڑے کا تھا اس کے علاوہ ہندوستانی کپڑے پر ستر اور اسی فیصدی چنگی لگائی گئی جس سے اس کی کھپت بالکل بند ہونے لگی اس پر ہندوستانی تاجروں نے فریاد کی اور اپنی عرضداشت لندن بھیجی کہ جس طرح برطانوی مال بغیر محصول اتارا جاتا ہے اسی طرح ہمیں بھی رعایت دی جائے مگر نقار خانے میں طوطی کی صدا کون سنتا۔ نتیجہ یہ کہ صنعت بالکل تباہ ہوگئی اور ساتھ ہی تجارت بھی غارت ہوئی۔

بنگال کے کپڑا بننے والوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ صرف انگریزوں کی فیکٹریوں میں کام کریں۔ ولیم بولٹس لکھتا ہے۔

"غریب ہندوستانی دست کاروں اور کاریگروں پر ایسے ایسے مظالم توڑے گئے جن کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ غریب کمپنی کے غلام بنا دیئے گئے۔ جرمانے، قید، جبری معاہدے اور بیدزنی کی سزاؤں نے نور بافوں کی نسل معدوم کر دی۔۔۔ نور باف جب کمپنی کے سخت اور جابرانہ معاہدے منظور کرنے سے انکار کرتے تو کمپنی کے ایجنٹ ان کا سامان نیلام کر دیتے اور قیمت ضبط کر لیتے۔ باریک ریشم کاتنے والوں پر بھی یہی ظلم کیا جاتا، ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں کہ لوگوں کے انگوٹھے اس لئے کاٹ دیئے گئے کہ وہ مہین دھاگا نہ بنا سکیں۔ [۵۱]

اس کا نتیجہ کیا ہوا۔؟ ——— یہ جیمس ٹیلر کی زبانی سنیئے۔

"صنعت و حرفت اور تجارت کے تنزل کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ڈھاکہ کی آبادی تقریباً

۵۱۔ کمپنی کی حکومت / ۳۸۰

برباد ہوگئی ۱۸۱۳ء میں دو لاکھ تھی اور اب (۱۸۳۸ء میں) صرف سترہ ہزار رہ گئی ہے۔ جتنی تیزی سے آبادی گھٹی اس سے کہیں زیادہ سرعت سے افلاس بڑھ گیا"۔ لہ

ہولناک قحط ۱۷۷۰ء میں بنگال و بہار میں ہولناک قحط پڑا جس کی بدولت ایک تہائی آبادی بھوک سے تڑپ تڑپ کر فنا ہوگئی۔ بارش کی کمی سے فصل بگڑنا نئی بات نہ تھی مگر پہلے کاشت کار عام طور پر خوش حال ہوتے تھے اور اناج کے اتنے ذخیرے موجود رہتے تھے کہ ایک دو فصلوں کی خرابی مہلک نہ ہوتی لیکن اب صرف ایک سال کی بارش کی کمی سے خوفناک قحط پڑ گیا اور سب سے زیادہ مصیبت ـــــ زرخیز ہونے کے باوجود انہی علاقوں پر آئی جو چند سال سے انگریزی چنگل میں تھے مگر

"کمپنی کے ملازموں نے انسانی نعشوں کے اوپر کھڑے ہو کر محاصل اور مالیہ کا مطالبہ کیا۔ بربریت کی تاریخ میں اس سے زیادہ خونچکاں حوادث کا ملنا امر محال ہے۔ کمپنی کے فلک بوس گوداموں کے سائے میں لوگ دانے دانے کو تڑپ کر مرگئے لیکن کمپنی نے گوداموں کو بدستور مقفل کیے رکھا" ۲ہ

اس قحط سالی کی بدولت مدت تک یہ علاقہ ویران رہا چنانچہ قحط کے تقریباً بیس سال بعد کارنوالس نے بنگال کی نسبت لکھا۔

"یہ ملک آج کل درندوں کا مسکن اور غیر آباد جنگل رہ گیا ہے" ۳ہ

لہ ۲ہ کمپنی کی حکومت

۳ہ ہاشمی۔ تاریخ ہند/ ۶۵

اللہ اللہ۔ کہاں تو وہ بنگال جو صنعت و حرفت میں دنیا کو انگشت بدنداں کر رہا تھا، اور کہاں "درندوں کا مسکن" اور "غیر آباد جنگل" ——

دستکاروں کی بدحالی

اسی طرح جب برطانوی مصنوعات ملک کے بازاروں میں چھا گئیں، ہندوستانی صنعت بالکل تباہ ہوگئی تو یہ حالت ہوئی کہ یہ بدنصیب ملک صرف خام اشیاء کی منڈی بن گیا۔ نتیجہ یہ کہ کاریگر اور دستکار طبقہ بالکل تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔ اس سلسلہ میں لارڈ ولیم بنٹنک نے کورٹ آف ڈائرکٹرز کو لکھا۔

"ان کی بدحالی کی مثال تجارت کی تاریخ میں مشکل سے مل سکے گی" [1]

ملک کی اقتصادی، زراعتی اور صنعتی بدحالی کی الم ناک داستان ہم دوسرے صفحات میں پیش کریں گے۔

---

1. Symposium—7

ہندوستان برطانوی شکنجے میں

(۱۸۵۷ء تک صد سالہ واقعات و حالات کا سرسری جائزہ)

۱۸۵۷ء کی انقلاب انگیز بغاوت کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ملک کا ایک سرسری سا نقشہ، سیاسی صورت حال اور واقعات بھی ذہن میں رکھے جائیں تاکہ ملک پر انگریزی تسلط کی غم ناک داستان ذہن نشین ہو سکے۔

وارن ہسٹنگز

انگریز گورنر جنرل جو اس بدنصیب سرزمین پر اپنے "سبز قدم" لے کر آئے اُن میں ایک، دوسرے سے زیادہ غاصب، جابر اور غارت گر ثابت ہوا لیکن پھر بھی یہ کہنا بے جا نہیں کہ کلائیو کے بعد آنے والے وارن ہسٹنگز کو ہم چوٹی کے سفاکوں میں شمار کر سکتے ہیں۔

جب ہسٹنگز لندن پہنچا تو چند شریف مزاج انگریز اس کے مخالف تھے اور انھوں نے انسانیت اور انصاف کے نام پر اس کے خلاف مقدمہ رکھا یا۔ اس کے مخالفین میں انگلستان کا مشہور جادو بیان مقرر ایڈمنڈ برک سب سے آگے تھا جو ایک عرصے سے ہندوستانی سیاست کا مطالعہ کر رہا تھا اور اسی وجہ سے ہسٹنگز کا سب سے زیادہ

مخالف تھا، بلکہ اس کی مخالفت عناد تک پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ اس نے چار دن تک مسلسل ایوان عام میں تقریر کی اور ہسٹنگز کے خلاف بائیس سنگین الزامات لگائے۔ انگریز مورخ مارشمین لکھتا ہے۔

"انھوں نے ہسٹنگز کو سارق، ظالم، غارت گر، فریبی، جعل ساز، ٹھگ، بے ایمانوں کا سردار اور دوزخ کا بچھو کے القاب سے یاد کیا اور پھر بھی انھیں یہ افسوس رہا کہ اس کے جرائم کی پوری تشریح کرنے والی صحیح اصطلاحات انگریزی زبان میں نہیں ملتیں"۔ (۱۱)

بہتر ہے کہ اس عہد کے چند واقعات بطور مثال پیش کر دیے جائیں۔

ہسٹنگز کا پہلا "کارنامہ" جنگِ روہیلہ

قصہ یہ تھا کہ نواب اودھ نے روہیلہ سردار سے کچھ روپیہ طلب کیا جو اس پر واجب تھا اور پہلی قسط وصول بھی کر لی لیکن نواب اودھ چوں کہ روہیلوں کی دلیری سے خوف زدہ تھا اس لیے اُس نے چالیس لاکھ روپے کے عوض انگریزوں کی مدد کے لیے گٹھ جوڑ کر لیا، ساتھ ہی دو لاکھ روپے ماہ وار فوجی اخراجات کے لیے دینا طے ہوا اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں! — حریص اور لالچی انگریز چالیس لاکھ کی طمع میں بے قصور روہیلوں پر ٹوٹ پڑا۔ روہیلوں کی شکست کے بعد ان پر جو ہولناک مظالم ڈھائے گئے اُن کی مثال صفحۂ تاریخ پر ملنا دشوار ہے۔ ایک مؤرخ کے اندازے کے مطابق پانچ لاکھ انسان بے گھر ہوئے تاہم انگریز مؤرخ یہ تعداد ایک لاکھ سے

---

1. Marshman – 210

زائد بتاتے ہیں، ان کے گاؤں جلا دیے، بچے ذبح کیے اور عورتیں بے عزت کی گئیں۔

برک نے اپنی تقریر میں کہا۔

"ہسٹنگز نے چالیس لاکھ کے عوض ظالم نواب اودھ کے ہاتھوں ایک قوم فروخت کردی اور زرخیز میدان ایک وسیع ویرانے میں تبدیل ہو گیا صفحۂ ہستی پر ایک بھی حساس اور راست باز انسان ایسا نہیں جو احترام و انصاف اور انسانیت و آشتی کے پیش نظر ہسٹنگز کے اس فعل کی مذمت نہ کرے۔۔۔۔

میں دوبارہ اس امر کو ثابت کر سکتا ہوں کہ یہ واقعہ اپنے اندر بدترین بھید چھپائے ہوئے ہے"۔

چیت سنگھ

ہسٹنگز کا دوسرا بڑا "کارنامہ" چیت سنگھ راجہ بنارس سے متعلق ہے جو کمپنی کا باج گذار تھا اور وہ اپنا خراج پابندی سے ادا کر رہا تھا مگر کمپنی کی جیب کو قاروں کا خزانہ بھی پر نہیں کر سکتا تھا، پھر کمپنی چاروں طرف سے جنگوں میں مصروف تھی، قتل و غارت کا دور دورہ تھا چناں چہ ہسٹنگز نے راجہ بنارس کا گلا دابا اور مزید پانچ لاکھ کا مطالبہ کیا۔ روپیہ اس غریب نے ادا کیا مگر مطالبہ ہر سال بڑھتا ہی گیا مجبوراً راجہ نے اپنی معذوری کا عاجزانہ اظہار کیا تو اس "جرم" پر ہسٹنگز روپیہ وصول کرنے خود بنارس پہنچا۔ راجہ نے راستے ہی میں آکر ملاقات کی، ناراضگی دور کرنے کے لیے پچیس لاکھ پیش کیا مگر اب مطالبہ پچاس پر پہنچ گیا تھا۔ راجہ کو گرفتار کر لیا گیا — لیکن آخر کہاں تک۔؟۔ راجہ کی رعایا برداشت نہ کر سکی اور گورے سپاہیوں اور افسروں کو قتل کرکے پھینک دیا۔ ہسٹنگز بہ مشکل تمام رات کے وقت کھڑکی سے کود کر بھاگا۔ عوام کا جوش حد سے بڑھ چکا تھا۔ کمپنی کی فوجیں "امن" قائم

کرنے پہنچیں اور نئے ہتھیاروں سے عوام کا جوش ٹھنڈا کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ روپے کے لالچ میں ہوا تھا مگر لطف یہ ہے کہ جب یہ سب کچھ ہو چکا تو انگریز افسروں نے خزانے کا روپیہ گورہ فوج میں تقسیم کر دیا۔ ہسٹینگز صاحب بہت برافروختہ ہوئے مگر بے سود۔! (۱۷۸۱ء)

بیگمات اودھ

اب یہ غصہ کہاں اُترے؟۔ نواب وزیر موجود ہے! مگر اس کا خزانہ بھی "چیل کا گھونسلا" بنا ہوا تھا البتہ بیگمات کے پاس زیورات وغیرہ کی شکل میں روپیہ تھا۔ لہٰذا ہسٹینگز کے اشارے پر اُن کی تمام مال و متاع، جاگیر و زیورات چھین لیے گئے (۱۷۸۲ء) ——— کس قصور میں؟

مارش میں لکھتا ہے۔

"اس وقت سے چھ سال پہلے اس خزانے پر بیگمات کا حق کلکتہ گورنمنٹ کی مہر کے ذریعے تسلیم کیا جا چکا تھا اور اس مہر کا احترام واجب تھا"

پھر، بیگمات پر جو ظلم اور زبردستیاں کی گئیں، قلم ان کے بیان سے عاجز ہے چناں چہ برک نے اپنی تقریر میں کہا۔

"بیگمات کی جاگیروں اور خزانوں پر غیر منصفانہ قبضے نے نہ صرف ان کو جسمانی مصائب کا شکار بنایا بلکہ ان کی جنسیت پر بھی اثر انداز ہوا ..... ان ظالمانہ افعال کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود محل کے مکین انتہائی تنگ دستی اور عسرت کا شکار ہو گئے ...... حضرات! ان بیگمات کو سپاہ کی سنگینیں ہی برداشت کرنا نہیں پڑیں بلکہ اخلاقی طور پر بھی اُنھیں ذلیل کیا گیا"

برک کی تقریر کا ہر لفظ اس قابل ہے کہ نہ صرف غور سے پڑھا جائے بلکہ اس کی روانی اور

وجد آور طرز بیان پر سر دھنا جائے۔ مگر خوفِ طوالت کی وجہ سے چند ہی جملوں پر اکتفا کرنا پڑے گا۔ استغاثہ کی تقریر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"میں الزام لگاتا ہوں کہ انھوں نے اپنے ذاتی اغراض کے لیے نظام حکومت کو فنا کردیا ..... میں الزام لگاتا ہوں کہ انھوں نے گنگا گووند سنگھ سے رشوت لی، میں الزام لگاتا ہوں، کہ انھوں نے فریب سے کام لے کر بیوہ عورتوں کی ملکیت کو خرد برد کیا .... میں الزام لگاتا ہوں کہ انھوں نے بغیر کسی قانونی حق کے یتیموں کی جائدادیں چھینیں ...... اور یوں وہ براہ راست ایسے ایسے مظالم کا باعث ہوئے، جو ضبط تحریر میں نہیں آسکتے، میں الزام لگاتا ہوں کہ انھوں نے ملک کو برباد کیا، کاشت کاروں کو تباہ کردیا، ان کے مکانوں کو جلایا، ان کی فصلوں کو غرق کیا اور ان کو طرح طرح کے عذاب پہنچائے، ہندوستانی عورتوں کی توہین و تذلیل کی، میں ان کے خلاف شدید و سنگین جرائم کے ارتکاب کا الزام قایم کرتا ہوں"۔

اتحاد میں ناکامی برطانوی درندگی اور حیوانیت کی یہ نادر مثالیں دیکھ کر اور آنے والے خطرے کا احساس کرکے ملک کی ریاستوں نے انگریز کے خلاف متحد ہونا چاہا اور ۱۷۷۹ء میں نانا فرنویس، حیدر علی، نظام اور دوسری مرہٹہ ریاستیں متحد بھی ہوگئیں مگر ہسٹینگز نے بھی عیارانہ سازشوں کی انتہا کردی۔ حیدر علی (والیٔ میسور) نے مدراس پر چڑھائی کی اور انگریزوں کو زبردست شکست دینے کے باوجود مدراس سے نکالے بغیر چھوڑ دیا۔ نانا فرنویس نے بمبئی پر حملہ کیا اور ہلکر کی مدد سے انگریز جنرل گوڈارڈ کو شکستِ فاش دی۔ ناگ پور کا راجہ طے شدہ

پروگرام کے مطابق بنگال کی طرف بڑھا ـــــ ہسٹینگز ان تمام کارروائیوں سے لرزہ براندام تھا مگر میدان میں مقابلہ ناممکن تھا، لہٰذا مرہٹہ دربار میں جو کئی طاقتوں میں تقسیم تھا اپنے گرگے روانہ کیے جنھوں نے اس اتحاد کو پارہ پارہ کر دینے کی پوری کوشش کی، دوسری طرف ناگ پور کے راجہ چمنا جی آپا کو سولہ لاکھ روپیہ رشوت دے کر اس معاہدے سے علیحدہ کر دیا۔ مارشمین کو اقرار ہے کہ

"اس طرح ہسٹینگز نے اس اتحاد کے سب سے خطرناک رُکن کو توڑ لیا"۔

صرف حیدر علی نے اپنے آخری سانس تک دشمنانِ وطن سے جنگ کی اور پھر سلطان ٹیپو شہیدؒ نے اس جنگ کو جاری رکھا۔

سلطان ٹیپو شہیدؒ

سلطان ٹیپوؒ اس راہ میں جہاد کرتا ہوا شہید ہو گیا مگر دشمنانِ وطن کی غلامی قبول نہ کی، سلطان کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے، زمانۂ حکومت پر نظر ڈالی جائے تو انگشت بدنداں ہونا پڑتا ہے۔ پندرہ سولہ سال کی عمر ـــ لڑکپن کا زمانہ ـــ مگر جذبۂ حُبِ وطن سے سرشار ٹیپوؒ دشمنانِ وطن کے خلاف میدانِ جنگ میں صف آرا نظر آتا ہے اور کرنل بیلی، آئر کوٹ بریتھ وڈ اور کرنل ہمبرسٹن جیسے آزمودہ کار انگریز جنرل اس سے شکست کھاتے دکھائی دیتے ہیں ـــ صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ سلطانؒ ایک علم دوست، مفکر اور جمہوریت پسند حکمراں نظر آتا ہے۔ وہ اپنی حُب الوطنی اور دوراندیشی کی بدولت شیاطین برطانیہ کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ چناں چہ جب حیدر علی اور سلطان نے پیہم شکستیں دیں تو انگریز حسبِ دستور ناپاک عیارانہ سازشوں پر اتر آیا، نظام حیدرآباد اور مرہٹوں سے ساز باز کر کے کارنوالس سلطان سے جنگ پر آمادہ ہو گیا اور خود ہی اس جنگ کا

بہانہ راجہ ٹراونکور کے ذریعے پیدا کر کے تینوں کی متحدہ فوجیں میسور پر ٹوٹ پڑیں۔ چاروں طرف سے حملہ کر دیا گیا۔ ٹیپو نے کئی بار صلح کی درخواست کی مگر ہر بار ٹھکرا دی گئی، اس پر بھی میسور کے شیروں نے اس بے دردی اور بے جگری سے دشمن کا مقابلہ کیا کہ کارنوالس ایک بار بالکل بے بس ہو گیا، بارود کی گاڑیوں کو آگ لگا دی، توپوں کو دریا میں ڈبویا اور بنگلور کو لوٹ گیا مگر اس کے بعد چودہ لاکھ روپیہ دے کر مرہٹوں کو خرید لیا چناں چہ مرہٹہ فوج مدد کے لیے آ پہنچی اور میسور پہ پھر حملے شروع ہو گئے کیوں کہ کارنوالس جانتا تھا کہ اس وقت میسور کا شیر بے بس ہے، تین متحدہ طاقتیں حملہ آور ہو رہی ہیں، فرانس بھی اپنی اندرونی گڑبڑ کی وجہ سے امداد کرنے سے قاصر ہے لہٰذا اس سے بہتر موقع ہاتھ نہ آسکے گا۔[1]

جب صلح ہوئی تو سلطان کی آدھی سلطنت چھین لی گئی، تین کروڑ سے زائد روپیہ تاوانِ جنگ وصول کیا گیا اور شہزادوں کو بطور ضمانت چھین لیا گیا۔ یہ تو سب کچھ ہوا ہی، مگر میسور کے اُن سرسبز و شاداب علاقوں کو جن کے متعلق متعدد مؤرخوں نے حیرت سے اقرار کیا ہے[2] کس بے دردی سے روندا گیا، میری نہیں "کمپنی کی حکومت"

---

[1] کارنوالس نے جنرل میڈوز کو لکھا۔ "اگر فرانس ٹیپو کی مدد کے قابل ہو گیا تو ہمیں ہندوستان سے نکلنا پڑے گا۔" ("کمپنی کی حکومت" ۱/ ۲۵۰)

[2] مثلاً برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر نے اقرار کیا تھا کہ میسور کے باشندے سب سے زیادہ خوش حال ہیں۔ اسی طرح میجر ڈیرام اسٹاف افسر لارڈ کارنوالس نے اقرار کیا ہے کہ سرنگاپٹم سب سے زیادہ خوب صورت سب سے زیادہ دولت مند اور سب سے زیادہ سکون بخش خطۂ زمین ہے ("کمپنی کی حکومت" اور "تاریخ سلطنت خداداد")

کے مصنف کی زبانی سنیے۔

"کارنوالس کے احکام کے مطابق اہل بنگلور پر ظلم و تعدی اور جور و جفا کے تیروں کی ایسی بارش کی گئی جس میں شباب مقتول، حسن خوار، عزت مجروح اور عصمت دریدہ تھی۔ جنگلی جانوروں کی طرح انسانوں کا شکار کیا گیا، زندوں کو قتل اور مردوں کو نذرِ آتش کیا گیا"

کارنوالس کے بعد ولزلی آیا۔ سلطان ٹیپو کی آدھی سلطنت چھن چکی تھی، اس کی حدیں سمندر سے دور ہو گئی تھیں، پھر بھی سلطان نے ہمت نہ ہاری ایران، افغانستان، ترکی اور فرانس کو آزادیٔ وطن کی جنگ میں امداد کے لئے سفارتیں بھیجیں مگر ولزلی کی عیاریوں نے ناکام بنا دیں ولزلی کے چھوڑے ہوئے گرگوں نے ایران اور افغانستان میں اختلاف پیدا کر دیا اور والیٔ افغانستان زماں شاہ ہندوستان کی سرحد تک آکر لوٹ گیا۔ فرانس کا نپولین امداد کا وعدہ کرنے کے باوجود اس قابل نہ ہو سکا۔ اس دوران میں انگریز، نظام اور مرہٹہ فوجیں میسور پر اچانک ٹوٹ پڑیں۔ تاریخ نے ایک بار پھر جنگِ پلاسی کا ڈرامہ سرزمین میسور پر دہرایا، میر جعفر اور رولب رام کی روحیں میر صادق اور پورنیا کی شکل میں نمودار ہو گئیں اور بطن حیدر و فاطمہ (سلطان ٹیپو کی والدہ) سے جنم لینے والے مردِ مجاہد نے تن تنہا ان سب کا مقابلہ کرتے ہوئے ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو جام شہادت نوش کیا۔ سلطان کی شہادت کے ساتھ ہی ہندوستان کی آزادی کا چراغ گُل ہو گیا اور اب دشمنانِ قوم و وطن کو للکارنے والا مجاہد کوئی باقی نہ رہا تو وہ فرطِ مسرت سے چلا اٹھے کہ "آج ہندوستان ہمارا ہے"[۲] اور واقعات نے ثابت کر دیا کہ

---

[۱] شبیرِ میسور / ۱۸۵

کہ واقعی ہندوستان آج ان کا ہو گیا کیوں کہ نظام حیدرآباد اور مرہٹے جنھوں نے لالچ اور گھمنڈ میں ملک سے غداری کی تھی انگریزی استبدادیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں سوکھی جھاڑیوں کی طرح بہہ گئے ـــــ اور صرف چار پانچ سال کے اندر ہی اندر ـــــ مگر میسور کو اس طرح غصب کرنے کے بعد انگلستان کی "مہذب" قوم نے شاہی محلات اور عام شہریوں کو کس طرح لوٹا، اسے سننے کے لیے پتھر کا جگر درکار ہے۔

سلطان ٹیپو کے بعد

میسور کی آزادی ختم کر کے مرہٹوں اور دوسری طاقتوں پر کمپنی کی لالچی نگاہیں اٹھنے لگیں۔ براہ راست ٹکر یقیناً ناممکن تھا لہٰذا "عہدِ معاونت" کا جال پھینکا یعنی ملکی ریاستوں کے دربار میں اپنے گرگے چھوڑے اور "حفاظتی فوج" کی پیش کش کی گئی۔ ان "گرگوں" اور "حفاظتی فوج" نے والیانِ ریاست کے درمیان پھوٹ ڈلوائی اور ان کی آزادی کو غصب کر کے بے دست و پا بنا دیا۔ اگر کسی ریاست نے مقابلہ کیا تو اس کو دوسروں نے دشمنانِ قوم کے مقابلے میں تنہا چھوڑ دیا حتیٰ کہ مرہٹہ ریاستیں بھی کئی حصوں میں تقسیم تھیں چنانچہ جب سندھیا سے جنگ ہوئی تو ہلکر علیحدہ رہا۔ نتیجہ یہ کہ اس کو شکست ہو گئی جس کے بعد انگریز ہلکر پر ٹوٹ پڑے اور اس کو اس نفاق کی سزا بالآخر ناکامی کی صورت میں ملی مرہٹوں کے ساتھ بہادر پنڈارے جن کے لیڈر کریم خاں اور چیتو تھے آخر تک لڑے اور ہلکر کے ساتھ امیر خاں اور ان کے ساتھیوں نے دادِ شجاعت دی مگر عیاری انجام کار بہادری پر غالب آ گئی اور جلد یا بہ دیر ان سب کو میدان چھوڑنا پڑا۔ نواب امیر خاں نے بعد تک جنگ کی، انگریز کھلے میدان میں جنگ کرتے گھبراتے تھے مگر سازشوں اور پُر فریب سرگرمیوں نے کامیابی سے ہم کنار کیا۔

مرہٹوں کی شکست

جب تک بہادر نانا فرنویس زندہ رہا مرہٹے انگریزوں

کے جال میں نہ پھنسے لیکن اس قابل اور جری سردار کے بعد ــــ جس کی دانشمندی قابلیت اور بہادری کا لوہا انگریزوں نے بھی مانا ہے ــــ فوراً ہی مرہٹے بھی "عہدِ معاونت" کا شکار ہو گئے۔ سندھیا کے بعد ہلکر نے بڑی بہادری سے جنگ کی اور جنرل مونسن کو عبرت ناک شکست دی مگر دہلی کے قریب پہنچ کر جب کہ اُس کے سوتے ہوئے بے خبر لشکر پر لوٹ پڑے، شکست ہوئی۔ اس سے پہلے سندھیا کی فوجیں بھی دہلی میں جنرل لیک سے شکست کھا کر منتشر ہو چکی تھیں۔ اسی دوران میں ایک موقع ایسا بھی آیا جب ہلکر، سندھیا، امیر خاں اور راجہ بھرت پور انگریزوں کے خلاف متحد ہو گئے مگر ولزلی نے روپیہ دے کر سندھیا کو توڑ لیا اور پھر آپس کے اختلاف کے سبب یہ اتحاد بھی خاک میں مل گیا۔ اس طرح اپنی پُر فریب اور ناپاک سازشوں کی بدولت ۱۸۰۴ء تک کم حیثیت انگریز تاجروں کی دغاباز کمپنی ہندوستان کی سب سے بڑی حکمراں طاقت بن گئی اور ان ہی کارناموں پر ولزلی کو انگریز قوم نے اپنا "ہیرو" تسلیم کیا، انعام دیا اور اس کا بت بنا کر لگایا۔ ولزلی کے زمانے میں نہ صرف میسور کی آزادی کا خاتمہ ہوا بلکہ مرہٹہ طاقت بھی لوٹ گئی، حیدرآباد کو بھی مفلوج کر دیا گیا اور اودھ کا آدھا علاقہ بھی غصب ہوا۔ اب جارج بارلو کا نمبر تھا۔

جارج بارلو ۱۸۰۵ء

بارلو نے ہلکر سے نہایت ذلت آمیز شرائط طے کیں اور ہلکر کو جو سندھیا سے جنگ کے وقت علیحدہ رہا اور انگریزوں کا دوست تھا، یقین ہو گیا کہ انگریز دغاباز اور بدمعاش ہیں۔ چلیے ہلکر تو پھر بھی انگریزوں سے ایک بار جنگ آزما ہو چکا تھا مگر غریب راجہ بوندی نے قوم و وطن سے غداری

کرکے انگریز کا ساتھ دیا، جس کا خود مارش مین کو اقرار ہے۔

"راجہ بوندی بہ حیثیت ایک مستقل وفادار اتحادی ہونے کے کمپنی کی طرف سے انتہا درجے کی احسان شناسی کے برتاؤ کا حق رکھتا تھا کیوں کہ اس نے ہلکر کی دھمکیوں کی پرواہ نہ کرکے اس وقت سے دو سال پہلے کرنل مون سن کو اس کی پسپائی کے وقت پناہ اور امداد دی تھی"۔ (۲۸۲)

احسان شناسی کے برتاؤ کا حق رکھنے والے اس "وفادار" کے ساتھ کیا برتاؤ ہوا؟ - یہ بھی سنیے۔

"سر جارج بارلو نے ہر فہمائش کی طرف سے اپنے کان بند کرلیے اور صلح نامے کی اس شرط کو بالکل کاٹ دیا جو راجہ بوندی کو ہلکر کے انتقام اور جبر و ستم سے بچانے والی تھی"۔ (۲۸۲)

راجہ جے پور کے ساتھ جو روش اختیار کی گئی وہ اس سے زیادہ شرم ناک تھی جس نے ہلکر کے مقابلے میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ اس راجہ سے امداد و حمایت کا وعدہ کیا گیا مگر جب ہلکر اس کو غداری کی سزا دینے کے لیے جے پور میں داخل ہوا تو انگریز اپنے وعدے کی شرم ناک حد تک خلاف ورزی کرکے اپنے اس وفادار کی حفاظت سے دست بردار ہو گئے ——— کس قدر لطف کی بات ہے کہ کچھ عرصے پہلے جب سلطان ٹیپوؒ سے چھیڑ خانی کرنا تھی تو اس کے لیے یہ بہانہ تراشا گیا کہ چوں کہ وہ کمپنی کے حلیف راجہ ٹراونکور پر حملے کا ارادہ رکھتا ہے لہٰذا اس کی حفاظت کے لیے سلطانؒ پر یورش کرنا ضروری ہے۔ مگر یہاں راجہ بوندی اور جے پور کو "وفاداری" کا انعام یہ دیا جاتا ہے کہ حملہ ہونے پر اُن کی امداد بند ———!

جارج بارلو کے زمانے کا ایک اہم واقعہ ویلور کی بغاوت ہے جس کا مفصل تذکرہ دوسرے باب میں کیا جائے گا۔

منٹو ۱۸۰۷ء

منٹو نے آکر سب سے پہلے بندیلکھنڈ پر چھاپا مارا اور زبردستی مسلط ہو گیا، اس کے بعد رنجیت سنگھ کا کچھ علاقہ ہضم کر لیا۔ اب یہ حریص نگاہیں ہندوستان سے باہر کی طرف بھی اٹھنے لگی تھیں، کابل اور ایران میں گرگے چھوڑے گئے اور برطانوی ریشہ دوانیاں شروع ہو گئیں۔ جزائر ماریشس اور جاوا پر چڑھائی کر کے قبضہ جما لیا گیا۔ ٹراونکور اور ناگپور پر بھی انگریزی تسلط پوری طرح قایم کر دیا گیا۔ اب پہاڑ پنڈاروں کا عروج نگاہوں میں کھٹک رہا تھا جن کے سرداروں کریم خاں اور چیتو نے سندھیا سے بڑی بڑی جاگیریں اور خطاب اپنی خدمات کے بدلے میں حاصل کیے تھے۔

لارڈ ہسٹینگز ۱۸۱۲ء

ہسٹینگز نے نیپال کو نشانہ بنایا، مگر جنگ کے لیے ضرورت تھی روپے کی۔ لہٰذا نواب اودھ کا گلا داب کر ڈھائی کروڑ روپیہ وصول کیا گیا اور اس سے وعدہ کیا گیا کہ اسے انگریزی گرگے "رزیڈنٹ" کی ـــــ جو اسے جونک کی طرح چمٹا ہوا تھا ـــــ "حکمانہ دخل در معقولات" سے نجات دلائی جائے گی۔[1] نیپال کو انگریز نے حلوا سمجھ کر چٹ کرنا چاہا تھا مگر ناکوں چنے چبانا

---

[1] مارش مین کہتا ہے ـــــ "نواب وزیر کو اس کی فکر تھی کہ کسی طرح برطانوی رزیڈنٹ کے حکمانہ دخل در معقولات سے خلاصی پا سکے اور لارڈ ہیسٹنگز نے اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ اس آئے دن کی پریشانی سے اسے ضرور نجات دلا دی جائے گی۔" / ۳۱۳

پڑے اور بہادر گورکھوں نے جن کی صفیں غداروں سے پاک تھیں، چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا۔ بل بہادر نے اپنے مٹھی بھر جاں بازوں کو لے کر انگریزی کا لشکر کا کامیاب مقابلہ کیا اور ایک بار چھ ہزار انگریزی فوج کو دو ہزار گورکھوں نے، دوسری جگہ چار ہزار کو صرف بارہ سو نے اور تیسری بار آٹھ ہزار کو ان بہادروں نے پسپا کیا۔ ایک انگریز افسر تو سر پر پاؤں رکھ کر ایسا بھاگا کہ دیناپور کی چھاؤنی میں آ کر دم لیا۔

نیپال میں دشمنانِ وطن کی پسپائی سے ملکی ریاستوں کے دل بڑھ گئے اور سندھیا امیر خاں اور رنجیت سنگھ انگریز کے خلاف متحد ہو گئے مگر یہ اتحاد بھی زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکا پھر آکٹرلونی نے گورکھوں پر پوری قوت سے حملہ کیا اور ۱۸۱۶ء میں ان کی آزادی کا خاتمہ ہو گیا۔ اب مرہٹوں کا نمبر آیا۔ پیشوا باجی راؤ سے کرکی کے مقام پر جنگ ہوئی (۱۸۱۷ء) جس نے ملکی ریاستوں کو انگریز کے خلاف متحد کر لیا، وہ اسی خیال میں تھا کہ وہ سب اس کے ساتھ ہی اچانک دشمنانِ وطن پر ٹوٹ پڑیں گے مگر انگریز پہلے ہی ان سب کو یعنی امیر خاں، ہلکر، ناگ پور، سندھیا وغیرہ کو ریشہ دوانیوں کے ذریعے محکوم بنا چکا تھا نتیجہ یہ کہ پیشوا کو شکست ہوئی اور مرہٹہ سلطنت کا بالکل ہی خاتمہ ہو گیا پیشوا کو پچھا کر کے گرفتار کر لیا اور اس کو بٹھور میں قید کر دیا گیا۔

پیشوا کو ختم کر کے ہلکر کی رانی تلسی بائی پر ڈورے ڈالے گئے جو ہلکر کے بعد تخت نشین تھی۔ غیرت مند فوجی سرداروں نے یہ وطن دشمن سازشیں دیکھ کر غدار رانی کا سر اڑا دیا اور اسے ندی میں بہا کر تمام فوج پیشوا سے ملنے چلی مگر پیشوا کو شکست ہو چکی تھی لہٰذا اس بہادر فوج نے سہد پور کے مقام پر انگریزی فوج کا مقابلہ کیا، نتیجے میں شکست ہوئی اور ہلکر کا بڑا علاقہ کمپنی نے ہضم کر لیا (دسمبر ۱۸۱۷ء)

اسی زمانے میں زبردست انگریزی لشکر نے پنڈاروں کو چاروں طرف سے اس طرح گھیرا کہ وہ سندھیا سے کٹ کر رہ گئے اور ان کو منتشر ہونا پڑا۔

ایمہرسٹ ۱۸۲۳ء

ایمہرسٹ نے برما کو تاکا اور دو سال کی مسلسل جنگ اور خوں ریزی کے بعد جس میں اس غریب ملک کا تیرہ کروڑ روپیہ بہایا گیا، برما کا ایک حصہ ضبط ہوا اور آزادی کا خاتمہ ہوگیا تو اب بھرت پور پر نظر پڑی جس کو لارڈ لیک فتح کرنے میں ناکام رہا تھا اور جب زبردست گولہ باری اور خوف ناک حملوں کے باوجود قلعہ بھرت پور پر اثر بھی نہ ہوا تو ساڑھے بارہ من بارود ایک سرنگ بنا کر بھری گئی اور ۱۸؍ جنوری ۱۸۲۶ء کو

"وہ دل ہلا دینے والا دھماکا ہوا جیسے زمین کی طنابوں کو ہلا ڈالا، بڑے بڑے تودے پتھر جیسی سخت مٹی اور شہتیر ہزاروں سر، ہاتھ، ٹانگیں اور دھڑ زنلے کے ساتھ ہوا میں اڑتے چلے گئے۔ تمام آسمان پر اندھیرا چھا گیا"۔[1]

ولیم بنٹنگ ۱۸۲۸ء

ولیم بنٹنگ کا ہر قدم ہندوستان کی تباہی پر اٹھا۔ دنیا میں تہذیب و تمدن کا منھ چڑانے والی قوم کے اس فرد کی حریص نگاہوں نے تاج محل کو بھی نہ چھوڑا۔ اس کا ارادہ تھا کہ تاج محل کو ڈھا کر ہموار کر دیا جائے تا کہ اس کے قیمتی پتھر ہاتھ لگیں مگر چوں کہ قلعہ آگرہ کے سامان کی نیلامی کچھ تسلی بخش ثابت نہ ہوئی اس لیے یہ ارادہ ملتوی کر دیا گیا۔[2] بنٹنگ نے کورگ اور کچھار کا الحاق کیا اور وہ

---

1 Marshman—355

[2] الجمعیۃ ۴ر ستمبر ۱۹۵۶ء بحوالہ تاریخ ہندازکے۔ ایل۔ نیل جلد سوم صفحہ ۳۰۵

کے معاملات میں دخل دیا، مغل بادشاہ کی توہین کی، گوالیار کی مرہٹہ ریاست کے خاتمے کی انتہائی کوشش کی۔ سندھ کے آبی سفر کی اجازت دے کر سندھ پنجاب اور افغانستان کی کشتی حیات کو تلاطم خیز موجوں کے سپرد کر دیا۔"

سید صاحب کی تحریک

اسی زمانے میں سید احمد بریلوی نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر سرحدی علاقوں میں چلے گئے۔ ان کی تحریک کافی مقبول بھی ہوئی، انہوں نے غازیوں کی ایک فوج بھی تیار کر لی مگر افسوس کہ یہ تحریک صرف مسلمانوں تک محدود رہی اور پھر چوں کہ انہوں نے اپنا مرکز صوبہ سرحد میں بنایا لہٰذا پہلے سکھوں سے الجھنا پڑا، علاوہ ازیں بعض سرحد کے پٹھان سردار بھی ان کے مقابل آ گئے نتیجہ یہ کہ یہ بہترین اور انمول طاقت تو اس طرح ضایع ہو گئی اور ملک کا اصل دشمن بدستور دندناتا رہا۔ البتہ اس تحریک نے مسلمانان ہند کے ایک بڑے طبقے کو کافی حد تک متاثر کیا اور انھوں نے بعد میں بھی برابر اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں چناں چہ ۱۸۵۷ء میں بھی اس تحریک کے مجاہدین، جن کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی تحریک سے متعلق اور متاثر کہا جا سکتا ہے، اکثر جگہوں پر پیش پیش نظر آتے ہیں اور ۱۸۵۷ء کے بعد بھی یہ حضرات برابر سرگرم عمل رہے۔

انگلینڈ ۱۸۳۶ء

انگلینڈ کی لالچی نظریں افغانستان کی طرف اٹھیں مگر جب چڑھائی کی گئی تو آزادی کے متوالے افغانوں نے ایسی ٹھکائی کی کہ پوری انگریز فوج کا ایک آدمی زندہ بچ کر آیا۔ ۱۸۴۲ء میں پھر کابل پر حملہ کیا اور اس کے بازار کو آگ

"کمپنی کی حکومت" / ۳۰۷

لگا گر جنرل پالک واپس آگیا افغانستان میں پسپائی کی جھنجھلاہٹ سندھ پر اتری اور امیران سندھ پر نہایت ڈھٹائی سے حملہ کرکے ان کا مال و دولت لوٹ لیا۔ الف نیپیر اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے۔

"ہم کو ان امیروں پر دباؤ ڈالنے کے لیے صرف کسی حیلے کی ضرورت ہے۔ .... جو حکومت زیادہ زبردست ہے وہ زیردست کو ہضم کرلے گی .... ہم کو سندھ پر قبضہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ لیکن ہم قبضہ کرکے رہیں گے اور یہ نہایت فائدہ مند، کار آمد اور شریف بے ایمانی ہوگی"

اس لوٹ مار سے جس میں امیران سندھ کی بیگموں کے کپڑے تک کھسوٹ لیے گئے۔ نیپیر کے حصے میں سات لاکھ روپیہ آیا۔ پھر بھلا یہ "بے ایمانی" نہایت "فائدہ مند اور کار آمد" کیوں نظر نہ آتی۔ یہ سب کچھ لارڈ الینبرا کے عہد میں ہوا۔

زبردست قحط

اسی زمانے میں شمالی ہند کے علاقوں میں ایک زبردست قحط پڑا (۳۷-۱۸۳۶ء) جس میں اندازاً کم از کم آٹھ لاکھ انسان موت کا نوالہ بنے۔ مگر انگریزی حکومت کو ہوسِ ملک گیری اور زر پرستی کے آگے بھوکے ننگے عوام کی پروا نہ تھی۔

ہارڈنگ ۱۸۴۴ء

ہارڈنگ گورنر جنرل ہوکر آیا تو پنجاب کو نگل گیا۔ چیانوالہ، مدکی، فیروز شہر، علیوال، سوبراؤں وغیرہ میں متعدد خوں ریز جنگوں کے بعد بہادر سکھوں کی قوت کو پارہ پارہ کردیا۔ سکھوں نے جس بہادری سے دشمنان

---

1. Oxford Hist. 673

وطن کا مقابلہ کیا وہ صفحات تاریخ پر یادگار رہے گا۔ یہاں تک کہ ـــــــ

"فاتحین نے جس وقت خندقوں کو اپنے بہادر مدافعین کی لاشوں سے پٹا ہوا دیکھا ستلج کے پایاب راستے کو ہزاروں مقتولوں سے اٹا ہوا پایا اور دریا کے ہر طرف ایک جرار سپاہ کی شکست و ریخت کے آثار نظر آئے تو ان کے دلوں سے بے ساختہ اپنے بہادر دشمنوں کی شجاعت اور مردانگی کی داد نکل گئی اور زبانیں خود بہ خود خالصہ شجاعوں کی جرأت و پامردی کے افسانے دہرانے لگیں"۔[1]

ڈلہوزی ۱۸۴۸ء

لارڈ ڈلہوزی اپنی جابرانہ پالیسی کے لیے کافی بدنام ہے اور اس پر کسی دوسری جگہ روشنی ڈالی گئی ہے۔

---

1. Marshman – 452

خاندانِ مغلیہ

اورنگ زیب کے بعد

مغل خاندان کے بادشاہ جو دہلی کے تخت پر شہنشاہ اورنگ زیب کے بعد متمکن ہوئے اپنی رنگ رلیوں اور غفلت کی بدولت کم زور اور تباہ ہوتے چلے گئے اور اس طرح خود بہ خود انگریزی سامراج کے لیے راستہ ہموار ہوتا گیا۔ ہوا یہ کہ اورنگ زیب کی وفات (۳ مارچ ۱۷۰۷ء) کے بعد جانشینوں میں جنگ ہوئی جس میں معظم شاہ کامیاب ہوا اور بہادر شاہ کے نام سے تخت پر بیٹھا، اگلے ہی سال اس کو پھر اپنے بھائیوں سے دکن میں لڑنا پڑا اور صرف چھ سال ہی حکومت کی تھی کہ انتقال ہو گیا، اس کا بیٹا عظیم الشان ہر طرح سلطنت کی اہلیت رکھتا تھا مگر تخت نشینی کے لیے پھر ایک خوں ریز جنگ ہوئی جس میں جہاں دار شاہ تخت کے لیے زندہ بچا جو نہایت عیاش اور نالائق تھا۔ دن رات طوائفوں اور ذلیل مصاحبوں کے ساتھ دادِ عیش دیتا تھا، اس نے کمین اور بد ذات لوگوں کو معزز عہدے دیے اور اپنے خاندان کے تمام شہزادوں کو قتل کرا دیا، یہیں سے سلطنت کے نظام میں ابتری شروع ہو گئی اور جہاں دار شاہ کو عیاشیوں کی سزا دینے کے لیے قدرت نے عظیم الشان کے بیٹے فرخ سیر کو بھیجا جس نے جہاں دار کو ذلت آمیز شکست دی

اور وہ اپنی داشتہ طوائف لال کنور کے ساتھ زنانہ بھیس بدل کر دہلی کو بھاگ گیا لیکن بعد میں قتل کرا دیا گیا۔ فرخ سیر نے بھی ظلم و ستم میں کسر نہ چھوڑی اور مغل شہزادوں کو قتل اور اندھا کیا۔ اس بربریت سے سلطنت کے کاموں میں رخنے پڑے اور شرفا میں خوف و ہراس پھیل گیا۔" یہاں تک کہ جو دربار میں جاتا اسے واپس آنے کی امید نہ ہوتی تھی[1] مگر یہ غرور اس طرح خاک میں ملا کہ فرخ سیر کو بارہہ کے سیدوں نے جن کا اس زمانے میں عروج و اقتدار بڑھ گیا تھا، پہلے تو اندھا کیا اور پھر نہایت تکلیف دے کر قتل کرا دیا (فروری ۱۷۱۹ء) اب مغل تاج و تخت ان سیدوں کے ہاتھ میں کھلونا تھا کیوں کہ کوئی بھی اس عظیم الشان سلطنت کا والی نہ رہا تھا۔

"کٹھ پتلیاں" چند مغل شہزادے زنانہ محلات میں نظر بند تھے جنہیں عورتوں کی صحبت نے کاہل مزاج اور ناکارہ بنا دیا تھا۔ یہی شہزادے سیدوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن سکتے تھے چناں چہ ان "ہیجڑوں" میں سے ایک بیس سالہ مدقوق شہزادہ (رفیع الدرجات) نکالا گیا اور تخت کی زینت بنا دیا گیا چند ماہ بعد جب یہ شہزادہ مر گیا تو دوسرا نکال کر بٹھا دیا گیا۔ یہ حضرت (رفیع الدولہ) جو شہنشاہِ ہند بنائے جا رہے تھے بہ مشکل پندرہ برس کے تھے مگر بیگمیں سات آٹھ رکھتے تھے جب محل سے باہر نکالے گئے تو سب کی صورت دیکھ کر سہمے جاتے اور اپنی اماں جان سے لپٹ کر روتے تھے کہ "اماں جان مجھ کو کہاں بھیجتی ہو میں نہیں بچوں گا۔"[2] توپوں کی آواز نے تو شہنشاہِ ہند کا حال پتلا کیا ہی تھا، نیکو سیر سے ایک جنگ کا سماں

---

[1] عروج الدولہ" از محمد عمر / ۴۴ [2] تذکرۂ عالم / ۲۱۱

اور لاشیں دیکھ کر بالکل ہی بے جان ہو گئے تو سیّدوں نے ایک اور مقید شہزادے روشن اختر کو لا بٹھایا جو محمد شاہ رنگیلا کے نام سے مشہور ہے۔

محمد شاہ رنگیلا

محمد شاہ کے عہد میں سیّدوں کا تو خاتمہ ہو گیا مگر سلطنت کو گھن لگ چکا تھا، مرہٹوں نے حملے شروع کر دیے۔ امن وامان مفقود ہو گیا، محمد شاہ رنگیلے کی عیاشیاں تو مشہور ہیں، ان سے بھلا سلطنت کیا ہوتی، رہی سہی کسر نادر شاہ کے حملے (۱۷۳۹ء) نے پوری کر دی جس نے دہلی میں ہولناک قتل عام کرایا اور جاتے وقت تخت طاؤس کے علاوہ کروڑوں روپے کے بیش قیمت ہیرے جواہرات (جن کی قیمت کا اندازہ بیس کروڑ سے زائد کیا جاتا ہے لے گیا اور ساتھ ہی خزانے میں بھی جھاڑو دے دی۔ جہاں سے تیس کروڑ روپیہ اس کے ہاتھ لگا۔ تخت طاؤس سات کروڑ روپے کا تھا ——— اس پر بھی ان رنگیلے شاہ کی عیاشیاں بدستور تھیں اور وہ تین تین سو کسبیاں ننگی اپنے سامنے نچاتے تھے، باورچی خانے کا خرچ تین کروڑ روپے ماہوار تھا ——— نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی مالی حالت نہایت خراب ہو گئی ملازموں کو کئی کئی مہینے تنخواہیں نہ دی جا سکیں۔ ادھر تخریبی عناصر نے سر اٹھایا اور مرہٹوں روہیلوں، سکھوں اور افغانوں سب نے ہی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ملک کا امن وامان غارت کرنا شروع کر دیا، مرکز کو کمزور پا کر صوبوں نے خود مختاری کے اعلانات شروع کر دیے۔ رنگیلے کے بعد احمد شاہ تخت نشین ہوا مگر پانچ چھ سال بعد ہی کمانڈر انچیف صاحب (غازی الدین) نے بادشاہ اور ملکہ کی آنکھیں نکال لیں اور پھر معظم بہادر شاہ کے پوتے کو عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا۔

عالمگیر ثانی

مغل شہزادے "ہمہ خانہ آفتاب" کا مصداق تھے۔ جب سے

جہاں دارشاہ نے لال کنور کو ملکہ بنا کر ڈوموں کو عہدے دیے اس وقت سے مغل خاندان کا رنگ بگڑتا ہی چلا گیا۔ چناں چہ اِن عالم گیر صاحب کا —— جو لقب تو اورنگ زیب جیسے شاہ ذی جاہ کا اختیار کیے ہوئے تھے مگر کردار میں موجودہ زمانے کے کسی تانگے والے سے بھی بدتر تھے —— یہ حال تھا کہ ایک پھل بیچنے والی کنجڑن پر مر مٹے اور اس کو ملکہ بنا کر چھوڑا۔ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ اس کو بھی لال کنور کا خطاب ملا اور شہنشاہِ ہند اس کے زانو پر سر رکھ کر دین و دنیا سے بے خبر ہوگئے، انجام یہ ہوا کہ آصف جاہ کے بیٹے غازی الدین نے اِن حضرت کو بھی ذبح کر ڈالا (۱۷۵۹ء) اسی زمانے میں مرہٹوں کی طاقت بہت بڑھ چکی تھی اور دوسری طرف احمد شاہ ابدالی کے حملے شروع ہو گئے جس نے ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں ایک خوں ریز جنگ کر کے ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو کافی کم زور کر دیا۔[1] مگر اس طرح ان کو شکست دے کر واپس لوٹ گیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو شاید یہ بدنصیب ملک برطانوی درندوں کی "چراگاہ" بننے سے بچ جاتا کیوں کہ مرہٹوں کی کم زوری اور پسپائی سے مغل تو فائدہ اٹھانے کے قابل ہی نہ تھے البتہ انگریزی سامراج کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے لیے راستہ صاف ہوگیا۔

احمد شاہ ابدالی کے حملے نے ملک کی حالت اور بھی خراب کر دی۔ وہ اپنے ساتھ کروڑوں روپے کے جواہرات لے گیا یہاں تک کہ دیوانِ عام کی نقرئی چھت تک گلا کر اتار لی گئی اور موتی مسجد (لال قلعہ) میں جو دُرِ آب دار کا گچھا لگا ہوا تھا، اتار لیا گیا۔[2] پھر

[1] اس جنگ میں مرہٹوں کا افسر توپ خانہ مشہور فرانسیسی جنرل بسی (BUSSY) کا شاگرد ابراہیم خان گاردی تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جنگ مذہبی نہیں بلکہ سیاسی تھی اور مرہٹوں میں مذہبی منافرت اور تعصب کا شائبہ بھی نہ تھا۔

[2] "سوانح دہلی" از مرزا احمد اختر (خلف اکبر دارا بخت ولی عہد بہادر شاہ) ۲۸/

اُس نے اپنی اور اپنے بیٹے کی شادی مغل خاندان میں کر کے لاکھوں روپے کا جہیز وصول کیا۔

شاہ عالم

عالم گیر ثانی کا جانشین شاہ عالم ہوا جو اپنے کو پہلے ہی انگریزوں کی پناہ میں دے چکا تھا، کہا جاتا ہے کہ وہ سی کنجڑن کے بطن سے تھا جو عالم گیر ثانی کی چہیتی ملکہ بنی تھی اور اس کا کردار بھی یہی ظاہر کرتا ہے۔ پرورش آپ کی اس طرح ہوئی تھی کہ چھ سہیلیوں کے جھرمٹ میں رہتے تھے، جب غازی الدین نے قلعے کو گھیر لیا تو الہ آباد کو بھگا دیے گئے جہاں ہر وقت اپنی سہیلیوں کو یاد کر کے روتے اور شاعری کرتے تھے۔ جنگ بکسر میں انگریزوں کے خلاف صف آرا ہوئے مگر وہ دست و بازو اُن کے پاس کہاں تھے جو تلوار پکڑتے ہیں۔ لہٰذا اپنے کو انگریزوں کی پناہ میں دے دیا اور پھر ان کو اس سرپرستی کا انعام بھی عطا فرمایا یعنی کھانے کی میزوں پر بیٹھ کر[1] بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی فقط چھبیس لاکھ مال گزاری کے عوض بخش دی۔ اس طرح ڈھائی کروڑ کی آبادی اور تین کروڑ روپے سالانہ کی آمدنی کے زرخیز علاقے قلم کی ایک جنبش سے، اتنے کم وقفے میں ان سفید درندوں کے آگے ڈال دیے گئے جو ایک گدھے کی خرید و فروخت کے لیے بھی ناکافی تھا (۱۷۶۵ء)۔ اس زمانے میں مرہٹے پھر زور پکڑ گئے اور دہلی پر بھی ان کا اقتدار قایم ہو گیا چناں چہ ۱۷۷۱ء میں انھوں نے شاہ عالم کو تخت نشین کیا مگر وہ

---

[1] مارش مین کہتا ہے "کلائیو کے خیمہ میں دو کھانے کی میزیں برابر کر کے رکھ دی گئیں اور ان کے اوپر ایک کرسی رکھ دی گئی جس پر زردوزی کی پوشش پڑی ہوئی تھی شہنشاہ اس پر بیٹھے اور ایک ایسی مملکت جس میں ڈھائی کروڑ نفوس کی آبادی تھی اور تین کروڑ سالانہ کی آمدنی تھی کلائیو کے حوالے کر دی گئی" (۱۶۳)

عیش وعشرت میں اپنے باپ دادا سے بھی بازی لیے ہوئے تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غلام قادر روہیلے نے قلعے میں گھس کر شاہی خاندان کی عورتوں تک کو ذلیل کیا اور لوٹا۔ پھر شاہ عالم کی آنکھیں نکال لیں۔ اس کا حد سے زیادہ ظلم و جور دیکھ کر چند راج پوت برداشت نہ کر سکے اور تلوار سونت کر کہا "اپنا ہاتھ روک لے ورنہ تیری بھی آنکھیں نکال لیں گے"[1]۔ تب کہیں وہ باز آیا مگر جب مرہٹہ سردار مادھوجی سیندھیا کو بادشاہ کی اس بے عزتی کی خبر ملی تو اس کو سخت غصہ آیا اور مرہٹوں نے غلام قادر کو بکرے کی طرح ذبح کر کے اس کا سر شاہ عالم کے پاس بھیجا۔ چناں چہ شاہ عالم نے ایک فارسی قصیدے میں مادھوجی کو "فرزند جگر بند" کہا ہے۔

"مادھوجی سیندھیا فرزند جگر بند من است   ہست مصروف تلافیِ ستم گاریِ ما"

آنکھیں نکلنے کے بعد "شہنشاہ ہند" کی خواہشات نفسانی کی آگ بجائے کم ہونے کے، اور تیز ہو گئی چنانچہ خواجہ سراؤں کو حکم ہوا کہ "اگر کوئی خوب صورت لڑکی نظر آئے تو ہمارے نکاح کی ترکیب لڑاؤ"۔ ادھر تو بادشاہ کی نفس پرستی کا یہ عالم تھا، دوسری طرف مرہٹوں نے لال قلعے کے تمام قیمتی زر و جواہر اپنے قبضے میں کر لیے اور مکمل اختیار ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان کے عوام مغل شہنشاہوں کی بڑی عزت کرتے اور انھی کو بادشاہ

---

[1] "تذکرہ عالم": یہ روایت تصدیق طلب ہے، البتہ اتنا ضرور ہے کہ غلام قادر نے شاہی خاندان، یہاں تک کہ بیگمات اور شہزادوں کو بھی ظلم و ستم کا نشانہ بنائے بغیر نہ چھوڑا۔ "رولرز آف انڈیا" کے مصنف نے بھی مادھوجی سندھیا کے حالات میں یہ واقعات لکھے ہیں۔

مانتے تھے چناں چہ مارش مین اقرار کرتا ہے کہ

"شہنشاہ دہلی اگرچہ اس وقت اپنی خود مختاری اور اپنی آنکھوں سے محروم تھا پھر بھی اس کو ہندو مسلمان یکساں سرچشمۂ عزوشان سمجھتے تھے اور شاہی مہر سے جو پروانہ منصب داری کا اس زمانے میں بھی عطا ہوتا تھا، کی دکن کے دور دراز صوبوں میں بھی اتنی ہی قدر ہوتی تھی جتنی اورنگ زیب کے زمانے میں"۔

(۲۶۸)

انگریزوں اور مرہٹوں کی خوں ریز جنگیں شروع ہوگئیں مگر یہاں بھی عیاری کے آگے بہادری نہ چلی، مرہٹوں کے یورپین افسروں نے انگریزوں کے کہنے میں آکر دغا کی اور ان کو شکست ہوگئی (۱۸۰۳ء) تو اب شاہ عالم جو پہلے ہی انگریزوں سے سازباز کر رہا تھا انگریزوں کی ماتحتی میں آگیا اور اس کی پنشن مقرر ہوگئی اس کی حکومت مشہور مثل "حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم" کا مصداق تھی بلکہ "تا قلعہ" ہو کر رہ گئی تھی ۱۸۰۶ء میں شاہ عالم کا انتقال ہوگیا۔

اکبر شاہ

ایسٹ انڈیا کمپنی اب پورے طور پر ہندوستان کو غصب کر چکی تھی مگر ابھی تک چوں کہ وہ ہندوستانی بادشاہوں کی آڑ لے کر حکم رانی کر رہی تھی اس لیے عوام کو غلامی کے اس جوئے کا احساس نہ ہو سکا جو آہستہ آہستہ ان کی گردن میں ڈالا جا چکا تھا۔ انگریزوں نے اب حکومت وسلطنت کے گھمنڈ میں آکر بادشاہ سے نہایت ذلیل برتاؤ شروع کر دیا تھا۔ خزانہ خالی تھا ملک کی مالی داخلاقی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ خصوصاً مسلمانوں میں تمام مشرکانہ رسمیں اور بدعتیں موجود تھیں، انگریز سیاہ وسفید کا مالک تھا اور

ملک کی دولت انگلینڈ کو کھنچی چلی جارہی تھی مگر اس منحوس دور میں اور اسی بدنصیب سرزمین پر حضرت شاہ عبدالعزیز رح اور حضرت اسمٰعیل شہیدؒ جیسے پاک باطن بھی موجود تھے جو اس حالت کو بدلنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔

بہادر شاہ مغلوں کا آخری "کٹھ پتلی" بادشاہ بہادر شاہ ۱۸۳۷ء میں تخت نشین ہوا۔ وہ بھی اپنے سابقہ تخت نشینوں کی طرح بے دست و پا تھا۔ انگریزوں نے اب اور بھی ذلت آمیز برتاؤ شروع کر دیا تھا بادشاہ کی نذر بند کر دی گئی۔ جھک کر سلام کرنے میں شان گھٹتی نظر آئی۔ بادشاہ کا "فدوی خاص" بننا گوارا نہ ہوا، یہاں تک کہ یہ اعلان کیا گیا کہ مغل خاندان کو بہادر شاہ کے بعد لال قلعے سے نکال دیا جائے گا اور "شاہ" کا لقب بھی ختم ہو جائے گا۔ شاہ عالم نے ایک شعر میں کس حسرت سے کہا ہے۔

آفتابِ فلکِ رفعت و شاہی بودیم
بُرد در شامِ زوال آہ سیہ کاری ما [۱]

چناں چہ ۱۸۵۷ء میں یہ "شامِ زوال" آپہنچی اور خاندان مغلیہ کا بالکل خاتمہ ہوگیا اگر بہادر شاہ کے اندر عالمگیر اور شاہ جہاں جیسی صفات کا شائبہ بھی ہوتا تو تاریخ شاید اپنا رخ بدل دیتی۔

---

[۱] ترجمہ۔ ہم شان و شوکت کے آسمان پر سورج کی طرح تھے مگر آہ ہماری سیاہ کاریوں نے ہمیں برباد کر ڈالا۔ اور شامِ زوال تک پہنچا دیا۔

(بغاوت کے اسباب)

"ہندوستانی قوم کی دیوانگی ایسی بعید از قیاس
نہیں ہے جو سمجھ میں نہ آسکے کیوں کہ مسلسل مصائب
اور تکلیفیں اٹھاتے ہوئے اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا
اور وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی" ———

——— ایڈورڈ تھامپسن

ملک کی عام حالت انگریزی راج میں

بے مثال اتحاد

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دوران ملک کے مختلف فرقوں میں مذہبی، سماجی اور نسلی اختلاف کے باوجود جو عظیم الشان اتحاد اور بھائی چارہ گوشے گوشے میں نظر آیا وہ یقیناً قابل غور ہے۔ فرقہ وارانہ اتحاد تو اس دور میں اس قدر تعجب اور اچنبھے کی چیز نہیں کیوں کہ مغل دور حکومت میں مذہبی تنگ نظری اور تعصب کی مثالیں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتیں۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۸۵۷ء میں مذہبی منافرت اور اختلافات کو بھڑکانے اور ایک دوسرے سے لڑانے کی کوششوں کے باوجود بھی انگریزوں نے حیرت سے دیکھا کہ ان کی تمام سو سالہ کوشش بے کار ثابت ہوئی اور وہ ہندو مسلمانوں کو جدا نہ کر سکے جو اُن کے خلاف حیرت انگیز طور پر متحد تھے۔ جان کے نہایت افسوس کے ساتھ لکھتا ہے۔

> "ان ایشائی نسلوں کی دشمنی اور مخالفت سے کوئی امید نہ رکھنا چاہیے جو ہمیشہ سے ہماری حفاظت اور مضبوطی کے خاص عناصر رہی تھیں۔ ہندو اور مسلمان پورے طور پر ہمارے خلاف متحد ہو گئے تھے" [1]

1. Kaye : V. I See
"Hindustan Times": Aug. 15, 1957

انگریز کے خلاف جوش وخروش اس قدر شدید تھا کہ انگریزی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں کا اکثر جگہ انھیں کی ذات اور عقیدے کے لوگوں نے بائی کاٹ کر دیا۔ وہ اپنے گھروں تک نہ جا سکتے تھے کیوں کہ اس حالت میں ان کی جان تک کا خطرہ تھا۔ ریو گمیڈی یہ حالات بتاتے ہوئے لکھتا ہے۔

"بغاوت اکثر موقعوں پر شخصی احترام اور سابقہ مالکوں سے وفاداری کے تمام جذبات بہالے گئی۔ اس زمانے میں انگریزی حکومت کی وفاداری کا الزام ناقابل برداشت تھا" [1]

ایک انگریز مصنف ایچیسن اس طرح مایوسی کا اظہار کرتا ہے۔

"اس موقعے پر ہم مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف کھڑا نہ کرسکے" [2]

چناں چہ دہلی، آگرہ اور بریلی وغیرہ میں انگریزوں کی طرف سے فساد اور تفرقہ پیدا کرنے کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اور عوام کے ہر طبقے نے بغاوت میں پورے جوش وخروش سے شرکت کی۔ جوسٹن مکارتھی کی رائے ہے کہ

"صرف سپاہی ہی بغاوت پر نہیں اٹھے، صرف ملٹری نے شورش نہیں کی، بلکہ یہ فوجی بے چینیوں، قومی تنفر اور انگریزوں سے مذہبی تعصبات کا ملا جلا مرکب تھی، دیسی راجگان اور فوج بھی اس میں شامل تھے۔ ہندو مسلمان اپنے اختلافات بھول کر عیسائیوں کے خلاف متحد ہو گئے تھے" [3]

1. Savarkar – 281
2. Ashok Mehta. 42 ("Great Rebellion")
3. Savarkar – 12

ظاہر ہے کہ ملکی عوام و خواص، امیر و غریب اور بلند و پست کا یہ حیرت انگیز اتحاد تاریخ میں پہلی اور آخری بار دیکھنے میں آیا مگر سوال یہ ہے کہ آخر ملک کے گوشے گوشے میں اس قدر جوش و خروش، مختلف عقیدے، مختلف مذہب اور مختلف رہن سہن کے باوجود اس بے مثال یک جہتی اور صوبہ سرحد سے آسام تک اور پنجاب سے بمبئی حیدر آباد تک عوام کے دلوں میں یکساں تڑپ اور لگن کی آخر وجہ کیا تھی؟ غور کیا جائے تو عوام کو اس حد تک ایک کر دینے کی تہ میں انگریز کی وہ ظالمانہ پالیسی کارفرما تھی جس نے ہندوستان کی زراعت و دستکاری کا ستیاناس کیا، صنعت و حرفت کو غارت کیا اور تجارت کو برباد کر کے اقتصادی حالت تباہ کر دی۔ علاوہ ازیں دیسی ریاستوں، جاگیرداروں، تعلقہ داروں اور ہندوستانی فوجیوں کے ساتھ جو سلوک ہوا وہ اپنی اپنی جگہ پر آرہا ہے۔ یہاں صرف عوام کی حالت پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔

عوام کی بدحالی

جنگ پلاسی کے بعد بنگال پر کمپنی کا غاصبانہ قبضہ ہوتے ہی ملک کی حالت بگڑنے لگی تھی، بہار، بنگال اور اڑیسہ کی دیوانی ہاتھ آجانے پر اور سونے پر سہاگا ہو گیا۔ بنگال کو کنگال بنا دینے کی الم ناک داستان تو ہم پچھلے صفحوں میں دہرا چکے ہیں۔ دیوانی ملتے ہی کمپنی نے ان علاقوں سے اپنے تمام یورپین مخالفین کو نکال کر تجارت پر مکمل قبضہ کر لیا۔ اسی سال یعنی ۱۷۶۵ء میں لگان بڑھا کر ۱۴۷۰۰۰ پونڈ کر دیا گیا جو کہ پہلے صرف ۸۱۱۰۰۰ پونڈ تھا۔ اس طرح جو روپیہ کھینچا گیا وہ کمپنی کے تمام مقبوضات بڑھانے میں کام آیا۔ چناں چہ جنگ پلاسی سے ۱۸۵۵ء تک کمپنی نے بیس جنگیں لڑیں، بے شمار ریاستوں کو ہضم کیا۔ قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا اور یہ سلسلہ اودھ کے الحاق پر ختم ہوا۔ ادھر یہ ہو رہا تھا کہ ۱۸۵۷ء میں قحط نے آ دبایا جس کی

ہوں ناکیاں اُنھیں زرخیز علاقوں کو برداشت کرنا پڑیں جو چند سال سے انگریزی چنگل میں تھے۔ اس قحط کی بدولت بنگال کی حالت کا نقشہ تو آپ پچھلے صفحات پر دیکھ چکے ہیں کہ یہ بدنصیب خطۂ زمین کس طرح قحط کے بیس سال بعد بھی غیر آباد جنگل کی مانند تھا اب ذرا بہار کے علاقوں کی حالت ملاحظہ ہو۔

"روزانہ مرنے والوں کی تعداد خاص پٹنے میں ڈیڑھ سو تک پہنچ گئی تھی اور اطراف و نواح کا حال اس سے بدتر تھا۔ پردہ نشین عورتیں اپنی اور بچوں کی جان بچانے کے لیے سربازار بھیک مانگتی تھیں اور روزانہ سڑکوں پر ہزاروں نفوس مرتے تھے جن کی لاشیں کتے، گیدڑ اور گدھ کھا جاتے تھے۔ ندی میں لاشوں کی کثرت سے مچھلی بھی کھانے کے لائق نہ رہی تھی ..... اکثر جگہوں کی نصف آبادی اور عام طور تمام علاقوں میں ایک تہائی آبادی اس قحط سے کم ہوگئی" [۵۱]

اور یہ حال صرف بنگال یا بہار کا ہی نہ تھا، بلکہ تمام انگریزی مقبوضات کا یہی عالم تھا چنانچہ برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر نے میسور کے متعلق کہا۔

"میسور کے باشندے ہندوستان میں سب سے زیادہ خوش حال ہیں جہاں ٹیپو (رح) کی حکم رانی (۱۷۸۲ء-۹۹ء) ہے۔ اس کے برعکس انگریزی مقبوضات صفحۂ عالم پر بدنما دھبوں کی حیثیت رکھتے ہیں جہاں کی رعایا قانونی شکنجوں میں جکڑی ہوئی پریشاں حال ہے" [۵۲]

کارنوالس نے آکر "بندوبست دوامی" رائج کیا جس سے کسان، کاشت کار اور زمیندار

---

[۵۱] تاریخ مگدھ"۔ فصیح الدین / ۳۸۰

[۵۲] کمپنی کی حکومت / ۲۳۱

بھی تباہ ہو گئے۔ اس بندوبست کا مقصد خود کارنوالس ہی سے سنیے۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز کو (۲ راگست ۱۷۸۹ء) لکھتا ہے۔

"یہ نیا پلان بہت غور کے بعد حساب لگا کر آپ کا لگان حاصل کرنے بلکہ اس کو بڑھانے کے لیے بنایا گیا ہے" [1]

اس نئے نظام کی رو سے لگان ادا نہ ہونے کی صورت میں حکومت کو زمین فروخت کرنے یا قرق کرا لینے کا اختیار حاصل تھا۔ اگر زمیندار مقررہ وقت پر سرکاری خزانے میں لگان کی رقم داخل کرنے میں ناکام رہتا تو اس سے کوئی سوال نہ پوچھا جاتا اور کوئی نوٹس یا مہلت دیے بغیر تمام جائداد نیلام کر لی جاتی تھی۔ ہومز لکھتا ہے

"کارنوالس کی کارروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ کم حیثیت لگان داروں کو اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچا زمیندار بار بار لگان کی ادائیگی میں ناکام ہوئے اور ان کی جائدادیں حکومت نے قرق کرالیں" (۱۲)

۱۸۰۲ء میں مدناپور کے کلکٹر نے لکھا۔

"قرقی اور فروختگی کے اس نظام کی بدولت چند ہی سال میں بنگال میں بڑے بڑے زمینداروں کی اکثریت مصیبت زدہ اور کنگال ہو گئی اور زمینی جائدادوں میں اس قدر زبردست تبدیلیاں ہوئیں کہ شاید کبھی کسی ملک میں صرف

---

1. Carnwallis Correspondence - 533
Symposium. - 10

اندرونی قوانین کی بدولت نہ ہوئی ہوں گی"[1]

شاہی زمانے میں ہندوستانیوں کو بڑے بڑے عہدے ملتے تھے اور بعض کی تنخواہیں تو ہزار روپے ماہ وار تھیں لیکن اب ان کے بیٹے صرف زیادہ سے زیادہ اسّی روپے پا سکتے تھے۔ اور وہ بھی اُس وقت کہ جب کہ وہ خوش قسمتی سے "رسال دار" کے عہدے پر پہنچیں ـــــ ملک کی عام حالت کو اُس زمانے کے ایک شاعر (مصحفی) نے اس طرح بیان کیا ہے ؎

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

صنعت، زراعت اور تجارت کی بربادی

ہندوستان کی دولت و صنعت کے افسانے دنیا میں مشہور تھے اور بیرونی ممالک کے لالچی تاجروں اور سیاحوں کو یہ دل فریب داستانیں ہی کھینچ کر لاتی تھیں مگر "سفید درندوں" نے اس سونے کی چڑیا کو نہ صرف بے جان کیا بلکہ ہڈیاں اور گوشت بھی نوچ لیا - چناں چہ یا تو یہ حال تھا کہ بقول مسٹر شیلڈن

"انگلستان میں جو ریشمی کپڑا فرانس اور اٹلی سے درآمد ہوتا تھا وہ بالکل بند ہوگیا اس لیے کہ بنگال کا ریشمی کپڑا فرانس اور اٹلی کے ریشمی کپڑوں سے آدھی قیمت پر انگلستان پہنچ جاتا ہے اور دونوں سے بہتر بھی ہوتا ہے"۔

اور یا یہ عالم ہوگیا کہ

---

1. R. P. Dutt. – P. 191.

"اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۷۹۲ء میں ۵,۷۴۵,۵۳۲ پونڈ کا کپڑا ہندوستان سے انگلینڈ پہنچا اور یہ مقدار گھٹتے گھٹتے ۱۸۴۹ء میں بالآخر صرف ۵۱۳,۷۶۹ پونڈ رہ گئی" [1]

ہندوستان کے کپڑا بننے والوں (پارچہ باف) پر ہول ناک مظالم توڑے گئے۔ ان کو انگریزی کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کیا گیا، ان کا مال ضبط کر لیا گیا اور ان کو طرح طرح کی سزائیں دی گئیں۔ کمرشل بورڈ کی ڈائری کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"نوربافوں کو ہول ناک سزائیں دی جاتی تھیں، جبر و تشدد کی حد یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ کاریگروں کو مجبوراً اپنا پیشہ ترک کرنا پڑا" [2]

صنعتی تباہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں کاریگر، صنّاع اور دست کار دانے دانے کو محتاج ہو گئے، ملک کی غریبی، بے روزگاری، اور پریشاں حالی اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور یہ عالم ہو گیا کہ بقول سر سیّد:

"کوئی سوئی بنانے والے اور دیا سلائی بنانے والے کو بھی نہیں پوچھتا"۔

بہار اور بنگال کی دیوانی ملنے کے بعد کمپنی نے تمام تجارت پر قبضہ کر لیا اور اپنے فرانسیسی اور دیگر یورپین حریفوں کو بہ یک بینی و دو گوش نکال باہر کیا۔ اب تجارت اور کاروبار پر انگریزوں کا مکمل تسلط تھا۔ چناں چہ ۱۷۶۵ء میں گورنر جنرل کے فیصلے کے مطابق اعلان ہوا کہ:

"فیصلہ کیا گیا ہے کہ انگریز تاجروں کی ایک سوسائٹی کو تمام تر حقوق نمک،

---

[1] "۱۸۵۷ء" محمد شفیع ص ۱۰۲ [2] "کمپنی کی حکومت" ص ۳۰

چھالیہ اور تمباکو کی تجارت کے دے دیے جائیں اور کوئی دوسرا شخص جو آنریبل کمپنی کے تابع (یعنی رعایا) ہو مجاز نہیں کہ اس تجارت میں حصہ لے سکے"۔

عام لوگوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اناج وغیرہ کو اسی قیمت پر خرید و فروخت کریں جس پر ان کے انگریز حکمراں ان کو مجبور کریں اگر وہ اس کے خلاف کرتے تو کوڑوں کی سزا، قید، جرمانے اور دیگر مظالم سہنے پڑتے تھے، تاجروں نے عاجز ہو کر لندن میں فریاد بھیجی مگر بے کار تھا، آخر کار ۱۸۱۵ء تک تجارت بالکل تباہ ہو گئی۔ اور اس تجارتی حریف کا گلا گھونٹ دیا گیا، جس سے انگریز کسی طرح بھی مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔

کاشت کار اور کسان علیحدہ تباہ ہوتے چلے گئے۔ قدیم زمانے میں بادشاہ اور حکام کاشت کاروں کے ساتھ رعایت اور فراخ دلی سے پیش آتے تھے مگر انگریزی راج شروع ہوتے ہی کسانوں کی حالت خراب ہونے لگی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ کارنوالس کے "بندوبست دوامی" نے حالات اور بھی بدتر کر دیے۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ کارنوالس نے

"وزارت انگلستان کی مدد سے ہندوستان میں کمپنی کے مقبوضات میں اضافہ کیا، ہندوستانیوں کو آرہ کشوں اور آب برداروں میں تبدیل کر دیا، آئینی اصلاحات کی شکل میں فتنہ و فساد کا بیج بویا بندوبست دوامی رائج کر کے کسانوں کو بالکل تباہ کر دیا"۔[1]

انگلینڈ کے دارالعوام میں مسٹر فاکس نے ایک تقریر میں کہا۔

"کارنوالس نے ملک میں لٹیروں کا ایک جتھہ تیار کیا ہے جو حق داروں کے حق

---

[1] کمپنی کی حکومت ص ۱۵۹

لوٹتا ہے" ؎

شاہی زمانے میں سالانہ پیداوار کا صرف ایک حصہ بطور لگان داخل کیا جاتا تھا۔ زمین پر کاشت کار قبیلے اور کسانوں کا حق تھا اور شاہی ملکیت تصور نہ ہوتی تھی مگر کمپنی کے عہد میں زمین کو حکومت کی ملکیت مانا گیا اور سالانہ لگان جو پہلے فصل پر موقوف تھا اب مقررہ مقدار میں زمین کے رقبے کے لحاظ سے ٹیکس کی صورت میں لگایا گیا جس میں فصل کی بہتری یا خرابی کا کوئی لحاظ نہ رکھا گیا، اور نہ اس سے کوئی سروکار تھا کہ زمین کا کتنا حصہ کاشت کیا گیا ہے۔ اکثر حالتوں میں یہ ٹیکس انفرادی تھا جو یا تو براہ راست کاشت کار سے وصول کیا جاتا تھا اور یا زمینداروں پر حکومت کی طرف سے واجب تھا زمین پر اس براہ راست ٹیکس نے دیہات کی مالی حالت تباہ کر کے رکھ دی ؎

"بندوبست دوامی" کی رو سے ہزار ہا جائدادیں لگان ادا نہ ہونے پر قرق اور فروخت کر دی گئیں اور جس نے زیادہ بولی لگائی اسی کے حوالے ہو گئیں۔ چناں چہ زمین کے پرانے مالک جو گاؤں ہی کے باشندے ہوتے اور کاشت کار زیادہ تر انھیں کی ذات برادری بلکہ اکثر ان کے رشتہ دار ہوتے تھے۔ وہ زمین سے حقیقی محبت کرتے تھے۔ مگر نئے مالکوں کے احساسات ان سے مختلف تھے۔ وہ زمین کی پروا نہیں کرتے تھے بلکہ صرف اپنی رقم پر منافع حاصل کرنے کی خواہش رکھتے تھے ؎ اس کے نتائج کسی اور کی

؎ شیرِ میسور/۱۰۷

2. R C. Dutt – 85
   Symposium – 8

3. Thornhill – 34

نہیں، خود انہیں کی زبانی سنیے - ایک انگریز بشپ ہیبر نے ۱۸۳۰ء میں اپنی یادداشت میں لکھا۔

"انگریزی مقبوضات کے کاشت کار بہ نسبت دیسی ریاستوں کے انتہائی محتاجی مفلسی اور دل شکستگی کی حالت میں ہیں کیوں کہ واقعہ یہ ہے کہ کوئی دیسی نواب راجہ وہ لگان اور کرایہ نہیں لیتا جو ہم لیتے ہیں"[1]

اس انگریز (ہیبر) نے ایک شخص سے پوچھا کہ کیا وہ انگریزوں کی رعایا بننا پسند کرے گا؟ جواب تھا۔

"میں تمام مصیبتیں جھیلنے کو تیار ہوں - مگر اس پر تیار نہیں، مجھے اس سے بچاؤ"

ڈاکٹر فرانسس کو کمپنی کی طرف سے اعداد و شمار دیکھنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ وہ اپنی رپورٹ میں کہتا ہے -

"دیسی باشندے بیان کرتے ہیں کہ مغل زمانے کے حکام کو موجودہ لگان کے آدھے سے بھی کم ادا کرنا پڑتا تھا"[2] (۱۸۱۴ء-۱۸۰۰ء)

سو سال تک اس مسلسل لوٹ نے نوبت یہاں تک پہنچادی کہ ۱۸۵۷ء میں اودھ کا جوڈیشنل کمشنر ایم۔ آر۔ گبنس بغاوت کے زمانے میں لکھتا ہے۔

"میں نے کہیں بھی اس قدر عام غریبی اور مفلسی نہیں دیکھی جتنی کہ اودھ میں نظر

---

1 [Narrative and Correspondence.- II - 413
Symposium.- 15

2. R. P. Dutt.- 185

آتی ہے"۔

تعلقہ داری اور جاگیرداری کا خاتمہ تو ہوا ہی تھا، مگر جاگیریں اور اراضی اس بے ڈھنگے پن سے ضبط و نیلام کی گئیں کہ تمام ملک الٹ پلٹ ہوگیا اور خصوصاً اودھ۔ انگریزوں کے "وفادار" سرسید فرماتے ہیں۔

"منبطی اراضیات نے جس قدر رعایائے ہندوستان کو ناراض اور بدخواہ ہماری گورنمنٹ کا کر دیا تھا اس سے زیادہ کسی اور چیز نے نہیں کیا۔ سچ فرمایا لارڈ منرو اور ڈیوک آف ولنگٹن نے کہ ضبط کرنا معافیات کا ہندوستانیوں سے دشمنی پیدا کرنی اور ان کو محتاج کر دینا ہے"۔ (۲۶)

"..... زمینداریوں کا نیلام کیا گیا اور ایسی بے ترتیبی سے ہوا کہ تمام ملک اُلٹ پلٹ ہوگیا۔ پھر قانون اول ۱۸۲۱ء جاری ہوا جس سے اور صدہا قسم کی خرابیاں پیدا ہوگئیں"

مشہور انگریز مورخ جان کے کی رائے ہے

"غلط طرز حکومت کے خراب نتائج کبھی اس قدر ہولناک طریقے پر ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ کبھی کسی غارت گر اور مجہول حکومت کی خرابیوں نے اس قدر پریشاں حالی پیدا نہیں کی تھی" ؎۱

زمین کی اس جبری خرید و فروخت نے کاشت کاروں کو کوئی فائدہ نہ پہنچایا جیسا کہ کمپنی نے

---

1. Kaye : V. I - 114

دعوے کیا تھا۔ کمپنی کے ملازموں کو فقط یہ فکر تھی کہ وہ ڈائرکٹروں کو زیادہ سے زیادہ آمدنی دکھائیں تاکہ نیا نظام فائدہ مند نظر آسکے لہٰذا جمع شدہ رقم بڑھانے کے لیے لگان بڑھایا گیا۔ بگس نے اقرار کیا ہے کہ بہت سے ضلعوں میں گورنمنٹ کا مطالبہ بہت زیادہ تھا۔ تھارن ہل نے اس کو "ظالمانہ" قرار دیا ہے۔ کاشت کاروں کو لگان ادا کرنے کے لیے قرض لینا پڑتا تھا اور پھر ان قرضوں کا سود نہایت کثیر ہوتا تھا[1]

اس طرح اس انگریزی نظامِ حکومت کی برکتوں سے نہ صرف تمام جاگیردار تعلقہ دار، انعام دار اور معافی دار فقط "نادار" بنا دیے گئے بلکہ عام لوگ بھی زندگی کا سہارا کھو بیٹھے۔ پہلے زمانے میں کاشت کار اور کسان خوش حال تھے اور وہ خوش حال تھے تو ملک بھی سرسبز و شاداب تھا، گاؤں میں پنچایتیں مقرر تھیں جن کے ذریعے دیہات کے باشندے اپنے آپس کے جھگڑوں کا، بغیر کسی دوڑ دھوپ اور اُلجھن کے، خود ہی فیصلہ کر لیا کرتے تھے مگر ملک پر انگریزی راج مسلط ہونے پر یہ پنچایتیں ختم کر دی گئیں۔ انصاف بھی مہنگا ہو گیا[2]

بہتر ہے کہ اس پُرالم باب کو چند ذمہ دار انگریزوں کے بیانات نقل کر کے ختم کر دیا جائے تاکہ ملک کی بدحالی کا نقشہ پورے طور سے ذہن میں آسکے۔

"ہندوستانی صنعت و حرفت کو ہم تباہ کر چکے ہیں، کیا تم ہندوستانیوں کو از سرِ نو خوش حال کرنے کے لئے انگلستان کو تباہ و برباد کرنا چاہتے

---

1. Symposium, - 15

[2] حصولِ آزادی کے بعد اب یہ پنچایتی نظام دوبارہ قائم کر دیا گیا ہے۔

ہو؟ - ہندوستان یا انگلستان دونوں میں سے کسی ایک کی صنعت و حرفت کا قربان کرنا دوسرے کی ترقی کے لیئے لازمی ہے"۔ (ہربرٹ)

"ہندوستان جس طرح زراعتی ملک ہے اسی طرح صنعتی بھی ہے ...... اس کی مصنوعات نہایت کام یاب رہی ہیں اور کوئی قوم بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی اب ہندوستان کو صرف زراعتی ملک بنا دینا سخت ناانصافی اور ظلم ہے"۔ (مارٹن) ——————

—————— پارلیمنٹری سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ [۱]

تعلیم

۱۸۹۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹر مسٹر تھامسن ٹرمین نے کہا تھا۔

"تم ہندوستانیوں کو تعلیم دینا چاہتے ہو۔؟ - تعلیم دے کر تم انھیں اپنی بے انصافیوں سے آگاہ کروگے، تم نے ان کا ملک لوٹ لیا ہے، تم نے ان کے ہم وطنوں کو برباد اور ذلیل کیا —— ، تم نے ان کے بادشاہوں کو قتل کر ڈالا ہے۔ لہٰذا تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ ان کو اسی طرح فریب خوردہ، خود فراموش اور جاہل رہنے دو" ——————

اس سلسلے میں سر ڈی ہملٹن کا قول اور سن لیجیے۔

"اگر کبھی انگریزوں کو ہندوستان اسی طرح چھوڑنا پڑا جس طرح رومیوں نے انگلستان چھوڑا تھا تو وہ ایک ایسا ملک چھوڑ جائیں گے جس میں نہ تعلیم ہوگی نہ حفظانِ صحت کا سامان، نہ دولت"۔ [۲] ——————

---

[۱] [۲] "کمپنی کی حکومت" ص ۳۰۴

واقعہ یہ ہے کہ تجارت پیشہ انگریزوں کے پیش نظر صرف تجارتی فائدے تھے، مگر جب ان کی حکمرانی کا دور شروع ہوا تو تجارت کو وسیع کرنے کے لیے ہی حکومت کی گئی اور ملک کے ایک ایسے طبقے کی ضرورت پڑی جو حکومت کی مشینری کو چلانے میں پرزوں کا کام دے چناں چہ تعلیمی پالیسی محض سامراجی مقاصد کی تکمیل کے لیے جاری کی گئی، ملک کے مفاد سے انہیں کوئی واسطہ نہ تھا بلکہ اپنے دفتروں کے لیے معمولی اہل کاروں، کلرکوں اور چپراسیوں کی ضرورت تھی۔ میکالے کا قول تھا کہ

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانا چاہیے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو، جو خون اور نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز۔"

تعلیمی پالیسی کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کو رفتہ رفتہ عیسائی بنا دیا جائے اور جو مقصد بدزبان پادریوں کی زہر افشانیوں سے حل نہ ہو سکا وہ یوں پورا ہو جائے۔ سر فریڈرک ہلیڈے نے دارالعوام میں کہا تھا کہ

"میں سمجھتا ہوں کہ ہندو کالج میں انجیل کی تعلیم اس قدر زیادہ ہے کہ انگلستان کے کسی پبلک اسکول میں بھی اتنی نہیں ہے" [1]

اس پالیسی کا نتیجہ جو ہونا چاہیے وہی ہوا، دنیا کے دوسرے ممالک تھوڑی مدت میں سائنس، انجینئرنگ، صنعت و حرفت اور زراعت و تجارت میں کہیں سے کہیں پہنچے مگر ہندوستان جہاں کا تہاں ہی رہا۔ روحانی بصیرت کو اس تعلیم نے فنا کر دیا، ہماری

---

[1] "مسلمانوں کا روشن مستقبل"

ذہنیت ہر لحاظ سے غلامانہ ہوگئی اور بچوں کو غلط، من گھڑت اور فرقہ وارانہ تعصب سے بھرپور تاریخیں پڑھائی گئیں جن سے منافرت اور تنگ نظری ان کے دماغوں میں رچ کر رہ گئی۔

بغاوت کے فوری اسباب

۱۸۵۷ء کی عظیم بغاوت اور عوام کی جی توڑ جد و جہد یقیناً بعض ایسے اسباب و واقعات کی بنا پر تھی جن کی بدولت وہ اس پر مجبور نظر آتے تھے ان کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار ہی نہ رہا تھا کہ وہ ملک کو اس نئے ظلم و جور سے نجات دلانے کی کوشش جان کی بازی لگا کر کریں اور برطانوی سامراج کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکیں جس نے تقریباً تمام ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ گذشتہ سو سال میں ملک کے ساتھ انگریز کا جو رویہ رہا تھا، وہ اگر ہماری نظر میں ہو تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ عوام یہی کچھ کرنے پر مجبور تھے جو انھوں نے کیا۔ ایک انگریز کا بیان ہے:

> "فوج والوں کے چہروں پر ترش روئی کے آثار تھے اگرچہ وہ اپنے افسران سے کچھ نہ کہتے تھے، صرف ایک جوان سپاہی نے اتنا کہا کہ تمہارا نمک پانی اب کھایا نہیں جاتا" [۱]

اسی طرح لکھنؤ کے واقعات میں ایک انگریز لکھتا ہے۔

---

[۱] محاربۂ عظیم / ۶۲

"مفسد (باغی) عذر کرتے ہیں کہ ہم نے ناچار ہو کر یہ کیا"۔ [1]

اس قدر متنفر تھے کہ جب مختلف جگہوں سے انگریز بھاگے تو راستے میں اکثر مقامات پر وہ عوام طعنے دیتے، بری طرح پیش آتے، کوئی سائے میں نہ بیٹھنے دیتا، حتیٰ کہ پانی بھی نہ دیتے تھے۔ ایک انگریز کو اقرار ہے کہ

"کینۂ مفسدین ہماری جانب اس قدر ہے کہ اگر اُن سے ہو سکے تو ہماری بیخ و بن اکھاڑ ڈالیں"۔ [2]

ایک فرانسیسی عورت مسز ہورنسٹ انگلیسی اپنی سرگذشت میں لکھتی ہے۔

"ان کی ہر ادا بتاتی تھی کہ وہ ہمارے خون کے پیاسے ہیں۔ ... یہ لوگ ہم انگریزوں کے تسلط سے ایسے دل تنگ اور انگریزی حکومت سے اس قدر نالاں تھے کہ مار سیاہ کی طرح بل کھاتے تھے، ان کی کوئی بات طنز سے خالی نہ ہوتی تھی"۔ [3]

سرسید نے "اسباب بغاوت ہند" میں لکھا۔

"باغی کہتے تھے اگر ہم یہ نہ کرتے تو کیا کرتے ایک نہ ایک دن سرکار ہم کو تباہ کردیتی"۔ (۵۵)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کیا مجبوریاں تھیں جنھوں نے ملک کے لوگوں کو انگریز سے متنفر کر کے اس حد تک سر بہ کف کر دیا تھا۔ آئیے ایک سرسری نظر ڈالیں۔

---

[1] محاربۂ عظیم / ۱۴۹ [2] محاربۂ عظیم / ۱۴۶

[3] ایامِ غدر / ۱۲ و ۸

مغل بادشاہوں کی توہین

جنگِ آزادی کے محرک اسباب کی کڑیاں اگرچہ جنگِ پلاسی سے جا کر ملتی ہیں جن پر گذشتہ صفحات میں ایک نظر ڈالی بھی جا چکی ہے لیکن یہاں ہمارا مقصد ان فوری اسباب و واقعات کا بیان کرنا ہے جنھوں نے ملک کے عوام کو "تنگ آمد بہ جنگ آمد" کے مصداق کر دیا۔

مغل بادشاہ ہندوستانی عوام میں صدیوں کی روایات کی بنا پر قابلِ عزت مانے جاتے تھے مگر انگریزوں کی جیسے جیسے طاقت و اختیارات بڑھے انھوں نے مغل بادشاہوں کو حقیر و ذلیل کرنا شروع کر دیا اور فطری طور پر اس گستاخانہ برتاؤ سے ان برائے نام مغل شہنشاہوں کی عزت کرنے والے عوام کو صدمہ پہنچا۔ چناں چہ شاہ عالم جب الہ آباد میں تھا تو کرنل اسمتھ نے نہایت سخت اور توہین آمیز برتاؤ کیا۔ قلعے میں نہ رہنے دیا، پنج وقتہ نوبت وغیرہ حکماً بند کرا دی اور دوسری بے اعتدالیاں کیں۔[1] اسی طرح ۱۸۰۳ء میں جب لارڈ لیک نے مرہٹوں کو شکست دی اور مغل بادشاہ انگریزوں کا پنشن خوار ہوا تو یہ پوشیدہ ذہنیت اور بھی رنگ لائی اور رفتہ رفتہ بادشاہ کی ذلت و خواری میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا گیا چناں چہ ۱۸۰۶ء میں جب اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوا تو انگریز رزیڈنٹ چارلس مٹکاف نے جو برائے نام بادشاہ کی رسمی عزت اور احترام بھی کرنا نہ چاہتا تھا، بادشاہ کے خلاف سخت نازیبا حرکتیں شروع کر دیں کیوں کہ اس کے خیال میں انگریزوں کے لیے بادشاہ کی عزت کرنا بادشاہی

---

[1] "تذکرۂ عالم" - ۲۴۶

قوت کو زندہ رکھنا تھا۔ ان حالات نے رفتہ رفتہ بادشاہ اور عوام کو انگریزوں سے متنفر کر دیا[1]۔ اکبر شاہ کے بیٹے مرزا جہانگیر کو جلا وطن کر دیا گیا کیوں کہ اُس نے رزیڈنٹ کو "لولو" کہا اور اس پر گولی چلائی۔ اکبر شاہ ان کو ولی عہد بنانا چاہتے تھے مگر انگریزوں نے منظور نہ کیا، پھر انھوں نے مرزا نیلی کو بنانا چاہا مگر وہ بھی اپنی غیور طبیعت کی بنا پر اس قابل نہ سمجھے گئے۔ آخر بہادر شاہ کو ولی عہد بنایا گیا۔ جب بہادر شاہ نے تخت نشین ہو کر اپنے وظیفے میں اضافے کا مطالبہ کیا جو اکبر شاہ کے وقت سے ہو رہا تھا تو مٹکاف نے سخت مخالفت کی اور اس کے لیے کڑی شرطیں لگائیں، بادشاہ کو تقریبات کے موقعے پر نذر دی جاتی تھی مگر لارڈ النبرا نے ۱۸۴۳ء میں وہ بھی بند کر دی۔ انگریز رزیڈنٹ ہارڈے نے نہایت حقارت سے لکھا کہ مجھے خطوط میں "بادشاہ کا فرزندار جمند" نہ لکھا جائے جو بادشاہ کی طرف سے خطاب تھا گورنر جنرل کی مہر سے "بادشاہ کا فدوی خاص" کے الفاظ ہٹا دیے گئے اور والیان ریاست کو بھی حکم ہوا کہ وہ عزت و احترام کے الفاظ شاہِ دہلی کے لیے نہ لکھیں[2]۔

دیسی ریاستوں کے ساتھ سلوک

دوسری طرف دیسی ریاستوں کو یکے بعد دیگرے ہضم کیا جا رہا تھا جس سے

---

[1] دہلی کی جانکنی: ۱۷/۱ : ص ۱۷

[2] سلیمن نے نہایت غصّے اور افسوس کے ساتھ یہ لکھا کہ راجہ دھول پور اور بندیلکھنڈ کے والیان ریاست جن کو حکومت برطانیہ نے قایم کیا ہے اور جن کو بہادر شاہ کی حکومت سے کوئی فایدہ نہیں پہنچ سکتا، اپنے لیے پھر بھی "شاہِ دہلی کا غلام" اور "بندہ" کے الفاظ اپنی مہروں میں استعمال کرتے ہیں"۔

(Symposium _ 96)

عام لوگوں میں بے حد ناراضگی پھیلتی تھی۔ ۱۸۱۸ء میں مرہٹوں کی شکست کے بعد پیشوا باجی راؤ کی پنشن کر دی گئی تھی، وہ ہمیشہ انگریزوں کا وفادار رہا مگر ۱۸۳۹ء میں باجی راؤ کے لے پالک بیٹے نانا راؤ کی پنشن بند کر دی گئی حتیٰ کہ انگلستان میں داد فریاد بھی صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ بھرت پور کے راجہ کی موت پر وہاں کے قلعے پر چورانسی توپوں سے گولہ باری کی گئی اور بارود سے اڑا دیا گیا۔ پھر وہاں کا خزانہ اور قیمتی اسباب لوٹا گیا۔ سنگھا پور ۱۸۱۹ء میں قبضے میں آیا۔ ۱۸۲۴ء میں برما پر چڑھائی کی گئی اور کچھ علاقے پر قبضہ کر کے تاوان جنگ وصول کیا گیا، پھر ۱۸۵۱ء میں اس "جرم" میں دوبارہ حملہ کیا گیا کہ راجہ انگریز صاحب بہادروں سے "گستاخی" کرتا ہے اور برما کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ جب راجہ نے سفیر بھیجے تو ان کو ذلیل کر کے دربار سے نکال دیا گیا۔ میسور کے راجہ کو ۱۸۳۱ء میں تخت سے اتار کر چیف کمشنر مقرر کیا گیا۔ ۱۸۰۹ء میں امیران سندھ سے معاہدہ ہوا تھا مگر ۱۸۴۱ء میں سندھ پر بھی رال ٹپکنے لگی اور بالآخر ان پر بھی حملہ کر کے سندھ کا علاقہ غصب کر لیا۔ ونسنٹ اسمتھ لکھتا ہے۔

> "اُس نے (چارلس نیپیر نمائندہ کمپنی) اہل سندھ کو اس قدر دق کیا کہ بمصداق تنگ آمد بجنگ آمد" بلوچیوں نے بگڑ کر حملہ کر دیا اور انگریزوں کو حسب دلخواہ بہانہ ہاتھ آ گیا"۔ [1]

سندھی فوجوں کو میانی کے مقام پر شکست دینے کے بعد امام گڑھ کے قلعے کو ڈھا دیا، حیدرآباد سندھ کے شاہی محلات کو جس بے دردی سے لوٹا گیا اس کی مثال چنگیزی

---

[1] آکسفورڈ ہسٹری/۶۸۵ (بحوالہ ہاشمی: تاریخ ہند/۱۳۰)

سفاکیوں کو ماند کر دیتی ہے، شاہی بیگمات کے جسموں سے کپڑے تک اُتار کر ان کو برہنہ[51] کر دیا گیا۔ اگلے ماہ میں خیر پور پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ ۱۸۴۵ء میں ریاست لاڈو ۱۸۴۷ء میں ریاست روپڑ، ۱۸۴۹ء میں راجہ کے لاولد مرنے پر ریاست ستارہ اور ۱۸۴۵ء میں سنبل پور پر قبضہ کیا گیا۔ ہوس ملک گیری میں اضافہ ہی ہوتا رہا اور طاقت کے گھمنڈ نے چین سے نہ بیٹھنے دیا چناں چہ ۱۸۴۹ء میں پنجاب کو بھی دو جنگوں کے بعد ڈلہوزی نے کمپنی کے منتظمین اور کونسل کے مشورے کے بغیر الحاق کا اعلان کر دیا راجہ کی جاگیرات، حتیٰ کہ زیورات پر بھی قبضہ کر لیا گیا "کوہِ نور" ہیرا بھی انہی میں شامل تھا جو آج کل انگلستان میں ہے[52]۔

۱۸۵۰ء میں ایک مہم راجہ سکھم کے خلاف بھیجی گئی اور چند انگریزوں سے بدسلوکی کا الزام لگا کر اس کا کچھ علاقہ ہتھیا لیا گیا[53]۔ ۱۸۵۰ء میں ہی تھانیسر، گنج پورہ اور شام گڈھ، ۱۸۵۳ء میں جھانسی اور کرناٹک کو شامل کیا۔ اسی طرح تنجور کی ریاست کو شامل کیا گیا، ناگ پور پر زبردستی قبضہ کیا گیا، یہاں کی رانیوں کی بے عزتی کی گئی اور راجہ کا سب مال و اسباب نیلام ہوا۔ رانیوں نے انگلینڈ کو دکیل بھیج کر دہائی دی مگر بے سود۔! ۱۸۵۶ء میں اودھ کو نہایت غاصبانہ طریقے پر ضبط کیا اور بادشاہِ اودھ واجد علی شاہ سے نہایت حقارت آمیز برتاؤ کیا گیا ڈلہوزی نے جس غاصبانہ طریقے سے اِن تمام ریاستوں کو چھینا بعض انگریز مورخوں نے

[51-52] کمپنی کی حکومت" [53] ہاشمی تاریخ ہند (چہارم) / ۱۳۶

[53] تاریخ ہند (چہارم) / ۱۳۷

بھی اس پالیسی کو قزاقی سے تعبیر کیا ہے۔ جو ارباب سلطنت کے لیے موزوں نہیں ہو سکتی
مثلاً مارش مین لکھتا ہے۔

"بعض طبقات میں اس اصول کو کسی برطانوی مدبر کی کارگذاری سے مشابہ
نہیں سمجھا گیا بلکہ ایسے رہزنوں کی غارت گری سے تعبیر کیا گیا جو اپنا مال غنیمت
ڈر کے مارے جنگلوں میں بیٹھ کر شمار کیا کرتے ہیں۔ ایسے طبقات میں ڈلہوزی
کو نہایت کمینہ اور بدترین حاکم سمجھا جاتا ہے"۔ [1]

مورخوں نے اودھ کے الحاق کو بغاوت کا ایک بڑا سبب قرار دیا ہے اور سر سید بھی
متفق ہیں کہ:

"اودھ کی ضبطی سے سب لوگ ناراض ہوئے اور سب نے یقین کیا کہ
ایسٹ انڈیا کمپنی نے خلاف عہد و اقرار کے کیا ہے عموماً رعایا کو ضبطی اودھ سے
اسی قدر ناراضگی ہوئی تھی جتنی کہ ہمیشہ ہوا کرتی جب کمپنی کسی ملک کو فتح کرتی"۔ [2]

عیسائی بنا دو

ساتھ ہی ہندوستانیوں کے مذہب پر بھی کھلم کھلا حملے ہو رہے تھے۔ انگلینڈ سے پادری بھیجے گئے جگہ جگہ مشنری اسکول قایم ہوئے اور یہ تمام اخراجات ہندوستان کے خزانے ادا کرتے تھے [3] یہ پادری جن کے ساتھ اکثر تھانے کا ایک چپراسی ہوتا عام مجمعوں اور میلوں وغیرہ میں جاتے اور تبلیغ کرتے یہاں تک بھی غنیمت تھا مگر انھوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ دوسرے مذہب

---

[1] تاریخ ہند از مارش مین ۶/۲۷۰

[2] "اسباب بغاوت ہند" / ۵

[3] "تاریخ ہند" ہاشمی / ۱۱۷

کے مقدس لوگوں اور متبرک مقامات کو حقارت و نفرت سے یاد کرتے، مذہبی رسم و رواج کا مذاق اڑاتے، اور ان کو ذلیل کرنے کے لیے کتابیں چھپواتے تھے جن میں مذہبی پیشواؤں کی انتہائی دل آزار طریقے سے توہین کی جاتی تھی، اکثر حکام اور فوجی افسر اپنے ماتحتوں سے مذہبی گفتگو کرتے اور ان کو حکم دیتے کہ ہماری کوٹھی پر آ کر پادری کا وعظ سنو۔ اسکولوں میں عیسائیت کی تعلیم ہوتی تھی، حکام وہاں جاتے اور بچوں کا امتحان مذہبی کتابوں میں لیا جاتا اور عیسائیت کے مطابق جواب دینے والوں کو انعام دیا جاتا تھا۔ دیہاتیوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ بچوں کو ان کے مکتبوں میں داخل کریں، ملازمتیں بھی انسپکٹروں کے سرٹیفکٹ پر منحصر تھیں۔ جو "کالے پادری" کے نام سے مشہور تھے۔

۱۸۵۵ء میں پادری فنڈر ہندوستان آیا اس کی کتاب "میزان الحق" سے کافی غم و غصہ پیدا ہو گیا علماء اور پنڈتوں نے اس سے مناظرہ کیا اور شکست دی، وہ ہار کر یورپ چلا گیا۔ یوپی کے انگریز گورنر نے "کتاب لائف آف محمدؐ" لکھی جس میں حضور پیغمبر اسلامؐ کی ذات پر گستاخانہ حملے کیے گئے[۱]۔ پادری ای ایڈمنڈ نے کلکتے سے تمام سرکاری ملازمین کو چٹھیاں بھیجیں جن میں کہا گیا تھا کہ اب تمام ہندوستان میں ایک عمل جاری ہو گئی ہے، تار برقی اور ریلوے سے آمد و رفت ہو گئی، مذہب بھی ایک چاہیے لہٰذا تم عیسائی ہو جاؤ۔ ان چٹھیوں کے آنے پر ——— "خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا، پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی اور یقین ہو گیا کہ ہندوستانی

---

[۱] "الجمعیۃ" ۵ر فروری ۱۹۵۷ء

جس وقت کے منتظر تھے وہ آگیا" ؎۱

اس زمانے کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پکتا ہوا پھوڑا اسی وقت پھوٹنا چاہتا تھا مگر انگریز حکام نے خطرے کے آثار دیکھ کر ایک اشتہار نکالا جس سے بڑھتی ہوئی بے چینی دھیمی پڑ گئی فرانسیسی عورت مسز ہورنشٹ انگلیسی اپنی سرگذشت میں لکھتی ہے۔

"ہم یہ ذکر کرتے جاتے تھے کہ انگلستان کا بڑا پادری چاہتا ہے کہ ہندوستان کو دین مسیحی میں داخل کرے جو لوگ خوشی سے اس کا دین قبول نہیں کرتے اُن سے سختی کے ساتھ پیش آتا ہے اور عیسائیت اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے" ؎۲

اسی زمانے میں سیکڑوں لاوارث اور یتیم بچے عیسائی مشنریوں کو دے دیے گئے۔ مثلاً ۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں بہت سے یتیموں کو عیسائی بنالیا گیا۔

عیسائیت کا پرچار صرف اسکولوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ جیل کے قیدیوں کے سامنے بھی یہی راگ الاپا جاتا تھا اور تمام سرکاری افسران اس میں دلچسپی لیتے تھے۔ ۱۸۴۵ء میں جیلوں میں مشترکہ کھانے کا رواج کیا گیا۔ اب تک ہر قیدی کو علیحدہ سوکھا اناج دیا جاتا تھا، اب یہ اُپج نکالی گئی کہ ہندو قیدیوں کا کھانا ایک برہمن پکائے گا مختلف ذاتوں کے ہندو یہ مشترک کھانا اپنے مذہب کی توہین سمجھتے تھے اور ان کے جذبات کو ٹھیس لگی ؎۳

؎۱ "اسباب بغاوت ہند" / ۲۲ ؎۲ "ایام غدر" / ۸

انگریزوں کے ارادے

ممکن ہے کسی خوش فہم کو یہ گمان ہو کہ کمپنی کے ماتحت حکام اس قسم کی جابرانہ حرکات کرتے تھے جن سے ذمہ دار انگریزوں کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اس لیے بہتر ہے کہ ان "ذمہ دار" انگریزوں کے خیالات کا بھی مختصراً جائزہ لیا جائے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ــ جو اب حکمراں طاقت تھی ـــ ڈائرکٹرز کے چیرمین مسٹر مینگلس نے ۱۸۵۷ء میں ہاؤس آف کامنز (دارالعوام) میں کہا۔

"ہر ایک کو اپنی پوری طاقت لگا دینا چاہیے تاکہ ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام میں کوئی رکاوٹ نہ رہے"۔ [1]

مینگلس کے ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ ملک میں عیسائی مشنریاں اور پرچارک کس قدر تیزی اور سرگرمی سے کام کر رہے تھے۔ ایک اور انگریز ریو کمینڈی کے خیالات ملاحظہ ہوں۔

"خواہ ہم پر کتنی ہی مصیبتیں آئیں مگر جب تک ہندوستان میں ہماری سلطنت باقی ہے ہمیں بھولنا نہیں چاہیے کہ ہمارا اصل کام اس ملک میں عیسائیت کا پرچار ہے...... ہمیں اس مقصد کے لیے اپنی تمام کوششیں اور ذرائع وقف کر دینا چاہیے اور اس وقت تک اپنے کام کو پوری طاقت سے مسلسل جاری رکھنا چاہیے جب تک کہ ہندوستان مشرق میں ایک زبردست عیسائی قوم نہ بن جائے"۔ [2]

1, 2. Savarkar – 56

میکالے ایک خط میں کہتا ہے (۱۲ / اکتوبر ۱۸۳۶ء)

"مجھے یقین ہے کہ اگر ہماری تعلیمی اسکیم کو بر روئے کار لایا گیا تو اب سے تیس سال بعد بنگال میں کوئی بت پرست باقی نہ رہے گا" ——————

اس اسکیم کے نتائج حسب دل خواہ ہی بر آمد ہوئے چناں چہ ڈبلو ہنٹر نے اپنی کتاب "ہندوستانی مسلمان" میں لکھا کہ —— "ہمارے تعلیمی اداروں سے کوئی شخص ایسا نہیں نکلتا جو اپنے باپ دادا کے مذہب اور عقائد کا مضحکہ نہ بنائے"۔ ——

غلط قوانین

بہت سے ایسے قانون جاری کیے گئے جن سے ہندو مسلمانوں کے مذہب میں مداخلت ہوتی تھی مثلاً ایکٹ ۲۱ ۱۸۵۰ء میں جاری ہوا جس کی رو سے عیسائی مذہب اختیار کرنے والوں کو وراثت اور ترکہ پانے کا حق دیا گیا[۱] اور ملک کے عوام میں یہ خیال فطری طور پر پیدا ہوا کہ یہ ان کے ساتھ کھلی ہوئی رعایت ہے جو حکومت کی طرف سے دی جارہی ہے یہ قانون صاف طور سے مذہبی قواعد میں خلل انداز ہوتا تھا اور لوگوں کو خیال ہوا کہ یہ عیسائی بنانے کے لیے جاری ہوا ہے ایکٹ ۱۵ ۱۸۵۶ء ہندوؤں کی مذہبی رسموں میں خلل ڈالتا تھا۔ چند ایسے قوانین بنے جن کی رو سے دو شخص خواہ ایک ہی مذہب رکھتے ہوں مگر دیوانی عدالت سے فیصلے ان کے مذہب کے مطابق نہ ہوتے تھے۔ ضبطی اراضیات کا قانون ۱۸۱۹ء میں جاری ہوا اور عوام کو اس سے سخت تکلیف، مصیبت اور بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑا۔ زمینداریوں کا نیلام اس بے ترتیبی سے ہوا کہ تمام ملک الٹ پلٹ ہو گیا ملازمتوں کی قلت ہو گئی، ہزارہا آدمی بے روزگار اور دانے دانے کو محتاج ہو گئے۔[۲]

---

[۱] سرسید / ۲۷

محکمۂ قضا ختم کر دیا گیا جس کے ماتحت قاضی مقرر تھے اور وہ مسلمانوں کے مقدمات اسلامی قانون کی رو سے طے کرتے تھے، ایسے قانون بھی بنے جو ہندوستانی عوام کی عادت و مزاج کے خلاف تھے۔

حکومت کا گھمنڈ

مغلیہ زمانے کے حکام اور افسران عوام سے انکساری اور محبت سے پیش آتے تھے، ان کی بات توجہ سے سنتے اور فیصلہ کرتے مگر انگریز حکام نے اس کے برعکس رویّہ اختیار کیا کالوں سے بات کرنا اُن کے لیے کسرِ شان تھا، ان کی نظر میں ہر ایک ہندوستانی ذلیل کتے سے بھی بدتر تھا، حکومت میں ہندوستانیوں کو کوئی حصہ نہیں دیا گیا، لیجس لیٹو کونسل کا ممبر نہیں بنایا گیا اور اس طرح حکومت ان کی طرف سے بے خبر اور لاپرواہ رہتی تھی۔ چناں چہ سر سید کے خیال میں بغاوت کا بڑا سبب یہی تھا کہ

> "ہماری گورنمنٹ نے آج تک اپنے آپ کو ہندوستانیوں سے ایسا الگ اور
> اَن میل رکھا ہے کہ جیسے آگ اور سوکھی گھاس ...... اور پھر ان دونوں میں
> ایک فاصلہ ہے کہ دن بہ دن زیادہ ہوتا جاتا ہے"۔ [1]

مغل دور میں اونچ نیچ، حسب نسب اور ذات پات کا لحاظ رکھا جاتا تھا لیکن انگریزی دور میں صرف کالے اور گورے میں فرق سمجھا گیا باقی سب تفریق ہیچ تھی، اس بات سے عوام کے دلوں کو زبردست ٹھیس پہنچی۔

دیسی سپاہ سے برتاؤ

انگریزی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ نہایت ذلیل برتاؤ کیا جاتا تھا، معمولی باتوں پر ہول ناک

---

[1] اسباب بغاوت ہند

سزا دی جاتی، ذرا سی غلطی کی سخت ترین سرزنش ہوتی تھی۔ زخمی سپاہیوں کو ہسپتال بھیجنے کے بجائے گولی مار دی جاتی تھی۔ جنگ بکسر کے بعد ۱۷۶۴ء میں سپاہیوں نے انعام اور اضافۂ تنخواہ کا مطالبہ کیا جو کہ ان کا حق تھا۔ انعام دیا گیا اور وہ یہ تھا کہ چوبیس سپاہیوں اور ان کے چار افسروں کو توپ سے اڑا دیا گیا۔ ایسا ایک ہی واقعہ نہیں بلکہ متعدد واقعات ہیں۔ جنگ کابل سے جنگ برما تک صرف آٹھ دس برس میں چار بار اسی قسم کے جھگڑے ہوئے اور بعض پلٹنیں تو اعلانیہ بغاوت پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ جنگ برما کے موقعے پر جب سپاہ نے الاؤنس مانگا کیوں کہ رنگون میں مہنگائی زیادہ تھی، تو کلکتے سے گورہ فوج نے بارک پور آکر گولیوں کا نشانہ بنایا، باقی کو پھانسی ملی۔ برخلاف اس کے گورہ سپاہ کو تمام مراعات دی جاتی تھیں حتیٰ کہ وہ آرام سے بارکوں میں رہتے تھے۔ جب کہ ہندوستانی سپاہیوں کو اپنے لیے کٹیا بنانی پڑتی تھی[1]

۱۸۴۲ء میں نمبر ۶ مدراس کیولری کو کامپٹی جانے کا حکم ہوا اور وعدہ کیا گیا کہ جلد ہی واپس آجائیں گے مگر وہاں جا کر انھیں بتایا گیا کہ یہاں مستقل رہنا ہوگا اور مزید یہ کہ مقررہ تنخواہ سے کم پر۔

اس طرح کی دھوکے بازی متعدد بار کی گئی جس کی وجہ سے فوج میں سخت ناراضگی پھیل گئی۔

سپاہ کو اور بھی بہت سی شکایات تھیں پیادے کو سات اور سوار کو

---

[1] باری: کمپنی کی حکومت

ستائیس روپے تنخواہ ملتی تھی جب کہ یورپین فوجیوں کو اس سے کئی گنا زیادہ ملتا۔ مؤرخ کہتا ہے۔

"ان کو یقین تھا کہ وہ فوجی کمالات میں دوسرے حیدر علی بھی بن جائیں تو بھی ایک نیچے درجے کے انگریز کی برابر تنخواہ بھی نہ پا سکیں گے" [1]

اس کے علاوہ انگریز سپاہیوں کو ہر قسم کی مراعات، آسانیاں اور سامان عیش مہیا تھا جس کا ایک دیسی سپاہی خواب بھی نہ دیکھ سکتا تھا، چھوٹے سے چھوٹے انگریز افسر بھی پالکی میں باہر نکلتے، خدمت کے لیے خانساماں، خدمت گار، کئی بیرے۔ ایک سردار بیرا اور دوسرے چند نوکر اُس کی چھتری، پائپ، بوتل و گلاس وغیرہ کے لیے ہر ایک کے ہمراہ رہتے تھے اور وہ عیش و عشرت کی زندگی گذارتا تھا۔

اسی زمانے میں جب سپاہیوں کو گائے اور سور کی چربی لگے کارتوس دیے گئے تو ان پر اعتراض کرنے والوں کے ساتھ انسانیت سوز برتاؤ روا رکھا گیا اور مختلف مقامات پر سخت سزائیں دی گئیں۔ ان واقعات نے سپاہیوں کے جذبات میں آگ لگا دی اور وہ نتائج سے بے پروا ہو کر تمام ہندوستان میں بغاوت پر آمادہ ہو گئے

ولی عہدی کے جھگڑے

بہادر شاہ اگرچہ برائے نام ہی بادشاہ تھے مگر اب انگریزوں کو یہ "کٹ پتلی بادشاہت" بھی کھٹکتی تھی چناں چہ شاہِ دہلی سے کہہ دیا گیا تھا کہ ان کے بعد ان کی اولاد کو "شاہ" کا لقب چھوڑنا پڑے گا، قلعے سے نکلنا ہو گا اور وظیفہ بہت معمولی کر دیا جائے گا، اس کے

---

1. Sen - 11. 12

باوجود بھی اس برائے نام بادشاہت کی ولی عہدی کے کئی دعوے دار تھے اور انگریز اس رقابت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ ۱۸۳۹ء میں جب بہادر شاہ کے ولی عہد دارا بخت کے انتقال پر ولی عہدی کا جھگڑا کھڑا ہوا تو بہادر شاہ نے جواں بخت کو ولی عہد بنانا چاہا لیکن انگریز اس آڑ میں اپنا کام نکالنا چاہتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے مرزا فخرو کو اپنے بے کار آمد پا کر اکسانا شروع کیا کہ ولی عہدی آپ کا حق ہے اور اس طرح مرزا سے اپنی تمام شرایط خفیہ طور پر منظور کرا لیں جن میں قلعہ چھوڑنے کا عہد بھی تھا۔ مرزا کو ولی عہد تسلیم کر لیا گیا مگر ۱۰ر جولائی ۱۸۵۶ء کو جب وہ بھی چل بسے تو پھر یہ جھگڑا چلا۔ بہادر شاہ نے ایک محضر پر تمام شہزادوں کے دستخط لیے کہ وہ جواں بخت کو ولی عہد ماننے کو تیار ہیں اور یہ کاغذ انگریز رزیڈنٹ کے حوالے کر دیا گیا۔ انگریزی کارندوں نے جب یہ معاملہ اتنی آسانی سے حل ہوتے دیکھا تو پھر ٹانگ اڑائی اور مرزا قویاش کو بھڑکا کر ولی عہدی کا دعوے دار بنا دیا۔ گورنر جنرل بہادر کو جھگڑے کا بہانہ درکار تھا ہی فوراً مرزا قویاش سے خفیہ طور پر پہلے سے بھی زیادہ کڑی اور ذلیل شرطیں منوائیں مگر ان کو فقط زبانی جمع خرچ پر رکھا۔ ان شرطوں اور خفیہ کارروائیوں کا بہادر شاہ اور ان کے خاندان کو علم ہوا تو ان کو سخت غصہ آیا اور عام لوگوں میں بھی ان حالات نے بے چینی پیدا کر دی خود چارلس مٹکاف کو بھی اقرار ہے کہ

> "جب یہ معلوم ہوا کہ انگریز جانشینی کو ختم کر دینا چاہتے ہیں اور خاندان کو منتشر کر دینا چاہتے ہیں تو اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے جذبات کو سخت ٹھیس لگی۔"[1]

[1] غدر کی صبح شام/ ۲۸

دیگر اسباب

مذکورہ بالا اسباب کے علاوہ اور بھی حالات ایسے تھے جو ملک میں سخت بے چینی اور اضطراب پیدا کر رہے تھے صنعت، زراعت اور تجارت کی بربادی کا ایک مختصر سا خاکہ ابھی ہماری نظر سے گذرا ہے۔ مگر مرے پر سو دُرّے —— باوجود اتنی تباہ حالی کے نئے نئے ٹیکس لگائے گئے تاکہ غریب عوام کو بالکل نچوڑا جاسکے۔ ان ٹیکسوں نے ملک کے بعض حصوں میں کافی ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں ملک پر انگریزی حکومت مسلط ہوتے ہی قحط، وبائیں اور خون ریزیاں تسبیح کے دانوں کی طرح ٹوٹ کر گریں اور ملک کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔

دستکار اور کسان تباہ حال تو ہوئے ہی تھے، اب پنچایتی نظام بھی ختم کر دیا گیا، تو غریب کسانوں کو ذرا ذرا سے جھگڑوں کے لیے عدالت میں برسوں ٹکریں کھانا پڑتیں، سامان قرق و نیلام ہو جاتا، دیوالہ نکل جاتا مگر نتیجہ پھر وہی ڈھاک کے تین پات! جس نے رشوت دی، تھیلیوں کا منھ کھولا اور روپیہ لٹایا، اسی نے انصاف خرید لیا تمام ملک میں رشوت ستانی کا دور دورہ ہو گیا جو ان تہذیب کے دعوے داروں کی یادگار کے طور پر آج تک موجود ہے۔ عدالتی کاغذات پر ٹکٹ لگانے کا جو انوکھا دستور نکلا اس کے بارے میں سر سید کی رائے سنیئے۔

> ”سب عقلاء اس محصول کو ناپسند کر گئے ہیں ان کا قول ہے کہ دستاویزات پر محصول لگانا جتنا قابل الزام اور بے وجہ محض ہے اس سے زیادہ بہا دہ محصول ہے جو کاغذات پر انصاف کرنے کے لیے لیا جاتا ہے“۔

بڑے بڑے امیروں اور جاگیرداروں نے اپنی جائدادیں خیراتی کاموں کے لیے مسجدوں مندروں، محتاجوں اور غریبوں کے لیے وقف کی تھیں مگر ان کی آمدنی نہایت بے دردی

اور ڈھٹائی سے اُن خیراتی کاموں کی بجائے انگریزی گرجوں اور عیسائی مشنریوں پر خرچ کی گئی۔ چناں چہ ڈبلو ڈبلو ہنٹر نے بھی اپنی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں ایک ایسا واقعہ لکھا ہے۔

۱۸۵۵ء میں حیدرآباد میں محرم کے جلوس اور رسومات پر پابندی لگادی گئی جس کی وجہ سے عام طور پر سخت ناراضگی پھیلی کرنل میسکنزی پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ فوجیوں نے علی الاعلان کہا کہ وہ حکومت کے لئے جان دے سکتے ہیں مگر اپنا مذہب اُن کو جان سے زیادہ عزیز ہے۔ محرم کا جلوس اگرچہ شیعہ مذہب کے لوگ نکالتے تھے مگر اکثر جگہوں پر اس میں سنی اور ہندو بھی عقیدت و احترام سے شرکت کرتے تھے[1]

پیشن گوئیاں بغاوت کے اسباب میں ان پیشین گوئیوں کو بھی بڑا دخل ہے جو اُس زمانے میں مشہور تھیں اور جن پر زیادہ تر لوگ یقین رکھتے تھے مثلاً جنگِ پلاسی میں سراج الدولہ کی شکست کو غیور عوام نے قومی شکست قرار دیا اور اس کا بدلہ لیا جانا ضروری سمجھا۔ اس جنگ سے ان کے احساسات یہاں تک وابستہ تھے کہ ہر سال پلاسی کے میدان میں جمع ہو کر شہیدوں کو خراجِ عقیدت ادا کرتے تھے۔[2] اور یہ بات سینہ بہ سینہ چلی آتی تھی۔ ایک پیشن گوئی کہ سو سال بعد انگریزی راج ختم ہو جائے گا"۔ کچھ نجومیوں اور مقتدر لوگوں کے نام سے بھی منسوب کر دی گئی تھی اور جنگ پلاسی کو ۱۸۵۷ء میں سو سال پورے ہوتے تھے۔ چناں چہ ۱۸۵۷ء شروع ہوتے ہی پلاسی کی سو سالہ یادگار منانے کے لیے عوام میں چرچے گوئیاں موجود تھیں اور میلوں

---

1. Sen. – 14. 2. A. K Mitra] "Sirajuddolah" (Bengali). See "Uttar Pradesh" Nov. 1956.

اور نمائشوں میں لوگ اس پر بات چیت کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک نمائش میں جو سیرام پور میں ہوئی تھی جنگ پلاسی کی سو سالہ یادگار کی ابتدا ہوئی جس میں اسی ہزار یاتری تھے۔

انگریزی حکومت کے خاتمے کی پیشین گوئیاں نئی نہ تھیں بلکہ جنگ پلاسی کے بعد ہی سے عوام کے دماغوں میں اتر چکی تھیں۔ مسلمانوں میں ایک بزرگ شاہ نعمت اللہ ولی کا فرضی قصیدہ مقبول تھا جس میں ہندوستان کے بارے میں کچھ پیشین گوئیاں کی گئی ہیں اس میں اس قسم کا اشارہ بھی موجود تھا مثلاً یہ شعر

درمیانِ این و آں گردد بسے جنگِ عظیم

قومِ عیسیٰ را شکستِ بے گماں پیدا شود [1]

علاوہ ازیں چند نجومیوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ ان کے حساب سے ستارے باغیوں کی حمایت میں ہیں۔ ان پیشین گوئیوں نے اہل ہند کو پختہ یقین دلا دیا تھا کہ انگریزی سامراج کے خاتمے کا وقت آپہنچا۔

اودھ کا الحاق

بعض مورخوں نے اودھ کے الحاق کو بغاوت کا سب سے بڑا سبب قرار دیا ہے۔ یہ آگ تو بہت پہلے ہی سلگ رہی تھی ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اودھ کے الحاق نے ان چنگاریوں کو شعلہ بنانے میں مدد دی

---

[1] بعض جہل آشنا دماغوں میں یہ نظم آج بھی خلل ڈالے ہوئے ہے اور اس کا یہ شعر خصوصیت سے قابلِ غور ہے۔

در ہزار دو صد و ہفتاد و ہشت
۱۲۷۸ھ
ملکِ ہندوستاں شود مانندِ دشت

اودھ کے غاصبانہ الحاق پر آگے روشنی ڈالی جائے گی، یہاں ہم صرف اُن حالات کا جائزہ لیں گے جو الحاق نے پیدا کر دیے تھے۔

اودھ پر انگریزی تسلط سے ہزارہا باشندگانِ اودھ جو دربار اور اس کے لوازمات سے وابستہ تھے اپنی زندگیوں کا سہارا کھو بیٹھے۔ اس کے علاوہ ہزاروں وہ لوگ جو امراء اور درباریوں کی ضروریات بہم پہنچاتے تھے بے کار ہو گئے اور ان کو سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ رنٹز ریز (L. E. Reez) بیان کرتا ہے۔

"ہزاروں شرفا، امراء اور حکام جو شاہی زمانے میں بڑے عہدوں پر تھے اور عیش و عشرت کی زندگی گذارتے تھے اب مفلسی اور محتاجی کے دن بسر کر رہے ہیں اور ان کے ماتحت، مصاحب اور ملازمین بے روزگاری کا شکار ہو رہے ہیں دیسی سوداگر، دکان دار اور مہاجن جو واجد علی شاہ کے زمانے میں شاہی ساز و سامان کی سپلائی سے فائدہ اٹھاتے تھے، آج اپنی چیزوں کا کوئی خریدار نہیں پاتے اور عام لوگ عموماً اور غریب عوام خصوصاً بے حد غیر مطمئن ہیں کیوں کہ ان پر طرح طرح کے ٹیکسوں کی بھرمار ہے"[1]

اسی طرح شاہِ اودھ کی معزولی پر فوج کو بھی برخاست کر دیا گیا جو تقریباً ستر ہزار آدمی تھے۔ اس کی وجہ سے بے چینی اور بدحالی میں اور اضافہ ہوا کیوں کہ بقول انس (INNS)

"ایک سپاہی کو برخاست کرنا ایک ڈاکو پیدا کرنے کے مترادف تھا"۔

---

1. Narrative of the seige of Lucknow - 33, 34

اودھ کا کوئی خاندان ایسا نہ تھا جس کا کوئی نہ کوئی مرد فوجی خدمات انجام نہ دے رہا ہو اس طرح فوج کی برطرفی سے تمام اودھ کا علاقہ ان برخاست شدہ سپاہیوں سے بھر گیا جن کی نئے اودھ کی پولس اور فوج میں کوئی جگہ نہ تھی۔ بہت سے گھر بے روزگاری کا شکار ہو گئے۔ کیو براؤن کہتا ہے۔

"یہاں تک کہ سپاہیوں کے گھر، اور پنشن یافتوں کے باغات بھی ٹیکسوں سے نہ بچے"۔

جائدادیں اس کثرت سے ضبط و نیلام کی گئی تھیں کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کے چار پانچ برسوں میں پینتیس ہزار میں سے اکیس ہزار قرقی و نیلام کی جا چکی تھیں۔ یہ تمام قرقی و نیلام وغیرہ "انعام کمیشن" کے ذریعے ہو رہا تھا جو اسی مقصد سے بنایا گیا تھا اور جس کی کارروائی کو کئی انگریز مصنفوں مثلاً تھارن ہل اور جی۔ بی۔ میلسن وغیرہ نے ناجائز اور ظالمانہ قرار دیا ہے۔ ان تمام حالات کی وجہ سے چودہ[۱۴] ہزار مقدمات پٹیشن ظاہر ہوئے جو کہ صوبے کے پچھتر[۷۵] ہزار سپاہیوں نے نئے نظام مال گذاری کی سخت گیری کے خلاف دائر کیے تھے۔[۱]

برطرف شدہ سپاہیوں میں پچیس ہزار برہمن بھی تھے جن کو خیراتی جائدادوں کی قرقی سے بھی زبردست دھچکا لگا تھا۔ مشہور انگریز مورخ میلسن نے بھی یہ تمام حالات بیان کیے ہیں اور انہی تمام حالات کے پیش نظر ڈیوک آف ولنگٹن نے کہا تھا کہ

---

1. Kaye : I – 17, Holmes – 41
Symposium – 14, 17

"کسی دیسی ریاست کا الحاق اس کے باشندوں کو زوال پذیر اور قلاش کر کے اپنا دشمن بنانا ہے"۔

تھامس منرو نے اس پالیسی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ

"اس پالیسی نے تمام لوگوں کو اکھاڑ پچھاڑ کر کے رکھ دیا ہے"[1]

---

1. Symposium — 14, 17

۳

طوفان

کی

آمد آمد

ہندیوں میں بو رہے گی جب تلک ایمان کی
جا کے لندن میں چلے گی تیغ ہندوستان کی
ظفؔر (بہادر شاہ)

بغاوت کی علامتیں

ملک کے ناقابل برداشت حد تک خراب اقتصادی، سماجی اور سیاسی حالات نے ارباب فکر کو یہ سوچنے پر بالآخر مجبور کر دیا کہ انگریزی سامراج کا بڑھتا ہوا سیلاب جو ہندوستانی عظمت و وقار کو کچل کر دیسی ریاستوں کو سوکھی جھاڑیوں کی طرح بہاتا چلا جا رہا تھا، اب ہر قیمت پر روکنا پڑے گا۔ ملک خاموش تھا، فضا میں سناٹا تھا، مگر یہ خاموشی اور یہ سناٹا بڑا دہشت ناک اور پُر فریب معلوم ہوتا تھا، عوام انگریز کے ظلم وستم سے تنگ آ چکے تھے، امرا، و جاگیردار ناراض تھے، فوج ناخوش تھی۔ یہ سب کچھ تھا مگر انگریزی قہرمانی اور گھمنڈ میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا تھا۔ یہ حالات تھے کہ آنے والے طوفان کی گرج سنائی دینے لگی۔

پٹنہ میں سازش

ملک کے مختلف حصوں میں سازشیں ہونے لگیں، بغاوت کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور فوجوں میں باغیانہ جذبات کا پرچار — ۴۶-۱۸۴۵ء میں جب ایک طرف پنجاب کی جنگوں میں انگریزوں کو موت وحیات کا سوال درپیش تھا، دوسری طرف بہار میں اُن کے خلاف ہمہ گیر سازش شروع ہو چکی تھی۔ حکومت کو دسمبر ۱۸۴۵ء میں اس سازش کا پتہ لگا۔ فوجیوں میں بغاوت

کے لیے روپیہ تقسیم ہو رہا تھا اور ان کو دین کی حفاظت کے لیے آمادہ کیا جا رہا تھا پٹنے
کے بڑے بڑے جاگیر دار اس میں شریک تھے، پولس اور فوج کے افسر بھی تھے اور
معمولی سپاہی بھی۔ فرسٹ رجمنٹ کا منشی پیر بخش بھی دیسی فوجیوں کو روپیہ تقسیم
کرتا تھا۔ میجر راکرافٹ نے یہ اطلاعات پا کر ان کی تصدیق کی اور پھر ۲۴ر دسمبر کو
پیر بخش کو گرفتار کر لیا گیا۔ خانہ تلاشی پہ باغیانہ خطوط برآمد ہوئے نیوریا کے بااثر زمیندار
راحت علی سے اس کے نامہ و پیام کا سراغ ملا۔ جسے ۲۵ر دسمبر کو پکڑ لیا گیا۔[1] مزید
چھان بین سے معلوم ہوا کہ دہلی کا ایک مغل اکثر اس کے پاس آیا کرتا تھا جو بہ ظاہر
کتابیں بیچنے کا کام کرتا ہے۔ راحت علی کے گھر (محلہ سبزی باغ پٹنہ) کی تلاشی پر
باغیانہ خطوط، کاغذات اور ایک "محضر نامہ" برآمد ہوئے۔ ان کاغذات نے سازش
کو کچھ اور اجاگر کر دیا، سہسرام کے ایک اور شخص شاہ کبیر الدین کا نام بھی معلوم ہوا
جس سے راحت علی کی خط و کتابت تھی۔ پیر بخش سے پوچھ گچھ پر پتہ چلا کہ اس تمام
سازش کا اصل سرغنہ خواجہ حسین علی خاں[2] ہے۔ مگر وہ کافی تگ و دو کے باوجود

---

[1] راحت علی ۱۸۲۹ء میں میر عبداللہ نامی شخص کے ہمراہ ایک زبردست مظاہرے کی رہنمائی بھی کر چکا تھا جو وقف جائداد پر قبضے، عیسائیت کی تبلیغ اور انگریزی تعلیم کی ہمت افزائی کے بارے میں تھا۔

[2] خواجہ حسین علی چند سال سے گوالیار میں ریاست کا ملازم تھا اور بطور وکیل ریاست کلکتہ میں بھی رہ چکا تھا۔ بہار کے مرحوم جسٹس محمد نور خواجہ موصوف کی اولاد تھے۔ (دتہ - ۶۲)

گرفت میں نہ آیا۔ مجسٹریٹ کو معتبر ذریعے سے پتہ چلا کہ پٹنے کے متعدد با اثر لوگ اور زمیندار بھی اس سازش سے وابستہ ہیں۔

سازش شروع ہونے کے اسباب مختلف ہیں، لوگ انگریزی قوانین اور نت نئے ظلم و ستم سے پہلے ہی نالاں تھے کہ اچانک جیلوں میں مشترک کھانے کا حکم ہوا۔ کیوں کہ مختلف ذاتوں کے ہندو مشترک کھانا اپنے عقیدے کی رو سے برا سمجھتے تھے اس لیے ان کو فطری طور پر خیال ہوا کہ حکومت ان کے مذہب میں مداخلت کرنا چاہتی ہے اکثر جیلوں میں اس پر سخت شورشیں برپا ہوئیں اسی دوران میں حاجیوں کا ایک جہاز بمبئی پر روک دیا گیا جس سے یہ خیال پیدا ہوا کہ مسلمانوں کو فرائض حج ادا کرنے سے روکا جا رہا ہے۔ اسی طرح کی دوسری جا و بے جا حرکتوں نے عوام کو متحد ہو کر سازش کے لیے تیار کر دیا۔ بے شمار شہریوں، مہاجنوں، کچہری کے عملے والوں وغیرہ نے تحریری عہد کیا کہ وہ اپنے ذات اور مذہب بچانے کو سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔ بہار کے راجاؤں، زمیں داروں اور با اثر لوگوں کو دعوت نامے بھیجے گئے اور بڑی تعداد میں ہندو مسلمان جمع ہوئے یہ پلان خواجہ حسین علی کے خیمے میں تیار کیا گیا جو سازش کے سرغنہ اور رہنما تھے۔ فوجیوں کی ہم دردی حاصل کرنا ضروری سمجھا گیا اور طے پایا کہ راجہ نیپال اور شاہ دہلی سے بھی مدد لی جائے۔[1]

اس سازش کے تحت ایک شخص سیف علی نے، جو خود کو شاہ دہلی کا پیغامبر بتاتا تھا ڈورانڈا، ہزاری باغ اور دانا پور کی دیسی فوج میں بغاوت پھیلانا شروع کر دی

---

1. Datta – 64

اور اس میں کام یاب بھی ہوا، خواجہ حسین علی اور فوجیوں کے درمیان وہی ایک واسطے کا کام دیتا رہا۔ راجہ نیپال سے بھی نامہ و پیام ہوا اور وہ امداد پر تیار ہوگیا۔ ادھر جگدیش پور میں کنور سنگھ کی نگرانی میں نئی فوج بھرتی کی جا رہی تھی کیوں کہ کنور سنگھ بھی اس خفیہ انقلابی جماعت میں شامل تھے وہ خواجہ حسین علی اور دوسرے بائی سرغنوں سے خط و کتابت کر رہے تھے۔[1] کہا جاتا ہے کہ وہ راجہ نیپال سے مدد کی درخواست کرنے نیپال بھی گئے تھے۔

اس سازش کی ہمہ گیری اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ انگریز حکام کو جن رہنماؤں کا پتہ چلا ان میں مذکورہ بالا لوگوں کے علاوہ بابو مود نرائن راجہ ٹکاری اور اس کا دیوان منشی چراغ علی، گیا کے صدر امین ہدایت علی، اشرف حسین اور مولوی نیاز علی (صدر امین ترہٹ)، دربھنگہ، بیتھا، ہتوا وغیرہ کے راجے، قرب وجوار کے ضلعوں کے تمام با اثر زمین دار، سوداگر اور مہاجن بھی شامل ہیں۔[2] لیکن ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے باوجود خواجہ حسین علی کو گرفتار نہ کیا جا سکا خواجہ نے انگریز افسروں کو بدحواس اور حیران و پریشان کر دیا۔ وہ برابر گھومتا اور اپنے ساتھیوں سے خط و کتابت کرتا رہا۔ ۸ اکتوبر ۱۸۴۶ء کو وہ خود مجسٹریٹ کے سامنے آگیا، مقدمہ چلا تو پیر بخش نے پہچاننے

---

[1] ایک شخص نِلک خادم علی مختار کی خانہ تلاشی پر وہ خطوط برآمد ہوئے جو کنور سنگھ نے خواجہ حسین علی خادم علی اور برکت اللہ (وکیلِ سرکار) میر عبداللہ وغیرہ کو لکھے تھے اور یہ سب لوگ اس سازش کے رہنما تھے (دتہ / ۶۵)

2. Datta – 67

ہی سے انکار کر دیا اور بالآخر ثبوت مہیا نہ ہو سکنے اور سازش کا سراغ نہ لگنے پر مجبوراً
۲۷ر اکتوبر ۱۸۴۶ء کو خواجہ بری کر دیا گیا۔

یہ سازش آنے والے طوفان کی پہلی گرج تھی۔

خطرے کا احساس

انگریز افسروں کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ ان کی سفاکیاں رنگ لائے بغیر نہ رہیں گی چناں چہ سر چارلس نیپیر (پنجاب) کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک میں باغیانہ رجحان موجود تھا جو جنوری ۱۸۵۰ء میں پنجاب کی پوری چالیس ہزار فوج میں سرایت کر چکا تھا۔[1] آر۔ ڈبلو فریزر لکھتا ہے۔

"بہت سے لوگوں نے ڈلہوزی کے زمانہ انتظام کی تیز رفتار تبدیلیوں میں خطرے کے آثار دیکھ لیے تھے"[2]

خود ڈلہوزی کو اپنی ستم ایجادیوں کا انجام نظر آ رہا تھا۔ اس نے فروری ۱۸۵۶ء میں کلکتے میں کہا۔

"کوئی سمجھ دار شخص جو مشرقی معاملات کا ذرا بھی علم رکھتا ہو ہندوستان میں زیادہ دیر تک قیام امن کی پیشین گوئی نہیں کر سکتا۔ سرکشی اور بغاوت زمینی بخارات اور بھاپ کی طرح اٹھ سکتی ہے اور تمام جنگوں سے زیادہ

---

1. Memorandum of Duke of wellington
"British India"- 273, 272

ظلم وتشدد میں اچانک وہ لوگ مبتلا ہو سکتے ہیں جو عین اس دن تک جس دن
ان کے خون میں ابال آیا، نہایت ہی معصوم بے ضرر اور بودے نظر آتے
رہے ہوں۔"[1]

اسی طرح اگست ۱۸۵۵ء میں لارڈ کیننگ نے ڈائرکٹرز کی الوداعی پارٹی میں کہا۔
"ہمیں بھولنا نہیں چاہیے کہ ہندوستان کے ساکت آسمان پر بادل کا ایک
چھوٹا سا ٹکڑا جو شروع میں انسانی ہاتھ سے بڑا نہ ہو، بڑھتے بڑھتے آخر کار
ہماری تباہی کا خطرہ پیدا کر سکتا ہے"[2]

اعلانات بعض انگریز مورخوں نے ایک اشتہار کا ذکر کیا ہے جو کسی ایرانی
شہزادے کے خیمے سے جنگِ ایران کے زمانے میں برآمد ہوا تھا
اور جو ان کے خیال میں اس بغاوت کا سبب تھا۔ اس اشتہار میں اس وقت کے
حالات پر روشنی ڈال کر یہ بتایا گیا ہے کہ انگریز افغانستان اور ایران پر بھی مسلط
ہونا اور ہمارے مذہب کو خراب کرنا چاہتے ہیں اور اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے
نہایت فریب اور عیاری سے کام لیتے ہوئے وفادار ایرانی افسروں کو توڑنا چاہتے
تھے جو کہ ہم پر ظاہر ہو گیا۔ انھوں نے اچانک ایران پر حملہ کر دیا جس کی وجہ سے ایران
پوری طرح تیاری بھی نہ کر سکا کیوں کہ اس کو اس حملے کا گمان بھی نہ تھا۔ اس اشتہار
میں ہر خاص وعام کو ان زیادتیوں کا بدلہ لینے کی جو انگریزوں نے مذہب اسلام پر

---

1. Fraser : "British India" - 273

گیں اور انگریزوں کے خلاف جہاد کی دعوت دی گئی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ اشتہار ہندوستان میں بھی تقسیم کیا گیا ہو لیکن یہ خیال کہ اتنی بڑی ملک گیر بغاوت کا سبب یہ اشتہار تھا، ایسی عجیب خیال آرائی ہے جو انگریز مورخوں کے دماغ میں ہی سما سکتی ہے، یہ ضرور ہے کہ جنگ ایران کے دوران میں شاہِ ایران نے بہادر شاہ ظفر سے خط و کتابت کی اور ایک نمایندہ دہلی سے ایران بھیجا گیا تھا۔ اسی زمانے میں اشتہارات دہلی میں چسپاں کیے گئے۔ یکم اپریل کو جامع مسجد کے دروازے پر ایک اشتہار لگایا گیا۔ یہ میلے سے کاغذ پر تھا جس میں دائیں بائیں تلوار اور ڈھال کی شکل بنی تھی اشتہار میں کہا گیا تھا کہ شاہِ ایران عنقریب اس ملک میں آنے والے ہیں اور مسلمانوں کو چاہیے کہ انگریز سے جہاد کے لیے تیار ہو جائیں۔ شکاف کا بیان ہے کہ اس اشتہار کو دیکھ کر پانچ سو مسلمانوں نے جہاد پر آمادگی ظاہر کی تھی[۱] کہا جاتا ہے کہ بغاوت سے چند روز پہلے بھی ایک اشتہار جامع مسجد میں لگایا گیا جس میں اس بغاوت کی جانب اشارہ تھا۔ دہلی میں شہر کی دیواروں پر بھی اشتہارات چسپاں تھے جن میں تمام ہندوستانیوں سے آزادیٔ وطن کے لیے جنگ کرنے کی اپیل کی گئی تھی اس طرح ملک کے مختلف حصوں میں بھی اعلانات چسپاں کیے گئے چناں چہ لکھنؤ میں ایک اعلان مختلف مقامات پر چسپاں ہوا۔

"ہندو مسلمانو۔ متحد ہو کر اٹھو اور ایک ہی بار ملک کی قسمت کا فیصلہ کر دو۔ کیوں کہ اگر یہ موقع ہاتھ سے نکال دیا گیا تو تم لوگوں کے لیے اپنی جانیں بچانے

---

[۱] مقدمہ بہادر شاہ میں تھیو فلس شکاف کا بیان

کا موقع بھی ہاتھ نہ آئے گا یہ آخری موقع ہے۔ اب۔ یا کبھی نہیں"۔! [۵۱]

مدراس کے ایک اعلان میں جو شہر کی دیواروں پر لگایا گیا، لکھا تھا۔

"ہم وطنو! اور مذہب کے وفادار شیدائیو۔!۔ اٹھو!۔ اٹھو۔! تم سب ایک ساتھ اٹھو"۔ فرنگی کافروں کو نیست و نابود کرنے کے لیے۔ جنھوں نے عدل وانصاف کے ہر اصول کو پاؤں تلے روند ڈالا، ہمارا راج چھین لیا، ہمارے ملک کو خاک میں ملانے کا ارادہ کرلیا ہے۔ صرف ایک ہی علاج ہے۔ اور وہ یہ کہ خوں ریز جنگ کی جائے یہ آزادی کے لیے جہاد ہے۔ یہ حق وانصاف کے لیے مذہبی جنگ ہے"۔ [۵۲]

مگر انگریزی حکومت اشتہارات لگانے والے "مجرموں" کا پتہ باوجود کوشش کے بھی نہ چلا سکی اور اس کی وجہ بھی جلد معلوم ہو گئی۔ پولس بھی ان تمام کاموں میں شریک تھی۔!!

پُر اسرار چپاتیاں

۱۸۵۷ء کے پہلے تین ماہ میں چپاتیاں تقسیم کی گئیں۔ جو اور گیہوں کے آٹے کی یہ چپاتیاں جو اندازاً دو تولہ وزنی اور انسانی ہتھیلی کی برابر تھیں شمالی ہند کے تقریباً تمام گاؤں میں نہایت تیزی سے تقسیم ہوئیں۔ خصوصاً شمالی مغربی صوبوں میں تقسیم کی گئیں لیکن جنوری ۱۸۵۷ء میں، وسطی صوبوں میں بھی پائی گئیں ساگر اور نربدا کے کمشنروں کی رپورٹ کے بہ موجب جنوری میں زیادہ تر اضلاع میں تقسیم ہو چکی تھیں بہار اور جھانسی میں بھی پائی گئیں اندازہ ہے کہ سب سے پہلے جنوبی یا وسطی حصوں میں کہیں سے شروع ہوئیں۔ بہادر شاہ کے مقدمے میں بعض گواہوں نے بتلایا کہ یہ روٹیاں اودھ یا لکھنؤ سے شروع ہوئیں۔ ۱۹ فروری ۱۸۵۷ء

---

[۵۱] [۵۲] بہ حوالہ ساورکر

گوڑگاؤں کے کلکٹر نے رپورٹ بھیجی کہ یہ چپاتیاں وہاں کے گاؤں میں تقسیم کی جارہی ہیں ان کو روکنے کے لیے احکام جاری ہوئے اور دہلی کے مجسٹریٹ نے بھی تقسیم بند کرانے کی کوشش کی مگر اس وقت تک یہ پنجاب میں پہنچ چکی تھیں اور تمام دیہات میں پھیل گئی تھیں۔ پہاڑ گنج کے تھانے دار معین الدین نے بھی اپنے روزنامچے میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بھائی نے جو بدرپور کا تھانے دار تھا اطلاع دی کہ یہاں چپاتیاں اور بکرے کے گوشت کی بوٹیاں تقسیم کی جارہی ہیں۔ وہ متھرا اور علی گڈھ بھی گیا، یہاں بھی چپاتیاں تقسیم ہو چکی تھیں۔ ان کی تقسیم کا طریقہ یہ تھا کہ گاؤں کا چوکی دار دوسرے گاؤں کے چوکی دار کو چپاتی دے جاتا اور یہ ہدایت کرتا کہ اسی قسم کی پانچ روٹیاں پکا کر آس پاس کے دیہات میں اسی ہدایت کے ساتھ تقسیم کردے۔ اندازہ ہے کہ جنوری سے شروع مارچ تک یہ چپاتیاں تمام شمالی ہند میں بارک پور سے انبالے تک اور دہلی سے ساگر اور نربدا تک کے ضلعوں میں پھیل چکی تھیں۔ ان چپاتیوں کی تقسیم سے عوام میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی اور مختلف چہ مے گوئیاں ہونے لگیں۔ سپاہیوں میں بھی یہ روٹیاں تقسیم ہوئیں۔ چناں چہ فرانسیسی عورت لکھتی ہے۔

"جب یہ کلچہ دست بدست ایک سپاہی سے دوسرے سپاہی کو ملتا ہے تو اس پر نظر کرنے سے ہر سپاہی کا چہرہ متغیر ہو جاتا ہے، غیظ و غضب کے آثار بشرے سے ہویدا ہونے لگتے ہیں اگرچہ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتے مگر دل ہی دل میں انگریزوں پر پیچ و تاب کھاتے ہیں"[1]

---

[1] "ایام غدر" / ۵

چپاتیوں کی گردش کو اوّل اوّل تو انگریز حکام نے مطلق اہمیت نہ دی اور جب وہ ان کی روک تھام پر متوجہ ہوئے تو وہ تمام ملک میں پھیل چکی تھیں۔ انگریز مورخوں نے اس لیے اہمیت نہ دی کہ وہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو چند سرکش سپاہیوں اور ناخوش جاگیرداروں کی فتنہ پردازی ثابت کرنا چاہتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ چپاتیاں اُس خفیہ اور منظم گروہ کی ایجاد تھیں جو ملک میں خاموشی سے اپنا کام کر رہا تھا اور یہ ہندوستان کے کروڑوں جاہل اور غریب عوام کو ہوشیار کرنے کا ایک طریقہ تھا کہ وہ جنگِ آزادی کے لیے تیار ہو جائیں تھیو فلس مٹکاف اس نظریے کو تسلیم کرتا ہے۔

"اغلب گمان یہ ہے کہ وہ مشترکہ اعلان تھا جو ہندو مسلمان سازش کنندگان کا مشترکہ نتیجہ تھا"۔[۱]

یہ خیال اس بات سے بھی پختہ ہوتا ہے کہ بعض افسروں کو یاد تھا کہ پچاس سال پہلے بھی یہ چپاتیاں دیکھی گئیں اور اس کے بعد ویلور کی بغاوت ہوئی (۱۸۰۶ء) اور یہ پلاسی کی جنگ کو پچاسواں سال تھا۔ لہٰذا اب پھر ان چپاتیوں کی تقسیم جنگِ پلاسی کو سو سال گذرنے پر یقیناً اس قومی شکست کا احساس دلانے کے لیے تھی۔

صحیح طور پر پتہ نہیں چل سکتا کہ یہ چپاتیاں کہاں سے شروع ہوئیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ مولانا احمد اللہ شاہ رحنے یہ چپاتیاں اپنے دورانِ سفر میں شروع کیں۔ تاہم ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ یہ نانا صاحب کے دربار سے شروع ہوئیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اودھ سے شروع ہوئیں جب کہ بعض پانی پت کرنال سے ابتدا بتاتے ہیں۔[۲] لیکن زیادہ قرین قیاس

---

[۱] غدر کی صبح شام / ۱۹

[۲] مقدمہ بہادر شاہ

یہ ہے کہ یہ وسطی یا جنوبی علاقوں میں کہیں شروع ہوئیں۔

ان چپاتیوں کا تصور غالباً چین سے ہندوستان آیا کیوں کہ چینی تاریخ بتاتی ہے کہ ۱۳۶۸ء میں منگولوں کا تختہ الٹنے کے لیے وہاں اسی طرح روٹیوں کی تقسیم کی گئی تھی جس سے تمام چین متحد ہو گیا اور منگولوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ چین و ہندوستان ایک دوسرے سے قریب تھے اور اکثر بار ہندوستانی سپاہی سرکاری حکم سے چین جا چکے تھے اس لیے اس خیال کو اور بھی تقویت ملتی ہے اگرچہ قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال یہ پُر اسرار چپاتیاں ملک میں ایک پوشیدہ اور منظم انقلابی جماعت کا کھلا ثبوت ہیں جس کی طرف سے عملی قدم اٹھانے کے لیے یہ ایک فوری پکار تھی ـــــ عوام کو ایک جھنڈے کے تلے جمع کرنے کے لیے اشارہ تھا۔

خفیہ کارروائیاں

کیا ملک میں کوئی انقلابی تحریک موجود تھی؟ اس کا جواب اوّل تو چپاتیوں کی پُر اسرار تقسیم سے ہی ملتا ہے دوسرے خود انگریز مورخین بھی شہادت دیتے ہیں مثلاً فریزر کہتا ہے۔

> "نانا صاحب بٹھور سے کالپی، دہلی، لکھنؤ کے درمیان سفر کر رہا تھا اور ایک عالم و فاضل فیض آبادی مولوی (مولانا احمد اللہ شاہؒ) نے دہلی، میرٹھ، کلکتہ اور پٹنے کا سفر کیا۔ وہ بغاوت پھیلا رہا تھا اور ہمہ گیر سازش کے پوشیدہ جال نہایت ہوشیاری سے بُن رہا تھا۔"

میلیسن لکھتا ہے۔

> وہ (مولانا احمد اللہؒ) اس ملک گیر سازش کے محرک اور منظم کرنے والے تھے جس کی شاخیں تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھیں"۔

مولانا احمد اللہ شاہؒ نے تمام ملک خصوصاً شمالی ہند میں جگہ جگہ خود جاکر تحریر و تقریر کے ذریعے بغاوت کی انقلابی تحریک کو منظم کیا اور لوگوں کو جنگ آزادی پر آمادہ کیا۔ شاہ صاحب دہلی بھی آئے مگر یہاں عجیب رنگ تھا۔ مغل شہزادے عیش و عشرت میں مست، امراء عیاش اور عوام مدہوش تھے۔ آپ نے ذی شعور اور حساس طبقے کو نہایت خفیہ طور پر اس طرف متوجہ کیا۔ مفتی صدر الدین کے مشورے سے آگرے گئے اور انہیں کے خط سے وہاں جان پہچان پیدا کی ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا فیض احمد بدایونی بھی شریک کار ہو گئے اور کافی لوگ آپ کے معتقد ہو گئے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی بھی اس سلسلے میں دہلی آئے تھے۔ اسی طرح ایک مولوی صاحب جن کا تذکرہ خواجہ حسن نظامی مرحوم نے "بیگمات کے آنسو" میں کیا ہے یہ تصدیق کرنے آئے تھے کہ نئے کارتوسوں کے متعلق افواہیں کس حد تک درست ہیں۔ آپ ہندو جوہریوں کے مہمان تھے جو آپ کے شریک اور راز دار تھے۔ جذبہ صادق کا اندازہ لگائیے۔ ایک شخص یوسف سے کہتے ہیں۔

"ہم صرف ثبوت چاہتے ہیں تاکہ ہمارا انتقام خدا کے نزدیک جائز ہو جائے۔ یہ دونوں آدمی ہندو ہیں اور فوج کے ملازم ہیں اور مجھ کو ایک دوسری فوج کے مسلمان افسروں نے اس کام پر مقرر کیا ہے"۔

کہا جاتا ہے کہ یہ مولوی صاحب میرٹھ چلے گئے۔

ملک میں جس طرح خفیہ طور پر یہ تحریک جاری تھی اور جس کا پتہ انگریز جیسی عیار قوم بھی نہ لگا سکی اس کے لیے جارج گرانٹ جیکب کا یہ بیان بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا

"یہ بتانا مشکل ہے کہ کس حیرت انگیز طور پر یہ تمام سازش پھیلائی گئی اور

طے شدہ اسکیم کا پرچار کیا گیا تھا سازشی گروہ کس قدر ہوشیاری سے اپنا کام کر رہا
تھا۔ آپس کے تعلقات کو خفیہ رکھ کر اپنے مقصد کے لیے کافی ہدایات فراہم
کی جاتی تھیں۔ یہ تمام کام نہایت وفاداری سے انجام پاتے تھے جو ان کو ایک
دوسرے سے وابستہ کیے ہوئے تھی"۔[1]

فرانسیسی عورت نے اپنی سرگذشت میں لکھا ہے کہ کلکتہ، بمبئی اور مدراس سے خطوط کے
ذریعے ان لوگوں کو علم ہوا کہ ہندوستان میں عنقریب ایک بڑی شورش برپا ہونے
والی ہے اور یہ کہ ہندوستان کی فوجیں تمام ملک میں عنقریب بغاوت کریں گی، پٹنہ
لکھنؤ اور حیدرآباد وغیرہ کے حالات بھی بتاتے ہیں کہ انقلابی تحریکیں پورے ملک
میں موجود تھیں۔

عظیم اللہ خاں

۱۸۵۳ء میں جب نانا صاحب کے وکیل عظیم اللہ خاں انگلستان
گئے تو وہاں ناکامی کے بعد ہی انھوں نے انقلابی اسکیم بنانا
شروع کر دی تھی۔ اسی مقصد کے تحت وہ مختلف ممالک میں گھومے، یورپ کا دورہ
کیا۔ ٹرکی کی راجدھانی میں گئے، قسطنطنیہ کے عمر پاشا کو خطوط لکھے اور روس میں
بھی کچھ عرصے قیام کیا۔ نانا صاحب نے ایک خفیہ جماعت قایم کی جو بڑی ہوشیاری
اور رازداری سے کام کر رہی تھی۔ ملک کے مختلف حصوں دہلی، کولھاپور، پٹوردھن
اودھ، بندیلکھنڈ وغیرہ میں وفد اور خطوط بھیجے گئے چناں چہ ایک پیام بر انگریزوں نے
دربار میسور میں پکڑا تھا۔ ساورکر کا بیان ہے کہ یہ خفیہ تحریک سب سے زیادہ دہلی میں

---

1. Western India p. 62

جڑ پکڑ رہی تھی۔ اور مغل شہزادے اس کام میں مصروف تھے۔ لال قلعے میں تذکرہ ہوتا تھا کہ عنقریب فوجیں بغاوت کریں گی اور عوام ان سے مل کر فرنگی راج کا جوا اتار پھینکیں گے مائیں اپنے بچوں سے دعا کراتی تھیں کہ فرنگی جڑ بنیاد سے غارت ہو جائیں۔ مندروں اور مسجدوں میں بھی دعائیں ہوتی تھیں۔[۱] اگست ۱۸۵۵ء میں انگریزوں نے ایک خط پکڑا جو امیر کابل کے نام تھا۔ یہ خط لکھنؤ سے لکھا گیا تھا اور ان سے بغاوت کے لیے امداد کی امید ظاہر کی گئی تھی۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ خفیہ جماعتیں کافی عرصے پہلے سے سرگرم عمل تھیں۔

اودھ کو جبری طور پر ختم کرنے کے بعد واجد علی شاہ اور ان کے ہمراہی کلکتے بھیج دیے گئے تھے۔ وہاں ان کے وزیر علی نقی خاں ان تمام خطرناک اور خفیہ انقلابی سازشوں میں ہمہ تن مصروف تھے اور حیرت انگیز طور پر بنگالی افواج کو اکسا کر اس پر تیار کر رہے تھے کہ مقررہ وقت پر وہ ان کا ساتھ دیں۔ انھوں نے اپنے معتبر آدمی فقیروں اور سنیاسیوں کے بھیس میں سپاہیوں کے پاس بھیجے۔ فوج کے ہندوستانی افسروں کو جو خطوط انھوں نے لکھے، اُن میں اودھ کے جبری الحاق، بادشاہ کی تذلیل، بیگمات کی بے عزتی اور ملک میں انگریز کے ظلم و ستم کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا تھا کہ بہادر

---

[۱] فرانسیسی خاتون لکھتی ہے۔

"یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مسلمان اپنی مسجدوں میں اور ہندو مندروں میں دعا کرتے ہیں کہ ہندوستان میں سلاطین دگور گانیہ، مغلیہ کی اولاد میں سے کسی کا راج ہو، ہندوستان کے تمام ہندو مسلمانوں کا عقیدہ تھا کہ انگریزی حکومت سو سال سے زیادہ نہ رہے گی"۔ (ایامِ غدر)

سپاہی پھوٹ پھوٹ کر رو دیے[1]۔ انھوں نے گنگا جل اور قرآن پاک ہاتھ میں لے کر قسمیں کھائیں کہ وہ انگریز سامراج کو مٹائیں گے ——— یا خود مٹ جائیں گے

علی نقی خاں نے اس طرح بنگالی سپاہ کے دل جیت لیے۔ ان کے ایجنٹ فورٹ ولیم قلعے میں بھی خاموشی سے کام کر رہے تھے۔ بارک پور کے سپاہی مختلف رجمنٹوں سے خط و کتابت بھی کر رہے تھے۔[2]

ہزاروں فقیر، پنڈت، سادھو، اور سنیاسی ملک کے گوشے گوشے میں بغاوت کے بیج بونے کے لیے بھیس گئے تھے۔ باا ثر علماء نے جہاد کی اہمیت پر زور دیا۔ گاؤوں اور شہروں میں دورے کیے۔ تقریریں کیں۔ رضاکاروں نے گھر گھر جاکر چندہ کیا، فقیر اور سنیاسی زیادہ تر چھاؤنیوں کے قریب قیام کرتے اور سپاہی ان کے بے حد معتقد ہو جاتے تھے۔ اگر حکومت کی طرف سے شبہ کیا جاتا اور ان کو ہٹنے کا حکم ہوتا تو کسی سپاہی کے گھر جاکر بسیرا کر لیتے اور اپنا کام انجام دیتے تھے۔ (جیسا کہ میرٹھ میں ہوا)

مولانا احمد اللہ شاہؒ نے اسی طرح دورے کرنا شروع کیے۔ وہ ہزاروں کے مجمع میں بہ بانگِ دہل تقریر کرتے اور بتاتے تھے کہ وطن اور مذہب کو بچانے کا

---

1. Savarkar— 81

[2] انگریز مورخ کے نے کچھ خطوط بہ طور مثال نقل کیے ہیں ——— دوسکنڈ گرانڈیئر نے کہا کہ "پوری رجمنٹ نواب کا ساتھ دینے کو تیار ہے" ——— صوبے دار نے کہا کہ "وہ نواب اودھ سے مل جائیں گے" ——— صوبے دار مبارک خاں، اسرار خاں اور رام شاہی لال نے کہا کہ "کوئی شخص بھی ..... فرنگیوں کی برابر دغا باز نہیں ہو سکتا نواب سے ملک چھن گیا مگر اس کو پنشن تک بھی نہ ملی" ——— اس قسم کے بہت سے خطوط بعد میں انگریزوں کے ہاتھ لگے

صرف ایک ہی راستہ ہے — انگریزوں کا خاتمہ —! — انھوں نے لکھنؤ اور آگرے کے عوام میں جہاد کی آگ بھڑکا دی تھی۔ ادھر جگدیش پور کا ہیرو کنور سنگھ اپنے صوبے میں آنے والی جنگ کے لیے سامان فراہم کر رہا تھا۔ پٹنہ انقلابی سرگرمیوں کا گڑھ بن چکا تھا۔ عظیم آباد (پٹنہ) میں سید احمد صاحب شہید کے معتقد اور کارکن سرگرم کوششیں کر رہے تھے اور ہزاروں روپیہ اور آدمی بھرتی کر کے اپنے مرکز واقع صوبہ سرحد کی طرف روانہ کیے جا رہے تھے۔ حیدرآباد میں پوشیدہ جلسے شروع ہو گئے تھے۔ لکھنؤ میں بھی بغاوت کی خفیہ تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اودھ کے الحاق پر یہ سرگرمیاں، جن کا تفصیلی بیان اودھ کے حالات میں ہماری نظر سے گذرے گا اور بھی تیز ہو گئیں۔

انقلابی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں

اب ضرورت صرف یہ تھی کہ مختلف انقلابی جماعتوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا جائے۔ چناں چہ اس مقصد کے لیے معتبر پیام بر روانہ کیے گئے خفیہ زبان میں خطوط لکھے گئے اور جب کچھ عرصے بعد ان کو انگریزوں نے پکڑنا چاہا تو ایک ایسی زبان میں لکھے گئے جو مخصوص اشارات پر مشتمل تھی اور نکتوں اور ہندسوں سے لکھی جاتی تھی اور تمام موقعوں پر استعمال کی جاتی تھیں۔

چربی والے کارتوسوں کے واقعے کے بعد دو ماہ تک نواب اودھ کے نام سے پنجاب، مہاراشٹر، میرٹھ، انبالہ وغیرہ کی رجمنٹوں کو بارک پور سے خطوط بھیجے گئے۔ مارچ ۱۸۵۷ء میں نانا صاحب، ان کے بھائی بالا صاحب اور عظیم اللہ خاں نے مختلف مقامات کا دورہ کیا تاکہ انقلابی تحریکوں کو تیز کیا جائے اور متحدہ بغاوت کی تاریخ مقرر ہو سکے۔

انھوں نے پہلے دہلی کی طرف رخ کیا۔ حالات کا جائزہ لیا اور انبالے روانہ ہو گئے ۔
۸ راپریل کو بغاوت کے یہ رہ نما لکھنؤ پہنچے وہاں کے عوام میں ان کی آمد سے جوش و مسرت
کی لہر دوڑ گئی، اُسی دن ایک مشتعل ہجوم نے چیف کمشنر ہنری لارنس کی بگھی کو گھیر لیا اور
اس پر کیچڑ پتھر برسائے نانا صاحب اور عظیم اللہ خاں یہاں سے کالپی پہنچے اور آخر
اپریل تک اپنے مقام بٹھور واپس آگئے۔

ملک میں مختلف جگہوں پر ڈراموں، ناٹکوں اور گیتوں کے ذریعے بھی عوام کو
غلامی کا احساس دلایا گیا عورتوں میں انقلابی جذبات کا پرچار کرنے کے لیے خانہ بدوش
لڑکیاں بھیجی گئیں۔ ان سرگرمیوں میں بہت سے اعلیٰ و ادنیٰ سرکاری عہدہ دار بھی
شریک تھے مثلاً میرٹھ کے جج، ججوں نے کارتوسوں کے انکار پر سپاہ کو سزا کا فیصلہ سنایا
وہ تمام انقلابی تحریک سے وابستہ تھے اور یہی جج بغاوت کی اسکیم بنا رہے تھے[1] اسی
طرح بریلی میں خان بہادر خاں جو جوڈیشل آفیسر تھے، انقلابی جماعت کے روحِ رواں تھے
اس خفیہ جماعت کی طرف سے متفقہ طور پر ۳۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو اچانک بغاوت کی اسکیم
بنائی گئی تھی۔ مسٹر ولسن جو بعد میں اس تحقیقات پر مقرر کیا گیا اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے۔

"تمام ملک میں بہ یک وقت بغاوت کے لیے ۳۱ رمئی کا دن مقرر کیا گیا تھا۔ ہر رجمنٹ
میں ایک تین ممبروں کی کمیٹی تھی اور یہی کمیٹی بغاوت کے بارے میں تمام کام انجام
دیتی تمام اہم معاملات اور اسکیمیں طے کرتی، خط و کتابت کرتی تھی۔ سب نے متفقہ

---

1. Inne's Sepoy Revolt, p. 55
   Savarkar – 93

طور پر ۳۱ مئی کا دن مقرر کیا جو کہ اتوار کا دن تھا لہٰذا ان کو انگریز افسران کی زیادہ تعداد گرجا گھروں میں موجود ملتی جہاں ان کا قتل عام کیا جانا طے پایا تھا"

کنول کا پھول

بنگالی سپاہ کی چھاؤنی میں کنول کا ایک سرخ پھول ایک سے دوسرے کے پاس پہنچایا گیا جسے ایک شخص لے کر وہاں گیا تھا۔ جب یہ پھول باری باری ہر سپاہی کے پاس پہنچ چکا تو واپس اسی شخص کے پاس آگیا اور وہ اسے لے کر دوسری رجمنٹ میں چلا گیا۔ بنگال کی کوئی چھاؤنی اور فوجی پڑاؤ ایسا نہ تھا جہاں یہ پھول نہ پہنچا ہو یہ پھول پہلے رجمنٹ کے ہندوستانی افسر کے پاس پہنچتا تھا اور وہ اسے اپنے قریبی سپاہی کو دے دیتا تھا۔ اسی طرح پوری رجمنٹ میں گردش کرتا ہوا اگلی رجمنٹ میں جا پہنچتا[1]

سرخ پھول کی اس گردش نے جو بظاہر نہایت معمولی چیز تھی تمام سپاہیوں کو ایک پراسرار پیام دیا اور ان کو متحد کرتا چلا گیا۔

انگریز کے خلاف نفرت و انتقام کا پیالہ لبریز ہو گیا — اب چھلکنا چاہتا ہے — مدت سے پکتے پکتے اب یہ پھوڑا پھوٹنے کے قریب ہے — یہ آتش فشاں آگ اگلنے کو ہے۔ ملک کے غیرت مند سپوت سو سالہ انتقام لینے پر تلے ہوئے ہیں۔

---

1. NARRATIVE OF THE MUTINY BY SAVARKAR

مختلف بغاوتیں

بغاوت ۱۸۵۷ء کے حالات شروع کرنے سے پہلے اُن بغاوتوں پر بھی نظر ڈالنا ضروری ہے جو ۱۸۵۷ء سے قبل رونما ہوئیں، تاکہ اندازہ ہوسکے کہ ملک میں دورِ غلامی کی ابتدا سے لے کر ۱۸۵۷ء تک کبھی غیرت مند و زندہ انِ وطن نے انگریزی حکومت کے طوقِ غلامی کو بہ خوشی قبول نہیں کیا اور وہ برابر اس کے خلاف جد و جہد کرتے رہے، یہ اور بات ہے کہ ان کی کوششیں منظم نہ ہونے کی وجہ سے ہر بار ناکام ہوگئیں کیا عجب ہے کہ ان ہی ناکامیوں نے ان کو یہ احساس دلایا ہو کہ ملک گیر تنظیم کے بغیر کامیابی دشوار ہے اور جب تک تمام ہندوستان میں بہ یک وقت اور اچانک بغاوت نہ ہو غلامی کی زنجیریں نہیں کٹ سکتیں۔ تمام مختلف بغاوتوں کو تفصیل سے بیان کرنا دشوار ہے اس لیے ہم ان کے مختصر تذکرے ہی پر اکتفا کریں گے [1]

---

[1] تفصیلات کے لئے حسب ذیل کتابیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان ہی سے یہ حالات لیے گئے ہیں۔

1. Marshman : History of India
2. Chaudhri : Civil Disturbances...
3. Majumdar : Sepoy Mutiny

سب سے پہلے جنگِ بکسر کے بعد سپاہیوں نے دستور کے مطابق تنخواہ بڑھانے اور بھتہ دیے جانے کا عاجزانہ طور پر مطالبہ کیا مگر جواب نہ صرف نہایت ترش روئی سے ملا بلکہ چوبیس[۲۴] دیسی افسروں کو توپ سے اڑا دیا گیا۔ تقریباً اسی زمانے میں جب یورپین افسروں نے یہ مطالبہ کیا تو اُن کو معمولی سزا بھی نہیں دی گئی۔ ۱۷۶۳ء کے بعد سے ہر سال صوبہ بہار و بنگال میں ہندو مسلمان فقیروں اور سنیاسیوں کی مذہبی انجمنیں بغاوت کراتی تھیں، انھوں نے کئی بار پورے جنگی قواعد سے انگریزی فوجوں کا مقابلہ کیا اور شکست دی۔

مالابار وغیرہ

میسور کی دوسری جنگ کے بعد عہدنامے کی رو سے (۱۷۹۲ء) جب سلطان ٹیپوؒ کی سلطنت کا کچھ حصہ کمپنی کے قبضے میں آیا تو مالابار کے تقریباً تمام راجہ چھ سال تک انگریزوں سے جنگ کرتے رہے، خصوصاً کوٹایم کے راجہ کیرالا ورمانے جو عام طور پر پاچے راجہ بھی کہلاتا تھا اس بغاوت میں دوسرے سرداروں کے ساتھ مل کر نمایاں حصہ لیا، انگریزی دستوں سے متعدد بار جنگ ہوئی اور حالات انگریزوں کے لیے اس قدر خطرناک صورت اختیار کر گئے کہ ان کو راجہ سے نرم شرائط پر صلح کرنا پڑی۔ گنجام ضلع کی ایک بڑی جاگیرداری ریاست کمیڈی کے جاگیردار کو جب کمپنی نے خراج کی ادائیگی میں دیر ہونے کی وجہ سے گرفتار کیا تو وہاں ۱۷۹۸ء میں عام بغاوت پھیل گئی اور انگریزی اقتدار کو سخت خطرہ پیدا ہو گیا۔ گاؤں والوں نے اپنی جانیں دینا گوارا کیا مگر کمپنی کو لگان دینے سے انکار کر دیا بغاوت اگرچہ دبا دی گئی مگر ۱۸۳۴ء تک برابر خوفناک بغاوتیں بار بار ہوتی رہیں علاوہ ازیں چھوٹی چھوٹی بغاوتیں رنگ پور (۱۷۸۳ء)، بشنوپور (۱۷۸۹ء)،

گھاٹ میلارام اور بارا بھوم (۱۷۹۹ء) اور سلہٹ (۱۷۸۶ء) میں ہوتی رہیں۔ مالابار کے علاقے میں ۱۸۰۲ء میں پھر بغاوت ہوئی جو اگلے سال تک پورے صوبے میں پھیل گئی اور ۱۸۱۲ء تک ان شورشوں کا سلسلہ جاری رہا۔

میسور کی فتح کے بعد ایک مرہٹہ سردار دھونڈ یا واگ نے بغاوت کی اور اس قدر قوت جمع کرلی تھی کہ انگریزوں کے لیے انتہائی خطرہ بن گیا مگر ۱۸۰۰ء میں اس کو شکست ہوئی اور مار ڈالا گیا۔ مشہور انگریز مصنفوں کا خیال تھا کہ اگر وہ مارا نہ جاتا تو دوسرا حیدر علی ثابت ہوتا۔

آسام اور اڑیسہ

آسام پر انگریزی قبضہ ہونے کے بعد وہاں متعدد بغاوتیں ہوئیں۔ باغی سردار سنگ فو اور اس کے ساتھیوں نے ۱۸۳۰ء میں سادویا کے مقام پر حملہ کیا۔ اسی طرح ۱۸۳۵ء، ۱۸۳۹ء میں بھی بغاوتیں ہوئیں اور انگریزوں کو کافی نقصان پہنچا۔ ۱۸۴۹ء میں ناگاؤں نے بغاوت کی۔ اڑیسہ کے پائکوں (PAIKS) نے ۱۸۱۷ء میں بغاوت کی اور ایک فوج منظم کرلی۔ یہاں خردا (Khurda) کے راجہ کو نئے ٹیکسوں سے بڑا نقصان اٹھانا پڑا تھا چناں چہ باغیوں کی رہنمائی خردا کا سابق کمانڈر جگ بندھو کر رہا تھا جس کی سرکردگی میں یہ پائک متحد ہوکر اٹھے اور پہلے بان پور میں تمام سرکاری عمارتوں کو آگ لگادی، خزانہ لوٹ لیا، پولیس تھانوں پر حملہ کیا اور سَو کے قریب آدمی قتل کیے۔ رفتہ رفتہ تمام علاقہ انگریزوں کے خلاف ہتھیار لے کر کھڑا ہوگیا اور کچھ عرصے کے لیے اس علاقے میں انگریزی اقتدار کا چراغ گل ہوگیا۔ اسی طرح جب ایک مقام پوری میں بغاوت ہوئی تو کمپنی کی فوجیں پوری کو چھوڑ کر کٹک بھاگ گئیں اور نئے

دستے بھیجے گئے۔

دیگر مقامات پر

اوپر بیان کی گئی بغاوتوں کے علاوہ ملک کے دوسرے حصوں میں بے شمار چھوٹی بڑی بغاوتیں ہوتی رہیں۔ مثلاً بندیلکھنڈ پر انگریزی قبضے کے بعد (یعنی ۱۸۰۳ء کے بعد) اس علاقے کے تقریباً ڈیڑھ سو قلعہ داروں اور سرداروں خصوصاً اجے گڈھ اور کالنجر کے قلعہ داروں نے سخت بغاوت کی، اجے گڈھ کے سردار لکشمن راؤ کو جب قید کیا گیا تو اس نے درخواست کی کہ مجھے توپ سے اڑادو!۔

ٹراونکور میں ۱۸۰۴ء میں بغاوت ہوئی جس کا سبب ریاست کے اندرونی معاملات میں کمپنی کی بے جا دخل اندازی کہا جاتا ہے۔ اس میں تمیس گورے قتل ہوئے یہاں کے دیوان ویلوتامپی نے ۱۸۰۸ء میں ایک فوج جمع کر کے انگریزوں سے سخت مقابلے کیے۔ شکست کھانے پر اس نے ایک مندر میں پناہ لی اور وہیں خودکشی کر لی۔ سہارن پور کے گوجروں نے ۱۸۱۳ء میں بغاوت کی جسے جلد ہی دبا دیا گیا۔ بریلی میں ۱۸۱۶ء میں ایک خوں ریز بغاوت ہوئی جس میں ایک مقامی مقتدر عالم مفتی محمد عیوض نے جو پورے روہیلکھنڈ میں مقدس مانے جاتے تھے، خود حصہ لیا اور بغاوت کے حق میں فتویٰ بھی دیا۔ شورش کا فوری سبب ایک عورت تھی جو پولیس کے ہول ناک مظالم کا شکار رہی۔ اس جدوجہد میں خود مفتی محمد عیوض بھی زخمی ہو گئے ان کے زخمی ہو جانے سے حالات اور بھی خطرناک صورت اختیار کر گئے کیوں کہ نہ صرف بریلی بلکہ قرب و جوار کے مسلمان سخت مشتعل ہوئے اور ہزاروں کی تعداد میں مسلح آدمی پیلی بھیت، رام پور اور شاہ جہاں پور سے صرف دو دن کے اندر اندر بریلی پر چڑھ

آئے۔ ان کی تعداد تقریباً پندرہ ہزار تک بتائی جاتی ہے۔ ۲۱۔ اپریل ۱۸۱۶ء کو باغیوں نے ایک انگریز کو قتل کر دیا اور انگریزی دستوں کو جنگ میں شکست دی۔ مقامی فوج اور پولیس کی ناکامی کے بعد باہر سے برطانوی فوجوں نے آکر باغیوں کو شکست دی۔ ۱۸۱۵۔۱۸ء میں کاٹھیاواڑ، کچھ، بڑودہ کے علاقوں میں بغاوت کے آثار تھے اور یہاں انگریزوں کو نکالنے کی سازشیں ہو رہی تھیں۔ راؤ بھرمل ثانی کے عرب دستے سب سے زیادہ خطرے کا باعث بن گئے تھے۔

۱۸۱۹ء میں خاندیش کے بھیل بغاوت پر اٹھے۔ اس علاقے میں ۱۸۴۶ء تک کئی بار بغاوت ہوئی۔ ساحل کچھ سے مغربی ساحل تک ۱۸۲۴ء اور ۱۸۳۶ء میں زبردست بغاوت ہوئی۔ ضلع بیجاپور میں ایک برہمن دواکر ڈکشت نے اپنے ہمراہیوں کو جمع کر کے ۱۸۲۴ء میں ایک مقام سندگی کو جو بیجاپور سے چار میل جانب مشرق ہے لوٹا اور اپنی حکومت قایم کر لی۔ شیوالنگا کی موت پر جب کمپنی نے اس کے بے بالک بیٹے کو جانشین تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو ۱۸۲۴ء میں ریاست کٹور (KITTUR) میں زبردست بغاوت ہوئی جس میں انگریز قتل ہوئے اور باغیوں نے ریاست کی آزادی کا مطالبہ کیا، ان کو بعد میں شکست ہوئی لیکن آزادی حاصل کرنے کے لیے ۱۸۲۹ء میں یہاں پھر بغاوت ہوئی۔ ۱۸۲۶ء میں راموسس نے بغاوت کی اور دکھنی علاقوں میں جہاں کہ قحط پھیلا ہوا تھا یہ بغاوت تین سال تک رہی۔

شمالی کونکن (KONKAN) کے مقام ساونت وادی میں ۱۸۳۰ء ۳۲ء ۳۶ء میں کھلی بغاوتیں ہوئیں۔ ۴۴ء میں کولھاپور میں بغاوت ہوئی اور ریاست کے ولی عہد انا صاحب نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ باغیوں نے انگریزی فوج کے دیسی

افسران سے بھی ساز باز کرلی تھی اور جلد ہی آس پاس کے دیسی علاقوں میں بھی بغاوت پھیل گئی۔ اندھرا اسٹیٹ کے وزاگاپٹم ضلعے میں برا بھدرا روزے اور جگناتھ روزے نامی سرداروں نے ایک بغاوت کی رہ نمائی کی (۱۸۳۰ء تا ۱۸۳۲ء) اسی طرح پل کونڈہ میں ۱۸۳۱ء میں عام بغاوت ہوئی۔ ۱۸۴۰ء میں ایک برہمن نرسم دتا تریہ کی رہ نمائی میں کچھ عربوں نے نظام کے علاقے سے نکل کر قلعہ بادامی پر قبضہ کرلیا اور شہر میں قبضہ کرکے نرسم کی حکومت کا اعلان کیا۔ ضلع ساگر کے چند زمینداروں نے ۱۸۴۲ء میں بغاوت کی۔ اسی سال دکھنی علاقوں کے پالیگاروں نے مختلف مقامات مثلاً بیلاری، کڑاپا، اننت پور، اور ضلع کرنول وغیرہ میں اتنی زبردست بغاوتیں کیں کہ انگریز مورخوں نے بھی ان کو آزادی اور ملکی دفاع کے لیے جنگ کرنے پر خراج تحسین ادا کیا ہے۔ ۱۸۵۵ء میں سنتھالوں نے (بہار) بغاوت کی۔

فوجی شورشیں سب سے پہلے جنگ بکسر کے بعد فوجی بے چینی نمودار ہوئی، جس کا تذکرہ گذر چکا ہے۔ اس کے علاوہ جنگ برما کے موقعے پر بھی فوج میں بغاوت پھیلی۔ بارک پور کی ۴۷ رجمنٹ نے رنگون جانے کے لیے باربرداری کی مشکلات اور مہنگائی کے متعلق اپنی دشواریوں کو معقول طریقے سے پیش کیا مگر انگریز افسران نے اس کو سرکشی کی علامت سمجھا اور نہایت سخت جواب دیا گیا جس کے نتیجے میں برہمی پیدا ہوگئی۔ شورش دبانے کے لیے پریڈ کے میدان میں خفیہ طریقے سے توپ خانہ جمایا گیا، گورہ پلٹنیں کھڑی کی گئیں اور پھر ۴۷ رجمنٹ کو اچانک کھڑا کرکے گولہ باری کی گئی۔ دوسری طرف سے گورہ فوج نے نشانہ بازی کی اور بھاگتے ہوئے سپاہیوں پر ان "بہادروں" نے تیغ آزمائی کے "جوہر" دکھائے، بہت سوں کو گرفتار کرکے پھانسی دی گئی اور بعض کو

بیڑیاں پہنا کر ذلیل طریقے سے سڑکوں پر کام کرایا گیا۔

۱۸۴۳ء میں بنگال کی چار رجمنٹوں نے بغاوت کی جن کو سندھ غصب کرنے کے بعد بھتہ دینے سے انکار کر دیا گیا جو کہ ہمیشہ ان کو دیا جاتا تھا۔ مارش مین لکھتا ہے۔

"الحاق سندھ کا خدائی انتقام بھی ساتھ ہی ساتھ نازل ہوا۔ اس سے دیسی فوجوں کی وفاداری اور اطاعت شعاری میں بڑا فرق پڑ گیا اور اُس بغاوت کی داغ بیل پڑ گئی جس نے تیرہ سال بعد تمام دیسی فوجوں کا صفایا کر کے رکھ دیا"۔[1]

یہ بھتہ بند ہو جانے پر سپاہ میں زبردست ناراضگی پھیلی۔ فروری ۱۸۴۴ء میں ۳۴ پلٹن نے سندھ جانے سے صاف انکار کر دیا۔ بنگالی رسالے اور توپ خانے نے بھی ایسا ہی کیا۔ دو پلٹنوں نے فیروز پور پہنچ کر کشتی پر سوار ہونے سے انکار کر دیا اور ۶۴ رجمنٹ نے لدھیانہ کی اور شکار پور میں بغاوت کی۔ جب مدراسی فوجوں کو سندھ جانے کا حکم ملا تو اس نے بھی انکار کر دیا۔ غرض یہ کہ ہندوستانی سپاہیوں میں بددلی اور ناراضگی کی لہر دوڑ چکی تھی اور بقول مارش مین۔

"ان کی سمجھ میں یہ انصاف و قاعدہ کسی طرح نہیں آتا تھا کہ ان کا بھتہ صرف اس لیے بند کر دیا جائے کہ انھوں نے اپنے آقاؤں کی سلطنت میں ایک نئی مملکت کا اضافہ کر دیا تھا"۔

اس قسم کی شورشیں متعدد بار ہوئیں مگر صرف فوج تک محدود رہیں اور جلد ہی کچل دی گئیں۔ ۱۸۴۰ء سے ۱۸۵۶ء تک کئی بار فوج میں بے چینی کے آثار پیدا ہوئے اور بعض جگہ شورشیں

1. Marshman, p. 436

بھی ہوئیں۔ نیپئر کے اندازے کے مطابق پنجاب کی پوری دیسی فوج میں ۱۸۵۰ء ہی میں بغاوت کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

ویلور کی بغاوت

ویلور کی بغاوت اس لیے اہم ہے کہ اس کو ۱۸۵۷ء کا ریہرسل یا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ ویلور میں جو مدراس میں واقع ہے سلطان ٹیپو رح کے خاندان کو نظر بند کیا گیا اور بغاوت پھیلانے کا الزام ان ہی کے سر لگا کر ان کو کلکتے میں نظر بند کر دیا گیا۔ بغاوت کی وجہ دراصل وہ اصلاحات تھیں جو فوج میں رائج کی گئیں۔ اور جن کی رو سے داڑھی کو خاص طریقے سے چھانٹنے کا حکم ہوا، قشقہ لگانا ممنوع ہو گیا اور ایک انگریزی طرز کی پگڑی کا زبردستی استعمال کرایا گیا۔ ان بے جا دست درازیوں سے ہندوستانی سپاہیوں کے، جن میں اکثر مسلمان تھے، جذبات مشتعل ہو گئے اور انھوں نے ۱۰ر جولائی ۱۸۰۶ء کو دن کے دس بجے تقریباً دو سو گوروں کو ہلاک و زخمی کر ڈالا۔ مارش مین اس بغاوت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

> "مسلمانوں نے جو اس ٹوپی کے خاص طور سے مخالف تھے سپاہیوں میں یہ خیال بڑے اہتمام سے پھیلانا شروع کیا کہ یہ نئی وضع کی پگڑی اُن سب کو زبردستی عیسائی بنانے کی کارروائی کا پیش خیمہ ہے۔"[1]

اس بغاوت کو بھی باقاعدہ منظم کرنے کی کوشش کی گئی تھی چناں چہ چپاتیاں بھی اس موقعے پر تقسیم ہوئیں مگر یہ خالص فوجی بغاوت رہی اور بہت جلد سختی سے دبا دی گئی۔ اتنا ضرور ہوا کہ ملک میں عیسائی پادری جو اُدھم مچا رہے تھے وہ اچانک دھیما پڑ گیا لیکن چند ہی سال

1. Marshman, p. 286

بعد پھر بے لگام کر دیے گئے۔ پلاسی کی جنگ کو پچاس سال بیت چکے تھے۔

شورش کے آثار

۱۸۵۷ء کا انقلابی سال شروع ہوا تو ملک گیر شورش کے آثار نظر آنے لگے، مختلف حصوں میں آگ لگنے کی وارداتیں ہونے لگیں، انگریزوں کے بنگلوں میں، گورے افسران کی کوٹھیوں میں، اور سرکاری دفتروں میں —— سب سے پہلے ۲۳ر جنوری ۱۸۵۷ء کو چھاؤنی رانی گنج میں آگ لگی، دو تین دن بعد میجر کا بنگلہ جل اٹھا۔ ۲۵ر کو دفتر تار برقی (ٹیلی گراف آفس) خاک ہوگیا —— اس آگ کی روشنی ملک کے دوسرے حصوں کے لیے مشعلِ راہ بن گئی۔ اب مختلف مقامات پر یہی ہونے لگا، انبالے میں، دہلی کے مضافات میں اور دوسری جگہوں پر —— ! ۔ مگر حکومت اپنی تمام جاں نشانی کے باوجود "مجرموں" کا پتہ لگانے میں ناکام رہی۔

اسی زمانے میں چکنے کارتوسوں کا واقعہ پیش آیا جس نے اس بارود میں شتابہ لگا دیا اور جسے ہم تفصیل کے ساتھ اگلے صفحات میں پڑھیں گے۔

سلگتی آگ پر تیل

منگل پانڈے

چکنے کارتوس

جب عیسائی پادریوں کے جبر و تشدد سے کام نہ بنا تو ہندوستانی فوجیوں کا مذہب خراب کرنے کے لیے نئے کارتوس ایجاد ہوئے جن میں گائے اور سُور کی چربی استعمال کی گئی، ان کو دانتوں سے کاٹنے کا حکم ہوا سپاہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ ان کارتوسوں کو کاٹیں۔ آج تک انگریز مورخین دنیا کی آنکھوں میں یہ دھول جھونکتے چلے آئے ہیں کہ کارتوسوں میں چربی کی افواہ غلط تھی اور یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی" —— مگر حقیقت کو دنیا کی نظروں سے زیادہ دیر پوشیدہ نہ رکھ سکے۔ آیئے سرسری طور پر دیکھیں۔

انگریزی فوجوں کے سپہ سالار انسن (ANSON) نے لارڈ کننگ کو لکھا۔

"کارتوسوں کا معائنہ کرنے کے بعد مجھے سپاہیوں کے اعتراضات پر مطلقاً حیرت نہیں ہوئی ..... میری رائے میں ان کارتوسوں کے استعمال سے

سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو ناقابل یقین طریقے سے ٹھکرا دیا گیا ہے"۔

گائے اور سُور کی چربی!

"تاریخ عہد انگلیشیہ" کا مصنف لکھتا ہے۔

"اگرچہ اس میں سؤر کی چربی نہ تھی مگر گائے کی ضرور تھی"۔ (ص ۲۱۴)

یہ حقیقت اس وقت سے نہیں بلکہ ۱۸۵۲ء سے حکومت کے علم میں تھی۔ انگریز مورخ نے اپنی کتاب میں لکھتا ہے۔

"دسمبر ۱۸۵۳ء میں کرنل ٹکر نے یہ بات بالکل صاف طور پر گورنمنٹ رپورٹ میں بیان کردی تھی"۔ (۳۸۰)

چربی کی سپلائی کے ٹھیکے دار نے اسی زمانے میں اپنے معاہدے میں صاف الفاظ میں یہ بات ظاہر کی تھی۔ معاہدہ یہ تھا کہ کارتوس چربی سے چکنے کیے جائیں گے اور گائے کی چربی دو پنس فی پونڈ کے حساب سے خریدی جائے گی۔ جب یہ اسکیم لوگوں پر ظاہر ہونے لگی تو حکومت نے فوراً یہ احکام جاری کیے کہ آیندہ گائے اور سؤر کی چربی استعمال نہ کی جائے۔ ان احکامات سے اگر کچھ ظاہر ہوتا ہے تو یہی کہ اب تک یہ چربی استعمال ہوتی رہی ہے۔ ایک انگریز فورسٹ نے سرکاری دستاویزیں شایع کیں، اُن سے یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہوگئی کہ کارتوسوں میں استعمال کی جانے والی چکنائی دراصل گائے اور سؤر کی چربی ملاکر (MIXEP) استعمال کی جاتی تھی۔[1] رابرٹس کہتا ہے۔

"مسٹر فورسٹ کی حالیہ تحقیقات سے ثابت ہوگیا ہے کہ کارتوس چکنانے کے لیے

---

1. Savarkar p. 65,

جو کمیچر استعمال کیا گیا وہ واقعی قابلِ اعتراض اشیا (یعنی گائے اور سور کی چربی) سے بنایا گیا تھا اور اس سے سپاہیوں کے مذاہب کی حیرت انگیز طور پر توہین ہوتی تھی۔ ان کارتوسوں کے چلانے میں مذہبی تعصب سے کام لیا گیا تھا۔"[1]

راز کھلتا ہے

یہ کارتوس ۱۸۵۷ء کے ابتدائی ایام ہی میں رائج ہو گئے تھے اور ڈم ڈم میں ان کی تیاری کا کارخانہ قایم ہوا۔ ایک دن اس کارخانے کا ملازم ایک برہمن سپاہی سے ملا۔ پانی پینے کو مانگا، جس پر برہمن سپاہی نے اس کی ذات پوچھی، کارخانے کے ملازم نے کہا ـــــ "ذات کیا پوچھتے ہو، کچھ دن بعد تمھاری ذات بھی نہ رہے گی کیوں کہ اب نئے کارتوس کاٹنا پڑیں گے جن میں گائے اور سور کی چربی استعمال ہوئی ہے" ـــــ یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیلی اور سپاہ نے طے کرلیا کہ وہ یہ کارتوس استعمال کرکے اپنا مذہب خراب نہ کریں گے، چناں چہ جنوری ۱۸۵۷ء ہی میں تربیت گاہ کے سپاہیوں نے انھیں استعمال کرنے سے انکار کردیا۔

کارتوس نہیں لیں گے۔!

۲۶ فروری کو برہام پور کی رجمنٹ ۱۹ نے کارتوس لینے میں پس و پیش کیا اور اپنا شبہ ظاہر کیا۔ پھر ایک عرضی کلکتہ ڈویژن کے میجر جنرل کو بھیجی جس میں اپنے ان خیالات کا عاجزانہ اظہار کیا۔ مگر انگریز افسروں کے دماغ غرور و نخوت سے بھرپور رہتے، انھوں نے حکم دیا کہ کارتوس نہ کاٹو گے تو سخت سزا دی جائے گی۔ ۱۹ رجمنٹ نے (جس کو علی نقی خاں کے آدمیوں نے

---

1. "Forty Years in India" p. 431
   Savarkar

تمام حالات بتا کر انقلابی بنا دیا تھا) صاف صاف اعلان کر دیا کہ وہ نہ صرف یہ کہ کارتوس
استعمال نہیں کرے گی بلکہ ضرورت پڑی تو اپنی تلواریں بھی بے نیام کر دے گی۔ انگریز
افسر اس غیر متوقع اعلان پر خوف زدہ ہو کر خاموش ہو گئے اور یہ اعلانات کرنے لگے کہ اب
کارتوس کاٹنا نہیں پڑیں گے اور بجائے چربی کے گھی استعمال کیا جائے گا مگر اندر ہی
اندر سپاہیوں کو اس انکار کی سزا دینے کے لیے تیاریاں ہونے لگیں۔ برما سے ایک
انگریز رجمنٹ بلائی گئی اور اب ۱۹ رجمنٹ کو سزا دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ ۲۱ مارچ کو وہ
بارک پور پہنچی۔ ۲۷ کو سزا کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ چناں چہ ان کے ہتھیار چھین لیے گئے اور
برطرفی کا حکم ہوا۔ مگر بارک پور کی غیرت مند رجمنٹ کے لیے یہ برداشت کرنا ناممکن تھا
کہ ان کے ہم وطن اس طرح ذلیل کیے جائیں۔

منگل پانڈے کی سرفروشی

بارک پور رجمنٹ کے ایک بہادر سپاہی
منگل پانڈے کے دل میں جوشِ انتقام کی
آگ بھڑک اٹھی —— کھولتا ہوا خون بے قابو ہو کر ابل پڑا —— اس نے اپنے
ساتھیوں پر زور ڈالا کہ بغاوت آج ہی شروع کر دی جائے مگر جب انقلابی جماعت
کے لیڈر اور سپاہی مقررہ وقت سے پہلے بغاوت پر تیار نہ ہوئے تو وہ جذبات سے
بے قابو ہو کر خود ہی تلوار اور بندوق سنبھال کر میدان میں آیا —— "اٹھو بھائیو!
—— اٹھو" — اس نے پکار کر کہا —— "دیش کی آزادی کے لیے آگے بڑھو اور
دغا باز دشمن پر حملہ کرو — !" — سارجنٹ میجر نے اس کی گرفتاری کا حکم دیا مگر کوئی
بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ اور منگل پانڈے کی ایک ہی گولی نے میجر کا خاتمہ کر دیا —— یہ
سن کر لفٹیننٹ آیا۔ منگل پانڈے کی گولی اس کے گھوڑے کے لگی اور وہ مع گھوڑے

کے پیچھے آرہا۔ پانڈے اپنی بندوق دوبارہ بھر ہی رہا تھا کہ لفٹینٹ نے اٹھ کر پستول اس کی طرف کرکے فائر کیا مگر نشانہ چوک گیا۔ منگل نے پھرتی سے تلوار کھینچ لی۔ لفٹینٹ نے بھی تلوار نکالی مگر منگل کی تلوار اس کا خاتمہ کرچکی تھی —— ایک اور گورہ افسر منگل پانڈے پر حملہ کرنے بڑھا ہی تھا کہ ایک سپاہی نے اپنی بندوق کی نالی سے اس کے سر کے پرخچے اڑادیے —— شور بلند ہوا ——

"منگل پانڈے کو ہاتھ نہ لگاؤ"

فوراً ہی کرنل ڈیکر آیا —— "گرفتار کرلو اس خبیث باغی کو ——!"

"ہم اس مقدس برہمن کا بال بھی بیکا نہیں کریں گے" —— سپاہیوں کا خون بھی کھولنے لگا تھا۔ کرنل ڈیکر خاموش ہوکر جنرل کے پاس چلا گیا۔ پانڈے خون آلود تلوار اور بندوق لیے برابر چلا رہا تھا۔

"اٹھو بھائیو —! — اٹھو! —— دیش کی آزادی کے لیے —— دین کی حفاظت لیے ——!"

کچھ دیر بعد جنرل ہیرسی چند گوروں کے ساتھ آیا جب سپاہی اس کے حکم سے بھی گرفتار کرنے کے لیے نہ بڑھے تو وہ خود آگے بڑھا اور گارڈ والوں اور جمع دار کو ساتھ لے کر آنے کا حکم دیا۔ مگر کوئی ہلا بھی نہیں۔ جب جنرل نے تیسری بار چراغ پا ہوکر حکم دیا تب وہ اس کے ساتھ روانہ ہوئے مگر منگل پانڈے نے ان کو اپنی طرف آتا دیکھ کر بندوق کا رخ اپنی طرف کرلیا — موت بہتر تھی دشمن کے ناپاک ہاتھوں میں جانے کے مقابلے میں —— اس کا زخمی جسم زمین پر گر پڑا۔ انگریز افسران بہادری اور بے خوفی کی یہ حیرت انگیز مثال دیکھ کر حیران رہ گئے —— منگل پانڈے پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس پر زور ڈالا گیا کہ وہ خفیہ

انقلابی جماعت کے راز اور سازش کرنے والوں کے نام بتلا دے مگر اس بہادر نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ اسے مقتول انگریزی افسروں سے کوئی ذاتی عداوت نہیں تھی ۔۔۔۔ پھانسی کا حکم ہوا۔ مگر پورے بارک پور میں ادنیٰ سے ادنیٰ شخص بھی اسے پھانسی دینے کے لیے نہ مل سکا مجبوراً کلکتے سے چار جلاّد بلائے گئے اور ۸ر اپریل ۱۸۵۷ء کی صبح کو (یعنی آج کے دن جب کہ یہ سطور لکھی جا رہی ہیں ۸ر اپریل ۱۹۵۷ء) اس کو سپاہیوں کے سامنے لا کر پھانسی دے دی گئی۔ پھانسی کے تختے پر بھی اُس بہادر نے یہی کہا کہ وہ خفیہ جماعت کے لیڈروں کے نام ہرگز نہ بتائے گا ۔۔۔۔ آفریں ہے منگل پانڈے کی بہادری اور جرات پر ۔۔۔۔ انگریز مورخ چارلس بال لکھتا ہے کہ ۔۔۔۔ ہندوستان بھر کے باغی اس کا نام بڑی عزت سے لیتے تھے"۔[1]

اب منگل پانڈے کے ساتھیوں کی باری آئی۔ ۳۴۔ رجمنٹ کے بہت سے سپاہی گرفتار کیے گئے جنھوں نے احکام کی تعمیل میں کوتاہی کی تھی مگر انگریز لفٹیننٹ پر گولی چلانے والا سپاہی قید سے فرار ہو گیا۔ جمع دار ایشری سنگھ کو جس نے منگل پانڈے کو گرفتار کرنے اور پہرے میں رکھنے سے انکار کیا تھا ۲۱ر اپریل کو پھانسی دی گئی اور اسی طرح دوسرے سپاہیوں کو ہولناک سزائیں ملیں۔

نئے کارتوسوں کی خبریں اب پنجاب تک جا پہنچی تھیں کیوں کہ بارک پور کے سپاہی تمام ملکوں کی رجمنٹوں سے خفیہ خط و کتابت کر رہے تھے اور ان کو ہدایت کر رہے تھے کہ وہ نئے کارتوس لے کر اپنا مذہب خراب نہ کریں۔ افواہ تھی کہ لارڈ کیننگ یہ وعدہ

---

1. Savarkar

کر کے آیا ہے کہ تمام ہندوستان کو تین سال میں عیسائی بنا دے گا۔ ماہ مارچ میں یہ افواہ بھی تیزی سے گشت کر رہی تھی کہ سرکاری حکم سے گائے اور سور کی ہڈیاں پیس کر آٹے میں ملا دی گئی ہیں اور وہ فروخت کیا جا رہا ہے یہ خیال اس وجہ سے اور بھی پختہ ہو گیا کہ اِس آٹے کا بھاؤ پہلے سے کافی سستا تھا۔

جذبۂ بغاوت

۱۹ رجمنٹ کے سپاہی بھی جذبۂ بغاوت سے سرشار تھے چناں چہ ان کو بھی ۳۴ رجمنٹ کے باغیوں کی طرح ہتھیار چھین کر برخاست کر دیا گیا۔ جب انگریز افسروں نے ان سے کہا کہ وہ اپنی وردی وغیرہ واپس کر دیں اور ٹوپیاں جو کہ وہ اپنے پاس سے خریدا کرتے تھے رہنے دیں کیوں کہ یہ اُن ہی کی ملکیت ہے تو پُرجوش سپاہیوں نے نہ صرف یہ وردیاں اتار اتار کر پھینک دیں بلکہ تمام ٹوپیاں بھی حقارت سے ہوا میں اچھال دی گئیں اور ان کو پاؤں سے رَوند ڈالا گیا۔ سپاہی "آزاد" ہو کر اشنان کرنے دریا کی طرف چلے گئے —— اس دوران میں ملک کے مختلف حصوں میں آگ لگنے کی وارداتیں بھی ہونے لگیں۔ ۱۶ اپریل کو انبالے میں ہسپتال اور پھر شراب کا گودام جل کر راکھ ہو گیا۔ اس کے چند روز کے اندر اندر متعدد عمارتیں نذرِ آتش ہو گئیں۔ یہاں انگریز کمانڈر انچیف انسن رہتا تھا مگر باوجود کوشش کے بھی آگ لگانے والوں کا پتہ نہ چل سکا۔ مجبور ہو کر کمانڈر انچیف نے گورنر جنرل کیننگ کو توجہ دلائی اور آخر اپریل میں پھر لکھا کہ ہم ابھی تک مجرموں کا پتا لگانے میں ناکام ہیں۔ اپریل کے آخر تک ملک کے دوسرے شہروں۔ دہلی، لکھنؤ، میرٹھ، وغیرہ میں بھی سرکاری عمارتیں نذرِ آتش ہونے لگیں۔ انبالے کی طرح لکھنؤ کے تمام سپاہیوں نے بھی یکم مئی ۱۸۵۷ء کو کارتوس کاٹنے سے انکار کر دیا۔ ان کے چہروں پر ترش روئی کے

آثار تھے تاہم وہ بالکل پُرسکون تھے آخر کار انگریز افسروں کے سمجھانے بجھانے سے وہ کارتوس کاٹنے پر تیار ہو گئے مگر انگریز بریگیڈیر پر بھوت سوار تھا۔ سپاہی بغاوت کریں یا نہ کریں، وہ "انگریزی نادر شاہی" دکھانا ضروری سمجھتا تھا چناں چہ آٹھ بجے وہ پریڈ پر بلائے گئے۔ ان کو چاروں طرف سے مسلح گورہ فوج نے آکر گھیر لیا اور ان کے سامنے توپ خانہ نصب ہوا۔ ان پر گولہ باری کے لیے مہتابیں روشن کی گئیں۔ یہ دیکھ کر اُن میں سے زیادہ تر سپاہی جان بچانے کے لیے بھاگے تو "بہادر" گوروں نے ان کا پیچھا کیا۔

---

[1] کنہیا لال: محاربہ عظیم / ۳۷ - ۴۲

”یہ عوامی جنگ ہے اور ہندوستان کی کسی بھی
جنگ میں آج تک عوام کی اتنی کثیر تعداد نے حصّہ
نہیں لیا۔ . . . . لیکن ایک بات کا ہمیں
یقین ہے اور وہ یہ کہ خواہ بغاوت دبائی جائے یا
نہ دبائی جائے لیکن یہ ہندوستان ہمارے ہاتھ
سے نکل جانے کی پیش رو نقیب ہے“

—————— ارنسٹ جونس

۱۸۵۷ء
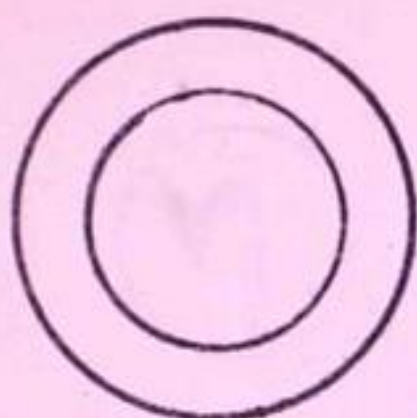
آزادی کے دیوانوں کی پہلی طوفانی قربانی

منزل روشن، راہیں دھندلی، تدبیریں جانی آنجانی

سینے پر زخم محکومی، اس پر بھی اونچی پیشانی

ایک عبادت کیش بغاوت، ایک مقدس نافرمانی

آزادی کی پہلی دھڑکن

سن اٹھارہ سو ستاون

میرٹھ

اچانک اور قبل از وقت

انقلابی لیڈروں اور کارکنوں نے متحدہ بغاوت کی اسکیم بنائی تھی اور اس کے لیے ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کی شام مقرر کی تھی مگر میرٹھ میں تاریخ مقررہ سے پہلے بغاوت پھوٹ پڑی اور اس طرح تمام بنی بنائی اسکیم ملیامیٹ ہو کر رہ گئی۔ اس سے جو نقصان پہنچا وہ تو آئندہ صفحات پر ظاہر ہوگا۔ یہاں صرف واقعات کا بیان مقصود ہے۔

۲۳ اپریل سے میرٹھ میں آگ لگنے کی وارداتیں شروع ہو گئی تھیں چناں چہ ۲۳ کو اسمتھ کے خیمے اور اسپتال میں آگ لگی اور ۲۴ کو ہندوستانی سپاہ نے نئے کارتوس لینے سے انکار کیا۔ نگران کے اس عاجزانہ اعتراض نے انگریز افسران کو چراغ پا کر دیا۔ ۶ مئی کو وہ پھر جمع کیے گئے، گورہ فوج مسلح ہو کر کھڑی ہوئی، توپ خانہ جمایا گیا اور حکم صادر ہوا کہ ــــ "کارتوس کاٹنا پڑیں گے" ــــ ہندوستانی افسروں نے معذرت کی کہ سرکار معاف فرمایئے مگر پھر وہی حکم صادر ہوا ــ پھر عاجزانہ انکار تھا ــــ حکم پھر دیا گیا، سپاہی کارتوس چھونے کو بھی تیار نہ تھے۔ لہٰذا ہتھیار لے لیے گئے گھوڑوں سے اتار دیا گیا۔ نوّے میں سے پچاشی ہندوستانی فوجی افسران جو کارتوس

چھونے سے انکاری تھے چھاؤنی: بھیج دیے گئے اور کورٹ مارشل شروع ہوا۔ اس دوران میں روزانہ رات کو سرکاری دفتروں اور فوجی عمارتوں میں آگ لگنے کی وارداتیں (۹ مئی تک) ہوتی رہیں۔ فوجیوں میں روز مشورے بھی ہوتے تھے: صدر بازار کے عوام بھی ان کے شریک تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مشورے کالی پلٹن کے مندر اور شاہ پیر صاحب کے مقبرے میں ہوتے تھے۔

۹ مئی فیصلے کا دن تھا۔ چناں چہ اِس دن صبح کو "ملزموں" کو پریڈ پر لایا گیا، تمام ہندوستانی فوج جمع کی گئی —— فیصلہ، جو بلند آواز سے سنایا گیا، یہ تھا کہ دس دس سال قید سخت —— اور اس کے بعد ان ہی پچاسی افسران کی، جو اپنی فوج کی ناک سمجھے جاتے تھے، وردیاں پیچھے سے پھاڑ دی گئیں، فوجی سنگینوں کے پہرے میں اور تمام سپاہیوں کے سامنے نہایت حقارت سے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈال دی گئیں اور ان کے فوجی نشانات چھین لیے گئے۔ اس طرح ذلیل کر کے ان کو جیل بھیجا گیا، انھوں نے گڑگڑا کر رحم کی درخواست کی، مارش مین کہتا ہے۔

"ان میں سے بعض تو تمام فوج کی ناک تھے اور کئی کئی معرکوں میں سلطنت کی خدمات انجام دے چکے تھے انھوں نے جنرل سے رحم کی درخواست کی کہ اس ذلت سے معافی دی جائے اب سپاہیوں کے دل میں فقط اپنی ذات بگڑنے کا ہی وسوسہ نہیں رہا تھا بلکہ اس کے ساتھ ہی غصے کی آگ بھی یہ دیکھ کر بھڑک اٹھی تھی کہ اُن کے بیڑے والوں کو بدمعاشوں کی طرح جیل میں بھیج دیا گیا۔"[1]

---

1. Marshman p. 295

ہندوستانی سپاہی چپ چاپ یہ تماشا دیکھتے اور پیچ و تاب کھاتے رہے۔ کر بھی کیا سکتے تھے ــــ گورہ فوج کی سنگینیں گھیرے ہوئے تھیں اور توپ خانہ سامنے ــــ مگر جب وہ اپنے گھروں پر پہنچے تو عورتوں کا جذبہ غیرت ابل پڑا۔

"تم مرد ہو؟ تم سے تو ہم عورتیں اچھی ۔ تم کو شرم نہیں آتی کہ تمھارے سامنے تمھارے افسران کے ہتھکڑیاں پڑیں اور تم کھڑے دیکھا کیے ــــ تم سے کچھ نہ ہوسکا ــــ!! لو یہ چوڑیاں پہن لو اور ہتھیار ہمیں دو۔ ہم افسران کو چھڑائیں گے" [۱]

کون تھا جس کا ضمیر طعن و تشنیع کے یہ تیر کھا کر بیدار نہ ہوتا۔ کون تھا جس کا خون صنف نازک کے یہ جملے سن کر نہ کھولتا ــــ ماؤں نے اپنے بیٹوں کو، دلہنوں نے اپنے شوہروں کو اور بہنوں نے بھائیوں کو انگریزی فوجوں سے لڑنے پر آمادہ کیا۔ صدر بازار کی طوائفوں نے ان فوجیوں کو غیرت دلائی جو شام کو تفریح کی غرض سے جاتے تھے [۲]

تمام رات سپاہیوں میں خفیہ مشورے ہوتے اور فوراً بغاوت کا پروگرام بنایا گیا رجمنٹ نمبر ۲۰ کا اصرار تھا کہ انگریزوں کا قتل عام ہو مگر باقی سپاہی اس کے حق میں نہ تھے رات ان ہی بحثوں میں بیت گئی ــــ دہلی کو آدمی روانہ کر دیے گئے کہ ہم ۱۱ مئی کو پہنچیں گے اگلے دن ۱۰ مئی کو اتوار تھا۔ افواہ تھی کہ اب باقی سپاہیوں کا بھی یہی حشر ہوگا۔ شہر میں اشتہارات بھی چسپاں ہوئے۔

دس مئی

دس مئی کی صبح آگئی۔ انگریز اطمینان سے اتوار منا رہے تھے۔ شام کو گرجوں کی گھنٹیاں بجیں، تمام افسران اور دیگر انگریز جمع ہوگئے۔

---

[۱] "داستان غدر" [۲] "باغی میرٹھ" ص ۲۵

اگر ہندوستانی سپاہی اس وقت گرجے پر حملہ آور ہوتے تو ان انگریز افسران کی بوٹیاں بھی ہاتھ نہ آتیں مگر انقلابی سپاہیوں کا یہ مقصد نہ تھا۔ اس لیے وہ جیل کی طرف گئے اور اپنے پچاسی افسران کو آزاد کرالیا۔ یہاں بھی وہ جیل کے افسران سے کچھ نہ بولے، نہ ستایا، نہ ہاتھ اٹھایا[۵] ——— کیا یہ ان کی بہادری اور نیک دلی کا کھلا مظاہرہ نہیں تھا ——— ؟

گرجا کی عبادت ختم ہوئی اور گورہ فوج پریڈ پر جمع ہونے لگی۔ انقلابی سپاہیوں نے یہ دیکھ کر کہ گورہ فوج ان کے مقابلے کی تیاری کر رہی ہے اپنی چھاؤنی میں آگ لگا دی۔ کرنل فنس جو ابھی تک غرور و نخوت سے سرشار تھا یہ ہنگامہ دیکھ کر سپاہیوں کے پاس آیا اور نہایت پُرغرور انداز میں دھمکیاں دینے لگا۔ سپاہیوں نے کہا ——" ہمارے سامنے سے چلے جاؤ" ——— مگر کرنل فنس طاقت و حکومت کے نشے میں چور تھا، چنانچہ اور بھی پُرغرور لہجے میں دھمکانے لگا رجمنٹ ۲۰ تو پہلے ہی قتل عام کی حامی تھی اسی رجمنٹ کی ایک سپاہی کی گولی نے فنس (FINN) کا گھمنڈ خاک میں ملا دیا۔

"مارو فرنگی کو!"

اب تو ہر طرف سے یہی آواز آتی تھی کہ " مارو فرنگی کو " چنانچہ فرنگی کو چُن چُن کر مارا گیا، شہر میں ہنگامہ برپا ہو گیا شہری و دیہاتی عوام بھی اپنے ٹوٹے پھوٹے ہتھیار لے کر ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے۔ ہیوگف لکھتا ہے۔

" شہروں اور دیہاتوں کے کھیتوں سے بے شمار ہندو مسلمان نکل کر آ گئے

---

[۵] " دہلی کی جانکنی " / ۲۰

تھے اور انگریزوں کے ساتھ درندوں کا سا کام کر رہے تھے"۔ ؎

انگریزوں کے مکانات راکھ کا ڈھیر ہو گئے۔ گورہ فوج نے انقلابیوں پر گولہ باری کی، رات بھر مقابلہ ہوتا رہا باغی سپاہی اور شہر کے عوام جوش و غصے سے بے قابو ہو چکے تھے۔ صرف ایک ہی آواز تھی جوان کے کھولتے ہوئے خون کی ترجمانی کر رہی تھی ــــ "مارو فرنگی کو" ــــ دہلی اور میرٹھ کے درمیان ٹیلی گراف کے تار کاٹ دیئے گئے ریلوے لائنوں پر پہرہ بٹھا دیا گیا۔ تقریباً تمام انگریزی افسران مع ظروور کے خاک میں ملا دیے گئے۔

میرٹھ کے عوام تو یہاں انگریز سے تلو سالہ انتقام لیتے رہے اور باغی فوج اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق رات ہی میں دہلی کی طرف مارچ کرنے لگی۔ وہ مختلف راستوں سے روانہ ہوئے اور ایک طے شدہ مقام پر مل گئے تاکہ انگریزی فوجیں مقابلہ نہ کر سکیں، اُن کی مختلف پیدل و سوار ٹولیاں یکے بعد دیگرے دہلی کی طرف روانہ ہونے لگیں ــــ اب چاندنی رات میں انقلابی سپاہی پوری آن بان کے ساتھ دہلی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس لیے میرٹھ کو چھوڑ کر ہم بھی دہلی کے حالات کا جائزہ لیں گے۔

میرٹھ کے آس پاس

اس سے پہلے کہ دہلی کے حالات ہمارے سامنے آئیں، بہتر ہے کہ میرٹھ کے قرب و جوار پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے۔

ــــــــــ

؎ "دہلی کی جانکنی" ۲۱/

میرٹھ کے دیہات میں بھی زبردست بغاوت ہوئی۔ ۱۱ر۱۲ر مئی کو سردھنہ کی تحصیل پر راج پوتوں اور دوسرے دیہاتیوں نے حملہ کیا اور قلندر خاں جولدار نے انتظامات سنبھال لیے۔ شاہ مل سنگھ نے باغپت کے باغیوں کی رہ نمائی کی۔ شہر پر حملہ کیا اور جمنا کا پل توڑ دیا جو کہ میرٹھ اور برطانوی فوجی ہیڈ کوارٹروں کو ملانے والا راستہ تھا۔ ۹ر جولائی کو باغیوں کا ایک اور بڑا مجمع سکری پر جمع ہوگیا اور بیگم آباد کو لوٹ کر انگریزی فوج کا جم کر مقابلہ کیا۔ ڈھولانہ کے باشندوں نے دہلی کے چند باغیوں کے ہمراہ ہوکر پولیس افسران کو نکال دیا اور گورنمنٹ کی عمارتوں اور کاغذات میں آگ لگادی۔ پرگنہ بڑوت کے عوام برابر شاہ مل کے ذریعے سے دہلی کے باغیوں کو رسد وغیرہ پہنچاتے رہے۔ ۱۶ر جولائی کو ایک گاؤں بسودھ (Busodh) کے باغیوں نے انگریزی دستوں کا سخت مقابلہ کیا۔ بعد میں انگریزوں کو یہاں غلّے کے زبردست ذخیرے ملے جو دہلی بھیجنے کے لیے جمع کیا گیا تھا۔ یہ ذخیرہ اتنا تھا کہ فوج کی تمام گاڑیاں اس کا فقط ایک حصہ ڈھو سکتی تھیں۔[1]

سہارن پور اور رڑکی

سہارن پور میں جیل کے محافظ دستے کے سپاہی قرب وجوار کے گوجروں اور شہر کے انقلابیوں سے مل کر بغاوت کا پلان بنا رہے تھے اور یہاں سے چند میل کے فاصلے پر گوجر جمع تھے جو شہر پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے مگر یہ خبریں انگریز افسروں کو بھی پہنچ گئیں

1. Narrative of Events, p. 406
   Symposium p. 197

اور جیل کے گارڈ دستے سے ہتھیار لے لیے گئے، امداد طلب کر لی گئی۔ شاید اسی لیے گوجروں نے حملہ نہ کیا البتہ رڑکی کو ان گوجروں نے آزاد کرا لیا تھا لیکن جلد ہی یعنی ۳۰ مئی کو دوبارہ انگریزی فوجوں نے قبضہ کر لیا ۲ جون کو پھر فوج میں بغاوت ہو گئی، کچھ بجنور چلے گئے کچھ گرفتار ہوئے۔ گاؤں والوں پر بے پناہ مظالم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۱۳ جون کو ایک سوار دستے نے بغاوت کی اور اگلے دن ایک گاؤں میں سخت مقابلہ ہوا۔ یہاں سے ہٹ کر انقلابیوں نے دوسرے گاؤں میں مورچہ لگا لیا اور دوبارہ خوں ریز تصادم ہوا۔ ۲۲ جولائی کو محمود پور اور دیوبند کے درمیان ایک اور مقابلہ ہوا۔ لیکن شکست دہلی کے بعد کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ اور امن قائم ہونے کے بعد ہولناک مظالم کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ سیکڑوں کو برگد کے درخت سے لٹکا کر پھانسی دی گئی اور بے شمار بے گناہوں کو گولی مار دی گئی۔[1]

بلند شہر

۲۶ مئی ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ کی طرف سے نواب ولی داد خاں کو صوبے دار مقرر کیا گیا، انھوں نے مہربان علی اور مظفر علی خاں امروہوی[2] کے ہمراہ ہزاروں گوجر بھرتی کیے اور مالاگڈھ کے قلعے میں قیام کیا۔ ایمن گوجر اُن کا خاص آدمی تھا اور ان کی فوجوں کی کمان کر رہا تھا، تمام گوجر اس کے جھنڈے تلے جمع تھے۔ بلند شہر میں نواب ولی داد کی حکومت کا اعلان کر دیا گیا۔ ۲۲ جون کو بریلی کی انقلابی فوجوں نے دہلی جاتے ہوئے گڈھ مکتیشر کے قریب گنگا کو پار کیا۔ اسی دوران میں انگریزوں اور نواب ولی داد خاں سے ایک جنگ بھی ہوئی دہلی سے بھی انقلابی فوجیں ان کی مدد کو آگئی تھیں اور انگریزی فوج

---

[1] "محاربۂ عظیم"۔ "الجمعیۃ" ۱۸ مئی ۱۹۵۷ء

[2] مظفر علی خاں امروہہ کے کلال خاندان میں درویش علی خاں (منصب دار عہد فرخ سیر) کی اولاد سے تھے۔ مشہور علی برادران انھیں کے نواسے تھے۔

سے گلاؤ ٹھی پر مقابلہ ہوا۔ انگریزی فوجوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا مگر نواب کے ماموں کی غداری کی بدولت انقلابیوں کو فتح حاصل نہ ہو سکی۔ دہلی پر انگریزی تسلط کے بعد ۲۸ ستمبر کو دوبارہ مسلح انگریزی فوجیں حملہ آور ہوئیں۔ انقلابی دستے تین گھنٹے تک بہادری اور استقلال سے مدافعت کرتے رہے مگر انگریزوں کو دہلی اور میرٹھ سے برابر مدد مل رہی تھی۔ جب انگریز جنرل، بابو گڈھ پر آیا تو نواب کی فوجیں گلاؤ ٹھی کے قریب قیام پذیر ہوئیں۔ انگریزوں کو کسی مخبر نے اطلاع کر دی اور انھوں نے رات میں اچانک حملہ کر دیا، بے خبر انقلابی فوجیں بدحواس ہو کر بھاگیں اور ان کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس شکست سے اُن کی ہمت ٹوٹ گئی۔ نواب ولی داد خاں اپنے ساتھیوں کو لے کر بریلی چلے گئے۔ گورہ فوجیں حسب عادت مالا گڈھ پر ٹوٹ پڑیں۔ قلعہ کھود کر مسمار کر دیا گیا۔[1] پھانسیوں کا بازار گرم ہوا اور بلند شہر، دادری، دنکور، خورجہ وغیرہ کے بے شمار بے گناہوں کو پھانسیاں دی گئیں گوجروں کے گاؤں کے گاؤں جلا دیے اور ضبط کر کے نیلام کیے گئے۔ بلند شہر میں کالے آم پر پھانسی دی جاتی تھی جو آج تک اس بے مثال ظلم و ستم کی یاد دلا رہا ہے۔ اس علاقے کے چھوٹے چھوٹے قصبوں میں بھی انگریزوں کو زبردست مقابلے کرنا پڑے۔

---

[1] مالا گڈھ نواب ولی داد خاں کا مرکز اور قلعہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نواب کے دادا نے ایک مشہور بزرگ حضرت سید محمود مالا مال کرمانیؒ (متوفی ۸۶۵ھ) سے عقیدت و ارادت کی بنا پر "مالا گڈھ" نام رکھا تھا۔

نواب ولی داد خاں بہادر خاں کے بیٹے اور حق دار خاں کے پوتے تھے بہادر خاں کے انتقال (۱۸۲۴ء) کے بعد سے ان کو انگریزوں نے ایک ہزار روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ (کیفیت بلند شہر، مصنف لچھمن سنگھ، بحوالہ "در مقصود" ۱۹۴۲ء نیز تواریخ بلند شہر مصنف منگل سین ص ۵۰)

مظفرنگر ضلع مظفرنگر میں بہت سے علماء نے، جن کی رہ نمائی حضرت حاجی امداد اللہ کر رہے تھے، دشمنان وطن کے خلاف تلوار اٹھائی۔ اسی طرح اس ضلع کے قصبۂ کیرانہ میں مولانا رحمت اللہ نے انقلابیوں کی رہ نمائی کی اور میدان جنگ میں صف آرا ہوئے (ان علماء کے مفصل حالات کسی دوسری جگہ بیان ہوئے ہیں)

اس علاقے کے مجاہدوں کی قربانی تاریخ کے صفحات پر یادگار رہے گی۔ بڑے بڑے علماء نے حضرت حاجی امداد اللہؒ کی رہ نمائی میں یہاں کے علاقے تھانہ بھون اور شاملی میں جہاد کیا۔ تھانہ بھون کے انقلابی قرب و جوار کے عوام کو جنگِ آزادی کے لیے تیار کر رہے تھے اور ان میں قاضی عنایت علی پیش پیش تھے۔ علمائے کرام نے بہادر شاہ سے بھی رابطہ قایم کر رکھا تھا۔ تحریک شروع ہوئی تو انھوں نے باقاعدہ اعلان جہاد کر دیا اور پہلا حملہ ایک میگزین پر کیا جو سہارن پور سے شاملی کو جا رہا تھا۔ میگزین لے جانے والوں نے شکست کھائی اور وہ انقلابیوں کے ہاتھ آیا۔ اس کے بعد جب بہادر انقلابیوں کو کلکٹر سہارن پور کے آنے کی اطلاع ملی تو انھوں نے شاملی پر حملہ کیا۔ حضرت حافظ ضامن علیؒ حضرت مولانا محمد قاسمؒ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ بھی اس حملے میں شریک تھے۔ انگریز فوج پسپا ہو گئی اور تحصیل میں پناہ گزین ہوئی مگر انقلابیوں نے تین دن کے محاصرے کے بعد تحصیل کا دروازہ توڑ لیا حافظ ضامن علی شہید ہوئے۔ جب تحصیل لٹ جانے کی اطلاع سہارن پور پہنچی تو فوج روانہ کی گئی اور تھانہ بھون پر محاصرہ کر کے گولہ باری کی گئی مگر اس توپ خانے کا افسر حضرت حاجی امداد اللہؒ کا معتقد تھا اور انقلابی ذہن رکھتا تھا لہٰذا اس نے توپوں کے منہ اوپر کی طرف کر دیے اگلے دن صبح کو انگریز حاکم کو اس کا علم ہوا تو اس نے افسر توپ خانہ کو گولی سے اڑا دیا اور اب باقاعدہ گولہ باری شروع

کی مگر قصبے کے انقلابیوں نے باہر آکر انگریزوں پر حملہ کیا اور شکست دی۔ ان کے پاس ہتھیار کم تھے لیکن وہ اپنی پیشانیوں پر غلامی کا داغ گوارا نہ کر سکتے تھے، دہلی کے شکست ہونے کی خبر پہنچی تو انقلابی حلقوں میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی مگر قاضی عنایت علی نے اعلان کیا کہ وہ آخر دم تک جنگ کریں گے چناں چہ وہ اپنے صرف تنلو ساتھیوں کو لے کر انگریزوں کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔ انگریزوں نے پوری تیاری کے بعد دوسرا زبردست حملہ کیا اور قصبے کو گھیر کر گولہ باری کی، پھر اندر داخل ہو کر لوٹ مار کا بازار گرم کیا، آگ لگائی، قتل عام کیا اور تمام قصبہ ویران کھنڈروں میں تبدیل ہو گیا۔ دو سال بعد جب پھر آباد ہوا تو لوگوں نے حیرت سے دیکھا ایک سو بتیس شہیدوں کی بے گور و کفن لاشیں اب تک درختوں پر لٹک رہی تھیں۔ ان کو کسی جانور نے چھوا بھی نہ تھا اور ان کا گوشت و پوست سوکھ کر رہ گیا تھا۔[۱]

۱؎ "الجمعیۃ" ۱۶ / اکتوبر ۱۹۵۷ء

دہلی

اپریل کے آخر میں انقلابی رہنما پیشوا نانا صاحب دہلی آئے تھے۔ تمام خفیہ انقلابی لیڈروں کے مشورے سے ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء متفقہ طور پر بغاوت کی تاریخ طے ہوگئی اور بے چینی سے اس دن کا انتظار ہو رہا تھا کہ اچانک میرٹھ کی بغاوت نے یہ سارا پروگرام ہی درہم برہم کر دیا۔ ۱۰ مئی کی بغاوت کے بعد میرٹھ سے پیام بر آچکے تھے کہ ہم ۱۱ مئی کو دہلی پہنچیں گے، انگریز افسروں نے بھی دہلی کو آدمی دوڑا دیے تھے مگر یہاں کا کمشنر فریزر انقلابیوں کی خوش قسمتی سے شراب پیے مست پڑا تھا اور اس نے یہ پیغام اس وقت دیکھا جب پانی سر سے اونچا ہوگیا۔

دہلی کے انقلابیوں کو پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی کہ اگر میرٹھ میں چکنے کارتوسوں پر ہنگامہ ہوا تو میرٹھ کے سپاہی دہلی کی فوج سے آملیں گے اور یہ سازش ایک ہندستانی

افسر کے ذریعے عمل میں لائی جاتی تھی۔ چناں چہ ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کا سورج بلند ہونے بھی نہ پایا تھا کہ انقلابی سپاہیوں کی ایک ٹولی کا عکس جمنا میں نظر آنے لگا —— "جمنا جی کی جے" —— کا نعرہ لگا کر انھوں نے پُل پار کیا اور شہر دہلی کی فصیل کے نیچے آ گئے۔ ابھی صبح کے آٹھ بھی نہ بجے تھے۔

دہلی کے انقلابی سپاہی اور عوام تو پہلے ہی اپنے دین اور دیش کے لیے سر بکف ہونے کو تیار تھے، خصوصاً منگل پانڈے کے واقعے نے انھیں اور بھی بے چین کر دیا تھا اب جب کہ میرٹھ کے انقلابی دہلی کا دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے وہ کیسے رک سکتے تھے، چناں چہ شہر پناہ کے نگہ بانوں نے نہایت جوش و خروش سے ان کا استقبال کیا اور دروازے کھول دیے، انگریز افسران جہاں کہیں دروازوں پر تھے مارے گئے، اب باغی سپاہی گروہ در گروہ کشمیری دروازے، راج گھاٹ دروازے اور دہلی دروازے سے "دین دین" کے نعرے لگاتے ہوئے داخل ہو گئے، شہر کے ہندو مسلم عوام نے ان کی خاطر مدارات کی، قلعہ سلیم گڑھ پر جو توپچی فتیلے جلائے منتظر بیٹھے تھے انھوں نے باغی سپاہ کو آتا دیکھ کر فتیلے پھینک دیے اور ہتھیار رکھ کر ان کے ساتھ ہو گئے۔

انقلابی سپاہی
بہادر شاہ کے سامنے

یہ سوار یہاں سے لال قلعے کے جھروکے کے نیچے آئے یہ تقریباً تیس چالیس سوار تھے، بعض کے ہاتھوں میں برہنہ تلواریں تھیں۔ اور بعض پستول اور کارتوس لیے ہوئے تھے، ان کے ہمراہ کچھ سائیس بھی تھے جن کے سروں پر گٹھریاں تھیں، ان

---

[1] بہادر شاہ کا مقدمہ۔ جاٹ مل کا بیان

سواروں نے باقاعدہ بادشاہ کو سلامی دی، اکثر وردیوں میں تھے اور بعض معمولی کپڑوں میں۔ ــــــ انھوں نے شور مچانا شروع کیا۔

"دہائی ہے، بادشاہ سلامت کی، ہم دھرم کی جنگ میں مدد کے طالب گار ہیں"

یہاں روایتیں مختلف بیان کی جاتی ہیں۔ ظہیر دہلوی کے بیان کے بہ موجب حکیم احسن اللہ نے تسبیح خانے میں آکر سواروں سے بات چیت شروع کی، چند سوار زیر جھروکہ آکر کھڑے ہو گئے، گھوڑوں سے اترے اور کہا۔

"حضور آپ دین دنیا کے بادشاہ ہیں تمام ملک آپ کا فرماں بردار ہے"

انھوں نے اپنی خدمات، انگریزوں کی دغابازیاں، میرٹھ کے حالات اور کارتوسوں کا واقعہ مفصل بیان کیا۔ بادشاہ نے جواب میں کہا۔

"سنو بھائی، مجھے بادشاہ کون کہتا ہے میں تو فقیر ہوں ایک تکیہ بنائے اپنی اولاد کو لیے بیٹھا ہوں، بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی، سلطنت تو سو برس پہلے میرے گھر سے جا چکی ..... میرے پاس خزانہ نہیں، کہ تم کو تنخواہ دوں، فوج نہیں کہ تمھاری مدد کر سکوں، ملک نہیں کہ تحصیل کے لیے نوکر رکھوں، ہاں یہ کر سکتا ہوں کہ انگریزوں سے تمھاری صلح کرا دوں ....."

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ فریزر وہاں آگیا، بادشاہ نے اس سے بھی گفتگو کی وہ باغیوں کے سامنے آیا اور کہا۔

"کیا یہی تمھاری نمک خواری ہے کہ ہم نے تمھیں پرورش کیا اور آج تم ہمارے مقابلے کو تیار ہو"۔

باغیوں نے جواب دیا ــــــ "کوئی شک نہیں، ہم کو سرکار نے پالا اور پرورش کیا مگر

ہم نے آج تک نمک حرامی نہیں کی، جہاں سرکار نے جھونک دیا ہم آگ اور پانی میں آنکھیں بند کر کے کود پڑے، کابل پر ہم گئے، لاہور ہم نے فتح کیا، کلکتے سے کابل تک ہم نے جانیں دیں اب جب کہ سرکار کا قبضہ ہو گیا تو ہمارے دین کے درپے ہوئی ہے۔ ہم کو مر جانا قبول ہے مگر بے دین ہونا نہیں"۔ ——— فریزر نے قسمیں کھا کر یقین دلانا چاہا کہ ہم انصاف کریں گے مگر جواب ملا۔

"غریب پرور۔! ہم کو سرکار کے قول پر بھروسا نہیں جس نے اکثر جگہ دھوکا دے کر ملک گیری کی ہے، آج ہم اطاعت کریں گے اور کل ہم کو پھانسی پر لٹکایا جائے گا، ہم کو بھنگی کے ہاتھ پھانسی پانے سے تلوار سے مرنا اچھا معلوم ہوتا ہے"۔

یہی تکرار تھی کہ ایک بپھرے ہوئے سپاہی نے فریزر پر گولی چلا دی مگر وہ تسبیح خانے کے ستون پر لگی اور اس کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر گرا، جو آج بھی اسی طرح موجود ہے۔ فریزر خوف زدہ ہو کر قلعے کے اندر بھاگ گیا اور باغی سوار راج گھاٹ دروازے سے شہر میں داخل ہوئے۔

مقدمہ بہادر شاہ میں ذمہ دار لوگوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ فریزر نہیں بلکہ کپتان ڈوگلس باغیوں سے گفتگو کرنے آیا اور اسے بادشاہ نے بلوایا تھا مگر باغی سپاہیوں کے قریب جانے سے منع کیا تو اس نے اوپر ہی سے گفتگو کی۔ یہ سواروں کا پہلا دستہ تھا، اس کے بعد مزید سواروں اور پیدل فوج کے دستوں نے پل عبور کیا۔

مسٹر ساور کر لکھتے ہیں کہ تقریباً دو ہزار سپاہی سوار و پیدل میرٹھ سے دہلی آئے اور بہادر شاہ سے رہ نمائی کی درخواست کی۔ جب بادشاہ نے فوج اور خزانہ نہ ہونے کا عذر کیا تو انھوں نے کہا کہ ہم تمام انگریزی خزانے لوٹ کر آپ کے قدموں میں ڈال دیں گے، بادشاہ نے

رہ نمائی قبول کرلی تو تالیوں کی پرزور گونج سنائی دی[1]۔

ایک بیان یہ ہے کہ بادشاہ دیوانِ خاص میں تخت پر بیٹھے اور سپاہی ان کے آگے سے سر جھکا کر گزرتے اور وہ ان کے سر پر ہاتھ رکھ دیتے تھے۔ دہلی دروازے سے جو باغی داخل ہوئے انھوں نے دریا گنج میں انگریزوں کے مکانات کو لوٹنا اور آگ لگانا شروع کردیا تھا —— "دروازے کی سڑک جو کھائی چوبجی دریا گنج کی چوڑائی میں سنہری مسجد کے سامنے جاکر ختم ہوئی ہے وہاں سنہری مسجد کے نیچے چورا ہا ہے۔ ایک سڑک تو لال قلعے کے نیچے ہوتی ہوئی لال ڈگی جاتی ہے اور ایک راستہ خاص بازار کو جاتا ہے اور یہیں سے قلعے کا میدان شروع ہے اور جنوب جانب میں دو سڑکیں برابر دلّی دروازے کو جاتی ہیں، نہر حایل ہے اور ایک سڑک گوشۂ جنوب و مشرق میں دریا گنج کو جاتی ہے اس میں اوّل ہی سڑک کے کنارے پادری کا بنگلہ ہے۔ یہ پادری پہلے ہندو تھا پھر عیسائی ہوگیا، اول اسی پادری کو قتل کیا گیا اور کشت و خون یہیں سے شروع ہوا"[2]

میگزین پر حملہ

شہر کے تمام آزادی پسند عوام، اور موقعے سے فائدہ اٹھا کر بدمعاش بھی باغی سپاہیوں کے ساتھ ہوگئے تھے، جیل سے قیدی بھی رہا ہو چکے تھے، ہسپتال پر بھی حملہ ہوا اور تقریباً بارہ بجے بنک لوٹا گیا، پھر "دہلی گزٹ" کے پریس میں توڑ پھوڑ ہوئی۔ میگزین پر بھی حملہ ہوا لیکن پہلے بادشاہ کی

---

1. Savarkar — 121.

[2] داستانِ غدر / ۵۶

طرف سے وہاں کے افسران کو پیغام بھیجا گیا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں، جب انھوں نے توہین آمیز رویہ اختیار کیا تو سیڑھیاں لاکر انقلابیوں نے دیواروں پر چڑھنا شروع کیا، میگزین کا تمام ہندوستانی عملہ اور خصوصاً دربان رحیم بخش درپردہ انقلابی جماعت کا ممبر تھا، وہ باہر کے انقلابیوں کو تمام ہدایات دے رہا تھا مگر انگریز افسروں نے حالات نازک اور بے قابو دیکھ کر میگزین کو بارود سے اُڑا دیا جس سے نہایت ہی خوف ناک دھماکہ ہوا اور تمام شہر ہل گیا۔ یہ تقریباً تین چار بجے کا وقت تھا۔

اس دوران میں پیدل سپاہ کے دستے برابر دہلی میں داخل ہوتے رہے، شہر میں دو آدمی سبز لباس پہنے، اونٹوں پر سوار پکارتے پھر رہے تھے کہ

" اے لوگو۔! مذہب کا ڈنکا بج گیا ہے "

کسی کو پتہ نہیں کہ وہ کون تھے اور کہاں سے آئے تھے، شہر کی آبادی نے ان کو فرشتہ قرار دیا۔ ؎۵

انگریزوں کی ناکامی

جب میرٹھ کے باغی سپاہیوں کی آمد کا حال دہلی کے انگریز افسروں کو معلوم ہوا تو انھوں نے وفاداری پر لکچر دینا شروع کیے، کرنل رپلے نے تمام فوج کو پریڈ پر جمع کرکے نصیحتیں کیں اور باغیوں کی مذمت کی تو ۵۴ رجمنٹ کے سپاہیوں نے کہا —— "ہمیں میرٹھ کے سپاہیوں کے سامنے کر دیجیے ہم اُن سے سمجھ لیں گے" —— "شاباش"۔! کرنل خوشی سے چلایا اور رجمنٹ کو مارچ کا حکم دے دیا مگر جب انھوں نے میرٹھ کے

؎۵ "غدر کی صبح شام" / ۶۱

انقلابیوں کو گھوڑوں پر سوار اپنی طرف آتے دیکھا تو ایک دوسرے کو سلوٹ کیا اور باہم مل گئے۔ جب میرٹھ کے انقلابیوں نے نعرے لگائے ——"فرنگی حکومت برباد"
——"شہنشاہ ہند زندہ باد" —— —— تو دہلی کے انقلابیوں نے جواب دیا —— "مارو فرنگیوں کو" —— !

"کیا بات ہے، کیا بات ہے"؟ - کرنل ریپلے گھبراہٹ میں چلایا مگر ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور وہ پیچھے آرہا۔ یہ سپاہی کشمیری دروازے سے داخل ہوئے۔
جنرل گرد بھی ایک فوج لے کر مقابلے کے لیے گیا اور انقلابی فوجوں سے شکست کھا کر واپس ہوا اس طرح دہلی انگریزی چنگل سے آزاد ہو گیا مگر دنیا کا قاعدہ ہے کہ حکومتوں میں تبدیلی اور انقلاب کے موقعے پر کچھ نہ کچھ بدنظمی اور انتشار ضرور پیدا ہو جاتا ہے چناں چہ یہاں بھی غنڈوں اور بدمعاشوں نے موقع غنیمت سمجھ کر عام لوٹ مار شروع کر دی، لوگوں نے بہادر شاہ سے فریاد کی اور ۱۲؍ مئی کو انھوں نے ایک اعلان جاری کیا، عہدے داروں کو قیامِ امن پر مامور کیا اور اسی دن خود دو بار ہاتھی پر سوار ہو کر جلوس کے ساتھ بازاروں میں گشت کیا ان کی سواری کے آگے آگے انقلابی سپاہی "بہادر شاہ کی جے" —— اور —— "دین دنیا کے گیتاں کی جے"۔ کے نعرے لگاتے چل رہے تھے اور پیچھے ترک سوار "اللہ اکبر" کے نعروں سے بام و در لرزا رہے تھے! بہادر شاہ کی سواری نکلنے سے بہت سی دکانیں کھل گئیں، باغیوں نے قیام امن کے لیے کوششیں شروع کر دیں اور پہرے بٹھا دیے مگر پھر بھی کہیں کہیں بدنظمی جاری رہی۔ انقلابی فوجیں عام لوٹ مار میں حصہ نہیں لے رہی تھیں اور یہ کام شہر کے بدمعاش کر رہے تھے[1]

[1] محاربۂ عظیم / ۵۵

۱۱ مئی کو بادشاہ کی سلامی کے طور پر توپیں داغی گئیں مغل شہزادوں، مرزا مغل، مرزا خضر سلطان، مرزا ابوبکر، مرزا اسید و، مرزا عبد اللہ وغیرہ کو مختلف انقلابی فوجوں کا سردار مقرر کیا گیا، مرزا مغل کمانڈر ان چیف تھے، ان شہزادوں نے میدان جنگ کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔

انگریزوں کا قتل

انگریز افسران جن میں ڈگلس اور فریزر بھی شامل ہیں ۱۱ مئی کو ہی قتل کر دیے گئے تھے۔ اب رفتہ رفتہ حالات معمول پر آنے لگے، فوجوں کو اناج مہیا کیا گیا تاکہ لوٹ مار نہ ہو، بدمعاشوں کو گرفتار کیا جانے لگا۔ ریاست جھجر، ملبب گڈھ، فرخ نگر، الور، جے پور وغیرہ کے نام امداد کے لیے چھٹیاں روانہ کی گئیں۔ بہادر شاہ چوں کہ انگریزوں کے قتل عام کے حامی نہ تھے اس لیے ان کی درخواست پر ۴۹ انگریزوں کو قلعے میں نظر بند کر دیا گیا تھا مگر باغیوں کو برابر غداری اور جاسوسی کی خبریں ملتی تھیں۔ حتیٰ کہ حکیم احسن اللہ اور محبوب علی بھی انگریزوں سے ساز باز رکھتے تھے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ ان انگریز قیدیوں کی وساطت سے میرٹھ کے انگریزوں سے نامہ و پیام کیا جا رہا ہے۔ یہ سچ ہو یا جھوٹ مگر ان کا مشتعل ہو جانا یقینی تھا۔ چناں چہ ان تمام حالات نے انقلابیوں کو اس قدر غضب ناک کر دیا کہ انھوں نے بادشاہ کے منع کرنے کے باوجود ۱۶ مئی کو ان تمام انگریزوں کو جن میں عورتیں بھی تھیں کاٹ کر پھینک دیا[1] —— لوگ اسے ظلم و ستم قرار دیں اور باغیوں کی مذمت کریں مگر وقت کا تقاضا یہی تھا۔ —— کیا سراج الدولہ نے انگریزوں کی جان بخشی کر کے نقصان نہیں اٹھایا؟ کیا یہی لوگ اس کے دربار میں

"1. METCALE: Native Narrative"

سازش پھیلا کر ہندوستان کی غلامی کا باعث نہیں ہوئے ؟ ۔ پھر، آنے والے واقعات میں نانا صاحب نے کان پور میں انگریز عورتوں اور بچوں کو پناہ دی اور وہی عورتیں جو اُن کی قید میں آرام و اطمینان سے رہیں، جن کو اچھی پوشاک اور غذا ملی، جن کو خدمت کے لیے ملازم ملے، کیا اس کے باوجود غداری کرنے سے باز رہ سکیں ؟

باغیوں نے راجہ کشن گڈھ کی کوٹھی پر بھی حملہ کیا کیوں کہ اس نے انگریزوں کو پناہ دی تھی، ۱۳؍ مئی کو دوبارہ حملہ کیا، بالآخر تیس انگریز زندہ باہر لائے گئے اس موقعے پر ولی عہد سلطنت نے آکر باغیوں سے کہا کہ ان کو ہمیں دے دو ہم حراست میں رکھیں گے مگر انھوں نے ان انگریزوں کا کام تمام ہی کرنا بہتر سمجھا۔ اب مختلف مقامات سے انقلابی فوجیں بغاوت کر کے دہلی آنا شروع ہو گئی تھیں وہ وہاں کے خزانے لے کر آئے اور شاہی خزانے میں داخل کر دیے۔ اس طرح علی گڈھ، آگرہ، متھرا، مین پوری اور نصیر آباد وغیرہ سے باغی فوجیں دہلی آگئیں، دہلی کا ایک سیٹھ لچھمن داس روزانہ انقلابی سپاہیوں کی دعوت کرتا تھا۔ شہر میں روز بروز امن قایم ہوتا جا رہا تھا، پہرے نصب کر دیے گئے تھے۔

مصیبت زدہ انگریز

جو انگریز اپنی جانیں بچانے میں کام یاب ہوئے وہ کرنال کی طرف بھاگے مگر ان کو انتہائی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ایک انگریز کا بیان ہے کہ وہ اپنے خاندان کے ہمراہ بھاگا جاتا تھا کہ باغیوں نے ان کو گھیر کر لوٹ لیا، اس انگریز نے اپنا سر زمین پر رکھ دیا، ایک شخص نے اس کے سر پر پاؤں رکھا، قریب تھا کہ سر تن سے جدا کر دے کہ انگریز نے کہا ــــ " میں اپنا سر اس نیت سے قربان کرتا ہوں کہ تم میرا سر لینے کے

بعد عورتوں کی بے عزتی نہ کرنا"۔۔۔ یہ سن کر باغیوں نے اس کو چھوڑ دیا۔ایک اور انگریز کا بیان ہے کہ لوگ اسے کھینچ کر ایک گاؤں میں لے گئے، اس سے کہا کہ۔۔۔ "تم فرنگیوں نے چاہا تھا کہ ہم لوگوں کو عیسائی بنا دو"۔۔۔ انھوں نے اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ دیے اور ایک نے کہا۔۔۔ "کریم بخش جاؤ اپنی تلوار لے آؤ ہم اس کافر کا سر کاٹیں گے"۔۔۔ کچھ انگریز عورتیں اور زخمی مرد جو کرنال روانہ ہوئے بیان کرتے ہیں کہ بعض بعض جگہ لوگ مہربانی کرتے مگر اکثر جگہ طعنے اور نامہربانیاں ہوتیں، حتیٰ کہ کوئی سایے میں بھی نہ بیٹھنے دیتا، پانی بھی میسر نہ آتا تھا، جب یہ لوگ بال گڈھ پہنچے تو یہاں کی رانی منگلا دیوی نے ان کی خاطر مدارات کی مگر رعایا نے دھمکی دی کہ اگر ان کو رخصت نہ کیا گیا تو ہم تمھارا موضع لوٹ لیں گے۔ مجبوراً یہ لوگ وہاں سے نکلے گئے۔یورپین خاتون اپنی سرگذشت میں کہتی ہے۔

(بغاوت سے پہلے) "جس وقت بھی ہم لوگوں میں سے کوئی کسی مقام پر آتا جاتا مل جاتا تھا تو یہ لوگ نیچے کو ہاتھ ڈال کر ایک طرف ہو جاتے اور نہایت تعظیم و تکریم سے جھک جھک کر سلام بجالاتے تھے۔آج کہ شورش برپا ہے اور ہمارا رایت اقبال نگوں سر ہے وہی لوگ ہم کو آنکھیں دکھاتے ہیں جو بار اطاعت سے مثل کمان خمیدہ رہتے تھے آج تیر کی مانند سیدھے ہیں، جو دل ہمارا نام سُن کر لرزتے تھے آج ہمارے خوف سے کوسوں دور ہیں ایک وقت وہ تھا کہ شہر میں جو انگریز گذرتا تھا عزت کی نگاہیں اس کے خیر مقدم کو اٹھتی تھیں، ایک وقت یہ ہے کہ ہر ذلیل سے ذلیل ہندوستانی ہماری توہین و تحقیر پر آمادہ ہے جس کی طرف دیکھو آنکھوں سے خون گرا رہا ہے، غصے سے دانت پیستا ہے، گو زبان سے نہ

کہیں نگران کی زبانِ حال کہہ رہی ہے کہ یہ مملکت ہندوستانی ہے جو بطور وراثت ہم کو ہمارے اجداد سے پہنچی ہے تم دوسرے ملک کے رہنے والے کس حق سے ہمارے اوپر حکومت کر رہے ہو؟ کس دلیل سے حاکم بن کر ہمارے اموال و املاک پر قابض و متصرف ہو؟"

بلب گڈھ کے راجہ ناہر سنگھ پورے طور پر انقلابیوں کے ساتھ تھے۔ ۲۵ مئی کو عید کے دن راجہ کی طرف سے ایک سوار آیا جس نے اطلاع دی کہ مہاراجہ نے انگریزی فوج دیکھی ہے جو دہلی کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے مگر بعد میں یہ خبر غلط نکلی۔ راجہ نے پلول تک قبضہ کر کے تمام انگریزوں کو نکال دیا تھا۔ اسی طرح ریاست جھجر اور باغیوں کے درمیان جنگ ہوئی باغی کامیاب ہوئے اور خزانہ لے کر دہلی آگئے۔ ۲۶ مئی کو کسی نے اسلام گڈھ کی توپوں کو کنکروں اور پتھروں سے بھر دیا۔ باغیوں نے حکیم احسن اللہ اور محبوب علی پر شبہ کیا حتیٰ کہ انھوں نے اپنی تلواریں نکال لیں مگر بادشاہ کی سفارش اور ان دونوں کے حلف اٹھا لینے پر چھوڑ دیا۔ ۲۷ مئی کو پھر دمدموں کی بعض توپوں میں میخیں ٹھوک دی گئیں اور باقی میں پتھر کنکر بھر دیے گئے جس کی وجہ سے انقلابیوں میں بے حد جوش پھیل گیا کیوں کہ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ شہر میں غدّار موجود ہیں۔

انگریزی فوج کی تیاری

انگریز جب دہلی سے بھاگے تو انھوں نے بدحواسی کے باوجود اتنا کام کیا کہ انبالے کو بذریعے تار بغاوت کی اطلاع دے دی، وہاں کے افسروں نے اس تار کی نقل فوراً شملے روانہ کی جہاں انگریز کمانڈر انچیف انسن مقیم تھا۔ وہ ۱۴ مئی کو وہاں سے آیا اور فوجی

تیاریاں شروع کیں۔ مگر کون مدد کر سکتا تھا؟۔ فوج بگڑی ہوئی تھی اور عوام انگریزوں کے خون کے پیاسے۔ ایسے آڑے وقت میں پنجاب کے والیانِ ریاست کام آئے، ان رجواڑوں نے یقیناً اپنے وطنی بھائیوں کو روندنے میں انگریزوں کو بھی مات کر دیا یہ پٹیالہ، نابھ، جیند وغیرہ کے راجہ تھے۔ جنھوں نے بہادر شاہ کے بھیجے ہوئے پیغام بروں کو قتل کر ڈالا، انگریزوں کی امداد کے لیے روپیہ بہایا، فوجیں مہیا کیں، راستوں کی حفاظت کی، انگریزوں کے ساتھ ہو کر دہلی پر حملہ کیا اور جب پنجاب کے باغیوں نے بغاوت کا پرچم بلند کرنا چاہا تو نہایت سفاکی سے ان کا قتل عام کیا۔ چناں چہ انبالے سے جو باغی فوجیں دہلی آ رہی تھیں اُن پر پٹیالہ کی "وفادار" فوجیں ٹوٹ پڑیں۔

دیسی ریاستوں کی پوری امداد حاصل کر کے انگریزی فوج ۲۵ مئی کو انبالے سے دہلی کی طرف چلی، ۲ کو کمانڈر انچیف کو کالرے نے جاں بہ حق کر دیا اور برنارڈ مقرر ہوا۔ اب یہ لشکر دہلی کی طرف بڑھنے لگا، مگر اس طرح کہ انبالے اور دہلی کے درمیان ہزاروں گاؤں میں وہ تمام لوگ جو آسانی سے ہاتھ آ سکے قطار در قطار کھڑے کیے گئے اور موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ ان کو صرف پھانسیاں ہی نہیں دی گئیں بلکہ سر کے بال پکڑ کر اٹھایا گیا اور ان کے جسموں میں سنگینیں چبھو چبھو کر ہلاک کیا گیا، نیزوں، برچھیوں اور سنگینوں کی مدد سے ہندوؤں کے منھ میں گائے کا گوشت ٹھونسا گیا۔[1]

ہنڈن پر جنگ

میرٹھ سے بھی انگریزی فوج پنجاب کی فوجوں سے ملنے کے لیے چلی لیکن راستے میں باغیوں نے حملہ کر دیا۔

1. "History of the Siege of Delhi"
Savarkar — 290

۳۰ مئی کو ہنڈن ندی کے کنارے یہ تصادم ہوا۔ باغی فوج کے سردار مرزا ابو بکر تھے جنھوں نے گولہ باری تو کیا، کبھی بندوق کی آواز اور تلوار کی جھنکاریں بھی نہ سنی ہوں گی۔ یہاں وہ ندی کے پل کے قریب ایک مکان کی چھت سے جنگ کا "معائنہ" کر رہے تھے۔ انقلابی فوجوں نے اگرچہ جم کر مقابلہ نہ کیا مگر گوروں کے حواس خراب ہو گئے اور وہ گرمی کی شدت سے کلبلا کر بھاگ کھڑے ہوئے[1]۔ جنگ کے دوران میں جب باغی فوج کے ایک حصّے میں کچھ گڑبڑ ہو گئی اور وہ پانچ توپیں میدان میں چھوڑ کر پسپا ہونے لگا تو ایک بہادر سپاہی نے اپنے میگزین میں آگ لگا دی۔ ہولناک دھماکا ہوا، انگریز کیپٹن انڈ ربوز اور اس کے سیکڑوں ساتھی لقمۂ اجل ہو گئے، ساتھ ہی یہ بہادر سپاہی بھی اسی میں خاک ہو گیا۔ افسوس! کہ تاریخ کے صفحات اُس کا نام محفوظ نہ رکھ سکے۔ مشہور انگریز مورخ جان کے اس کی دلیری پر حیران ہو کر لکھتا ہے۔

> "اس سے پتا چلتا ہے کہ باغیوں میں ایسے دلیر اور باہمت لوگ تھے جو قومی مفاد کے لیے جان تک دے دینے کو تیار تھے"[2]

اس دلیرانہ شان کے ساتھ ہی اُن شہزادے صاحب کی نالائقی اور بزدلی کا نظارہ بھی قابل دید تھا جو فوج کے سردار تھے۔ اتفاقاً ایک گولہ ان کے قریب آ کر پھٹا اور فضا گرد آلود

---

[1] ظہیر دہلوی لکھتے ہیں — "میں نے ایک سوار سے پوچھا کہ تم اتنی جلدی کیوں واپس آ گئے اس نے بیان کیا کہ ہماری فتح ہو گئی۔ گورے مقابلے سے بھاگ گئے۔" داستانِ غدر۔

2. Kaye vol. II. P. 138

ہوگئی۔ آپ جھٹ جھٹ پرے کو دے اور محافظ دستے کے ساتھ پیچھے کی طرف چلے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فوج کے پیر اُکھڑ گئے۔ مگر اِن بھگوڑوں سے قدرت نے بھی انتقام لیا۔ یعنی جب وہ پل پار کرنے لگے تو پل ان کو لے کر بیٹھ گیا لہٰذا تقریباً دو سو آدمی جمنا کی آغوش میں سو گئے[1]

۳۱ مئی کو بھی اسی طرح ایک معمولی تصادم ہوا۔ ۷ رجون کو دونوں انگریزی فوجیں مل گئیں اور متحدہ طور پر علی پور کی طرف چلیں۔ بدلی کی سرائے پر ۸ رجون کو انقلابیوں نے مقابلہ کیا، کوئی خاص کامیابی نہ ہو سکی، شاید اس لیے کہ یہاں بھی ایک چھبیلا مغل شہزادہ ان کی کمان کر رہا تھا۔

انگریزوں کی چال

انگریزوں نے براہِ راست مقابلہ مشکل دیکھا تو دوسری چالیں شروع کیں۔ دو جاسوس نیلی وردیاں پہنے گھوڑوں پر سوار آئے۔ ان کے ہاتھوں میں نیلی جھنڈیاں تھیں، انھوں نے ضروری چیزوں کا جائزہ لیا اور انقلابیوں کو بتایا کہ "ہم انگریزی فوج کے سپاہی ہیں، جنگ کے وقت تم سے آملیں گے"۔ انقلابی فوجوں کو اس دغابازی کا یقین آگیا اسی شام کو انقلابی فوج مقابلے کے لیے آئی، پہاڑی پر توپیں چڑھائی گئیں اور تمام تیاریاں بڑے اہتمام سے مکمل کر لی گئیں۔ صبح سے پہلے تین بجے کے قریب جنگ شروع ہوئی۔ انگریز فوج کا سخت نقصان ہو رہا تھا، اسی دوران میں ایک دستہ جو نیلی وردیوں میں تھا اور نیلی جھنڈیاں لیے تھا باغیوں کی طرف بڑھا انھوں نے اس کو

---

[1] غدر کی صبح شام ص ۷۷

حملہ نہیں کیا اور یہ دستہ توپوں کے قریب پہنچ گیا۔ باغی فوجوں کے درمیان پہنچ کر اس نیلے دستے نے اپنی توپوں سے اچانک گولہ باری شروع کر دی۔ انقلابی فوجوں کو سخت نقصان پہنچا اور اُن کو اب معلوم ہوا کہ وہ دھوکا کھا گئے ہیں۔ اتنے میں یہ دستہ اور بھی نزدیک آ چکا تھا۔ یہ گورا فوج کا دستہ تھا۔ دست بدست جنگ ہونے لگی مگر گوروں نے توپوں پر قبضہ کر لیا۔ انقلابی فوجیں دھوکا کھا کر بد حواس ہو گئیں ان کا سخت نقصان ہوا ــــــ بھاگنے والوں میں سب سے آگے ان فوجوں کے کمانڈر انچیف مرزا خضر سلطان تھے ــــــ! ظہیر دہلوی کا بیان ہے کہ جب گوروں نے توپوں پر قبضہ کیا تو بھی انقلابیوں نے ہمت نہ ہاری اور دست بدست جنگ کرتے رہے، لکھنؤ کا رسالہ انقلابی فوجوں کی مدد کو پہنچا، گھمسان کی جنگ ہونے لگی کافی دیر بعد پیچھے ہٹ کر ترپولیہ پر توپیں چڑھا دیں اور گولہ باری کی مگر وہ تینوں کچھ دیر بعد بے کار ہو گئیں، انگریزوں نے پیچھے ہٹتے ہوئے باغیوں کا تعاقب کیا۔ انقلابی فوج سڑک کے کنارے باغوں میں چھپ گئی اور جب انگریزی فوج آگے بڑھتی ہوئی ان باغوں کے درمیان سڑک پر آ گئی تو یک بارگی گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ انگریز بد حواس ہو کر پیچھے کی طرف بھاگ گئے۔ انقلابی فوج نے اس کو اپنی فتح خیال کیا اور شہر میں واپس آ گئی۔ پہاڑی کے مورچے والوں نے جب اس فوج کو واپس آتے دیکھا تو وہ بھی مورچوں پر سامان اور توپیں چھوڑ شہر میں آ پہنچے۔ انگریزوں نے جب چھاؤنی سے دیکھا کہ پہاڑی خالی ہے تو بہ آسانی قبضہ کر کے توپوں کا رُخ شہر کی طرف کر دیا۔[1]

---

[1] "داستان غدر" / ۹۲

انقلابیوں کی بہادری

یہاں بہادر انقلابیوں کی دلیری کا ایک نظارہ پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے ظہیر دہلوی اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"دو سوار میری برابر سے نکلے، میں نے دیکھا کہ ان کے سینوں پر گولیاں لگی ہوئی ہیں اور چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے اور پشت پر مبا تے کھلے ہوئے تھے اور کلیجے اور پھیپھڑے کے ٹکڑے اور خون کے لخت اور پرخچے پڑے تھے۔ دائیں ہاتھوں میں ان کے تمنچے اور بائیں ہاتھوں میں گھوڑوں کی باگیں تھیں اور کسی طرح کا کرب اور بدحواسی ان کے بشرے سے ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ اچھی خاصی طرح ہوش و حواس قایم تھے اور آپس میں باتیں کرتے چلے آ رہے تھے ....

ایک زخمی کو دیکھا، اس کا ہاتھ کہنی پر سے اڑ گیا تھا اور کٹے ہوئے بازو سے خون گرتا چلا آ رہا تھا۔ دو ایک پوربیے اس سے کہتے ہوئے آتے تھے کہ یہیں سے ہم تم کو ہاتھوں پر اٹھا کر ڈیرے پہنچا دیں تو وہ کہتا نہیں میرے پاس نہ آؤ"۔

انگریزوں کی فوج علی پور آ گئی۔ اب ان کا بیرونی مقامات پر قبضہ ہو چکا تھا اور انقلابیوں نے شہر پناہ پر توپیں چڑھا دیں، انگریز مبارک باغ تک بڑھ آئے، ۹ رجون کو باغیوں سے پھر تصادم ہوا لیکن کل کی جنگ سے انقلابی فوجوں میں بددلی پھیل چکی تھی پھر بھی مرزا مغل نے اعلان کیا کہ فوج ہر وقت تیار رہے، میں اپنے مقام پر مضبوطی سے قائم ہوں مجھے شکست کا کوئی اندیشہ نہیں۔

۱۰ رجون کو باغی فوجیں جنرل محمد خاں کی سرکردگی میں انگریزوں پر حملہ آور

ہوئیں۔ محمد خاں نے انگریزی طریقۂ جنگ سے کام لینا چاہا یعنی انگریزوں سے کہلا بھیجا کہ مجھے نواب جھجر نے آپ کی مدد کے لیے بھیجا ہے مگر یہ ترکیب کامیاب نہ ہوئی تو براہ راست حملہ کیا، کافی گورے زمیں بوس ہوئے۔ شام تک انقلابی فوجیں شہر میں واپس آگئیں اور کشمیری دروازے کے مورچے سے گولہ باری ہوتی رہی۔ مقتول یورپینوں کے سر کاٹ کر ان کا شہر میں گشت کرایا گیا۔[1] ۱۱ر کو انگریزوں نے کشمیری دروازے پر گولہ باری شروع کر دی مگر انقلابی توپچی کالے خاں نے اس قدر شدت سے گولے برسائے کہ انگریزی توپوں کے منھ بند کر دیے، تمام شہر میں اس کی جرأت و بہادری کے چرچے ہو گئے، انگریزی توپ خانے فریزر کی کوٹھی اور فخ گڑھ پر تھے اور انقلابیوں کے چار توپ خانے ایک سلیم گڑھ، دو کشمیری دروازے پر اور چوتھا کابلی دروازے کے قریب تھا۔ باغی فوجوں کی تعداد میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا تھا دیوانِ عام (لال قلعہ) میں بارود تیار کی جاتی تھی مگر پھر اس کو محلہ چوڑی والان شمرو بیگم کی حویلی میں منتقل کر دیا گیا۔ اب روزانہ صبح کو انقلابی فوجیں تیار ہو کر نکلتیں، انگریز صرف مدافعانہ جنگ کرتے اور شام کو باغی واپس شہر کی طرف چلے آتے۔ ان کے پاس نئے خزانے اور فوجیں آ رہی تھیں ۱۲ر کو انھوں نے دو جانب یعنی مٹکاف کی کوٹھی اور سبزی منڈی سے حملہ کیا۔ ۱۳ر کو ہندو راؤ کے مکان کی طرف حملہ آور ہوئے۔ ۱۵ر کو پھر حملہ کیا۔ ۱۷ر کو عیدگاہ پر بیڑی جمائی اور یہاں جب انگریز حملہ آور ہوئے تو زبردست تصادم ہوا، بندوقوں کے بعد تلواروں سے دست بہ دست جنگ ہوئی اور جب تک ایک ایک انقلابی سپاہی لڑتا ہوا قتل نہ ہو گیا عیدگاہ پر قبضہ نہ ہونے دیا۔ ۱۸ر کو نصیر آباد کی تازہ دم فوجیں

---

[1] "غدر کی صبح شام" / ۱۳۶

آگئیں۔ تیج اور مرار سے بھی انقلابی فوجیں داخل ہوئیں جو جنرل سدھاری سنگھ اور غوث محمد خاں کی رہ نمائی میں تھیں، ۲۰ کو نصیر آباد کی فوجیں حملہ کرنے نکلیں اور انگریزی فوجوں پر پیچھے سے یعنی سبزی منڈی ہو کر آئیں، اچانک حملہ آور ہوئیں، ان کا حملہ بے پناہ تھا، انھوں نے انگریزوں کی کئی توپیں چھین لیں، پنجابی ریاستوں کی فوجوں نے بار بار ان پر حملہ کیا مگر بری طرح لپسپا ہونا پڑا، رات ہو گئی، مگر گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی، انگریزوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا وہ سوائے توپیں بچانے کے اور کچھ نہ کر سکے۔ ایک انگریز رابرٹ نے لکھا ہے کہ

"باغیوں نے ہمیں بری طرح لپسپا کر دیا تھا"

جنگ آدھی رات تک جاری رہی مگر انقلابیوں کے پاس بارود اور سامان جنگ ختم ہو گیا تھا۔ انگریز میدان سے لپسپا ہو گئے اور اہم مقامات پر انقلابیوں کا قبضہ ہو گیا انھوں نے میگزین لینے کے لیے شہر کو آدمی بھیجے مگر پہرے والوں نے روک لیا۔ مجبوراً یہ فتح مند فوج شہر میں واپس آگئی اور انگریزوں نے ان اہم مقامات کو مدافعت سے خالی پا کر پھر قبضہ کر لیا جو اُن کے ہاتھوں سے نکل گئے تھے اس طرح سے انقلابی فوجوں نے انگریزوں کو اپنے دفاع پر مجبور رکھا اور ایک قدم بھی آگے نہ بڑھنے دیا

جنگِ پلاسی کی یاد

۲۳ جون آگئی —— یہ ملک کی تاریخ میں یادگار دن ہے۔ چناں چہ بہادر انقلابی پوری تیاری اور مردانگی کے ساتھ یہ تہیہ کر کے نکلے کہ آج پلاسی کا بدلہ لیں گے ——

سورج کی ہر کرن اور ہوا کا ہر جھونکا آج پلاسی کی یاد دلا رہا تھا —— جیسے ہی سورج بلند ہوا، انقلابی فوجیں لاہوری گیٹ سے باہر آنا شروع ہو گئیں۔ انگریز بھی آج

کے لیے پوری طرح تیاری کر رہے تھے۔ ان کا ضمیر پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ آج میدان پلاسی کی تاریخی دغابازیوں اور ستم رانیوں کی قیمت ادا کرنا ہوگی —— آج فرزندانِ وطن اپنی قومی شکست و تذلیل کا بدلہ لیں گے —— اور آج کلائیو کے سیاہ کرتوتوں کا حساب چکانا پڑے گا —— انگریزوں کو پنجاب گورنمنٹ سے امداد پہنچ چکی تھی۔ انھوں نے اپنی پچھلی طرف کے تمام پل توڑ دیے تھے مگر یہ باتیں انقلابیوں کے عزم اور ہمت کو نہ توڑ سکتی تھیں چناں چہ وہ سبزی منڈی سے آکر پورے جوش و خروش سے حملہ آور ہوئے، تلوار سے تلوار ٹکرائی، خون کے فوارے چلنے لگے۔ برطانوی انفینٹری نے حملہ روکنا چاہا مگر بار بار دھکیل دی گئی۔ شہر کی فصیل سے توپ خانہ آگ اُگل رہا تھا۔ —— دوپہر بارہ بجے تک گھمسان کی جنگ ہوتی رہی، ایک طرف دشمنانِ وطن کے مسلح دستے، پنجاب سے آئی ہوئی تازہ دم فوجیں —— اور دوسری طرف انقلابیوں کے پُرجوش اور حوصلہ مند دل —— میجر ریڈ محاصرۂ دہلی کی یادداشت میں لکھتا ہے۔

"بارہ بجے باغیوں نے پوری قوت اور ہمت سے حملہ کیا، کوئی بھی ان کی بہادری سے بازی جیت نہ سکتا تھا۔ ایک مرتبہ تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ مجھے لپسا ہونا چاہیے"۔ [1]

انقلابی صفوں میں کوئی ہوشیار اور ماہر جنگ رہ نما نہ تھا۔ صرف وطن کو آزاد دیکھنے کی خواہش اور پلاسی کی قومی تذلیل کا جذبہ ہی ان کو سینہ سپر کیے ہوئے تھا پھر بھی

1. Savarkar – 294.

آج کے مقابلے میں انگریزوں کی تمام امیدیں لوٹنے لگی تھیں لیکن ابھی پنجاب کی تازہ دم فوج باقی تھی چناں چہ اب اس کو میدان میں بھیجا گیا۔ انقلابی فوجیں دن بھر کی جنگ سے تھکی ہوئی تھیں۔ ان کو اب ایک مسلح اور تازہ دم فوج سے سامنا تھا۔ مگر وہ برابر اسی ہمت اور دلیری سے جنگ کرتے رہے یہاں تک کہ شام ہونے پر اپنے مقام پر لوٹے اور کسی فتح و شکست کے بغیر یہ دن تمام ہو گیا۔

انگریزوں کو امداد

۲۷ر کو قدسیہ باغ میں اور ۳۰ر کو سبزی منڈی پر تصادم ہوئے۔ اب انگریزوں کو نئی مدد ملنے لگی تھی۔ اس تازہ امداد کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان پر قبضے کے بعد انگریزوں نے آس پاس کے ملکوں کی آزادی پر بھی ڈاکہ ڈالنا شروع کر دیا تھا، کبھی افغانستان پر چڑھائی کی کبھی ایران پر دوڑے، ابھی جنگ ایران ختم ہوئی تھی کہ چین سے جنگ مول لے لی، اور اب انگریزی فوجیں چین پر چڑھائی کرنے جا رہی تھیں کہ ملک میں آزادی کی جدوجہد شروع ہو گئی۔ چوں کہ دوسرے ممالک پر دست درازیوں کے لیے ہندوستان پر قبضہ رکھنا ضروری تھا لہٰذا یہ فوج بجائے چین کے ہندوستان کو چلنے آگئی۔ لارڈ کیننگ نے مدراس، رنگون اور بمبئی سے بھی تازہ دم فوجیں طلب کر لی تھیں۔

جنرل بخت خاں کی آمد[1]

۲ر جولائی کو صوبے دار محمد بخت خاں اپنے چودہ ہزار کے لشکر اور خزانے کے ساتھ دہلی میں داخل ہوئے۔ ان کا استقبال کرنے کے لیے بہادر شاہ نے اپنے خسر مرشد قلی خاں کو

---

[1] بخت خاں کے مزید حالات روہیلکھنڈ اور اودھ میں ملیں گے۔

شاہدرے بھیجا ان کی فوج کے سپاہی جمنا کا پل پار کر کے پوری فوجی آن بان اور قواعد کے ساتھ بینڈ بجاتے اور رنگ برنگے جھنڈے لہراتے ہوئے کلکتہ دروازے سے داخل ہوئے، انگریزوں کو بھی برابر پنجاب سے امداد مل رہی تھی۔ مگر بخت خاں کی آمد سے انگریزی کیمپ میں کھلبلی پڑ گئی۔ وہ بخت خاں کی بہادرانہ زندگی سے بہ خوبی واقف تھے۔ کیوں کہ جنرل بخت خاں بریلی میں صوبے دار تھے اور اس سے پہلے جلال آباد اور نیمچ وغیرہ میں معزز فوجی عہدے پر رہ چکے تھے۔ ان کے ہمراہ مشہور انقلابی رہ نما پیشوا نانا صاحب کے بھائی بالا صاحب بھی دہلی آئے اور کفن بر دوش مجاہدین کی بھی ایک فوج تھی۔ جس کی رہ نمائی مولانا سرفراز علی کر رہے تھے۔

بخت خاں کا انتظام

اب انتشار اور بدنظمی کا دور ختم ہوا، ضبط و تنظیم کا زمانہ آیا۔ انقلابی فوجوں کو ایک قابل جنگ جو اور بہادر سپہ سالار کی ضرورت تھی۔ بہادر شاہ کو اپنا قوتِ بازو ایک منتظم درکار تھا، اور یہ دونوں جگہیں بخت خاں نے پُر کر دیں۔ بہادر شاہ نے انھیں لارڈ گورنر کا خطاب دیا اور کل انتظامات سپرد کر دیے۔ انھوں نے باغی فوجوں کی کمان سنبھالی، شہر کا انتظام درست کیا، کوتوال کو حکم بھیجا کہ اگر شہر میں بدنظمی ہوئی تو تمھاری خیر نہیں، نمک و شکر سے ٹیکس ہٹایا۔ عوام کو مسلح کیا، اور دوسری اصلاحات جاری کیں۔ مگر عیش پرست مغل شہزادے اُن سے حسد کرنے لگے فوجوں کو ان کے خلاف بھڑکایا بہادر شاہ کے پاس شکایتیں بھیجیں، انگریزوں سے ساز باز کا الزام لگایا۔ ان حالات میں بخت خاں کا دل برداشتہ ہو جانا یقینی تھا۔ انھوں نے بہادر شاہ سے شکایت کی بہادر شاہ نے جواب دیا کہ " مجھے تمھاری وفاداری پر پورا بھروسا ہے۔ افسوس کہ لوگ تمھاری

دل آزاری کرتے ہیں"۔۔۔۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ان باتوں سے دل برداشتہ ہو کر بخت خاں نے صرف بریلی کی فوجوں کو اپنی کمان میں رکھا اور باقی کو چھوڑ دیا۔ مان سنگھ نے پانچ ہزار مسلح سپاہی جمع کیے، ان کو بھی بخت خاں کی کمان میں دے دیا گیا۔

انگریزوں کو شکستیں

بخت خاں نے اپنی تدبیروں کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ وہ ۳ر جولائی کو انگریزی فوج پر حملہ آور ہوئے پھر ہر کو پیچھے سے حملہ کر کے علی پور تک دھکیل دیا۔ انھوں نے انگریزی فوجوں کی رسد کاٹنے کے لیے دستے روانہ کیے۔ ۹ر اور ۱۴ر جولائی کو بھی سخت مقابلہ ہوا۔ اور بخت خاں نے انگریزی فوجوں کو پسپا کیا۔ اِن جنگوں میں انگریزوں کے ایک بڑے افسر ہل کو ایک انقلابی سپاہی نے گھوڑے سے گرا کر مار ڈالا اور اس کے سینے پر کھڑا ہو گیا دوسرے انگریز افسر نے اس کو گولی مار دی تو دوسرا سپاہی جھپٹا اس نے تین انگریزوں کا مقابلہ کیا، ایک کو قتل اور دوسرے کو زخمی کر کے تیسرے کی تلوار سے خود زخمی ہو گیا۔ انگریزوں کو ان مقابلوں میں سخت نقصان اٹھانا پڑا مگر اس شرم ناک پسپائی کا انتقام اُن ہندوستانی مظلوموں کے خون سے لیا جو انگریزی کیمپ میں ادنیٰ ملازموں کی طرح خدمت کر رہے تھے۔[۱]

بخت خاں نے ایک حملے میں تیس ہزاری کا مقام انگریزوں سے چھین لیا ان کے سپاہیوں نے انگریزی کیمپ میں گھس کر حملہ کیا اور بہت سے افسروں اور گوروں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ گھوڑے، اونٹ اور دوسرا قیمتی سامان ہاتھ آیا۔[۲]

1. Kaye and Malleson. vol. II. P. 438
Savarkar - 293

۲۔ غدر کی صبح شام/۱۹۳

۱۲ر جولائی کو اطلاع ملی کہ آگرے میں انگریزوں کو شکست ہوئی اور وہ فرار ہو گئے ۔ بخت خاں نے یہ خوش خبری منادی کے ذریعے تمام شہر میں پہنچا دی اور اگلے دن قلعہ سلیم گڑھ اور جنرل بخت خاں کے کیمپ سے اکتیس[۳۱] توپیں فتح آگرہ کی خوشی میں سر کی گئیں ۔

۲۸ر جولائی کو نصیر آباد اور دہلی کی فوجیں انگریزوں پر حملہ آور ہوئیں ، انگریز پسپا ہوئے اور اپنی توپیں چھوڑ کر بھاگ گئے ۔ جھانسی کی باغی فوج نے بھی بڑی بہادری سے حملہ کیا ۔ مگر انگریزی کیمپ کے ہندوستانی سپاہی انقلابیوں پر ٹوٹ پڑے اور جو مقامات نکل گئے ان پر پھر قبضہ کر لیا ۔

سبز پوش عورت

اس زمانے میں بہادری کی جرأت آموز مثال ایک سبز پوش بوڑھی عورت قایم کر رہی تھی ، یہ دلیر بڑھیا مردانہ لباس پہن کر گھوڑے پر سوار ہوتی شہر کے لوگوں کو جہاد پر آمادہ کرتی ——— "آؤ چلو خدا نے تمھیں بہشت میں بلایا ہے" ——— شہر کے لوگ اس کی مجاہدانہ صدا سُن کر جوق در جوق اس کے ہمراہ ہو جاتے ۔ وہ ان کو لے کر بہادری سے انگریزوں پر حملہ کرتی ، اس کا وار بے پناہ ہوتا ، وہ تلوار اور بندوق سے دشمن کی صفوں میں کھلبلی ڈالتی تھی ۔ اگر اس کے ساتھی بھاگ جاتے تو یہ جنگ جو اور دلیر بڑھیا تنہا جنگ کرتی اور پھر زندہ واپس آجاتی " بعض لوگ چشم دید قصہ کہتے ہیں کہ اس عورت میں غضب کی دلیری تھی ، اس کو موت کا کچھ بھی خوف نہ تھا ، وہ گولوں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں بہادر سپاہیوں کی طرح آگے بڑھتی چلی جاتی ، کبھی اس کو پیدل دیکھا جاتا کبھی گھوڑے پر ، وہ تلوار اور بندوق چلانے میں ماہر تھی ، اس کی جرات اور ہمت دیکھ کر شہر کے

عوام میں بڑا جوش پیدا ہوجاتا تھا"[۱] ——— واپس آکر وہ کہاں جاتی تھی ؟ وہ کون تھی ؟ کسی کو پتا نہ چل سکا۔ آخر ایک دن ماہ جولائی میں (غالباً ۲۷، ۲۸) وہ جنگ کرتی ہوئی انگریزی مورچے کے قریب جا پہنچی مگر زخمی ہوکر گھوڑے سے گری اور گرفتار کر کے انبالے بھیج دی گئی۔ لفٹننٹ ہڈسن نے ڈپٹی کمشنر انبالہ کو ایک خط (۲۹ ؍ جولائی) میں لکھا۔

"میں تمھارے پاس ایک مسلمان بڑھیا کو روانہ کر رہا ہوں۔ یہ عجیب قسم کی عورت ہے۔ اس کا کام یہ تھا کہ سبز لباس پہن کر شہر کے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرتی تھی اور خود ہتھیار باندھ کر ان کی کمان کرتی ہوئی ہمارے مورچے پر حملہ کرتی تھی۔ جن سپاہیوں کا اس سے سابقہ پڑا، وہ کہتے ہیں کہ اس نے بارہا دلیرانہ اور مردانہ حملے کیے اور مستعدی سے ہتھیار چلائے۔ اس میں پانچ مردوں کے برابر طاقت ہے۔ جس روز گرفتار ہوئی اس دن گھوڑے پر سوار تھی اور شہر کے باغیوں کو فوجی ترتیب سے لڑا رہی تھی . . . . . یہ بہت ہی اندیشہ ناک عورت ہے"۔

انگریزوں کو مایوسی

انگریزی کیمپ میں مایوسی پھیلی ہوئی تھی۔ ۱۴ ؍ جولائی کو ان کا ایک مشہور اور بہادر کمانڈر چیمبرلین مارا گیا تھا۔ وہ اب محاصرہ اٹھانے کی تجویز پر بحث کر رہے تھے۔ کمانڈر انچیف جنرل ریڈ بھی مستعفی ہوگیا اور ولسن مقرر ہوا۔ تمام ذرائع آمد و رفت برباد ہوگئے تھے۔ جب وہ انقلابیوں کا

---

[۱] "بیگمات کے آنسو" ۱۲۶

بچھا کرتے تو شہر کی فصیل سے توپیں اتنی آگ اگلتی تھیں کہ ان کے ان گنت سپاہی مارے جاتے لہٰذا ولسن نے حکم دیا کہ پچھانہ کیا جائے۔ ان کو پنجاب سے دو ہزار سپاہ کی مدد اور آگئی تھی۔ بخت خاں نے نجف گڑھ جا کر پڑاؤ ڈالا۔ پھر جنرل سدھاری سنگھ اور غوث خاں بھی اپنی فوجیں لے گئے مگر اس دن سخت بارش ہوئی، توپیں اور بارود خراب ہو گیا۔ انگریزی فوج نے آکر گولہ باری کی بخت خاں کی فوج نے بھی جواب دیا دوسرے دن وہ اپنی فوج لے کر واپس آگئے۔

انقلابیوں کا عہد

جنرل بخت خاں نے جان کی بازی لگادی تھی۔ انھوں نے انگریزوں پر فیصلہ کن حملے کا پلان بنایا، بہادر شاہ سے مشورہ کیا، تمام جنگی سامان اور مقامات کا خود معائنہ کیا (۲۲ر جولائی) فوجوں کو جب ان کا پیغام پڑھ کر سنایا گیا کہ وہ انگریزوں سے آخر دم تک لڑنے کا عہد کریں اور جو اُن میں کم زور دل ہوں وہ اپنے گھر چلے جائیں تو فوج کے ایک ایک فرد کا متفقہ جواب تھا

"خواہ کچھ ہی ہو، ہم آخر دم تک انگریزوں سے لڑیں گے"۔

ذبیحہ پر پابندی

بہادر شاہ نے بخت خاں کے مشورے سے کوتوال کو حکم بھجوایا کہ بقر عید کے موقعے پر جو شخص گائے ذبح کرے گا اس کو توپ سے اڑا دیا جائے گا۔ بخت خاں کی طرف سے کوتوال شہر کے نام ۲۸ر جولائی کو حکم بھیجا گیا کہ گائے ذبح کرنے والے کو موت کی سزا کا اعلان کرا دیا جائے[1]۔

---

1. Matiny Papers. III (c) 31.

کوتوال نے چاندنی چوک کے تھانے دار کو عام اعلان کے لیے ہدایات دیں کہ کوئی مسلمان جو گائے، بیل یا بھینس کی قربانی کرے گا موت کی سزا پائے گا۔ اس کے بعد ۲۹ر جولائی کو بادشاہ کی طرف سے کوتوال کو ہدایت کی گئی کہ ذی الحجہ کی سات سے تیرہ تاریخ تک گائے کا کوئی بیوپاری شہر میں داخل ہونے نہ پائے اور تمام شہر کے مسلمانوں کی گائیں عارضی طور پر لے لی جائیں جو کہ تہوار کے دوران میں کوتوالی میں رکھی جائیں مگر شہر کے کوتوال سید مبارک شاہ خاں (رام پوری) نے جواب میں لکھا کہ کوتوالی میں اتنی جگہ نہیں ہے کہ تمام شہر کی گائیں سما سکیں اور اسی عرضی میں یہ تجویز کی کہ تمام تھانے داروں کو یہ ہدایت کر دی جائے کہ شہر کے مسلمانوں سے گائے ذبح نہ کرنے کا تحریری عہد لے لیں ـــــ ۲۹ر جولائی کو کمانڈر انچیف نے کوتوال کو لکھا کہ تمام قصائیوں کے پاس جتنی کھالیں اور چربی وغیرہ موجود ہے اس کی فہرست روانہ کی جائے ۔[1]

کہا جاتا ہے کہ حکیم احسن اللہ نے اس حکم پر احتجاج کیا اور کہا کہ وہ علماء سے استفسار کریں گے مگر بہادر شاہ اس پر سخت ناراض ہوئے اور اٹھ کر چلے گئے

یہ کیوں ہوا؟ | بعض ناواقف حکیم احسن اللہ کی حمایت کرتے ہوئے بہادر شاہ

---

[1] یہ تمام دستاویزیں اور کاغذات "نیشنل آرکائیوز" نئی دہلی میں محفوظ ہیں اور اُن میں سے کمانڈر انچیف کے فرمان میری نظر سے بھی گذرے ہیں، نیز "ہندوستان ٹائمز" مورخہ ۱۵ اگست میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

2. "Hindustan Times" Aug. 15, 1957

اور بخت خاں پر اعتراض کریں گے کہ ذبیحہ گائے پر موت کی سزا دینا کہاں تک حق بجانب تھا۔ اور قدرتی طور پر یہ سوال ذہن میں پیدا بھی ہوتا ہے کہ آخر اس قدر انتظامات کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟ مگر شاید وہ لوگ حیرت سے سنیں گے کہ انگریز اور اُن کے پٹھو بقر عید کے موقعے سے فائدہ اٹھا کر شہر میں فرقہ وارانہ فساد کرانے کی انتہائی کوششیں کر رہے تھے اور انھیں یقین تھا کہ اس موقعے (یکم اگست) پر ضرور ہندو مسلمانوں میں تفرقہ ڈال کر دہلی فتح کر لیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ حکیم احسن اللہ کی طرف سے اس حکم کی مخالفت کی گئی۔ مگر یہ تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں چناں چہ انگریزوں کی مایوسی اور ناامیدی کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو کرنل کیتھ ینگ نے ۲ اگست ۱۸۵۷ء (اتوار) کو انگریزی کیمپ سے اپنی بیوی کو لکھا۔ وہ لکھتا ہے۔

"بہ ظاہر کل شہر میں زبردست فساد کے لیے ہماری امیدیں پوری نہیں ہوسکیں کم از کم شہر کی خبروں کے متعلق موصول شدہ واحد اطلاع نامے میں اس قسم کا کوئی اشارہ نہیں ہے۔ بادشاہ نے نہ صرف گائے بلکہ بکری تک کی قربانی کی شہر میں ممانعت کر دی ہے، اور اس بات پر اگر عمل کیا گیا تو یہ چیز یقیناً ہندوؤں کو مطمئن کر دینے کے لیے کافی ہے، چناں چہ بجائے اس کے کہ وہ لوگ آپس میں لڑتے، وہ سب ہمارے خلاف ایک متحدہ اور بھرپور حملہ کرنے کے لیے ایک ہو گئے ہیں تاکہ ہمیں برباد کریں اور صفحۂ زمین سے ہمارا نام و نشان بھی مٹا ڈالیں، جب کہ ایسے انتظامات کیے گئے تھے کہ بادشاہ شام کی نماز ہمارے کیمپ میں ادا کرے۔"

اس خط سے ان تمام سازشوں اور ناپاک ریشہ دوانیوں پر روشنی پڑ جاتی ہے۔ جو

غداران وطن کے ذریعے دہلی میں کی گئیں مگر پھر بھی رابرٹ کا یہ بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"اس خاص موقعے (بقر عید - یکم اگست) پر ہندوؤں کا لحاظ کرتے ہوئے قربانی ملتوی کر دی گئی اور اس کی جگہ فرنگیوں کو ختم کرنے کے لیے ہندو مسلمانوں کی زبردست متحدہ کوشش ہو رہی تھی۔ پہلی اگست کی صبح کو مسجدیں اور مندر پُر ہجوم تھے اور تمام لوگ اس زبردست جد و جہد کی کامیابی کے لیے دعا کر رہے تھے۔ شام کو ہزاروں کی تعداد میں ان گنت باغی جوش اور تعصب سے پاگل ہو کر شہر کے دروازوں سے جہاد کے نعرے لگاتے ہوئے نکلے اور آگے بڑھ کر ہمارے دفاع پر حملہ آور ہوئے۔"[1]

غداروں کی کارروائیاں

مختلف مقامات سے اب بھی انقلابی فوجیں رضا کار اور مجاہدین دہلی آ رہے تھے اور بعض جگہوں سے عریضے بھی موصول ہوتے تھے مگر اب خزانے میں روپیہ نہ تھا۔ اُدھر انگریز برابر سازشوں میں مصروف تھے۔ ان کے سیکڑوں جاسوس شہر کے اندر اپنا کام کر رہے تھے۔ انگریزوں نے کچھ پٹھان اس غرض سے بھرتی کیے کہ وہ شہر میں داخل ہو کر انقلابیوں سے جنگ کریں اور اس طرح انگریز حملہ کر کے بہ آسانی قابض ہو جائیں۔ حکیم احسن اللہ نے یہ خبر اڑائی کہ یہ لوگ جہادی ہیں مگر انقلابی افسران پر راز کھل گیا اور یہ اسکیم بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ انقلابی افسران احسن اللہ کو اس غداری کی سزا دینے اس کے

1. Hindustan Times Aug. 15, 1957

گھر پہنچے مگر وہ اپنے گھر سے غائب ہو گیا۔ انگریزوں نے اب ایک اور وار کیا، یعنی ہڈسن نے اپنے چند مخبروں سے وعدہ کیا کہ اگر تم انقلابیوں کا بارود خانہ اڑا دو تو ایک ہزار روپیہ انعام ملے گا چنانچہ ۷ راگست ۱۸۵۷ء کو بارود کا کارخانہ جو شمرو بیگم کی حویلی واقع محلہ چوڑی والان میں تھا، اڑا دیا گیا۔ اور اس کو اڑانے والا جاسوس انگریزوں سے انعام مانگنے بھی نہ آسکا۔ وہ خود بھی اسی میں بھسم ہو گیا تھا۔[1]

باغیوں نے کارخانہ اڑانے کا شبہ احسن اللہ پر کیا اور وہ اس کے قتل کے درپے ہوئے، بہادر شاہ نے چھپا دیا مگر انقلابی کسی طرح نہ مانے، جان بخشی کا وعدہ کر کے گرفتار کیا اور قید کر دیا۔ اس کا گھر لوٹ کر سامان عام مجمع کے سامنے جلا دیا گیا۔ شہر میں خوف و ہراس تھا، باغیوں نے متعدد جاسوسوں کو گرفتار کیا مرزا الٰہی بخش برابر ان جاسوسوں کی حمایت اور امداد کرتا رہا اور بہتوں کو جہنم رسید ہونے سے بچایا۔

انقلابیوں کو مایوسی

انقلابی صفوں میں اب مایوسی کی لہر دوڑنے لگی تھی، خزانہ خالی تھا۔ کارخانہ اڑ جانے سے سامان جنگ کی بھی قلت ہو گئی، فوجوں میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی۔ جنرل بخت خاں اور سردھاری لال نے ۱۲ راگست کو بھی انگریزوں پر حملہ کیا۔ فوج کی تنخواہ کے لیے مشورہ ہوا جس میں مرزا مغل، مرزا خضر سلطان، راجہ دیوی سنگھ، سالگ رام مہاجن، رام جی داس اور راے گنجا رام وغیرہ شامل تھے، باہمی مشورے کے بعد ڈیڑھ لاکھ روپیہ جمع کرنے کا وعدہ کیا گیا کیوں کہ فوج اب اس قدر تنگ تھی کہ تنخواہ نہ ملنے پر شہر لٹ جانے کا خطرہ تھا۔ اس دوران میں انگریزوں سے برابر تصادم ہوتے رہے۔ دن بھر لڑائی ہوئی مگر اب پانسا باغیوں کے حق میں نہیں پڑتا تھا مغل شہزادے اپنی خرمستیوں سے اب بھی باز نہ آئے

[1] غدر کی صبح شام / ۸۴

وہ مہاجنوں اور دوسرے لوگوں سے فوج کے نام پر لاکھوں روپیہ وصول کرتے اور خود ہضم کرجاتے، لہٰذا مہاجنوں کو حکم ہوا کہ وہ جنرل بخت خاں سے گفتگو کریں اور مغل شہزادوں سے واسطہ نہ رکھیں۔ بہادر شاہ خود بھی مختلف مورچوں پر جاکر گولہ باری کا معائنہ کرتے تھے مگر فوج میں تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے بڑی بے اطمینانی تھی چناں چہ بہادر شاہ نے کچھ زیورات اور جواہرات اپنے حرم سے لاکر ان کے حوالے کرنا چاہے لیکن افسران نے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا۔

"ہم شاہی زیورات کو ہاتھ نہیں لگائیں گے لیکن ہمیں یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ آپ ہمیں قائم و برقرار رکھنے کے لیے اپنی جان و مال دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے"

زرد کوٹھی کا مورچہ

ان ہی دنوں میں کشمیری دروازے کے باہر نصف میل دور انقلابیوں نے زرد کوٹھی میں مورچہ بنایا اور گولہ باری کی جس سے انگریزوں کو سخت نقصان پہنچتا تھا۔ نصیر آباد والی فوج اس مورچے کی حفاظت کررہی تھی۔ جب اس کی ڈیوٹی تبدیل ہوئی تو نصیر آباد کے سپاہیوں نے پہرے والوں سے ہوشیار رہنے کی ہدایت کی۔ انھوں نے جل کر جواب دیا —— "بھیئن تم سپاہی ہو ہمو سپاہی نہیں" —— مگر رات ہوئی تو بجائے پہرہ دینے کے مزے سے پڑکر سو گئے۔ ادھر مخبروں نے انگریزوں کو خبر کر دی چناں چہ گورے اور گورکھے ننگے پاؤں پہاڑی سے اترے اور دبے پاؤں آکر پہلے تو ان سونے والوں کے ہتھیار اٹھا لیے پھر توپوں پر قبضہ کرکے ان کو بیدار کیا اور بری طرح مارنا شروع کیا۔ یہ بدحواس ہوکر بھاگے، انگریزی فوج نے پیچھا کیا، یہاں کشمیری دروازے کے باہر نصیر آباد والی فوج

پڑی تھی اُس نے اچانک گوروں پر گولیوں کی بوچھاڑ کی ادھر سیاہ برج اور کشمیری دروازے کی توپیں فوراً آگ اُگلنے لگیں۔ انگریزوں کو جان بچانا مشکل ہوگیا۔ ان کے سیکڑوں آدمی ہلاک اور زخمی ہوئے اور واپس بھاگ گئے مگر زرد کوٹھی کا مورچہ قبضے میں آگیا اور انھوں نے توپوں کا رخ شہر کی طرف پھیر کر گولہ باری شروع کر دی۔[1]

مایوسی

۲۸ اگست کی رات کو انگریزوں نے کشن گنج والے مورچے پر حملہ کیا۔ تمام فوج کو مسلح کر دیا گیا تھا۔ کیوں کہ عام حملے کا خطرہ تھا۔ ۲۹ اگست کو انگریزی توپوں نے تمام دن شہر پر گولہ باری کی۔ اطلاع ملی کہ انگریز باوڈیر نئے مورچے بنا رہے ہیں جن سے تمام شہر کو تباہ کیا جا سکتا ہے۔ بہادر شاہ نے جنگی کونسل کا جلسہ طلب کیا اور صورت حال پر غور کیا گیا۔ مگر اب حالات بد سے بدتر ہو چلے تھے۔ سپاہی اناج کی کمی سے تنگ تھے۔ مزید بارود دستیاب نہ ہو سکتی تھی۔ تاجروں نے کہہ دیا کہ "نہ ہمارے پاس گندھک ہے اور نہ گندھک کے لیے روپیہ"۔ مہاجنوں سے روپیہ مانگا گیا تو انھوں نے کہا کہ "شہزادے تقریباً چار لاکھ وصول کر چکے اب ہم میں سکت نہیں"۔ فوجی افسروں اور شہزادوں میں تکرار ہوئی۔ بہادر شاہ نے کہا کہ وہ اپنا سامان بیچ کر فوج کی تنخواہ ادا کریں گے۔ روپے کی اس قدر کمی تھی کہ بخت خاں تک کو اپنے کچھ ہاتھی اور گھوڑے فروخت کرنا پڑ گئے۔ فوج کا ماہوار خرچ پانچ لاکھ تہتر ہزار تھا۔ ان حالات میں بھی انقلابیوں کی ہمتیں پست نہ تھیں چناں چہ انگریز ۳ ستمبر کو پل اڑانے کا ارادہ کر رہے تھے مگر دو ہزار سپاہیوں نے

---

[1] "داستانِ غدر"

پسپا کر دیا[1]- انگریزوں نے کابلی دروازے کے سامنے مورچہ بنایا تو کشمیری اور کابلی دروازے سے شدید گولہ باری نے پرخچے اڑا دیئے۔

بہادر شاہ کا خط والیانِ ریاست کو

۴ ستمبر کو بہادر شاہ نے جے پور، جودھ پور، الور، بیکانیر کے راجوں کو دستخطی چٹھیاں بھیجیں۔ انھوں نے لکھا "میری دلی خواہش ہے کہ فرنگی جس طرح بھی ہو، ہر قیمت پر ہندوستان سے نکال دیئے جائیں اور ملک آزاد ہو لیکن آزادی کی جنگ اس وقت کام یاب ہو سکتی ہے جب ایک قابل شخص جو تحریک کا تمام بار اپنے کاندھوں پر لے کر منتشر قوتوں کو منظم کر سکے اور اس بغاوت کی رہنمائی کے لیے آگے بڑھے۔ میں ذاتی طور پر حکومت کی کوئی خواہش نہیں رکھتا۔ اگر تم دیسی راجگان اپنی تلواریں دشمن کو نکالنے کے لیے بے نیام کرنے کو تیار رہوں تو میں ان کے حق میں شہنشاہی سے مستعفی ہو جاؤں گا جو اس کام کے لیے منتخب ہوں[2]۔ مگر ان رجواڑوں کو ملک کی غلامی کا احساس نہ تھا بستم تو یہ ہے کہ وہ غیر جانب دار بھی نہ تھے بلکہ انگریزوں پر روپیہ اور فوج کی بارش کر رہے تھے۔ دھول پور کے راجہ نے پندرہ سو پیدل، کچھ سوار اور چھ توپیں بھیجیں، بیکانیر نے تین ہزار راجپوت بھرتی کر کے بھیجے۔ راجہ نالی گڈھ نے ایک ہزار گورکھے روانہ کیے۔ جموں کا راجہ بھی فوج بھیج رہا تھا۔ غرض ۶ ستمبر تک تمام نئی، تازہ دم اور مسلح فوجیں انگریزی کیمپ میں آگئیں اور انھوں نے مورچے بنانا شروع کر دیے۔ ادھر انقلابی کیمپ میں کوئی ایسا افسر نہ تھا جو تمام فوجوں کو اکٹھا کر کے ان کی کمان کرتا، افراتفری اور

---

[1] "غدر کی صبح شام"/ ۲۲۲ [2] غدر کی صبح شام/ ۲۴۲

انارکی کا عالم تھا۔ فوجی اخراجات کے لیے آٹھ لاکھ روپے کی ضرورت تھی مگر آٹھ روپے بھی جمع نہ ہو سکتے تھے۔

انقلابیوں کی جاں بازی

مختلف مقامات کے جہادی، جو حفاظت دین وطن کے لیے سروں سے کفن باندھ کر آئے تھے، اگرچہ جذبۂ شہادت سے سرشار تھے مگر بدن پر ثابت کپڑے بھی نہ تھے اور بھوکے مرتے تھے ایک رات کو انگریزوں نے سیاہ برج کے مقابل لکڑی کی ٹال میں آگ لگادی۔ برج والے کچھ نہ سمجھ سکے۔ انگریزوں نے اس آگ کے دھوئیں میں اپنا مورچہ بنا کر چالیس قلعہ شکن توپیں لگادیں اور اچانک گولہ باری شروع کردی (۸ستمبر) قدسیہ باغ اور لڈلو کیسل ۸ستمبر ہی کو ان کے قبضے میں آچکے تھے، ۱۰ستمبر تک انھوں نے قدسیہ باغ اور کسٹم کی کوٹھی میں بھی مورچے بنالیے اور شہر پر دن رات گولے برسنے لگے۔ ادھر سے انقلابی بہادر بھی پوری شدت سے جواب دے رہے تھے۔ انھوں نے بھی ہر انگریزی توپ کے مقابلے میں ایک توپ قایم کردی تھی اور اتنی شدید آگ برسائی کہ دشمن کے چھکے چھڑادیے۔ آخر کار مسلسل گولہ باری سے ۱۲ کو سیاہ برج کا مورچہ ٹوٹ گیا انگریزی فوج نے آگے بڑھ کر کابلی دروازے پر بھی توپیں لگادیں۔ ۱۲ کو اعلان کیا گیا تھا کہ بہادر شاہ آج خود حملے کی کمان کریں گے۔ یہ سن کر تقریباً دس ہزار آدمی کشمیری دروازے کے قریب جمع ہو گئے اور آدھی رات تک انتظار کے بعد منتشر ہوئے کیوں کہ تمام شہر کے لوگوں کو حملے کی دعوت دی گئی تھی۔ ۱۳ کو پھر ایسی ہی منادی کی گئی انگریزوں نے اپنے جاسوس بھیج کر پتہ چلالیا کہ فصیل میں شگاف پڑ چکے ہیں اس لیے ۱۴ستمبر کی صبح کو وہ ان ہی شگافوں سے داخل ہو گئے،

انھوں نے فوج کو چار حصّوں میں تقسیم کیا۔ تین دستے نکلسن کی رہ نمائی میں بائیں طرف اور ایک ریڈ کی رہ نمائی میں دائیں طرف کابلی گیٹ کی طرف بڑھے۔ گولہ باری بند ہو چکی تھی۔ جیسے ہی نکلسن کی فوج دیواروں کی طرف بڑھی انقلابی توپوں نے آگ برسائی، انگریز ایک دوسرے پر ڈھیر ہو گئے، لاشوں کے انبار لگ گئے۔ پھر بھی ان میں سے کچھ سیڑھی لگا کر دیوار تک پہنچ گئے۔ دوسری طرف واٹر بسچین (آبی مورچہ) کے مورچے پر خوف ناک دست بہ دست جنگ ہو رہی تھی ایک دستے نے کشمیری گیٹ کا ایک حصہ بارود سے اڑا کر راستہ بنا لیا تھا۔ کشن گنج میں جو دستہ داخل ہوا اس کو دکانوں میں شراب کے ذخیرے مل گئے۔ وہ پی پی کر مست ہو گیا اور انقلابیوں نے اچھی طرح ٹھکائی کر دی انگریزی دستہ یہاں سے پسپا ہو کر بھاگا اور باڑہ ہندوراؤ کی طرف چلا گیا۔ میجر ریڈ کے دستے پر سبزی منڈی میں اتنا زبردست حملہ ہوا کہ وہ پسپا ہونے کو تھا مگر ہوپ گرانٹ مدد کو آگیا۔ ریڈ زخمی ہو گیا اور انقلابیوں نے ہر طرف خون کے دریا بہا دیے۔ انگریزوں کو ایک قدم بڑھنا دشوار تھا۔ عید گاہ پر انگریزی فوج بری طرح پسپا ہوئی۔ کابلی گیٹ سے نکلسن آگے بڑھ رہا تھا مگر شہر کا ہر مکان ایک مورچہ تھا، ہر کوچہ گڑھی بن گیا تھا۔ چاروں طرف در و دیوار سے مسلسل گولیاں برس رہی تھیں۔ اور یوں گرم جوشی سے انگریزوں کا استقبال ہو رہا تھا! یہیں ایک گلی میں کئی انگریز افسران مارے گئے۔ نکلسن کے بھی گولی لگی اور انقلابی سپاہیوں نے اُسے لات مار کر زمین پر لڑھکا دیا۔ یہ خوف ناک گلی ہر انچ پر ایک انگریز کی بھینٹ لے رہی تھی۔ مجبوراً انگریزی دستہ یہاں سے گھبرا کر بھاگا اور کشمیری گیٹ چلا گیا۔
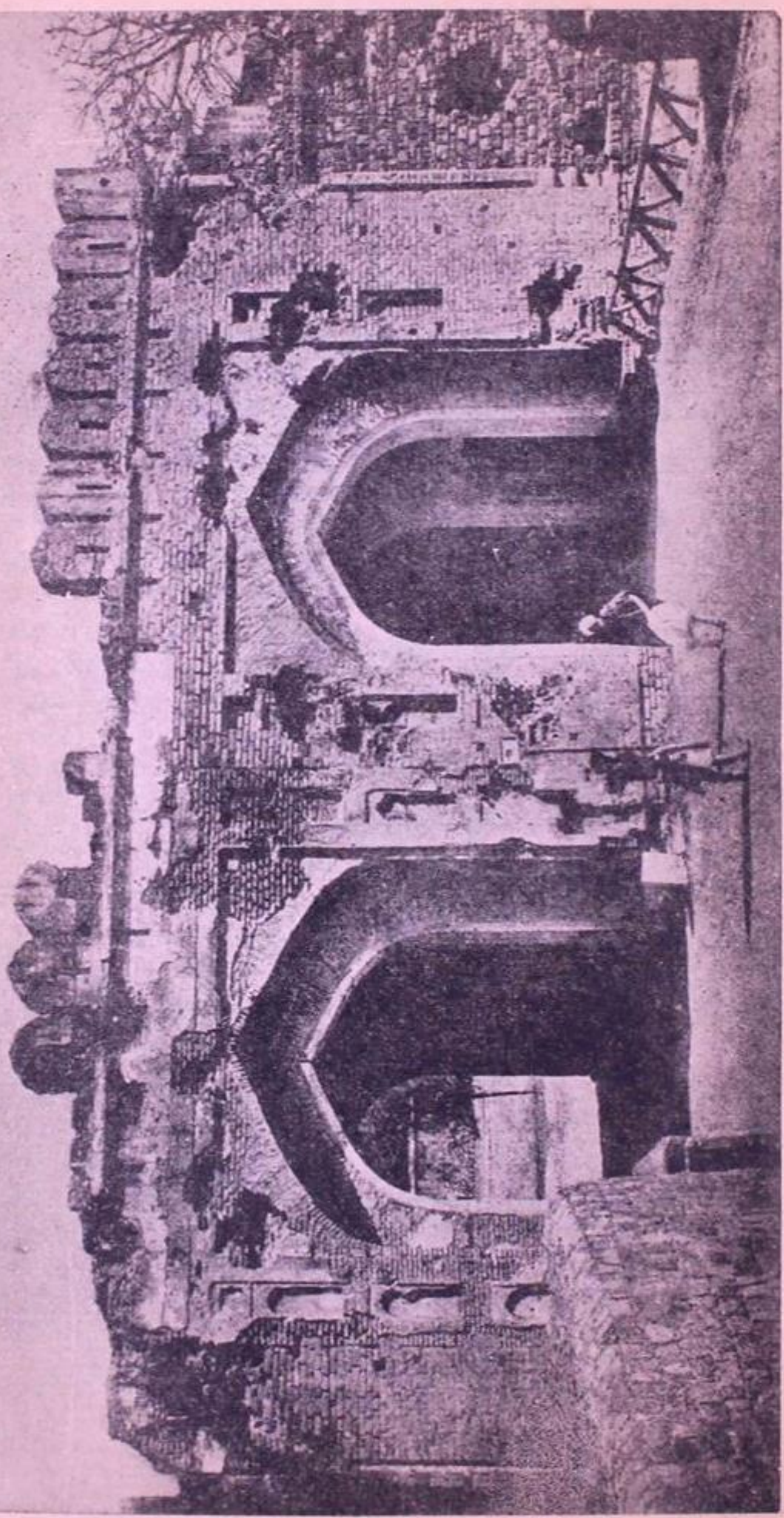
کشمیری دروازہ دہلی :- جس کے شکستہ درودیوار زبانِ حال سے انقلابیوں کی جرأت و بہادری کی ولولہ انگیز داستان سنا رہے ہیں

جامع مسجد پر جنگ

ایک اور کالم جامع مسجد تک پہنچ گیا تھا۔ آدھ گھنٹے تک اس دستے نے کمک کا انتظار کیا۔ مسجد میں ٹھہرے ہوئے مسلمانوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ فوج آرہی ہے تو ایک شخص نے مکبّر پر چڑھ کر للکارا

"تمہارے امتحان کا وقت آگیا..... تم میں کون ہے جو اپنی جان نثار کرنا چاہتا ہے؟ دشمن سامنے کھڑا ہے جس کو مرنا ہو وہ میرے ساتھ شمالی دروازے کی طرف آئے اور جسے جان پیاری ہو وہ جنوبی دروازے سے چلا جائے کہ ادھر دشمن نہیں ہے"۔

"اللہ اکبر" کے نعروں نے بام و در لرزا دیے۔ مجاہدین تلواریں کھینچ کر تیار ہو گئے اور ایک بھی جنوبی دروازے کی طرف نہیں گیا۔ جیسے ہی وہ شمالی دروازے سے نکلے انگریزی فوج نے گولیوں کی باڑھ ماری۔ دو سو شہید ہو کر گر پڑے مگر انگریزی فوج کو دوسری بار گراب مارنے کی مہلت نہ ملی اور یہ لوگ، جن کے پاس صرف تلواریں تھیں ان کے سر پر جا پہنچے۔ بے پناہ حملے کیے، دست بہ دست جنگ ہوئی۔ انگریزی فوج اس مجاہدانہ جذبے کی تاب نہ لاکر بھاگنے لگی۔ شہر کے لوگ جو اُن کے ہاتھ آیا، حتیٰ کہ پلنگ کی پٹیاں تک لے کر نکل پڑے۔ ان مسلمانوں نے انگریزی فوج کا پیچھا کیا اور کشمیری دروازے کے گرجا تک نکال دیا۔ دہلی میں جامع مسجد اور گرجا (سینٹ جیمس) آج بھی اُن بہادروں کی جاں بازی کا تصور پیش کرنے کے لیے موجود ہیں! ۔ کاش اگر ہر دل میں یہی دلیرانہ جذبہ اُبل پڑتا تو دہلی کی سرزمین ایک بار پھر دشمنانِ وطن سے پاک ہو جاتی۔

انقلابی فوجوں میں اختلاف

اس طرح ابھی تک صرف شہر کا ایک

چوتھائی حصہ دشمن کے قبضے میں آیا تھا۔ انقلابیوں نے شہر میں توپیں لاکر انگریزوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ ابھی تک وہ بڑی تعداد میں موجود تھے اور انگریزوں کو مقابلے کے لیے للکار رہے تھے مگر اب انقلابی حلقوں میں یہ اختلاف رونما ہوگیا تھا کہ دہلی کو چھوڑ دیا جائے یا نہیں۔ ایک طبقے کا خیال تھا کہ یہاں سے ہٹ کر کسی مناسب مقام پر جنگ جاری کی جائے جب کہ دوسرا گروہ کہتا تھا کہ ـــــــ

"چاہے ہم میں سے ایک ایک ختم ہو جائے، مگر ہم دہلی نہیں دیں گے"۔

دوسری طرف انگریزی کیمپ میں بھی محاصرہ اٹھا لینے کی تجویزیں تھیں کیوں کہ آج ان کے سیکڑوں سپاہی اور مشہور افسر مارے گئے تھے مگر انگریزوں نے متفقہ طور پر جمے رہنے کا فیصلہ کیا جب کہ انقلابی کسی ایک بات پر متحد نہ ہو سکے۔ اُن میں سے بہت سے تو دہلی سے چلے گئے اور باقی نے وہیں ختم ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ انگریزوں نے پہلے دن اس طرح منھ کی کھا کر رات کو اچانک حملہ کیا اور یکایک سوتے ہوؤں کو گھروں میں گھس گھس کر ہلاک کرنا شروع کر دیا، اچانک کشت و خون کا بازار گرم ہونے سے ہر شخص بدحواس ہوگیا۔ دلیر انقلابیوں نے ایک ایک انچ پر ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ایک دو دن نہیں ـــــــ ۱۵ ستمبر سے ۲۰ تک مسلسل[1]! انگریزی فوجوں کے داخلے (۱۴ ستمبر) سے پانچ دن تک برابر خوں ریزی ہوتی رہی، ہر کوچہ و بازار میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ دہلی کے در و دیوار انقلابی خون سے لالہ زار ہوتے جاتے تھے۔ اور بہادر باغی ـــــــ جو ہتھیار ڈالنے یا ہٹ جانے کی بجائے وہیں جان دینے کا اٹل فیصلہ کر چکے تھے ـــــــ پروانہ وار نثار ہو رہے تھے۔

---

1. Savarkar - 342

آخر کار تمام انقلابی فوجیں دروازوں سے باہر ہوگئیں کیوں کہ انگریزوں نے اپنا ایک دستہ اُس راستے سے بھیجا جہاں سے حملہ کرنا نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر انقلابی فوجوں نے تمام طاقت اسی طرف لگا دی تو انگریزی فوجیں دوسرے راستے سے آسانی سے داخل ہوگئیں۔ آخر میں دہلی دروازہ اور اجمیری دروازہ انقلابیوں کے پاس رہ گیا تھا، مگر ۲۰ ستمبر تک مکمل انگریزی قبضہ ہوگیا۔ شہر کے عوام لاکھوں کی تعداد میں باہر نکل کر جہاں پناہ پا سکتے تھے چلے گئے۔

جنرل بخت خاں اور بہادر شاہ

۱۹ ستمبر کی رات کو بخت خاں بہادر شاہ کے پاس آئے، اُن کو سمجھایا اور ہمت دلائی۔ انھوں نے کہا۔

"اگرچہ انگریزوں نے دہلی کو لے لیا ہے لیکن اس سے ہمارا کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا ہے۔ تمام ملک ہمارے ساتھ ہے۔ ہر شخص کی نظر آپ کی ذات پر لگی ہوئی ہے آپ میرے ساتھ تشریف لے چلیں میں پہاڑوں میں بیٹھ کر ایسی مورچہ بندی کروں گا کہ انگریزوں کا فرشتہ بھی نہ آسکے گا۔ دہلی پایۂ تخت ہے، فوجی قلعہ نہیں ہے۔ لڑائیوں کے لیے ایسے مقامات مناسب نہیں ہوتے۔ چند مہینے جو ہم نے مقابلہ کیا یہ بھی کچھ معمولی بات نہیں۔ ہمارا شہر نشیب میں تھا اور انگریز پہاڑی پر۔ کوئی ناتجربہ کار فوج بھی پہاڑی جیسے مضبوط مورچے پر ہوتی تو فتح دشوار نہ تھی۔ پھر سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ حضور کے صاحب زادے مرزا مغل کمانڈر انچیف بنا دیے گئے، وہ لڑائی کے فن سے ناواقف تھے۔ اگر وہ میرے کاموں میں رخنہ نہ ڈالتے اور میرے منصوبوں میں حارج نہ ہوتے تو یقیناً

اسی خود سر فوج سے دشمن کو شکست دیتا ..... ہم کو آپس کے بگاڑ اور ایک دوسرے پر بھروسا نہ کرنے کے سبب وہ قوتیں جو دشمن کے مقابلے میں صرف ہوتیں خانگی جھگڑوں میں بے کار ضایع کرنا پڑیں مگر اب بھی کچھ نہیں گیا ہے ..... تمام ہندوستانی ریاستیں چپ چاپ بیٹھی ہیں۔ جس وقت ہمارا پلہ ذرا بھی بھاری ہوگا وہ ہماری مدد کے لیے اٹھ کھڑی ہوں گی ..... آپ یقین کیجیے کہ اگر آپ محفوظ مقامات سے انگریزوں کا مقابلہ کریں گے تو تمام ملک ساتھ دے گا، آدمی، رسد، ہتھیار اور روپیہ ہم کو اس افراط سے مل سکتے ہیں کہ انگریز اپنے ملک کے بچے بچے کو ہم پر چڑھا لائیں تب بھی ہم صدیوں تک ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں.... جہاں پناہ کے سامنے یہ عرض کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے کہ حضور کے باپ دادا نے اس سے بڑھ بڑھ کر شکستوں اور ناکامیوں کا مقابلہ کیا ہے ....." [1]

بہادر شاہ اس تقریر سے بہت متاثر ہوئے اور اگلے دن اُن سے ہمایوں کے مقبرے میں ملنے کو کہا۔ مگر الٰہی بخش کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ بہادر شاہ کو انقلابی فوج کے ساتھ نہ جانے دے۔ اور وہ منشی رجب علی کے ذریعے تمام خبریں انگریزی کیمپ میں پہنچا رہا تھا بخت خاں کے جاتے ہی بہادر شاہ کے پاس آیا اور نہایت چکنی چپڑی باتیں کیں، بڑھاپے کا احساس دلایا، برسات کے دل آزار موسم کی دہائی دی، چھوٹے چھوٹے شہزادوں شہزادیوں اور بیگمات کی تکلیفوں کا نقشہ کھینچا، انگریزوں سے معاملات کی صفائی کرانے کی ذمے داری لی شاہی خاندان کو محفوظ رکھنے کا یقین دلایا۔ اُس نے کہا:

---

[1] "دہلی کی جانکنی" ۳۷، ۳۸

"مجھ کو ذرا بھی یقین نہیں کہ باغی کسی جگہ جم کر مقابلہ کر سکیں گے۔ بخت خاں

بہادر نے جو کچھ کہا اس کو تو میں مانتا ہوں۔ بے شک ہندوستان کی ریاستیں اور

عوام دل سے آپ کے ساتھ ہیں لیکن میں یہ نہیں مانتا کہ باغی فوج آپ کے یا بخت خاں

کے قابو میں رہ سکے گی......"

بہادر شاہ یہ باتیں سن کر خاموش ہو گئے وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے تو ایک خواجہ سرا نے کہا۔

"حضور!۔ صاحب عالم (الٰہی بخش) تو انگریزوں سے ملے ہوئے ہیں۔ آپ

بخت خاں بہادر کی گذارش پر توجہ فرمایئے۔ مرنا اور تکلیف اٹھانا تو زندگی

کے ساتھ ہے"۔

بہادر شاہ یہاں سے ہمایوں کے مقبرے میں چلے گئے۔ مقبرے جانے سے پہلے وہ درگاہ حضرت نظام الدینؒ میں گئے ــ سلطنت مغلیہ کا آخری تاجدار جس کے باپ دادا نے ہندوستان پر اپنی حکومتوں کے اَن مٹ نشان چھوڑے ہیں، تین وقت کے فاقے سے تھا۔ اُف وہ زار و نزار بوڑھا درگاہ حضرت نظام الدینؒ میں مزار کے تکیے سے لگا بیٹھا ہے۔ سفید داڑھی پر گرد و غبار ہے چہرہ اترا ہوا ہے، مایوسی اور ہراس کا عالم ہے۔ درگاہ کے متولی سے مانگ کر بیسنی روٹی اور سرکے کی چٹنی کھا رہا ہے ــ!!

الٰہی بخش نے ہر ہر بات کی اطلاع انگریزوں کو دے دی۔ اس کو حکم ملا کہ ۲۴ گھنٹے بادشاہ کو روکے۔ بخت خاں پھر بہادر شاہ سے آ کر ملے، بہت دیر بحث و تکرار رہی، بہادر شاہ جانا چاہتے تھے مگر الٰہی بخش روک رہا تھا۔ اس نے بخت خاں سے تلخ انداز میں کہا:

"لارڈ گورنر صاحب!۔ کل آپ نے فرمایا تھا کہ میں حضور کو ہر تکلیف سے محفوظ

رکھوں گا تو کیا اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ جہاں پناہ کی آڑ میں آپ خود حکومت
کرنا چاہتے ہیں .... آپ مغلوں سے صدیوں کا انتقام لینا چاہتے ہیں....
میں جانتا ہوں آپ پٹھان ہیں اور پٹھان سیکڑوں برس تک کینے کو نہیں بھولتے"
یہ بے ہودہ گفتگو سن کر بخت خاں نے اپنی تلوار پر ہاتھ ڈالا اور قریب تھا کہ اس کا سر اڑادیں مگر شاہ نے روک کر کہا۔

"بہادر۔ مجھے تیری ہر بات کا یقین ہے اور میں تیری ہر رائے کو دل سے پسند
کرتا ہوں مگر جسم کی قوت نے جواب دے دیا ہے اس لیے اپنا معاملہ تقدیر کے
حوالے کرتا ہوں مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دو ، بسم اللہ کرو۔ یہاں سے جاؤ۔
اور کچھ کام کرکے دکھاؤ، میں نہیں، میرے خاندان میں سے نہیں، نہ سہی ، تم یا
کوئی اور ہندوستان کی لاج رکھے، ہمارا فکر نہ کرو اپنے فرض کو انجام دو"۔

بہادر شاہ گرفتار

بخت خاں مایوس ہو کر چلے گئے تو الٰہی بخش نے ہڈسن کو اطلاع دے دی اور وہ گرفتار کرنے کے لیے آپہنچا بہادر شاہ نے الٰہی بخش کو گھور کر دیکھا —— "تم نے مجھ کو بخت خاں کے ساتھ جانے سے روکا، اگر انگریزوں کو مجھ سے کچھ سروکار نہیں تھا جیسا کہ تم نے کہا تو وہ گرفتار کرنے کیوں آئے ہیں" —— ؟ —— یہ غدار کیا جواب دیتا، سر جھکائے چپ چاپ کھڑا رہا انھوں نے بخت خاں کو بلانا چاہا مگر وقت گذر چکا تھا۔ ہڈسن نے جاں بخشی کا وعدہ کیا اور بہادر شاہ نے اپنی بیگم زینت محل اور بیٹے جواں بخت کی زندگی اس کے ہاتھوں میں دے دی وہ ان سب کو گرفتار کرکے لاہوری دروازے سے شہر میں داخل ہوا، چاندنی چوک میں ہوتا ہوا قلعے میں لے گیا۔ ہڈسن اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ "میں بادشاہ کو

مردہ لانا بہ نسبت زندہ لانے کے زیادہ بہتر سمجھتا تھا "۔ ولسن بھی قتل کردینے کا حامی تھا مگر ابھی تمام ملک میں بغاوت کے شعلے بھڑک رہے تھے ہندو مسلمان اپنے ملک کی آزادی کے لیے خوں ریز جنگ کر رہے تھے۔ اس لیے مصلحت اسی میں سمجھی گئی کہ بہادر شاہ کو زندہ رکھا جائے۔ افواہ تھی کہ پیشوا نانا صاحب بہادر شاہ کو رہا کرانے کے لیے دہلی آئیں گے اس لیے انگریز حکام نے خفیہ ہدایات جاری کر دی تھیں کہ اگر ایسا ہو تو بہادر شاہ کے فوراً گولی مار دی جائے۔[1]

شہزادے

بہادر شاہ کی گرفتاری کے بعد الٰہی بخش اور رجب علی کے ہمراہ ہڈسن شہزادوں کو گرفتار کرنے آیا۔[2] شہزادوں نے بھی جان کی امان چاہی مگر ہڈسن نے کہا کہ ــــ " انھیں غیر مشروط طور پر آجانا چاہیئے "۔ شہزادے اس جواب پر برافروختہ ہوئے۔ ان کے رفیقوں نے بھی یہی صلاح دی کہ تیموری خاندان کے لوگ اس طرح مجبور ہو کر قید نہیں ہوا کرتے، تلوار اٹھاتے ہیں اور لڑتے ہیں، پھر یا قسمت یا نصیب کا معاملہ ہوتا ہے ...... ہم کو بھی دلیرانہ کام کرنا چاہیئے۔ ہڈسن اور اس کے سو سواروں کو ہم تھوڑی دیر میں شکست دے سکتے ہیں۔ مرنا ہی ہے تو بہادری کی موت کیوں نہ مریں " مگر الٰہی بخش پھر سمجھانے بیٹھ گیا اور شہزادوں کو مقابلے سے باز رکھا۔ ہڈسن اُن سب کو لے کر روانہ ہوا۔ راستے

1. Charles Ball - II - P. 184

[2] بعض تاریخوں میں ہے کہ شہزادوں کی گرفتاری دوسرے دن ہوئی۔ مگر یہ بات قرین قیاس نہیں ہے۔

میں ان کو رتھوں سے اتار کر اپنے ہاتھ سے قتل کیا ۔ یہ شہزادے مرزا مغل، مرزا ابوبکر، مرزا خضر سلطان، مرزا عبداللہ وغیرہ تھے ــــ صرف یہی نہیں ــــ دنیا کے تمام ظالموں اور سفاکوں کو شرم سے گردن جھکا لینا چاہیے کہ اس گرگ دہن آلود نے شہزادوں کا خون پیا[1] ــــ!! ــــ پھر ان کے سروں کو خوان میں رکھ کر بہادر شاہ کے سامنے لایا کہ ــــ

"یہ ہے آپ کی وہ نذر جو بند ہو گئی تھی"

"الحمد للہ! تیمور کی اولاد اسی طرح سرخ رو ہو کر باپ کے سامنے آیا کرتی ہے" ــــ بہادر شاہ کے الفاظ تھے ــــ ان **شہزادوں** کو کوتوالی پر اور ان کے سر جیل خانے کے خونی دروازے پر لٹکائے گئے ۔ اور پھر دریا میں پھینک دیے گئے ۔

بہادر شاہ کا انجام

مظلوم بہادر شاہ پر جنوری ۱۸۵۸ء میں مقدمہ چلایا گیا لال قلعے کا حکم راں آج لال قلعے کے دیوان خاص میں مجرموں کے روپ میں آیا ۔ مقدمے میں ان کو مجرم ثابت کیا گیا، بہادر شاہ کے وکیل کو جوابی تقریر کا حق بھی نہ دیا گیا، اور اس طرح یہ انوکھا مقدمہ فیصل کر کے ان کو جلا وطن کر دیا، یعنی، ۱۸/اکتوبر ۱۸۵۸ء کو رنگون بھیج دیا گیا ۔ ان کے ہمراہ زینت محل اور جواں بخت بھی تھے ۔ وہ گیروا لباس پہنے ہوئے تھے، داڑھی آنسوؤں سے تر تھی، دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے ۔ رنگون میں زندگی کے یہ آخری دن اس بوڑھے مظلوم نے کس طرح گذارے ــــ خود اسی کی زبانی سنیے:

---

[1] "دہلی کی جانکنی" / ۵۲

شمع جلتی ہے پر اس طرح کہاں جلتی ہے
ہڈی ہڈی مری اے سوزِ نہاں جلتی ہے

آخر کار رنگون کے اس سنسان اور چھوٹے سے بنگلے میں ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو نواسّی سال کی عمر میں انتقال کیا۔ وہیں ان کو دفن کر دیا گیا۔ ۱۸۸۶ء میں زینت محل کا بھی انتقال ہو گیا اور اپنے شوہر کے پہلو میں سپردِ خاک ہوئیں۔ دونوں قبریں کچی اور شکستہ تھیں، بیری کا درخت سایہ کر رہا تھا، وہ چوں کہ گھوڑ دوڑ کا میدان بنا دیا گیا تھا اس لیے وہ شکستہ قبریں بھی پامال ہو گئیں اور مظلوم ظفر کی یہ پیشین گوئی پوری ہو کر رہی۔

"پس مرگ قبر پر اے ظفر کوئی فاتحہ بھی کہاں پڑھے
وہ جو ٹوٹی قبر کا تھا نشاں اُسے ٹھوکروں سے اڑا دیا"

بہادر شاہ کی قبر

بہادر شاہ کے ساتھ رنگون جانے والوں میں زینت محل کے علاوہ جواں بخت، کلثوم زمانی، رونق زمانی اور جواں بخت کا ننھا بچہ جمشید بخت شامل تھے۔ جواں بخت کے استاد حافظ محمد ابراہیم وغیرہ کل پینتیس آدمی تھے۔ ان سب کو وہاں کے عوام و خواص سے دور رکھا گیا۔ کیوں کہ انگریزوں کو ڈر تھا کہ کہیں یہاں ۱۸۵۷ء کی یاد تازہ نہ ہو جائے۔ حتیٰ کہ طوائفوں کو سختی سے منع کر دیا گیا کہ وہ بہادر شاہ کی غزلیں نہ گایا کریں۔ بہادر شاہ اور ان کے ساتھیوں کا قیام اس مقام پر ایک بنگلے میں تھا جہاں اب مقبرہ بنا ہوا ہے۔ ۱۹۳۴ء میں اس سڑک کا نام ایک وکیل کی تجویز پر میونسپلٹی نے "ظفر شاہ روڈ" رکھ دیا۔

جب بہادر شاہ کا انتقال ہوا تو ان کی موت کو نہایت پوشیدہ رکھا گیا۔ اور چپکے سے وہیں دفن کر دیا گیا۔ جواں بخت مولمین (برما) بھیج دیے گئے اور انھوں نے وہیں ۱۸۸۴ء میں انتقال کیا۔ ان کی قبر کا کچھ پتہ نہیں۔ ان کے بیٹے جمشید بخت نے انگریزی تعلیم حاصل کی تھی وہ عام طور پر گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتے تھے اور رنگون سنٹرل جیل کے سامنے ایک لکڑی کے بنگلے میں رہتے تھے انھوں نے ایک شادی رنگون میں بھی کی تھی اور غالباً ۱۹۰۶ء میں ایک لڑکا سکندر بخت پیدا ہوا جو آج کل موجود ہے۔ جمشید بخت کا ۱۹۲۱ء میں انتقال ہو گیا۔ لوگوں نے چاہا کہ ان کو بہادر شاہ کے پہلو میں دفن کر دیا جائے مگر حکومت نے اس کی بھی اجازت نہ دی کیوں کہ اس زمانے میں تحریک خلافت کا زور تھا اور ۱۸۵۷ء کے پھر لوٹ آنے کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ لہٰذا تاجوے قبرستان میں دفن ہوئے، رونق زمانی نے ۳ر اپریل ۱۹۳۰ء کو انتقال کیا۔

بہادر شاہ کی موت کے بعد بھی وہاں سے پہرہ نہ ہٹایا گیا اور وہ انیسویں صدی کے آخر تک رہا۔ کسی کو قبر پر جانے کی اجازت نہ تھی چناں چہ رفتہ رفتہ قبر کا نشان بھی مٹ گیا۔ اکتوبر ۱۹۰۳ء میں ایک صاحب نے قبر کا کھوج نکالا اور اس پر گنبد وغیرہ بنوانا چاہا مگر حکومت اس پر بھی تیار نہ تھی، اسے یہ بھی گوارا نہ تھا کہ کوئی اور شخص یا جماعت ایسا کرے۔ بڑی مشکل سے اجازت ملی اور پبلک چندے سے موجودہ کٹہرا اور قبر بنوائی گئی (غالباً ۱۹۲۱ء سے پہلے)[۱]

ظفرؔ احوال عالم کا کبھی کچھ ہے، کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیشتر یاں تھے

---

[۱] سال نامہ "دورِ جدید" رنگون ۱۹۵۶ء

آگرہ ڈویژن اور علی گڈھ

آگرہ آگرے کے عوام بھی بغاوت کی خفیہ تیاریوں اور انقلابی سرگرمیوں میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ مولانا احمد اللہ شاہؒ کے دورے اور تقریروں نے اُن کو غلامی کا احساس دلا کر بیدار کر دیا تھا۔ مولانا نے یہاں کے علماء کو بھی اس طرف متوجہ کیا اور ان کی ایک باقاعدہ جماعت "مجلس علماء" کے نام سے بنائی تھی یہاں ڈاکٹر وزیر خاں[1] (سب اسسٹنٹ سرجن) جیسے انگریزی تعلیم یافتہ لوگ بھی خفیہ انقلابی تحریک سے وابستہ تھے اور مولانا فیض احمد بدایونی بھی یہیں سرگرم عمل تھے۔

---

[1] ڈاکٹر وزیر شرفائے اداغنہ ساکن بہار سے متعلق تھے۔ والد محمد نذیر زمیندار۔ انگریزی تعلیم مرشد آباد اور ڈاکٹری انگلینڈ میں پڑھی۔ عبرانی اور یونانی زبان سیکھی۔ عیسائیت کا مطالعہ کیا، آگرے میں تقرر ہوا، پادریوں سے مناظرے کیے، کتابیں لکھیں، مجلس علماء کے رکن تھے (شہابی: غدر کے چند علماء) وہ شہزادہ فیروز کے ہمراہ رہے اور غالباً اسی کے ساتھ مکہ معظمہ چلے گئے۔

۱۱ رمئی کو میرٹھ میں بغاوت کی خبریں پہنچنے پر عام طور پر دہشت و ہراس بڑھ گیا اور ساتھ ہی انقلابی سرگرمیاں تیز ہوگئیں، اس دوران میں ۳۰ رمئی کو دو پلٹنیں جو خزانے کی حفاظت کے لیے متھرا بھیجی گئی تھیں باغی ہوکر دہلی چلی گئیں، لہٰذا اگلے دن باقی ہندوستانی سپاہ سے ہتھیار چھین لیے گئے کیوں کہ اس کے بھی بغاوت کرنے کا امکان پیدا ہوگیا تھا۔ گوالیار میں بغاوت کے بعد آگرے کی گوالیار کنٹنمنٹ بھی باغی ہوگئی۔ ۳ رجولائی کو انگریزوں نے قلعے میں پناہ لی۔ یہاں کی بغاوت کو ایک مسلم تحریک سمجھ کر انگریز افسروں نے مذہبی اختلافات کو ہوا دینے کے لیے متھرا اور بھرت پور کے جاٹ اور مرہٹہ دستے مقرر کرنا چاہے، دونوں راجاؤں نے اگرچہ اپنے آقا کے اشارے پر سرِ تسلیم خم کیا مگر بھرت پور کے دستے تو منظم اور ہتھیاروں سے پوری طرح مسلح نہ تھے اور گوالیار کے دستوں پر انگریزوں کو بھروسا نہ تھا کہ وہ "وفادار" رہیں گے۔ ۵ رکو نیمچ اور نصیر آباد کے انقلابی آگرے پہنچے اور موضع سوچتیہ میں کالی ندی پر انگریزی فوجوں سے ایک خوں ریز جنگ میں فتح پاکر شہر میں داخل ہوئے، عوام نے تمام بنگلوں اور دفتروں میں آگ لگادی، بعض ذرایع سے معلوم ہوتا ہے کہ آگرے پر حملہ کرنے والی فوجوں کی رہ نمائی شہزادہ فیروز شاہ کر رہا تھا جو کہ وسط ہند سے اس طرف آیا تھا[1]۔ لیکن "قیصر التواریخ" کی عبارت ظاہر کرتی ہے کہ شہزادے نے شکست دہلی کے بعد آگرے پر حملہ کیا، ڈاکٹر سین نے بھی یہی لکھا ہے اور غالباً یہی زیادہ صحیح ہے کہ شہزادہ کے ساتھی ۶ راکتوبر ۱۸۵۷ء کو آگرے میں داخل ہوئے مگر چار دن بعد دہلی سے انگریزی

---

[1] مثلاً انتظام اللہ شہابی کی کتاب "غدر کے چند علما" میں یہی لکھا گیا ہے

فوجیں گریتھیڈ کی رہنمائی میں پہنچیں اور انقلابیوں کو منتشر ہونا پڑا۔ فتح پور سیکری کا سردار لال خاں میواتی بھی کہا جاتا ہے کہ شہزادے سے آملا تھا۔ فتح پور سیکری کے میواتی کافی عرصے تک بغاوت کرتے رہے فتح پور سیکری بالآخر جلا دیا گیا[۵]۔ اور ۱۴ر فروری ۱۸۵۸ء کو انقلابیوں کی آخری پارٹی نکالی جا سکی، میواتی تباہ کر دیے گئے۔ آگرے پر حملے کے بعد (جولائی) باغی فوجیں بھرت پور گئیں، یہاں کی بھی فوج باغی تھی، افسران قتل ہوئے اور بنگلوں میں آگ لگی۔

فتح گڈھ اور فرخ آباد

۱۸ر جون کو بغاوت کر کے انقلابی سپاہیوں نے فرخ آباد کے نواب تفضل حسین[۲] خاں کو اپنا حاکم بنالیا عوام کے جذبات بے حد مشتعل تھے، جناں چہ ہومز نے یہ اقرار کیا ہے کہ صوبے کے شمال و مغرب کے کسی علاقے میں اتنے جوشیلے اور امن دشمن لوگ موجود نہ تھے جتنے کہ فرخ آباد میں ——— فتح گڈھ میں۔ جو فرخ آباد سے تین میل دور ہے۔ رجمنٹ ۱۰ نے سب سے پہلے بغاوت کی، خزانے پر قبضہ کر لیا۔ اور کھلم کھلا باغیانہ خیالات ظاہر کیے۔ آخرکار ۱۴ر جون کو بغاوت شروع ہو گئی۔

۱۸ر جون کو ایک اور رجمنٹ باغی ہو گئی ۱۱، ادھر سیتاپور میں بغاوت کے بعد باغی فوج یہاں آپہنچی اور جیل توڑ کر قیدی رہا کیے گئے۔ نواب تفضل حسین خاں کو اکیس توپوں کی سلامی دی گئی، سرکاری عمارتیں اور انگریزی بنگلے جلا دیے گئے۔

[۵] تاریخ آگرہ / ۳۲

[۲] فرخ آباد کے نواب تفضل حسین خاں نصرت جنگ کے بیٹے تجمل حسین خاں کے بھتیجے تھے جن کے کوئی لڑکا نہ تھا۔ ۱۴ر دسمبر ۱۸۴۶ء کو تخت نشیں ہوئے۔ ۱۸۵۷ء میں ان کے پاس تیس ہزار کے قریب لشکر تھا۔

باغیوں نے قلعے میں پناہ گزیں انگریزوں کا محاصرہ کرلیا، سیڑھیاں لگاکر قلعے میں داخل ہونے کی کوشش ناکام ہوئی تو گولہ باری کی، پھر گولیاں اس قدر برسائیں کہ انگریزوں کی تین بڑی توپیں بے کار کر دیں[1] کئی بار سرنگ بناکر قلعے کو اڑانے کی کوشش کی پھر ایک اور توپ لگائی اور انگریزوں کی دو اور توپیں بے کار ہو گئیں۔ انقلابیوں کی یہ ہمت اور استقلال دیکھ کر محصور انگریزوں کا، جو اب تک مقابلہ کر رہے تھے دل ٹوٹ گیا اور وہ ۳ر جولائی کی رات کو چپکے سے کشتیوں میں بیٹھ کر بھاگے، جیسے ہی قلعے کی دیوار سے آگے بڑھے گولیاں برسنے لگیں باغیوں نے بھی کشتیوں میں بیٹھ کر پیچھا کیا گاؤں والوں نے گولیاں برسائیں، بچے ہوئے انگریز بہ مشکل بھاگ سکے۔

علی گڑھ کا برہمن

علی گڑھ میں نمبر ۹ پیادہ رجمنٹ مقیم تھی اور اسی کے کچھ دستے مین پوری اور اٹاوہ میں بھی تھے۔ انگریزوں کو اس رجمنٹ پر سب سے زیادہ بھروسا تھا، تاہم بلند شہر کے بازاروں میں یہ افواہ تھی کہ خفیہ انقلابی جماعتیں بغاوت کی تیاری کر رہی ہیں۔ مئی ۱۸۵۷ء میں ایک برہمن چھاؤنی میں آیا اور اس نے سپاہیوں کو برات کے جلوس کی شکل میں نکل کر اچانک بغاوت کرنے اور دہلی چلنے کی ترغیب دی۔ کسی بھی سپاہی کو انگریزی حکومت سے کوئی ہمدردی نہ تھی مگر اس پلان پر اختلاف تھا اس لیے مباحثہ شروع ہو گیا۔ اس دوران میں تین سپاہیوں نے انگریز حکام تک خبر پہنچادی، برہمن گرفتار ہوا اور علی گڑھ بھیج دیا گیا جو فوجی رجمنٹوں کا بڑا ہیڈ کوارٹر تھا۔ طے ہوا کہ ۲۰ر مئی کو تمام دیسی فوج کے سامنے

---

[1] کنہیا لال / ۲۳۶

اُسے پھانسی دی جائے۔ برہمن کو بغاوت پھیلانے کے جرم میں پھانسی ہوئی اور ہندوستانی سپاہیوں کا خون نہ کھولے۔ یہ کیسے ممکن تھا؟ چناں چہ انھوں نے آپس میں مشورے کیے، بات چیت کی، محب وطن برہمن کا کردار انھیں دین اور دیش کی حفاظت کے لیے پکار رہا تھا، ۲۰ مئی کا فیصلہ کن دن بھی آپہنچا۔ تمام ہندوستانی سپاہی پرے جما کر کھڑے کیے گئے، کچھ دیر بعد ان کے سامنے بہادر برہمن کا مردہ جسم پھانسی کے پھندے میں لٹک رہا تھا، اس خاموش مردہ جسم نے غیرت مند سپاہ کے جذباتِ بغاوت کو شعلوں میں تبدیل کرنے کا وہ کام انجام دیا جو کبھی برہمن کے الفاظ سے بھی نہ ہوا ہوگا جذبۂ بغاوت سے بھرا ہوا ایک سپاہی اپنی جگہ سے آگے بڑھا، تلوار میان سے کھینچی اور برہمن کے مردہ جسم کی طرف اشارہ کرکے چلایا

"دوستو! یہ شہید خون میں نہا گیا۔ یہ ہمارے دین پر قربان ہوگیا"۔![1]

سپاہی کے یہ الفاظ سلگتی آگ پر تیل بن کر گرے۔ اس کے اُبلتے ہوئے جذبات نے ہر دل میں آگ لگا دی انھوں نے اپنی تلواریں میان سے کھینچ لیں، اُن کے چہرے غصے اور جوش سے سرخ ہوگئے اور وہ فرنگی راج کی بربادی پر تُل گئے۔ انگریز حکام تو یہ دیکھ کر پہلے ہی تھر تھرا اٹھے تھے چناں چہ رات ہونے نہ پائی تھی کہ وہ چُپ چاپ علی گڈھ سے نکل گئے اور اس طرح برہمن نے زندہ رہ کر نہ سہی مگر مر کر انگریزی اقتدار کا جوا علی گڈھ کی گردن سے چشم زدن میں اتار پھینکا۔

مولانا جلیل علی گڈھ کی بغاوت میں مولانا عبد الجلیلؒ[2] نے بھی اہم حصہ لیا ہے۔ وہ اپنے پانچ ہزار ساتھیوں کے ساتھ میدان میں

[1] سین ۲۲۳، ساورکر ۱۶۱ [2] مفصل تذکرہ علیحدہ باب میں ہے۔

آگئے تھے۔ تقریباً دو ماہ بعد جولائی میں آگرے کی جانب سے انگریزی فوجوں نے چڑھائی کی تو مولانا نے نڈر اک کی سڑک پر مقابلہ کیا اور شہید ہوئے۔ آپ کی دیگر شہیدوں کی قبریں، علی گڈھ جامع مسجد کے شمالی حصے میں واقع ہیں۔ اور یہ "گنجِ شہیداں" کہلاتا ہے۔

علی گڈھ میں انگریزی قبضے کے بعد جو ہولناک ظلم وستم اور قتل و غارت ہوا وہ زبان یا قلم سے بیان نہیں ہو سکتا کہا جاتا ہے کہ چوراہا عبدالکریم اور پھول چوراہا پر پھانسیاں نصب تھیں۔

راجہ تیج سنگھ

علی گڈھ آزاد ہونے کی خبریں جب ۲۳ مئی کو مین پوری اور اٹاوہ میں پہنچیں تو یہاں کے عوام نے بھی بغاوت کا فیصلہ کرلیا۔ برہمن کے واقعے سے وہ جوش اور غصے سے پاگل ہو چکے تھے۔ یہاں کے حکام نے ایک شخص راجے ناتھ سنگھ کے جیونتی جانے کی خبر سنی یہ شخص میرٹھ کی بغاوت میں حصہ لے چکا تھا چناں چہ اس کی گرفتاری کے لیے کچھ سپاہی بھیجے گئے مگر انھوں نے اسے گرفتار کرنے کے بجائے حفاظت کے ساتھ جیونتی (JIVANTI) سے ہٹا دیا اور افسران سے آکر کہہ دیا کہ وہاں اس نام کا کوئی نہیں۔ علی گڈھ آزاد ہونے کے بعد مین پوری میں بھی انگریزی راج ختم ہو گیا اور باغی سپاہی خزانہ اور میگزین لے کر دہلی چلے گئے۔

یہاں کے راجہ تیج سنگھ انقلابیوں کے ساتھ تھے۔ جب ہوپ گرانٹ کا کالم اکتوبر ۵۷ء میں یہاں سے گذرا تو ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن پھر فوراً واپس آئے اور انگریزوں کے حامی بھوانی سنگھ کو بھگا دیا جس نے آگرے میں پناہ لی۔

آخر کار اپریل ۱۸۵۸ء میں انھوں نے مین پوری کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا انھوں نے اٹاوہ پر حملے کا ارادہ بھی کیا تھا مگر فوج کم ہونے کی وجہ سے ایسا نہ کیا۔

اٹاوہ میں بھی اسی زمانے میں بغاوت کے آثار تھے۔ چناں چہ کلکٹر اوہیوم نے ایک خاص فوج بنائی اور سڑکوں پر تعینات کیا۔ ۱۹ مئی کو کچھ میرٹھ کے سپاہی اس فوج کو ملے جن سے ہتھیار رکھنے کے لیے کہا گیا۔ انھوں نے بظاہر تو رکھ دیے مگر پھر اچانک اٹھا کر انگریزوں کو قتل کر دیا اور ایک مندر میں پناہ لی، یہ خبر سن کر ڈینیل کچھ فوج لے کر آیا۔ اور مندر پر حملے کا حکم دیا مگر سوائے ایک کے اور کوئی تعمیل کرنے کے لیے نہ بڑھا اور ڈینیل کے ساتھ ہی اس کے اس کالے غلام کا بھی گولیوں سے خاتمہ ہو گیا۔ ۲۲ مئی کو یہاں تمام دیسی فوج نے بغاوت کی، انگریزی کیمپ پر حملہ کیا، خزانہ لوٹا، جیل توڑا اور دہلی روانہ ہو گئی۔ انھوں نے انگریز عورتوں اور بچوں کا قتل عام نہیں کیا اور وہ لوگ بہ حفاظت یہاں سے نکل گئے۔ کلکٹر اوہیوم زنانے لباس میں فرار ہوا۔ [1]

---

1. Savarkar - 165
   Sen - 322

پنجاب اور سندھ

عام حالات

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بعد پنجاب میں سکھوں کا شیرازہ منتشر سا ہو گیا تھا۔ پھر بھی ان میں لاکھوں بہادر جنگ جو اپنی آزادی کے لیے سر بہ کف تھے۔ انگریزوں سے پہلی جنگ میں ان کو شکست کھانا پڑی۔ (سنہ ۴۶-۱۸۴۵ء) مگر انھوں نے اس خوبی سے مقابلہ کیا کہ دشمن کے دانت کھٹے کر کر دیے۔ مول راج اور شیر سنگھ نے متعدد مقامات مثلاً ملتان، مدکی، فیروز شہر، جلیوال، سوبراؤں، جلیانوالہ اور گجرات میں انگریزی فوجوں کو اکثر موقعوں پر شکست دی، لیکن آخری جنگ نے سکھوں کی قوت کو بالکل توڑ دیا (بمقام گجرات فروری سنہ ۱۸۴۹ء) اُدھر ملتان پر گولہ باری کر کے مول راج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا گیا اور اس طرح پنجاب انگریزوں کے قبضے میں آ گیا تھا مگر زندہ دلانِ پنجاب اپنی آزادی غصب ہونے پر تلملا رہے تھے چناں چہ سر چارلس نیپر کے بیان کے مطابق سنہ ۱۸۵۰ء میں پنجاب کی پوری فوج میں بغاوت کا زہر سرایت کر چکا تھا۔ البتہ سکھوں نے جو اس قدر بہادری سے لڑے تھے انگریز کے خلاف نہ صرف سرکشی نہ کی بلکہ امداد کی۔

چناں چہ:

"وہی جاں باز سپاہی جنھوں نے فیروز شہر اور چلیانوالہ پر برطانوی قوت کو جڑ بنیاد سے ہلا ڈالا تھا، اب آکر برطانوی جھنڈے تلے جمع ہونے لگے تھے اور ان ہی نے دہلی فتح کرنے میں برطانیہ کی امداد کی"[1]

الحاقِ پنجاب کے بعد نابالغ دلیپ سنگھ کو لندن بھیج کر عیسائی بنایا گیا، راجہ کی جاگیرات عمارات اور زیورات تک کمپنی کے لٹیروں نے ہتھیا لیے، "کوہِ نور" ہیرا انگلستان بھیج دیا گیا جو اس لوٹ میں ہاتھ لگا تھا، اہل پنجاب سے اسلحہ چھین لیے گئے۔

جب ملک میں آزادی کی جدوجہد شروع ہوئی تو پنجاب میں بھی شورش و بغاوت کے آثار نظر آنے لگے، فوج بغاوت پر تیار تھی۔ رابرٹ منٹگمری اور سر جان لارنس نے ایک برہمن جاسوس مقرر کیا جس نے خبر دی کہ "تمام سپاہی ہمہ تن بغاوت میں ڈوبے ہوئے ہیں"۔ انگریز یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بغاوت کس قدر منظم طریقے سے نہ صرف شمالی صوبوں میں بلکہ پنجاب میں بھی پوری طرح موجود ہے۔ منٹگمری نے فوراً میاں میر چھاؤنی کی سپاہ کے ہتھیار چھین لیے کیوں کہ دوسرے مقامات یعنی پشاور، امرت سر، پھلور، جالندھر وغیرہ کی فوجیں اس انتظار میں تھیں کہ میاں میر کی فوجیں لاہور کے قلعے پر حملہ آور ہوں تو وہ بھی کھڑی ہو جائیں، لدھیانہ کے علماء، تھانیسر کے پنڈت برہمن اور دوسرے خفیہ کارکن برابر گھوم رہے تھے، اور عوام میں بغاوت کا پرچار کر رہے تھے۔ مگر پنجاب کے ان حالات سے بروقت فائدہ نہ اٹھایا جا سکا ورنہ انگریزوں کو خود اقرار ہے کہ:

---

[1] مارشل مین / ۲، ۴۰

"اگر پنجاب چلا جاتا تو ہم برباد ہو جاتے اور جب تک دوسرے صوبوں سے مدد آتی یہاں انگریزوں کی ہڈیاں تک دھوپ میں پڑی پڑی سڑ چکی ہوتیں" [1]

پنجاب کے سکھوں میں عام طور سے یہ پیشین گوئی مشہور تھی کہ وہ ایک دن دہلی فتح کریں گے، انگریزوں نے اس کو اس طرح مشتہر کرایا کہ "وہ سکھ اور انگریز دہلی فتح کریں گے" اس کے علاوہ پنجاب کے سکھوں اور جاٹوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا، ایک جھوٹا اشتہار نکالا جس میں بتایا گیا تھا کہ شہنشاہِ دہلی نے پہلا فرمان سکھوں کے قتلِ عام کے لیے جاری کیا ہے۔ علاوہ ازیں سکھوں اور دوسرے طبقوں میں یہ بھی پروپیگنڈا کیا کہ پنجاب کو انگریزوں کے لیے فتح کرنے میں پوربی علاقے کے لوگوں نے نمایاں حصہ لیا ہے اور اب اُن سے جنگ کرنا گویا پنجاب کی شکست کا بدلہ لینا ہے۔ اس تمام پروپیگنڈے نے بڑا کام کیا اور سکھ انگریزوں کے ساتھ ہو گئے خود انگریزوں کو اقرار ہے کہ اگر سکھ ساتھ نہ دیتے تو ان کو کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔

لاہور

لاہور میں ۱۳ مئی کو گورا فوج کی سنگینوں اور توپ خانے سے گھیر کر ہندوستانی فوجیوں کے ہتھیار چھین لیے گئے حالانکہ بغاوت کے آثار ظاہر نہیں ہوئے تھے مگر "بہادر" انگریز افسران تو سزا دینے کے لیے بے چین تھے، لہٰذا ۹ جون کو دو سپاہیوں کو توپ سے اڑا دیا گیا لیکن جذبۂ آزادی کی چنگاریاں یوں نہیں دبا کرتیں، ۳۰ جولائی کو ۲۶ رجمنٹ آمادہ جنگ ہو گئی ہوا یہ کہ

1. "Life of Lord Lawrance" II, P. 335
Also qouted by Savarkar.

اس دن سخت آندھی آئی اور ایک شخص پرکاش سنگھ اپنی تلوار ہلاتا ہوا باہر آیا۔ اس نے اپنی پلٹن کو للکارا کہ فرنگی کو نیست و نابود کر دیں، اس نے میجر کو قتل کر دیا۔ سخت آندھی کی وجہ سے ہندوستانی سپاہی گھبرا کر بھاگ نکلے۔ اس فوج کے بغاوت کرنے کا امکان نہ تھا کیوں کہ وہ بالکل نہتے تھے، مگر ان سے کیا سلوک ہوا؟ —— دریائے راوی کو پار کرتے وقت انگریز فوج اور ان کے ایک "وفادار" نے ان بے قصوروں پر حملہ کیا، ان کا پیچھا کیا، گوروں اور سکھوں نے ان نہتوں پر گولیاں چلائیں تقریباً ڈیڑھ سو کو اس طرح ہلاک کرنے کے بعد، ۲۹۰ آدمیوں کو یہ جھانسا دے کر گرفتار کیا گیا کہ تمھیں مارا نہیں جائے گا مگر اگلے دن (یکم اگست) ۱۱۵ کو پھانسیاں دے کر ان لاشوں سے ایک کنواں پاٹ دیا گیا۔

"کال کوٹھری"

باقی ۲۸۲ آدمیوں کا کیا حشر ہوا؟ —— کاش وہ بھی گولیوں ہی سے اڑا دیے جاتے —— انھیں بھی پھانسی ہی دے دی گئی ہوتی مگر کانپ اٹھے ہوں گے زمین و آسمان یہ دیکھ کر کہ ان مظلوموں کو ایک تنگ و تاریک برج میں بند کر دیا گیا —— اگلے دن جب باری باری باہر لائے گئے اور دس دس کی قطاریں کھڑا کر کے گولی سے اڑا دیے گئے، ایک شخص یہ نظارہ دیکھ کر بے ہوش ہو کر گر پڑا —— جب ۲۳۷ کو اس طرح ختم کیا جا چکا تو باقی ۴۵ آدمی اس تنگ و تاریک برج سے باہر لائے گئے جو خوف، گرمی اور گھٹن سے دم گھٹنے سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہلاک ہو چکے تھے۔ کئی ان میں نیم مردہ حالت میں سسک رہے تھے مگر ان سب کو بھنگیوں کے ہاتھوں ویران کنوئیں آباد کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ یہ کسی ہندوستانی کے بیانات نہیں، کسی ہندو یا مسلمان کی من گھڑت کہانی

نہیں۔ انگریز مورخ جان گے کے بیان کردہ واقعات ہیں، امرت سر کے مجسٹریٹ کوپر کے چشم دید حالات ہیں اور ایڈورڈ تھامپسن کے قلم سے تحریر ہوئے ہیں[۱] جب کہ اخبار "ٹائمز" کی رپورٹ کے بہ موجب —

"رپورٹوں سے تصدیق ہو چکی ہے کہ باغی بالکل نہتے تھے اور طوفان سے ڈر کر بھاگ گئے تھے اور محاصرے کے وقت ان کی حالت نیم مردہ انسانوں کی سی تھی"۔

یہ تو سزا بھاگنے والوں کو ملی، اور ہم اگر مان لیں کہ ان نہتوں نے بھاگ کر برطانوی سامراج کے خلاف "بغاوت" کی تھی۔ مگر جو نہیں بھاگے تھے ان کو کس جرم میں توپ سے اڑا دیا گیا؟[۲]۔

کہاں ہیں وہ خوش فہم —! جو کہتے ہیں کہ انگریزوں کا ظلم و ستم ان کے ہم قوموں کے خون کا بدلہ تھا؟ ۔ان بے قصوروں نے کس انگریز کے سوئی چبھوئی تھی؟ کس گورے کے نکسیر پھوڑی تھی؟ —— اور کس سفید عورت کو گھورا تھا۔؟؟۔ پھر ایڈورڈ تھامپسن لکھتا ہے۔

"میں نے کوپر کی کتاب سے بعض سنگین واقعات کو نقل کیا ہے لیکن ان سے بھی زیادہ سنگین واقعات کو پھر بھی چھوڑ دیا ہے"۔

کوپر کی اس "فتح" پر مبارک باد پیش کی گئی۔ سر جان لارنس کی طرف سے اور رابرٹ منٹگمری کی جانب سے تہنیت کے پیغامات بھیجے گئے۔

۱؎ "انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ" ۵۰/ یہ واقعہ اجنالہ کے مقام پر پیش آیا

۲؎ " " " " " ۵۲/

روہتک

۲۲ مئی کو دہلی سے کچھ انقلابی دستے روہتک روانہ ہوئے اور ۲۴ کو وہاں پہنچ کر خزانے پر حملہ آور ہوئے، یہاں کی ہندوستانی سپاہ ان کے ساتھ ہوگئی اور خزانے کے پہرے داروں نے بھی اپنے ہم وطن انقلابیوں کا ساتھ دیا جیل سے قیدی رہا کیے گئے۔ شہر میں بھی ہنگامہ ہوا، انگریز افسران کے مکانات جلادیے گئے؛ افسران بھاگ نکلے۔ انقلابیوں نے نواب جھجر کی حکومت کا اعلان کر دیا۔

شملہ

۱۵ مئی کو گورکھا فوج نے انبالے جانے سے انکار کر دیا اور شام کو بغاوت کی خزانے اور میگزین پر قبضہ کر لیا۔ وہ بے حد بگڑے ہوئے تھے۔ انگریز افسران اپنی پلٹنیں اور سامان چھوڑ کر راتوں رات فرار ہو گئے۔ مگر بعد میں کمانڈر برگ کو بھیجا گیا اور گورکھوں نے بغاوت ختم کر دی۔

سیالکوٹ

پورے صوبۂ پنجاب میں دلیری کی روشن مثال غالباً سیالکوٹ کے انقلابیوں نے قایم کی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بہادر انقلابی فوجوں نے اپنے دیش اور دین کے دشمنوں سے آخر دم تک خوں ریز جنگ کی۔ چناں چہ ایک انگریز کا بیان ہے کہ یہاں ۔

"باغی ایسے خوں خوار ہو گئے تھے کہ ان سے زیادہ کوئی نہ ہو گا"۔

مگر ساتھ ہی اس کو یہ بھی اقرار ہے کہ انھوں نے انگریز عورتوں اور بچوں پر ہاتھ تک نہیں اٹھایا بلکہ صرف افسران کو قتل کیا[1]۔ اگر کسی نے انگریز عورتوں کو ستانے کا ارادہ بھی کیا تو دوسروں نے ان کی جانیں بچائیں باغ کے دروازے پر اعلان آویزاں کیے

---

[1] "محاربۂ عظیم" ۱/۲۷۸

گئے ایک میں لکھا تھا:

"انگریز بدمعاشوں کے نام۔

یقین رکھو پنجاب تمھارا کبھی نہ ہوگا، تمھاری ایک ایک ہڈی یہیں ٹوٹے گی۔

اگر بھلا چاہتے ہو تو فرنگستان کا رخ کرو......" [۱]

یہاں کے انقلابی منظم ہو کر مشرقی سمت میں روانہ ہو گئے۔ ترموگھاٹ پر دریائے راوی کو پار کرتے وقت انگریزوں سے تصادم ہوا۔ باغیوں کے پاس صرف ایک توپ تھی اور انگریز فوج کے پاس کئی توپیں اور نیا ساز و سامان بہ کثرت تھا اس پر بھی انقلابی فوجوں نے قیامت کی گولہ باری کی، گولیوں کا بے پناہ مینھ برسایا اور انگریز فوج کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ سخت جنگ کے بعد کچھ باغی تو پسپا ہو گئے لیکن باقی اب بھی دریا کے ایک جزیرے میں اپنی جگہ قایم تھے اور انگریزی فوج کا بدستور ہمت اور دلیری سے مقابلہ کر رہے تھے۔ انگریز دریا پار کر کے جزیرے میں پہنچے مگر انقلابی ایک انچ بھی نہ ہلے، جم کر مقابلہ کیا، شدید گولہ باری کی۔ جب گورا فوج قریب پہنچی تو دست بہ دست سنگینوں سے جنگ کرتے رہے۔ آخر کار پسپا ہونا پڑا۔ بعد میں کپتان لارنس نے سیکڑوں کو توپ سے اڑا دیا۔

انبالہ یکم جون کو رجمنٹ ۵ کے ہتھیار چھین لیے گئے اسی طرح رجمنٹ ۶۰ کے بھی چھینے گئے تھے مگر بعد میں واپس کر کے (غالباً انھوں نے اپنی وفاداری کا یقین دلایا ہوگا) روہتک کے انقلابیوں کو کچلنے کے لیے روانہ کیا گیا

---

[۱] ۱۸۵۷ء۔ محمد شفیع

مگر یہ بجائے روہتک جانے کے دہلی کے انقلابیوں سے ملنے کے لیے روانہ ہو گئے راستے میں راجہ پٹیالہ کی فوجیں ان پر حملہ آور ہوئیں۔ ۷ ر اگست کو کچھ سپاہی چھاؤنی چھوڑ کر بھاگ گئے۔

ہانسی، حصار و سرسہ

۲۹ ر مئی کو دہلی دروازے سے کچھ انقلابی حصار آئے۔ دروازہ ان کے لیے بہ آسانی کھول دیا گیا ہندوستانی سپاہ ان کے ساتھ ہو گئی ان سب نے جیل خانے جا کر جیسے ہی کہا کہ ”دروازہ کھول دو اور قیدیوں کو آزاد کر دو کیوں کہ شاہ دہلی نے اس ضلع پر قبضہ کر لیا اور انگریز قتل ہو گئے“۔ فوراً دروازہ کھول دیا گیا، پہرے دار گارد نے قیدی چھوڑ دیے۔ انقلابی سپاہیوں نے خزانے پر قبضہ کر لیا اور اس کو لے کر بہ حفاظت دہلی روانہ ہو گئے۔ شہری عوام نے انگریزوں کے بنگلوں اور سرکاری عمارتوں کو لوٹنا اور جلانا شروع کر دیا۔ انگریز افسران ہلاک کر دیے گئے تحصیل دار کی لاش تحصیل کے سامنے بازار میں ڈال دی گئی۔ لوگ آتے جاتے اس کو ٹھوکریں مارتے تھے۔

۳۰ ر مئی کو شہزادہ محمد عظیم بیگ نے جو پہلے سرکاری ملازم تھے، انتظام سنبھالا اور تحصیل میں آکر اجلاس کیا۔ شہر میں شہزادے نے ایک جلوس کی شکل میں گشت کیا لوگ اس کے حق میں نعرے لگا رہے تھے اور آگے ایک آدمی جھنڈا لیے چل رہا تھا۔ شہزادہ اس کے بعد مولوی رکن الدین کے یہاں گیا اور رات گئے تک آئندہ کے لیے مشورہ ہوتا رہا۔ اگلے دن تمام ملازمین سرکاری کی موجودگی میں شہزادے نے تحصیل میں اجلاس کیا۔ چار پانچ دن بعد وہ ہانسی روانہ ہو گیا تاکہ وہاں جو انقلابی مقیم تھے ان کے ساتھ آزادی کی جدوجہد میں حصہ لے سکے[1]۔ جون جولائی میں انگریزوں نے جنگی کارروائیاں

[1] محاربہ عظیم / ۲۰

شروع کردیں ان کے ساتھ پنجاب کے رجواڑوں کی فوجیں بھی تھیں۔ چناں چہ فیروز پور سے دو فوجیں حصار کی طرف آئیں اور شہزادہ مذکور سے جنگیں شروع کیں، ایک اور فوج سرحد پر حملہ آور ہوئی۔ انقلابی فوجوں سے بیلی اور بھٹیانہ کے مقامات پر چار جنگیں ہوئیں۔ باغی فوجوں کی رہ نمائی نواب گوہر علی خاں کر رہے تھے وہ بڑی بہادری اور استقلال سے لڑے مگر آخر کار انگریزوں اور پنجابی ریاستوں کی مسلح اور منظم فوجوں سے شکست کھائی۔ انگریزوں نے رانیہ میں گڑھی نوابان پر حملہ کیا، نواب کو گرفتار کرلیا اور ۱۵ اگست ۱۸۵۷ء کو پھانسی دے دی۔ اسی طرح فتح آباد کے قریب نواب وزیر علی خاں کو شکست دے کر مع تمام خاندان کے حصار میں پھانسی دی گئی بالآخر ۱۳ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شہزادہ عظیم بیگ اور اس کے ہمراہیوں کو جو متعدد جنگیں لڑ چکے تھے، مکمل شکست ہوگئی، حصار و ہانسی پر انگریزی تسلط ہوگیا۔

جھیلم جھیلم کے ہندوستانی سپاہی بھی بغاوت پر آمادہ تھے لہٰذا ان کے ہتھیار چھین لینے کے لیے ایک فوج بھیجی گئی، انھوں نے ہتھیار دینے سے انکار کر دیا، سخت خوں ریز جنگ ہوئی، انگریزی فوجوں نے گولہ باری کی مگر شکست کھائی، انگریز افسران کو قتل کرکے انقلابی دہلی روانہ ہوگئے۔ جن انقلابی سپاہیوں کو انگریزوں نے قید کرلیا تھا وہ جیل میں بھی حکام اور افسران کو گالیاں دیتے تھے[1] جھیلم میں بغاوت کی خبر پاکر سیالکوٹ میں بھی بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے۔

ملتان رجمنٹ ۶۹ کے چار سپاہی بھاگ گئے اُن میں سے ایک گرفتار ہوا اور اس کو جاں بخشی کا لالچ دے کر خفیہ سازشوں اور لیڈروں کے حالات معلوم کرلیے گئے، یہ حالات معلوم ہونے کے بعد بھی انگریز افسروں نے اسے پھانسی پر لٹکا دیا

[1] مارشل مین / ۳ ۹۹

فوج کے کئی عہدے داروں اور سپاہیوں کو پکڑا گیا اور کوئی شہادت فراہم نہ ہونے کے باوجود ۲۴ر جولائی ۱۸۵۷ء کو پھانسی دی گئی، پھانسی کے پھندے ان انقلابیوں نے نہایت استقلال اور خاموشی کے ساتھ اپنے گلوں میں ڈالے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے ہوئے قربان ہوگئے۔ ان انقلابی سپاہیوں کا سردار صوبے دار میجر ناہر خاں تھا[1]

"ایک اور کال کوٹھری"

پنجاب کی سرزمین نے کال کوٹھری کا ایک اور بھیانک واقعہ دیکھا، یہ بھی کسی ہندوستانی نے نہیں، ولبرفورس (Wilber Force) نے اپنی کتاب[2] میں بیان کیا ہے اور اسی کے حوالے سے مولانا غلام رسول مہر نے نقل کیا ہے۔ اس انگریز افسر کا بیان ہے کہ میری رجمنٹ کو ایک متحرک کالم میں شامل ہونے کا حکم ملا تھا۔ ہم اس کالم سے وزیرآباد میں جا ملے وہاں ہمیں بتایا گیا کہ ایک کالم کو غیر مسلح کر دیا گیا اور وہ لوگ بھاگ گئے چناں چہ ایک افسر پچاس سکھوں کو لے کر تعاقب میں نکلا اور تقریباً ایک سو پچیس میل کے فاصلے پر مفرور رجمنٹ کو جا لیا۔ سکھوں نے کہا کہ اب ہمارے پاس آتش بازی کا سامان کم ہے لہٰذا گولیاں نہ چلائی جائیں، افسر تذبذب میں پڑ گیا، وہ اس بات کے لیے تیار نہ تھا کہ ان کو زندہ چھوڑ دے۔ مجبوراً ان سب کو ایک عمارت میں بند کر دیا گیا، جس کے دروازے اور کھڑکیاں ہی نہیں بلکہ روشن دان بھی بند کر دیے گئے صبح ہوئی تو سب قیدی تڑپ تڑپ کر مر چکے تھے۔

---

[1] غلام رسول مہر/۳۲۰

2. "Unrecorded Chapter of the Mutiny"

لدھیانہ

مولانا عبدالقادر نے شہری عوام کو بغاوت پر آمادہ کیا اُن کے دلوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کی، چناں چہ دو بار ہنگامہ ہوتے ہوتے بچا ڈپٹی کمشنر نے شہریوں سے ہتھیار چھین لیے۔ مولوی صاحب اپنے ساتھیوں کو لے کر دہلی روانہ ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں سکھ بھی باغیانہ رجحان رکھتے تھے[1] مولانا عبدالقادر کچھ عرصے دہلی کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے، جب واپس آئے تو پنجاب کی ریاستیں اور انگریز تحریک آزادی کو کچلنے میں کام یاب ہو چکے تھے اس لیے مولانا پٹیالہ کے قریب ایک موضع میں روپوش ہو گئے اور وہیں انتقال کیا۔ حضرت مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی رحم کا خاندان آج بھی آپ کی یادگار کے طور پر دہلی میں موجود ہے۔

جالندھر

جالندھر، پھلور اور ہوشیار پور وغیرہ کے علاقوں میں بغاوت ہوئی چناں چہ جالندھر چھاؤنی میں کرنل کے بنگلے کو آگ لگائی، اور ہندوستانی فوج بغاوت پر آمادہ ہو گئی کمانڈر و تیم قتل کر دیا گیا اور ان علاقوں کی باغی پلٹنیں یک جا ہو کر لدھیانہ پہنچیں تاکہ وہاں سے دہلی کا رخ کریں۔

ریواڑی

ریواڑی کے راؤ تلارام اپنے علاقے میں انقلابیوں کے رہ نما تھے وہ دہلی کے انقلابیوں اور بہادر شاہ کی بھی برابر امداد کرتے رہے وہ ان چند انقلابی جاں بازوں میں سے ہیں جنھوں نے جنگ آزادی ناکام ہو جانے کے بعد بھی اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں جب میرٹھ میں بغاوت کا بگل بجا تو یہاں کے کوتوال راؤ کرشن گوپال نے قیدیوں کو آزاد کیا اور خود بھی راؤ تلارام کے ساتھ جدوجہد میں شریک ہو گیا۔ اس علاقے میں دو اور والیان ریاست یعنی والی جھجر اور بلب گڑھ بھی تحریک آزادی میں

1 Mutiny Reports – VIII. P. 94.

پیش پیش تھے۔ فورڈ کے مقابلے میں آخر کار تلارام کو شکست کھانا پڑی مگر انگریزوں کے ہاتھ نہ آسکے اور غائب ہوگئے۔ (مزید حالات آخر کے صفحات پر پیش کیے جارہے ہیں)

امرت سر کے سپاہیوں نے بھی بغاوت کی تھی مگر جلد ہی انگریزوں نے پیچھا کر کے گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔

راول پنڈی

راول پنڈی میں ۷ جون کو بغاوت کا خطرہ پیدا ہوگیا، افواہوں نے انگریزوں کو اور بھی پریشان کر دیا تھا چنانچہ تمام چھوٹے بڑے افسر اپنی جگہیں چھوڑ کر فرار ہونے لگے، گورا فوج کو مسلح رہنے کا حکم دے دیا گیا مگر افواہیں غلط ثابت ہوئیں اور جب بغاوت نہ ہوئی تو "انگریزی نادر شاہی" کا موقع ملا۔ ہندستانی فوج کو گورا فوج کی سنگینوں اور توپ خانے سے گھیر لیا اور ہتھیار لیے گئے یہ حالات دیکھ کر ہندوستانی سپاہی بھاگے تو ان بھاگتے ہوئے سپاہیوں پر گولہ باری کی گئی اور گوروں نے فائرنگ کیا۔ آخر کار انھیں گرفتار کر کے ہتھیار چھین لیے گئے۔

فیروز پور

فیروز پور میں انقلابی فوجوں نے اپنے انگریز افسران کو قتل کیا، ان کے بنگلوں اور سرکاری عمارتوں کو جلا کر راکھ کر دیا۔ چھاؤنی برباد کی، باغی عوام میگزین پر سیڑھیاں لگا کر اندر گھس گئے اور وہاں انگریزوں سے جنگ کی لیکن انگریزوں نے میگزین اڑا دیا۔ رسالہ نمبر ۱۰ نے توپیں چھین کر گولہ باری کی اور بے شمار گوروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ انگریزوں نے پٹیالہ کی فوجوں کے ذریعے انقلابیوں کا سات میل یعنی موضع حالیوالہ تک پیچھا کیا مگر ناکام رہے۔ جب پیچھا ترک کر دیا گیا تو انقلابی دوبارہ جمع ہوئے اور باقاعدہ فوجی ترتیب کے ساتھ دہلی روانہ ہوگئے۔

مری پہاڑ

بغاوت کے زلزلے نے جہاں میدانوں اور وادیوں میں سرفروشانِ وطن

سے قربانیاں لیں وہاں سرسبز و شاداب مری جیسے پہاڑوں پر بھی اس کی گڑگڑاہٹ پہنچی چناں چہ مری کے قبیلوں نے خفیہ طور پر بغاوت کی اسکیم بنائی، جس میں عباسی قبیلہ پیش پیش رہا اور ہزارہ سے ایک پیر صاحب اپنے مریدوں کے ہمراہ جنگِ آزادی میں حصہ لینے کے لیے پہنچے، پروگرام یہ تھا کہ کمشنر کے بنگلے کو آگ لگا کر خزانے پر قبضہ کیا جائے مگر انگریزوں کو اس خفیہ اسکیم کی سُن گُن جاسوسوں کے ذریعے مل گئی اور انھوں نے اپنی فوجی قوت جمع کر لی، خصوصاً خزانے پر مکمل حفاظتی انتظامات کر لیے۔ وقتِ مقررہ پر ۲ ستمبر ۱۸۵۷ء کو قبیلوں نے کمشنر کے بنگلے کو آگ لگائی تو انگریزی فوجیں جو اس تاک میں بیٹھی تھیں انقلابیوں پر ٹوٹ پڑیں اور پھر کچھ قبیلے غداری پر آمادہ ہو گئے اور یہ انقلابی تحریک دبادی گئی۔ قبیلوں کے بے شمار گاؤں نذرِ آتش کر دیے گئے۔ انقلابی لیڈر ہمت خاں گرفتار ہوا اور اس کو مع ۲۴ ساتھیوں کے توپ سے اڑا دیا گیا۔[۵۱]

صوبہ سندھ

صوبہ سندھ اگرچہ بہ ظاہر خاموش اور پُرسکون نظر آتا تھا مگر اندرونی طور پر عوام میں دہشت اور ہراس موجود تھا، اُدھر انگریز بھی اپنی جگہ خوف زدہ تھے اور احتیاطی تدبیریں کر رہے تھے۔ ملک کے دوسرے مقامات کی خبریں اور افواہیں برابر صوبے میں پھیلتی رہیں۔ شکارپور، کراچی، جیکب آباد اور حیدر آباد وغیرہ میں بغاوت کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔

کراچی میں ۲۱ ٹیٹو انفینٹری بغاوت پر آمادہ نظر آتی تھی، پلان یہ تھا

---

۵۱ "الجمعیۃ" ۳ر جون ۱۹۵۷ء، "ماہِ نو" مئی ۱۹۵۷ء

کہ یہاں سے خزانہ چھین کر حیدر آباد لے جایا جائے اور پھر دوسرے مقامات پر بیک وقت بغاوت ہو مگر ایک مخبر نے انگریز افسروں پر تمام اسکیم فاش کردی چناں چہ عین وقت پر ہتھیار چھین لیے گئے۔ کورٹ مارشل کے بعد انقلابی سپاہیوں کو پھانسی اور توپ سے اڑانے کی سزا دی گئی (۷ار ستمبر، مقابل ڈاک خانہ میدان)

حیدرآباد میں ۱۲ر ستمبر کو بغاوت کی تاریخ طے پائی تھی اور قلعہ پر قبضہ کرکے جنگ کو باقاعدہ طریقے پر منظم کرنا تھا مگر حکام کو بر وقت اطلاع ہو جانے کی وجہ سے ہتھیار لیے گئے۔ بغاوت کے الزام میں ایک رسالدار کو توپ سے اڑا دیا گیا اور باقی کو پھانسی اور کالے پانی کی سزائیں ملیں۔

سکھر میں انقلابیوں سے ایک ہلکا سا تصادم ہوا کیوں کہ توپچی آدھی رات کو توپوں پر آگئے اور ایک مربع شکل بنا کر گولے برسانے لگے، پولس پہنچی مگر انقلابی ایسی پوزیشن میں تھے کہ کافی دیر تک مجبور رہی آخرکار سوار فوج نے ہلّہ بول دیا۔ جس میں بہت سے انقلابی کام آئے، اور کئی زخمی اور گرفتار ہوئے، کچھ انقلابی کارکن خیرپور پہنچے تھے کہ وہاں عوام کو بغاوت پر آمادہ کریں شکارپور میں بھی اکثر کو سزائے موت اور کالے پانی کی سزائیں ملیں جو صوبے دار اور حوالدار تھے اس طرح سندھ کی بغاوت کو اٹھنے سے پہلے ہی دبا دیا گیا۔[1]

---

[1] "ماہِ نو" مئی ۱۹۵۷ء

صوبۂ سرحد

جب انگریزوں نے اپنے حلیف مہاراجہ رنجیت سنگھ سے دغابازی کی اور سرحد پر قبضہ جمایا ، سرحدی پٹھانوں کے دلوں میں آزادی اور انقلاب کی چنگاریاں جب ہی سے سلگ اٹھی تھیں ، ہر چند کہ انگریز نے یہ پرچار کرانا شروع کیا کہ اب رنجیت سنگھ کا دور حکومت ختم ہو گیا اور پٹھان ظلم و ستم سے آزاد ہیں مگر غیور پٹھان اس جھانسے میں آکر غلامی کی لعنت قبول کرنے والے نہ تھے چناں چہ انھوں نے سرحد کی پہاڑیوں میں دشمنانِ وطن سے گوریلا طریقے سے جنگ شروع کردی ۔ تحریک شاہ ولی اللہ کے مجاہدین کا کیمپ بھی اسی علاقے میں تھا اور اس طرح وہ برطانوی سامراج کے خلاف ان تھک اور مسلسل جدوجہد کر رہے تھے ان کو ملک کے مختلف حصوں سے برابر امداد ملتی تھی اور اسی وجہ سے ۱۸۴۰ء سے ۱۸۵۷ء تک انگریزوں کو سولہ بار اس علاقے میں بڑی جنگوں سے دوچار ہونا پڑا ۔

ناکام بغاوت

۱۸۵۷ء کا انقلاب انگیز سال شروع ہونے پر سب سے زیادہ خطرہ صوبہ سرحد سے تھا کیوں کہ اگر اس علاقے میں آزادی

کی جدو جہد شروع ہو جاتی اور سر فروش پٹھانوں کو میدان میں آنے کا موقع مل جاتا تو انگریزوں کے لیے بھی ہندوستان میں نظر نہ آتا اس حقیقت سے انگریز اچھی طرح واقف تھے چناں چہ انھوں نے مکروفریب سے کام لینا شروع کیا اور سرحد میں طرح طرح کی افواہیں پھیلا کر سرحدی عوام کو تحریک سے الگ رکھنے کی کوشش کی۔ اول تو انگریزوں کی اس چال نے سرحدی عوام کو خاموش رکھنے میں بڑی حد تک مدد کی اور دوسرے پنجاب کی تحریک چوں کہ پوری طرح اٹھنے سے پہلے کچل دی گئی اور یہاں سکھوں نے عام طور پر انگریزوں کا ساتھ دیا تھا لہٰذا سرحدی عوام اپنے دوسرے انقلابی بھائیوں سے کٹ کر رہ گئے' علاوہ ازیں بے دریغ روپیہ سرحدی قبائل کو خاموش رکھنے کے لیے اُن میں بانٹا گیا۔ تاہم اُن کے چند انقلابی سردار جذبۂ بغاوت سے سرشار تھے اور انھوں نے ہندستانی سپاہیوں سے مشورہ کرکے بغاوت کا پروگرام بنایا۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ ۲۲ مئی ۱۸۵۷ء کو پشاور میں بغاوت کا بگل بجایا جائے مگر وہاں کے ڈاک خانے سے کچھ ایسے خطوط انگریزوں کے ہاتھ لگے جن سے یہ راز قبل از وقت ان پر کھل گیا اور ۲۱ مئی کو ہندستانی فوجیوں سے ہتھیار چھین لیے گئے

مظالم

جب ان نہتے سپاہیوں میں سے کچھ نے شہر جانے کی اجازت مانگی تو ان کو فوراً پھانسی کی سزا دی گئی پھر کچھ اور سپاہیوں کو بھی یہ "انعام" دیا گیا۔ بے شمار نہتوں کو جنھوں نے کسی انگریز کے سوئی بھی نہ چبھوئی تھی ۱۰ جون ۱۸۵۷ء کو توپ سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ اس نظارے کو ایک انگریز کی زبانی سنیے [1]

---

[1] "محاربۂ عظیم / ۲۰۹

"چالیس باغی ایک گوشے میں پابہ زنجیر کھڑے تھے کہ جنرل صاحب آئے، سلامی لی اور سزا کا حکم سنایا، اول دس قیدی توپ سے باندھے گئے۔ افسر توپ خانہ نے اپنی تلوار ہلائی، توپ کی آواز آئی اور دھوئیں کے اوپر ٹانگیں ہاتھ اور سر وغیرہ چاروں طرف گرتے نظر آئے، اس طرح چار مرتبہ ہوا"

جو لوگ انگریزوں کو سلام نہ کرتے تھے ان کو بید سے خوب پیٹا گیا اور ان کا مال و اسباب ضبط کر لیا گیا انگریز مورخ جان کے کو بھی اس ظلم وستم کا اقرار ہے۔

"ایک سو بیس انسانوں کو ناکام اور قبل از وقت بغاوت کے جرم میں ماخوذ کیا گیا...... چنانچہ ۱۰ جون کو چالیس بدقسمت انسانوں کو ممکن سے ممکن اذیت دے کر نہایت ہولناک طریقے سے منظر عام پر توپوں سے اڑا دیا گیا...... میں بھی اس کی مزید تفصیل میں جانا نہیں چاہتا لیکن جہاں تک اس واقعے کی تفصیل اور جزئیات کا تعلق ہے وہ نہایت ہی دردناک اور ہولناک ہیں اور اس وقت بھی اُس زمانے کی دستاویزوں کی شکل میں میرے پاس محفوظ ہیں"۔

آگے چل کر یہ جادو سر چڑھ کر بولتا ہے اور وہ لکھتا ہے۔

"جب اُنھوں نے (سرحدی لوگوں نے) ہماری جیسی مہذب اور شائستہ قوم کو متانت اور سنجیدگی کے ساتھ وحشت اور بربریت کے ان تمام مکروہ افعال کا مرتکب ہوتے دیکھا جو ایک فوجی پریڈ کی باضابطگی کے ساتھ عمل میں لائے جاتے تھے تو ہمارے متعلق برتری اور بڑائی کے تمام عقیدت مندانہ خیالات ان کے دلوں سے جاتے رہے"۔ [1]

---

[1] تصویر کا دوسرا رُخ / ۳۲

یہ سب کچھ اُن بے قصور ہندوستانیوں کے ساتھ کیا گیا جن پر صرف بغاوت کرنے کا خفیف سا شبہ کیا جا رہا تھا اور جنھوں نے کسی انگریز کو گھورا بھی نہ تھا۔

پشاور سے کہیں زیادہ ظلم و ستم نوشہرہ مردان میں توڑے گئے۔ یہاں کی ہندوستانی رجمنٹ انگریزی پلٹن کے ہتھیار چھیننے کے لیے آنے کی خبر سن کر مقابلے پر ڈٹ گئی۔ چناں چہ سخت مقابلہ ہوا، تقریباً ڈیڑھ سو انقلابی اس طرح ختم ہوئے اور باقی کو گرفتار کر کے توپوں سے باندھ کر اڑا دیا گیا، روزانہ یہی شغل جاری رہا اور آخر کار تمام ہندوستانی سپاہی ختم کر دیے گئے۔ اس کے بعد بھی جس شخص پر ذرا سا بھی شبہ ہوا اُس کو طرح طرح کی تکلیفیں دے کر ہلاک کیا گیا، ایک انگریز نے اس کا اقرار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"حالاں کہ میرے پاس ایسے بہت سے خط موجود ہیں جن میں بیان کیا گیا ہے کہ ہمارے افسروں نے کس طرح زیادہ سے زیادہ اور گھنونی تکلیفیں لوگوں کو پہنچائیں پھر بھی اب میں اس بارے میں ایک لفظ نہیں لکھتا تاکہ یہ بات ہی دنیا کے سامنے نہ رہے" [۱]

ایک اور انگریز کی رائے سُن لیجیے، صوبہ سرحد اور پنجاب کے بارے میں لکھتا ہے

"نہ صرف ہر قسم کے جرائم کے بدلے میں بلکہ ایسے مشتبہ جرائم کے عوض میں اندھا دھند پھانسیاں دینے کی کارروائی سے جس میں عورت، بوڑھے اور بچے کی تمیز روا نہ رکھی گئی، نیز بے شمار دیہات جلائے جانے کی وجہ سے آبادی کے اس

---

[۱] "نیا ہند" دسمبر ۱۸۵۷ء

حصے میں نفرت اور دہشت پھیل گئی ہے جو اُس وقت تک گورنمنٹ کے خلاف نہ تھی“ [1]

اختلاف رائے

تحریک سید احمد شہید کے مجاہدین بھی ۱۸۵۷ء کا انقلابی سال آنے پر میدان عمل میں آئے وہ پہلے ہی سے برابر انقلابی سرگرمیوں میں مصروف تھے مگر چند سال قبل ان کے رہنماؤں مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی کے درمیان طریقۂ کار کے بارے اختلاف ہوگیا مولانا ولایت علی کا تو ۱۸۵۲ء میں انتقال ہوگیا لیکن ان کے حامی جو کہ سید احمد صاحب کے دوبارہ ظاہر ہونے پر یقین رکھتے تھے جنگ آزادی میں حصہ لینے کو تیار نہ ہوئے جب کہ مولانا عنایت علی نے انگریزی فوجوں سے بھی خط وکتابت کی اور ان کو آمادۂ جنگ کر دیا لیکن اول تو مجاہدین میں اختلاف پیدا ہو چکا تھا۔ دوسرے اسی زمانے میں چند ناگہانی حوادث پیش آئے مثلاً صوات کے بادشاہ سید اکبر شاہ نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو انتقال کیا جس سے سرحد کے انقلابیوں کو بڑی مدد مل سکتی تھی اور ان کے جانشین اس جدو جہد سے دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ اس طرح بہ قول مولانا غلام رسول مہر

”جب تک حالات سازگار نہ تھے مجاہدانہ اقدام کے لیے اسباب مہیا نظر آتے تھے۔ جب حالات سازگار ہوئے تو اسباب کا شیرازہ بکھر گیا“ [2]

مردان میں مقیم فوج کے انقلابی امداد کی امید پر صوات پہنچے مگر وہاں کے اخوند صاحب نے کوئی امداد نہ کی اگر یہاں سے ان انقلابی سپاہیوں کو مدد مل جاتی تو ہومز کے بیان کے

1. The Lost Dominion – 93
Thomoson – 32, 67......

2. سرگذشت مجاہدین / ۲۹۲

مطابق ——

"پوری آبادی میں مذہبی جوش وحمیت کے شعلے اس پیمانے پر بھڑک اٹھتے کہ شاید برطانوی سلطنت کا ڈھانچہ ان میں جل کر خاک ہو جاتا"۔

جنگ مولانا عنایت علی نے ایک پہاڑی مقام نارنجی کو اپنا مرکز بنالیا اور قریبی مقامات پر چھاپے مارنا شروع کر دیے۔ جولائی ۱۸۵۸ء میں انگریزی فوجوں نے نارنجی پر حملہ کیا اور پھر یکم اگست کو دوبارہ حملہ آور ہوئیں سخت جنگ ہوئی، انگریزی توپوں نے شدید گولہ باری کی، اس مقام کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا مگر مولانا یہاں سے نکل کر محفوظ مقام پر چلے گئے۔ انگریزوں نے حسب معمول در و دیوار سے انتقام لینا شروع کر دیا اب مولانا عنایت علی کی مالی حالت بھی خراب ہو گئی کیوں کہ ہندوستان سے روپیہ آنا بغاوت شروع ہوتے ہی بند ہو گیا تھا۔ انھوں نے اپنا سامان بیچ کر گذارہ کیا۔ اسی دوران میں بیمار ہو گئے اور مارچ ۱۸۵۸ء میں وفات پائی۔

انگریزوں نے اسی پر بس نہ کیا بلکہ سرحدی انقلابیوں کے تمام مرکز مثلاً پنجگلی، پنجتار، منگل تھانہ اور ستھانہ وغیرہ پر زبردست گولہ باری کر کے مسمار کر دیے۔ چناں چہ بہ طور نمونہ استھانہ کی بربادی کا حال سنیے۔

"انگریزوں نے استھانے کو بے دردی سے تباہ کیا، توپیں لگا کر گاؤں مسمار کر ڈالا ہاتھیوں سے مجاہدین کا قلعہ تڑوایا، ستھانہ منڈی اور مرکز مجاہدین کا نشان تک ٹک نہ چھوڑا .... بالائی استھانہ کو بارود سے اڑایا گیا۔ سایہ دار درختوں کو بھی کاٹ ڈالا گیا۔ جو کٹ نہ سکے ان کی چھال ایک ایک فٹ اتار دی گئی"[۲]

[۱] سرگذشت مجاہدین / ۲۹۲ [۲] " سرگذشت مجاہدین / ۳۱۳

بنارس اور الہ آباد

مولوی لیاقت علیؒ

بنارس اور الہ آباد کے علاقوں میں بھی بغاوت کی خفیہ تیاریاں ہو رہی تھیں، بنارس کے مندروں میں انگریزی حکومت کی بربادی کے لیے پرارتھنا ہوتی تھی، خفیہ انقلابی جماعتیں موجود تھیں، سپاہیوں کے کیمپ میں مولویوں کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ شہر میں اعلانات چسپاں کیے گئے جن میں بغاوت کی ترغیب دی گئی، لوگ انگریزوں کو اعلانیہ برا بھلا کہنے لگے، ادھر مولوی لیاقت علیؒ کی خفیہ سرگرمیوں نے بغاوت کی آگ کو ہوا دی

---

[1] مولوی لیاقت علی کا آبائی وطن اور جائے پیدائش موضع مہگاؤں پرگنہ چائل (ضلع الہ آباد) ہے۔ ان کی عمر ۱۸۵۷ء میں تقریباً چالیس سال تھی، نسباً جعفری زینبی سیّد تھے، ان کے والد کاشت کاری کرتے تھے (نام مہر علی) اور چچا فوج میں ملازم تھے۔ مولوی صاحب سید احمد شہید کے عقائد و خیالات سے متاثر تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد تین چار سال انگریزی فوج میں ملازم رہے (صفحہ ۲۳۰ پر)

خسرو باغ الہ آباد میں مولوی لیاقت علیؒ کی قیام گاہ اور ہیڈ کوارٹر
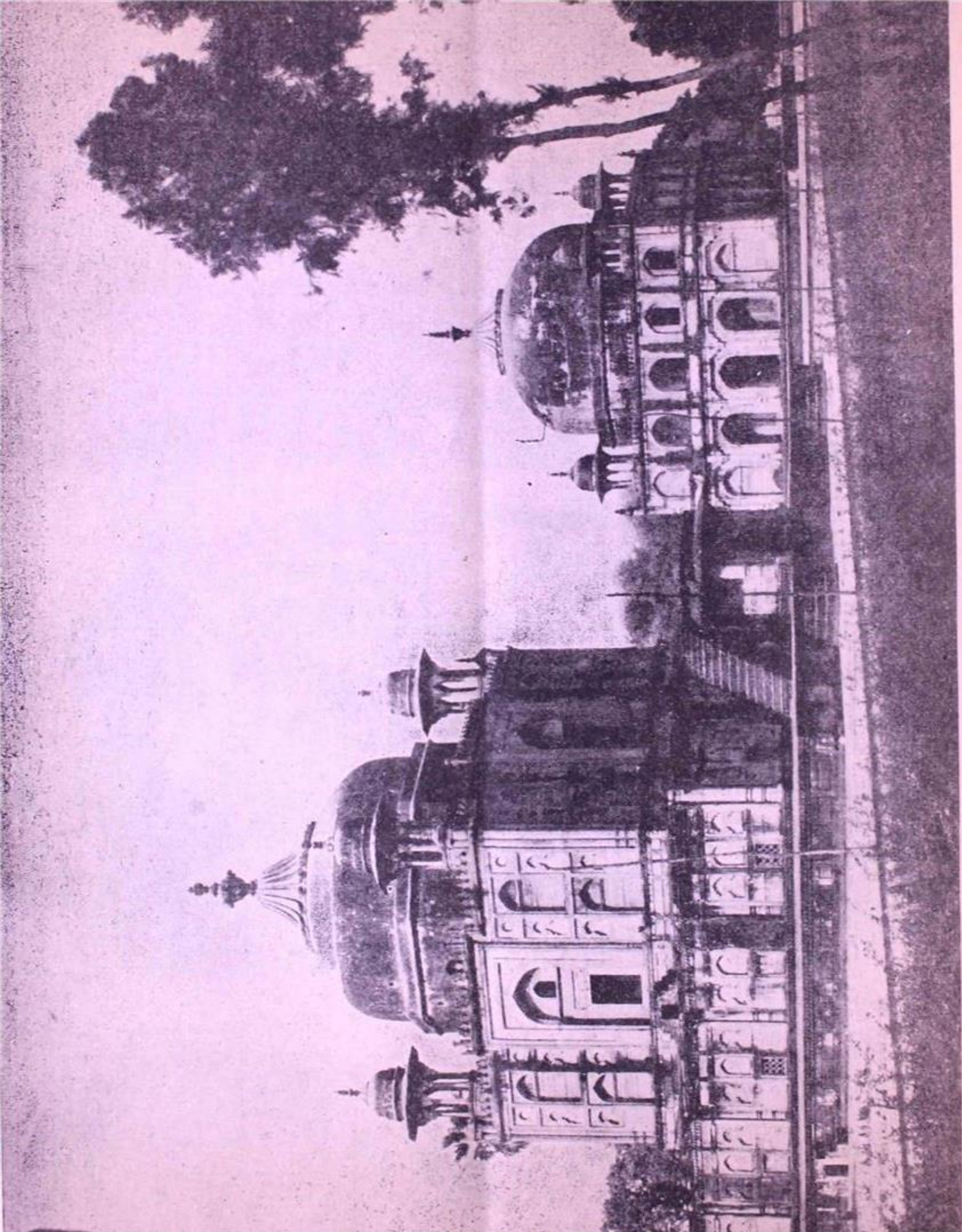
اور عوام کو آنے والی جنگ کے لیے تیار کر دیا تھا۔

اعظم گڈھ

بنارس میں چوں کہ اعظم گڈھ کی بغاوت سے اشتعال پیدا ہوا تھا اس لیے پہلے اعظم گڈھ کے حالات مختصراً جان لینا ضروری ہیں۔

یہاں کے ایک انگریز زمیں دار اور دیسی زمیں دار جگ بندھن سنگھ کے درمیان کچھ جھگڑا ہو گیا جس نے کافی طول کھینچا اور جگ بندھن نے انگریز زمیں دار کو برباد کر دیا۔ شہر میں یہ خبر پہنچنے پر انگریز افسران بڑے چراغ پا ہوئے اور جگ بندھن کو فوج بھیج کر ایک معمولی تصادم کے بعد گرفتار کر لیا۔ لیکن اس کی لڑکی نے باپ کی رہائی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی اور اس سلسلے میں مہور (قصبہ مبارک پور سے پانچ میل مغرب) کے زمیں دار رجب علی خاں سے امداد کی طالب ہوئی۔ جس نے باغی عوام کی ایک کثیر تعداد فراہم کر کے انگریزوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا اور شہر میں آ کر جیل خانہ توڑا، جگ بندھن کو رہا کرا لیا جب پولس کو فائرنگ کا حکم دیا گیا تو اس نے تعمیل سے انکار کیا اور بغاوت پر آمادہ ہو گئی۔

(بقیہ صفحہ ۲۳۰) انتہائی عبادت گذار اور پرہیزگار تھے، تبلیغ و تدریس میں وقت گذارتے تھے، فوج کے نہ صرف ہندستانی سپاہی بلکہ انگریز افسر بھی آپ کا احترام کرتے تھے۔ ملازمت سے استعفیٰ دے کر مذہبی اور اصلاحی سرگرمیوں کے سلسلے میں دہلی ٹونک، رائے بریلی وغیرہ مقامات پر رہے۔ تحریک ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے انقلابی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے۔ چناں چہ جب خفیہ میٹنگ ہوئی جس میں نانا صاحب، عظیم اللہ خاں، مولانا احمد اللہؒ، بخت خاں وغیرہ تھے تو طے پایا کہ مولوی لیاقت علی مختلف حلقوں میں جنگِ آزادی کی طے شدہ تاریخ (۳۱ مئی ۱۸۵۷ء) سے انقلابی کارکنوں کو مطلع کریں چناں چہ آپ نے اس سلسلے میں دن رات بڑی تیزی اور جاں فشانی سے سفر کیا۔

("الجمعیۃ" مضمون عبدالباری عاصی) ۱۷ اگست ۱۹۵۷ء

دو انگریز افسر قتل ہوئے اور باقی کو فوراً شہر سے نکل جانے کا حکم دیا گیا، بلکہ گاڑیوں میں سوار ہو کر چند سپاہیوں کی حفاظت میں بنارس روانہ کر دیا گیا، خزانے اور میگزین پر انقلابیوں کا قبضہ ہو گیا اور وہ ایک شان دار جلوس کی شکل میں فیض آباد روانہ ہو گئے

بنارس میں بغاوت

۱۸ مئی کی صبح کو بنارس کی بارکوں میں آگ لگی، اعظم گڈھ سے بغاوت کی خبریں پہنچنے پر اور بھی اشتعال پیدا ہو گیا تھا۔ لارڈ کیننگ برابر انگریزی فوجیں مختلف حصوں سے طلب کر رہا تھا چناں چہ جنرل نیل مدراس سے بنارس پہنچا اور داناپور سے بھی انگریزی فوج آ گئی مگر جب ہندستانی سپاہ کو ہتھیار چھیننے کے لیے جمع کیا گیا تو وہ چوں کہ جانتے تھے کہ ہتھیار لے کر بھی ان کو بخشا نہ جائے گا لہٰذا خوف ناک طریقے پر شور مچاتے ہوئے قریبی میگزین پر حملہ آور ہوئے اور افسروں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ پھر چھاؤنی کے پیچھے سے گولیاں برسانے لگے انگریزوں نے چھاؤنی میں آگ لگا دی۔ اب دوسری رجمنٹ بھی بگڑ گئی تھی۔ یہاں سکھ بھی انقلابیوں کی صف میں آ گئے، ہوا یہ کہ ایک ہندو نے انگریز افسر کو قتل کیا جب اس کی جگہ دوسرا آیا تو ایک سکھ سپاہی نے وقتی جوش سے گولی مار دی، اس سکھ کو دوسرے "وفادار" سکھوں نے ختم کر دیا۔ یہ سپاہی اپنی اس "وفاداری" کے انعام کے منتظر ہی تھے کہ گورا فوج نے ان پر فائرنگ شروع کر دی اور اس طرح ہندو و مسلمانوں کے ساتھ سکھ بھی گوروں پر حملہ آور ہوئے[1]۔ ادھر خزانے اور کچہری کے گارڈ نے

---

[1] سکھوں کے باغی ہونے کا یہ غالباً دوسرا موقع تھا کیوں کہ دہلی کی انقلابی فوج میں بھی کچھ سکھ شامل تھے اور انھوں نے بہادر شاہ سے درخواست کی تھی کہ سکھ دستہ الگ بنا دیا جائے۔ (غدر کی صبح شام)

بھی بغاوت کی۔ بنگلوں میں آگ لگائی اور انگریزوں کا قتل عام کیا، تار کاٹ دیے، ریلوے لائن اڑادی، بنارس کی یہ بغاوت جو ۴ جون کو ہوئی، جلد ہی دبا دی گئی اور بعد میں جب گرفتاریاں شروع ہوئیں تو ایک لکھ پتی مہاجن کی خانہ تلاشی پر بہت سے ہتھیار اور خفیہ جماعت کے پوشیدہ اشاروں میں لکھے ہوئے خط بھی برآمد ہوئے جن میں بغاوت کی اسکیم تھی اور اس کے لیے روپیہ مہاجن کو ادا کرنا تھا، لیکن بنارس کے واقعات نے جون پور، الہ آباد، فیض آباد وغیرہ کے سپاہیوں کو یقین دلا دیا کہ انتہائی وفادار سپاہی بھی برطانوی ظلم وستم سے محفوظ نہ رہ سکیں گے اس طرح اس بغاوت سے دور دراز کے علاقے بھی متاثر ہو گئے۔

بنارس میں مظالم

بغاوت کے بعد انگریزوں نے بے کس عوام کو مظالم کا نشانہ بنانے میں چنگیز و ہلاکو کو طفلِ مکتب ثابت کر دیا۔ جنرل نیل نے سکھ اور گورا سپاہ کے دستے بنائے اور یہ دستے دیہات میں داخل ہوئے، جو ہاتھ آیا اسے قتل کیا یا پھانسی دے دی۔ مگر آخر کار یہ لوگ اس مشغلے سے جلد اکتا گئے اور پھانسی پانے والوں کی تعداد اس قدر تھی کہ دن رات کام جاری رہنے کے باوجود بھی ایک پھانسی ناکافی معلوم ہوئی چناں چہ پھانسیوں کی ایک لمبی لائن بنائی گئی اور اس لمبی لائن پر بھی اگرچہ اتنی پھرتی سے کام کیا جا رہا تھا کہ لوگوں کو پوری طرح جان نکلنے سے پہلے ہی سسکتا ہوا پھینک دیا جاتا تھا، پھر بھی پھانسی کے "امیدواروں" کی ایک لمبی قطار انتظار میں موجود تھی۔!۔ درختوں کو کاٹ کر پھانسی کے لیے استعمال کرنے میں چوں کہ محنت اور طوالت درکار تھی اس لیے لوگوں کے گلے میں رسیاں باندھ کر درختوں کی ہر شاخ میں لٹکا ہوا چھوڑ دیا گیا، اب ایک نیا طریقہ سوجھا یعنی

پھانسی پانے والے کو ہاتھی پر بٹھا کر درخت کے نیچے لایا جاتا، اس کے گلے کو درخت کی شاخ سے مضبوط باندھ دیا جاتا اور ہاتھی کو نیچے سے ہٹا لیا جاتا تھا۔ اس صورت سے انتہائی تکلیف سے جان نکلتی تھی اور تڑپنے کی وجہ سے انسانی جسم انگریزی ہندسے "8 و 9" کی شکل بن بن جاتے تھے[1]۔ یہ نظارہ انگریز افسروں کے لیے بڑا تفریح بخش ثابت ہوا، آخر یہ بھی پرانا ہو گیا، مگر ابھی ہزاروں کالے زندہ تھے اور ان نئی "ایجادات" کے باوجود بہت کام باقی تھا ـــــ کلیجہ تھام کر سینئے کہ حضرت عیسیٰؑ کے اِن "مہذب ترین" انگلستانی پیروؤں نے اس مشکل پر بھی قابو پا لیا، اور اب نیا طریقہ شروع کیا گیا۔ یعنی یکے بعد دیگرے گاؤں کے گاؤں آگ لگا کر خاک کر دیے گئے۔ آگ لگاتے وقت انگریز فوج گاؤں کو چاروں طرف سے گھیر لیا کرتی تھی تاکہ کوئی بچ کر نہ نکل سکے آگ اتنی تیزی اور ہوشیاری سے لگائی جاتی کہ کوئی بچ کر نہ نکل سکتا، غریب اور بے کس کسان، مسلمان اور ہندو، اسکول کے بچے، بچوں کو سینے سے لگائے ہوئے مائیں جوان لڑکیاں، اندھے، بوڑھے، اپاہج ـ سب ان شعلوں کی نذر ہو جاتے تھے ـ کم زور اور بیمار بوڑھے جو ایک قدم بھی چلنے کے قابل نہ تھے، اپنے بستروں ہی میں جل کر خاک ہو گئے۔ اُن کی دل دوز چیخیں، اُن کے بلک بلک کر رونے کا نظارہ، اُن کا بے کسی سے خاک ہو جانا، بعض انگریزوں کے لیے تو اتنا مفرح اور دل کش تھا کہ انھوں نے انگلینڈ کو خطوط لکھے۔ ایک انگریز نے لکھا۔

"ہم نے بہت سے گنجان آباد گاؤں کو آگ لگا دی۔ ہم نے ان کو گھیر لیا تھا اور

---

1. Narrative - 69.
   Savarkar - 191.

جب وہ لوگ شعلوں سے بچ کر باہر کو بھاگتے تو ہم ان کو گولیاں مار کر ٹھنڈا کر دیتے تھے“

مختلف دستے جو گاؤں جلانے کی ”مہم“ پر بھیجے گئے ان میں سے ایک کا افسر اپنے بہت سے مشاہدات میں سے ایک میں لکھتا ہے۔

”تاہم آپ کو یہ سن کر اطمینان ہوگا کہ چند دیہات صفحۂ زمین سے مٹا دیے گئے“ [1]

اور یہ سب کچھ صرف خلاصہ ہے ان تمام مظالم کا جن کے متعلق انگریز مورخ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ۔

”بہتر ہے کرنیل کے انتقام کے بارے میں کچھ نہ لکھا جائے“

خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ مظالم کس قدر ہولناک ہوں گے جن کو انگریز مورخین شرم کے مارے پی گئے ہیں اور اس طرح ان کا کوئی تحریری ثبوت محفوظ نہ رہ سکا۔

الٰہ آباد آزاد

خفیہ تیاریاں الٰہ آباد میں ایک عرصے سے جاری تھیں، علماء اور پنڈت بغاوت کا جال بچھا رہے تھے، پروگرام یہ تھا کہ عوام اور فوج بیک وقت بغاوت کریں۔ سرکاری جج اور منصف ان جماعتوں سے وابستہ تھے، مگر بے خبر تھے انگریز افسر۔ ہندوستانی سپاہیوں اور فوجیوں نے اپنی وفاداری کا یقین دلایا تھا پھر بھی انگریزوں نے اپنے حفاظتی انتظامات کر لیے اور ۶ جون کی رات کو اچانک بگل بجا اور معلوم ہوا کہ جن سپاہیوں نے اپنی وفاداری کا ایک دن پہلے تک یقین دلایا تھا وہی بغاوت میں سب سے آگے ہیں، اندازہ ہے یہ سپاہ شروع سے بغاوت پر تلی ہوئی تھی ان کو صرف یہ

[1] Ball vol I, P. 244
Savarkar – 191

انتظام تھا کہ سکھوں کو اپنے ساتھ شامل کرلیں لیے راج گھاٹ پر ایک دستہ مقرر کیا گیا اور اسی نے سب سے پہلے بغاوت کی اور تمام سامان لے کر الوپی باغ میں جہاں سواروں کا دستہ مقیم تھا آ گئے تھے۔ انگریزوں کا قتل عام شروع ہو گیا، انھوں نے قلعے میں پناہ لی جہاں پہلے ہی تمام انتظامات کر لیے گئے تھے اور سکھ سپاہی حفاظت کر رہے تھے اور کھانے پینے کی تمام اشیاء اور میگزین کے کافی ذخیرے موجود تھے۔

انقلابیوں نے "رام چندر جی کی جے" کا نعرہ لگا کر ڈھائی ہزار قیدیوں کو چھڑایا جنھوں نے انگریزوں کے مکانات لوٹنا اور جلانا شروع کر دیے۔ اس طرح انگریزی اقتدار[1] کا چراغ گل کر دینے کے بعد انقلابیوں نے جن کی رہ نمائی رام چندر کر رہے تھے، مولوی لیاقت علی کو اپنا سردار بنایا جو اس وقت دیہاتوں میں بچوں کو پڑھانے اور تبلیغ کا کام کر رہے تھے مگر اپنے بلند کردار اور نیک طینتی کی بدولت عوام کو گرویدہ بنا لیا تھا، چنانچہ ان کو الٰہ آباد میں شاہ دہلی کا نمایندہ بنا دیا گیا ہندو اور مسلمان متحدہ طور پر مولوی لیاقت علی کے جھنڈے تلے جمع تھے، انھوں نے عوام کے دلوں میں بغاوت اور آزادی کی ایسی آگ لگا دی تھی کہ پنشن یافتہ بوڑھے بھی انقلابی فوجوں کو منظم کرتے نظر آتے تھے اور جو اس قابل بھی نہ تھے وہ نوجوانوں کو فوجی ہدایات دے رہے تھے، مولوی صاحب غیر معمولی اہلیت اور تنظیمی قابلیت کے مالک تھے انھوں نے شہر کا تمام انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر تمام معاملات کو نہایت خوش اسلوبی سے ترتیب[2] دیا اور الٰہ آباد کی

1. Sen _ 155.

2. Kaye _ I.P 193.
Savarkar _ 22

رپورٹ برابر دہلی بھیجتے رہے۔

سب سے پہلے مولوی صاحب نے قلعے پر حملہ کیا مگر انگریزوں کے سکھ محافظوں نے اس آسان کام کو مشکل بنا رکھا تھا وہ کسی طرح انقلابیوں کی حمایت و امداد پر آمادہ نہ ہو سکے۔ ۱۴ر جون کو قلعے کے انگریزوں نے مولوی لیاقت علی کے مقابلے کے لیے فوج بھیجی جس کو انقلابیوں نے پسپا کر دیا۔ اس دوران میں نیل بنارس سے فارغ ہو کر الٰہ آباد کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کچھ لوگوں نے افواہ اڑا دی کہ انگریز تمام شہر کو آگ لگا دیں گے چناں چہ تمام لوگ بھاگ کھڑے ہوئے اور مولوی لیاقت علی کی کوششوں کے باوجود شہر ویران ہو گیا، مگر وہ ہمت ہارنے والے نہ تھے چناں چہ نیل کو ۱۱ جون کو الٰہ آباد پہنچ چکا تھا، ایک ہفتے تک شہر میں داخل نہ ہونے دیا بالآخر سکھوں اور انگریزوں کی مسلح اور نئے سامانِ جنگ سے لیس فوجوں کا مقابلہ دشوار ہو گیا اور ۱۸ر جون کو انگریز شہر میں داخل ہو گئے انقلابیوں نے سخت مقابلہ کیا مگر چوں کہ قلعہ اور میگزین ان کے قبضے میں نہ آسکا تھا اس لیے شکست ہوئی۔ مولوی صاحب یہاں سے ہٹ کر گھوڑے پر سوار ہو کے چھپتے چھپاتے سنگرور کیمپ پہنچے اور اپنے ساتھیوں کو لے کر گنگا پار چلے گئے اور نانا صاحب کے پاس کانپور جا پہنچے، مگر ترب و جوار میں انھوں نے ایسی آگ لگا دی تھی کہ انگریز مدت تک چین سے نہ بیٹھ سکے۔ نہ تو کہیں سے رسد ملتی تھی، نہ سواری کے لیے جانور۔ حتیٰ کہ بیماروں کے لیے کہار تک نہ تھے اور گرمی شدید تھی۔ عوام نے دشمن کا اتنا زبردست بائی کاٹ کیا تھا کہ گورے کے ہاتھ روٹی بیچنے کے جرم میں ایک نان بائی کے ہاتھ اور ناک کاٹ لی گئی۔ نیل نے انقلابیوں کی گرفتاری کے لیے انعام مقرر کیا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ یہ مصیبتیں تھیں کہ انگریزی فوج کو ہیضے

نے آد بوچا، مدار کو الہ آباد انگریزی چنگل میں آچکا تھا مگر انقلابی رہنما صاف بچ کر نکل گئے۔ "بہادر" انگریزوں نے الہ آباد کو دوسرا بنارس بنا دیا۔ سیکڑوں بے گناہوں کو پھانسی ۔۔ بے شمار دیہات نذرِ آتش ۔۔۔! جون کے کو اقرار ہے کہ اندازاً چھ ہزار انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا، سیکڑوں عورتیں، بچے، جوان، بوڑھے زندہ جلا دیے گئے[1] ایک انگریز لکھتا ہے ۔۔۔۔

"الہ آباد ویران آباد کا نمونہ ہو گیا جس جگہ پر خوش نما مکانات اور دل فریب باغ تھے وہاں اب جلے ہوئے در و دیوار اور ویران مکانات نظر آتے ہیں"[2]

الہ آباد پر قبضہ کے بعد انگریزوں نے اس کو اپنا مضبوط گڑھ بنا لیا اور کیننگ بھی کلکتے سے یہیں آگیا تھا۔ جب کان پور سے محاصرے کی خبریں آئیں تو اس نے میجر رینارڈ کو روانہ کیا (۳۰ جون) رینارڈ کی یہ فوج راستے میں تمام گاؤں جلاتی ہوئی بڑھنے لگی[3] اب ہیولک انگریزی فوجوں کا کمانڈر مقرر ہوا جو اسی زمانے میں جنگ ایران ختم ہونے پر انگریزی فوج کے ساتھ یہاں پہنچا تھا، وہ کان پور کی طرف روانہ ہوا اس کے ساتھ وہ انگریز بھی تھے جن کو انقلابیوں نے رحم کھا کر چھوڑ دیا تھا ۔۔۔ جب ناناصاحب کو

۱؎ ہومز نے بھی اپنی کتاب میں (۳۳۰) ان مظالم کا اعتراف کیا ہے۔

۲؎ "محاربہ عظیم" / ۳۳۶

۳؎ مارٹن بن لکھتا ہے ۔۔۔ "میجر موصوف نے تین دن تک کوچ کیا اور اپنے پیچھے جوشِ انتقام کی علامتیں یعنی برباد شدہ مواضعات اور درختوں کی شاخوں میں لٹکتی ہوئی لاشیں چھوڑتا گیا"۔ / ۵۰۴

رینارڈ کے آنے کی اطلاع ملی تو انھوں نے کچھ دستے مقابلے کیلئے بھیجے مگر جب یہ دستے پہنچے تو ہیولاک بھی رینارڈ سے آ کر مل چکا تھا اور یہ متحدہ فوجیں فتح پور کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

فتح پور بریلی اور شاہ جہاں پور کے ہنگاموں کی خبریں آنے پر یہاں بھی آزادیٔ وطن کے دبے ہوئے جذبات ۹ رجون کو شعلوں میں تبدیل ہو چکے تھے، جیل سے قیدی رہا ہوئے، خزانے پر انقلابیوں کا قبضہ ہوا، سرکاری عمارتیں اور انگریزوں کے بنگلے جلا دیے گئے۔ تار کاٹ دیے گئے۔

آخر کار ۱۲ر جولائی کو انگریزوں کی فوجیں جن میں نیل بھی تھا ہیولاک کی کمان میں فتح پور پہنچیں اور نانا صاحب کے دستوں سے مقابلہ ہوا مشہور ہے کہ اس مقابلے میں مولوی لیاقت علی بھی شریک تھے۔ یہاں کے باغیوں کی رہنمائی ایک سرکاری عہدے دار (ڈپٹی مجسٹریٹ) حکمت اللہ کر رہے تھے۔ انقلابیوں کو پسپا ہونا پڑا، انگریزی فوجیں داخل ہوئیں اور تمام شہر شعلوں میں تبدیل کر دیا۔ فوج نے عام لوٹ مچا دی —— فتح پور کی آگ کا دھواں کان پور میں بھی اپنے ساتھ معصوم بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کی دل دوز چیخیں اور کراہیں لے کر پہنچا۔ پورا کان پور جوش و غصے سے کانپ اٹھا۔

اب انگریزی فوجیں کان پور کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ مگر کیسے؟ ——

ایڈورڈ ٹھامسن ایک انگریز مورخ کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے۔

"مصنف کا اشارہ جنرل نیل کی سپاہ کے اُن ہولناک مظالم کی طرف ہے جو محاصرۂ کان پور کی غرض سے جاتے وقت راستے میں دیہات کو اُن کی تمام آبادی سمیت زندہ جلا دینے کی صورت میں سرزد ہوئے۔ اگرچہ اُن بزدلانہ مظالم کے عینی شاہدوں کے تفصیلی بیانات میرے پاس موجود ہیں لیکن میں ناظرین

کو ان رنج دہ واقعات کے مطالعے سے مزید تکلیف میں ڈالنا مناسب نہیں سمجھتا " [1]

" پورے غور سے تحقیقات اور معتبر ذریعوں سے اطلاعات حاصل کرنے کے بعد مجھے مکمل یقین ہے کہ دہلی، کان پور جھانسی وغیرہ میں انگریزوں پر مظالم کی تمام داستانیں فرضی ہیں جنھیں گھڑنے والوں کو شرم آنا چاہیے "

——— لے یارڈ ممبر، پارلیمنٹ انگلینڈ

("ٹائم" ۲۵ راگست ۱۸۵۸ء)

---

[1] تصویر کا دوسرا رخ / ۷۳

6185 ۷

کان پور

پیشوا ناناصاحب اور عظیم اللہ خاں

کان پور کے قریب بٹھور میں پیشوا باجی راؤ کا خاندان جس سے ۱۸۱۸ء میں حکومت چھین کر آٹھ لاکھ سالانہ پنشن مقرر کر دی گئی تھی، جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ باجی راؤ کے تین لے پالک بیٹے دھوندو پنت نانا، سدا شیو پنت دادا، اور گنگا دھر راؤ بالا تھے، جن میں دادا راؤ کا ۱۸۵۷ء سے پہلے انتقال ہو چکا تھا اور ایک بیٹا پانڈو رانگا راؤ (معروف بہ راؤ صاحب) یادگار چھوڑا تھا۔

۱۸۵۱ء میں پیشوا باجی راؤ (ثانی) کا انتقال ہو گیا۔ مرتے وقت باجی راؤ نے وصیت کی کہ تمام جایداد پنشن کے حق دار اُن کے متبنّیٰ (منہ بولے بیٹے) ناناصاحب[1] ہوں گے

---

[1] ناناصاحب مہاراشٹر کے ایک گاؤں دینو میں غریب ماں باپ ــــ مادھو راؤ نرائن بھٹ اور گنگا بائی ــــ کے گھر ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں باجی راؤ پیشوا (اگلے صفحے پر)

انگریز کمپنی کو اب یہ پنشن بھی دینا گوارا نہ تھا چناں چہ بند کر دی گئی۔ مگر مجبور ہو کر نانا صاحب نے سنہ ۱۸۵۳ء میں عظیم اللہ خاں کو اپنا وکیل بنا کر انگلینڈ بھیجا جو حسب دستور ناکام ہوئے کہا یہ گیا کہ نانا صاحب اس پنشن کے ضرورت مند نہیں کیوں کہ باجی راؤ نے کافی دولت چھوڑی ہے۔ اس ناکامی کے بعد عظیم اللہ خاں نے لندن ہی میں ستارا کے راجہ رانگو باپوجی

تخت چھوڑ کر گنگا کے کنارے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے، ان کی سخاوت اور نیک دلی کا شہرہ سن کر بہت سے خاندان بٹھور (برہمورتا) چلے آئے تھے اور ان ہی میں مادھو راؤ کا خاندان بھی تھا جو سنہ ۱۸۲۷ء میں آیا۔ ان کے تین سالہ بچے نے باجی راؤ کا دل موہ لیا اور بچپن کے باوجود اپنے جذبات اپنی سنجیدہ سوجھ بوجھ اور ذہانت کی بدولت دربار میں ہر دل عزیز ہو گیا۔ چناں چہ ۷ جنوری سنہ ۱۸۲۷ء کو جب کہ یہ بچہ تقریباً ۲½ سال کا تھا انھوں نے اس کو گود لے لیا۔ نانا کی پرورش کی تعلیم و تربیت دی گئی، جاگیردار سنگھی کی بھتیجی سے شادی ہوئی، نانا صاحب جانور پالنے، ہتھیار جمع کرنے اور سیر و شکار کے شوقین تھے مگر عیش و عشرت اور فضولیات میں مبتلا نہ تھے۔ مرجون کے نے بھی اقرار کیا ہے کہ "وہ ظاہری آرائش اور تصنع سے بیگانہ نوجوان تھے اور کسی غیر معقول عادت میں مبتلا نہ تھے" ان کا رنگ ہسپانوی باشندوں کی طرح صاف و شفاف تھا، آنکھیں چمکیلی اور روشن نفیس، گفتگو دل چسپ اور پُر مزاح تھی، وہ انگریزوں کے ساتھ مہربانی اور کشادہ دلی کا برتاؤ کرتے تھے، اُن میں ذاتی بغض و عداوت کا شائبہ بھی نہ تھا، وہ سیاست میں دل چسپی رکھتے تھے اور روزانہ انگریزی اخبارات پڑھوا کر سنتے تھے (ساورکر/ ۳۰)۔ بعض لوگ غلط فہمی کی بنا پر اُن کا نام نانا فرنویس سمجھتے ہیں حال آں کہ نانا فرنویس اُس وقت سے تقریباً پچاس سال پہلے سلطان ٹیپوؒ کے عہد میں مرہٹہ سردار تھے۔

۵ عظیم اللہ خاں کے خاندانی حالات کا پتہ نہیں، (اگلے صفحے پر)

سے مل کر بغاوت کی اسکیم بنالی۔ باپو تو ستارا واپس آگئے مگر عظیم اللہ خاں نے جن کا لہو سوزِ بغاوت سے کھول رہا تھا۔ غیر ممالک کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے یورپ کا دورہ کیا، ٹرکی کے خلیفہ سے ملے، روس میں قیام کیا اور بعض انگریز مورخین کو شبہ ہے کہ وہ روس میں یہ معلوم کرنے گئے تھے کہ انگریزوں کے خلاف جنگ میں روس کس حد تک امداد کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ بغاوت شروع ہونے سے پہلے ملک میں افواہ تھی کہ نانا صاحب نے روس سے معاہدہ کرلیا ہے اور روس انگریزوں پر حملہ آور ہوگا۔ افسوس۔! کہ انھوں نے جو کوششیں کیں ان کا مفصل حال تاریخ کے صفحات پر محفوظ نہ رہ سکا یہ بھی پتہ چلا کہ وہ مصر میں بھی اپنی اسکیم کو کامیاب بنانے کی فکر میں تھے۔ بعد میں کچھ خطوط انگریزوں

وہ اپنی ابتدائی زندگی میں ایک انگریز کی گھریلو ملازمت پر مامور تھے اور غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے، کچھ عرصے میں انھوں نے انگریزی اور فرانسیسی زبانیں سیکھ لیں اور اس کے بعد کانپور کے ایک اسکول میں تعلیم حاصل کی اور وہیں ٹیچر ہوگئے، ان کی قابلیت کا شہرہ نانا صاحب تک بھی پہنچا اور اس طرح اس دربار سے ان کا تعلق ہوگیا، نانا صاحب نے ان کو اپنا مشیر خاص بنالیا اور ان کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہ کرتے تھے۔ وہ ۱۸۵۴ء میں انگلینڈ گئے اور وہاں اپنی شرافت، وجاہت، نقرئی آواز اور دیگر خوبیوں کی بنا پر بے حد موثر ہوگئے۔ یہاں تک کہ بعض انگریز عورتیں ان کی محبت میں مبتلا ہوگئیں۔ ہیروں اور جواہرات سے مرصع اس ہندوستانی راجہ کو دیکھنے کے لیے حیرت زدہ انگریزوں کی بھیڑ جمع ہو جاتی تھی بٹھور اور کانپور کی تباہی کے بعد کچھ خطوط انگریزوں کو ملے جو انگلینڈ کی معزز عورتوں نے عظیم اللہ کو لکھے تھے ۔۔۔۔۔۔ (ساورکر)

کے ہاتھ لگے جن میں کئی خود عظیم اللہ خاں کے لکھے ہوئے تھے اور ان میں سے دو قسطنطنیہ کے عمر پاشا کے نام تھے۔ ساورکر نے لکھا ہے [۲]

"۱۸۵۷ء کے اہم کرداروں میں عظیم اللہ خاں کا نام سب سے زیادہ روشن اور نمایاں ہے۔ جو دماغ سب سے پہلے جنگ آزادی کے تصور سے متاثر ہوئے اُن میں عظیم اللہ کو نمایاں مقام دیا جانا چاہیے۔ بغاوت کو منظم اور مکمل کرنے والی بہت سی اسکیموں میں عظیم اللہ کی اسکیمیں خصوصیت سے قابل غور ہیں"۔ (۳۲)

بغاوت کا خوف اپریل ۱۸۵۷ء میں نانا صاحب اور عظیم اللہ نے مختلف جگہوں کا دورہ کیا اور بغاوت کا پلان مکمل کرلیا خفیہ جماعت برابر اپنا کام کر رہی تھی اور انگریز اُن کے ارادوں سے بے خبر تھے کہ ۱۴ر مئی کو میرٹھ کے ہنگاموں کی خبر پہنچی۔ ان ہی دنوں بازار میں نیا آٹا بکنے کے لیے آیا جس کا نرخ نسبتاً کم تھا اور یہ بدبودار بھی تھا اس لیے یہ افواہ پھیل گئی کہ آٹے میں بھی گائے اور سور کی ہڈیاں پیس کر ملا دی گئی ہیں، عوام میں بے چینی کی لہر دوڑنے لگی، بغاوت کی افواہیں پھیلنے سے انگریز افسران خوف زدہ ہو گئے، جنرل وہیلر نے محفوظ پناہ گاہ (میدان پریڈ میں) بنائی اور نانا صاحب سے کان پور کی حفاظت کے لیے درخواست کی کیوں کہ ان پر انگریزوں کو اب تک مکمل اعتماد تھا۔ نانا صاحب ۲۲ر مئی کو کچھ فوج لے کر کان پور آگئے، خزانہ اور میگزین ان کی حفاظت میں دے دیا گیا، وہیلر کی رائے سے تجویز ہوا کہ

1. Roberts _ 429
2. Savarkar 32

انگریز عورتیں اور بچے ان کے محل میں چلے جائیں، اس دوران میں بغاوت کے لیے خفیہ کوششیں ہو رہی تھیں۔ باغی سپاہیوں کے لیڈر صوبہ دار ٹیکہ سنگھ، اور شمس الدین خاں کے مکان پر انقلابی کارکنوں کے جلسے ہوتے تھے اور ان جلسوں میں نانا صاحب کے دو وفادار ملازم جوالا پرشاد اور محمود علی اُن کی نمایندگی کرتے تھے۔ یکم جون کو نانا صاحب اور عظیم اللہ خاں گنگا کے کنارے آئے ٹیکہ سنگھ اور دوسرے لیڈر پہلے ہی منتظر تھے۔ کشتی پانی کو چیرنے لگی اور دو گھنٹے میں بغاوت کی اسکیم مکمل ہو گئی۔

انگریزوں کو عید (۲۵ مئی) کے دن بغاوت کا خطرہ تھا۔ یہ تاریخ گذرنے پر اطمینان سا ہو گیا۔ پھر بھی اگر ذرا بھی افواہ پھیلتی تھی تو وہ بھاگنا شروع کر دیتے تھے مگر جب یہ افواہیں غلط ثابت ہوئیں اور ان کو اطمینان ہو گیا تو وہیلر نے کیننگ کو لکھا کہ "اب کوئی خطرہ نہیں" (یکم جون) چناں چہ الہ آباد سے آئے ہوئے انگریزی دستے لکھنؤ روانہ کر دیے گئے کیوں کہ انگریز اس تمام سازش سے بے خبر تھے جس میں نہ صرف سپاہی اور انقلابی عوام بلکہ رقاصہ عزیزن[۱] بھی شریک تھی۔

بغاوت اور محاصرہ

۴ جون کی رات کو اچانک بغاوت پھوٹ پڑی ۵ رکو دو رجمنٹیں اور باغی ہو گئیں اور پروگرام کے مطابق انقلابیوں نے نواب گنج کی طرف مارچ کیا جہاں نانا صاحب کا کیمپ تھا۔ خزانہ (جو کلکٹری

---

[۱] عزیزن شمس الدین خاں کی محبوبہ اور فوجیوں کی ہردل عزیز رقاصہ تھی مگر وہ بازار میں محبت فروخت کرنے والیوں میں سے نہ تھی۔ وہ جذبۂ آزادی سے سرشار تھی اور شمس الدین خاں کے ذریعے تمام حالات سے باخبر۔

نواب گنج میں تھا) اور میگزین انقلابی ہاتھوں میں آ گیا۔ یہ باغی فوجیں دہلی کی طرف مارچ کرنے لگیں لیکن کلیان پور تک پہنچی تھیں کہ واپس آ گئیں یہ بات تحقیق طلب ہے کہ ان کو کس نے واپسی پر آمادہ کیا۔ بعض انگریزوں کا کہنا ہے کہ باغی فوج اور نانا کے درمیان پہلے سے کوئی پروگرام یا خفیہ پلان طے شدہ نہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نانا صاحب باغی فوج کو اپنی رہنمائی میں دہلی لے جانا چاہتے تھے، مگر عظیم اللہ خاں نے وہیں رہ کر مقابلے کی تجویز کی[1] کان پور کے مسلمانوں نے مولانا سلامت اللہ کی رہنمائی میں آزادی اور انقلاب کا پرچم لہرایا اور نانا صاحب کی حمایت کا اعلان کیا۔ عورتیں بھی میدان میں نکل آئی تھیں جن میں عزیزن مردانہ لباس پہنے گھوڑے پر سوار سب سے آگے نظر آتی تھی۔ وہ زخمیوں کو دودھ اور مٹھائیاں تقسیم کرتی تھی نانا صاحب کو فوج نے سلامی دی، صوبے دار ٹیکا سنگھ کمانڈر مقرر ہوئے اور شان دار جلوس کے ذریعے اعلان ہوا کہ نانا صاحب کی حکومت ہو گئی، تمام انتظامات عظیم اللہ، ہولاس سنگھ، ٹیکا سنگھ، شاہ علی، جوالا پرشاد اور رحیم خاں وغیرہ نے سنبھال لیے۔ جیل سے قیدی چھوٹے سرکاری عمارتیں اور مکانات جلا دیے گئے[2]۔

اب نانا صاحب نے وہیلر کو حملے کی اطلاع دی جو اپنے ساتھیوں کو لے کر محفوظ مقام پر چلا گیا تھا۔ اور اطلاع سے بارہ گھنٹے بعد ۶ر جون کو محاصرہ کر لیا گیا۔ انگریزوں نے بھی مقابلے کی تیاری کر لی تھی، گولہ باری ہونے لگی، بچے اور عورتیں پناہ گاہ میں مرنا شروع

1. Sen - 138.

[2] "محاربۂ عظیم" / ۱۲۰ "تاریخ بغاوت ہند" از مکند لال

نانا صاحب کا ایک اہم اشتہار

اشتہار

ایک مسافر وارد حال شہر کانپور جو کہ کلکتہ سی آیا تہا سنا گیا کہ کارتوسون کی تینی سی پہلی واسطی لینی دین اور مذہب ہندوستانیون کے
کونسل ہوئی صاحبان کونسل کی یہہ رای ٹہری کہ چونکہ یہہ مقدمہ دین کا ہی اسمین سات آٹھہ ہزار گورہ و انگریز کام آوینگے اور پچاس
ہزار ہندوستانی قتل ہونگے تب کل ہندوستانی کرسٹان ہو جاوینگے اس مضمون کی عرضی ملکہ وکٹوریہ کی خدمت مین بہیجی گئی بادشاہی
منظوری آئی پہر دوبارہ کونسل ہوئی اور انگریزی سوداگر بہی شریک کونسل کی کئی گئی یہہ تجویز ہوا کہ واسطی مدد کی سیاہ گورہ اسقدر
مرحمت ہو کہ جسقدر فوج ہندوستانی ہی کہ مبادا بروقت فتنہ بلند ہونے کی ہار نجاوین جب یہہ عرضی ولایت مین پڑہی گئی
وہان سی ۳۵ ہزار گورہ بہت جلدی جہازون پر سوار ہو کر روانہ ہندوستان ہوئی اور اونکی روانگی کی خبر کلکتہ مین آئی
صاحبان کلکتہ نی واسطی بانٹنی کارتوسون کی حکم جاری کیا کہ اصل مطلب اوس سی کرسٹان کرنا فوج ہندوستانی کا تہا کہ
جب فوج کرسٹان ہو جاویگی تب رعایا کی کرسٹان کرنی مین دیر نہوگی اور کارتوسون پر سور اور گای کی چربی ملی ہوئی تہی
یہہ حال بابت بنگالیون کی جو کارتوس بنانی پر متعین تہی معلوم ہوا چنانچہ اسبات کی ظاہر کرنیوالون سی ایک شخص جان سی
مار ڈالا گیا اور باقی سب قید ہوئی یہان یہہ اپنی تدبیرین کرتی تہی وہان یہہ خبر وکیل سلطان روم نی لندن سی اپنی سلطان
پاس بہیجی کہ یہان سی ۳۵ ہزار گورہ واسطی کرسٹان کرنی ہندستانیونکی روانہ ہندستان کی ہوئی سلطان روم خلد اللہ ملکہ نی
پادشاہ مصر کی نام فرمان جاری کیا خلاصہ اوسکا یہہ ہی کہ ملکہ وکٹوریہ سی سازش کرتی ہو یہہ وقت صلح کا نہین ہے کیونکہ ہماری وکیل
کی لکہنی سی معلوم ہوا کہ ۳۵ ہزار فوج گورہ واسطی کرسٹان کرنی رعایا اور فوج ہندستانکی روانہ ہندستان کو ہوئی ہے پس اسصورت
مین بہی اوسکا تدارک ممکن ہے اگر تم غفلت کرینگی تو خدا کو کیا منہہ دکہاوینگی اور یہہ دن ایکروز ہماری بہی آنیوالا ہی کیونکہ اگر انگریز
ہندستانیون کو کرسٹان کرلینگی تو ہماری ملک کا بہی قصد کرینگی جب یہہ فرمان سلطان روم مصر کی پادشاہ پاس پہونچا والی مصر نے
قبل پہونچنی فوج گورہ کی انتظام و اجتماع اپنی فوج شہر اسکندریہ مین کیا کیونکہ وہی راہ آمد ہندستان کی ہی بمجرد پہونچنی فوج گورون
کی فوج پادشاہ مصر نی چارون طرف سی توپین مارنا شروع کین اور جہازونکو توڑ تاڑ کر ڈبو دیا کہ ایک گورہ بہی اون مین سے
باقی نرہا انگریزان کلکتہ بعد جاری کرنی حکم کاٹنی کارتوسکی اور بلند ہونی اس فتنہ و فساد کی منتظر مدد فوج لندن کی
تہی کہ حق تعالی نی اپنی قدرت کاملہ سی پہلی ہی اونکا کام تمام کیا جب خبر قتل ہونی فوج لندن کی معلوم ہوئی تب
گورنر جنرل نی بہت رنج و غم کیا اور اپنا سر پیٹا ؎ سر شب سر قتل و تاراج داشت ٭ سحرگہ نہ تن سر نہ سر تاج داشت
بیک گردش چرخ نیلوفری ٭ نہ نادر بجا ماند و نی نادری ٭ حسب الحکم پیشوا بہادر طبع شد سوم ذیقعدہ سنہ ۱۲۷۳ ہجری

ہو گئے، تین چار دن کی گولہ باری میں انگریزوں کا حال پتلا ہو گیا، انھوں نے اپنے آدمی چھوڑے کہ وہ شہریوں کو روپے کا لالچ دیں اور باغیوں میں کسی طرح پھوٹ ڈلوا دیں مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا کیوں کہ اُدھر بھی کڑی نگرانی ہو رہی تھی۔ انقلابیوں نے اگرچہ سلسلۂ رسل و رسائل کاٹ دیا تھا، پھر بھی ایک ہندوستانی جنرل وہیلر کا خط چڑیا کے پَروں میں چھپا کر لکھنؤ لے گیا جس میں مدد کی درخواست تھی۔ ایک انگریز نے جب جاسوسی کرنے کے لیے ہندستانی لباس پہن کر نکلنا چاہا تو انقلابیوں نے پکڑ کر نانا صاحب کے سامنے پیش کیا اور اس پر مقدمہ چلا کر تین سال کے لیے جیل میں بند کر دیا —— حالانکہ گولی مار دینا چاہیے تھا۔

۲۳ر جون کو ۔ جو کہ جنگ پلاسی کی صد سالہ یادگار کا دن تھا —— کان پور میں غیر معمولی سرگرمی نظر آتی تھی اور انقلابی سپاہ نے پورے جوش و خروش سے انگریزوں پر حملہ کیا جس میں ان کی بالکل ہمت ٹوٹ گئی اور ۲۵ر جون کو صلح کا جھنڈا بلند کیا اور نانا صاحب نے صلح منظور کر لی [1]۔

نانا صاحب کی شرافت

۲۶ر جون کو انگریزوں سے صلح کی شرائط طے کرنے عظیم اللہ خاں اور جوالا پرشاد ان کے پاس گئے اور اُن سے نانا صاحب کی طرف سے کہہ دیا گیا کہ

"کان پور چھوڑ دو، تمھاری جان بچ جائے گی اور اگر تمھارے سپاہی لڑنے کو

---

[1] بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ نانا صاحب نے صلح کا پیغام بھیجا مگر یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں کہ نانا صاحب کی فتح مند فوجیں ایسی حالت میں کہ شہر پر ان کا پورا قبضہ ہے محصور شدہ انگریزوں سے صلح کی درخواست کریں۔

تیار ہوں تو اپنی عورتوں اور بچوں کو الہ آباد چھوڑ آؤ اس کے بعد آ کر لڑنا۔ ہم اس امر میں بد عہدی نہیں کریں گے، ہم جس کی دست گیری کرتے ہیں اور جو ہم پر اعتماد کرتا ہے ہم اس سے دغا نہیں کرتے اور اگر اس سے بھی دغا کریں تو خدا دیکھتا ہے اور وہ ہم کو اس کی سزا دے گا" [1]

بعض انگریزوں کا بیان ہے کہ نانا صاحب خود انگریزوں کے پاس آئے اور یہ الفاظ کہے۔ جنرل ویلر اپنے باقی ساتھیوں کے ہمراہ باہر آ گیا اور کہا کہ "اگر تم کو بد عہدی کرنا ہے تو ہم کو یہیں ختم کر دو" مگر نانا صاحب نے یقین دلایا کہ ان کا یہ ارادہ ہرگز نہیں ہے۔ اب ذرا لطف ملاحظہ ہو کہ اسی نانا کے حکم سے، جس کو انگریز مورخین اپنی فطری بد دیانتی اور تعصب سے مجبور ہو کر شیطان، درندہ، بھیڑیا اور نہ جانے کیا کیا خطاب دیتے ہیں۔ ان انگریزوں کو الہ آباد پہنچانے کے لیے چالیس کشتیاں تیار کی جاتی ہیں۔ اور پھر نانا کے ان ہی دشمنوں کی زبانی سنیئے کہ جب انگریزوں نے ان کشتیوں کو پسند نہیں کیا تو فوراً سو مزدور لگا کر ان کی مرمت کا حکم دیا گیا، ان کو آرام دہ بنایا گیا۔ شامیانے، چھتریاں اور تمبو لگائے گئے، غلاف چڑھا کر خوب صورت بنایا گیا۔[2] کھانے (پکوا کر) اور اناج وغیرہ رکھے گئے۔ انگریزوں کو گاڑیوں اور ہاتھیوں پر سوار کرا کر پناہ گاہ سے دریا تک لایا گیا، راستے میں دونوں طرف فوج کا پہرہ تھا، جنرل ویلر کا خاندان ایک آراستہ ہاتھی پر تھا جس پر نانا صاحب کا ہودہ رکھا ہوا تھا اور ویلر خود پالکی میں تھا۔ اس طرح یہ لوگ نہایت

---

[1] محاربۂ عظیم / ۱۲۶

2. Savarkar - 230, 233.

عزت و آرام کے ساتھ دریا تک پہنچے۔[1] کشتیوں میں سوار ہوئے۔ تانیتا ٹوپی، بالا صاحب اور عظیم اللہ خاں قریب ہی ایک مندر کے چبوترے پر کھڑے یہ سین دیکھ رہے تھے جب انگریز سوار ہو گئے تو نانیتا ٹوپی نے اپنا ہاتھ آگے پیچھے ہلا کر کشتیوں کو چلنے کا اشارہ کیا کہ اچانک بندوق اور توپ کی آوازیں آنے لگیں۔ انگریز بدحواسی میں کشتیوں میں سے کودنے لگے، کچھ دریا میں ڈوبے اور کچھ بندوقوں سے مارے گئے، بہت سے باقی بچے۔ یہ کیوں ہوا؟ - کسی اور کی نہیں، یورپین عورت ہورسٹ کی زبانی سنیے۔ جو خود اس موقعے پر موجود تھی؛ اپنی سرگزشت میں کہتی ہے۔

قتلِ عام کی وجہ

"اس کا سبب یہ تھا کہ جنرل ہیولاک جنرل ویلر کی رہائی کی غرض سے کان پور کے نزدیک آیا ہوا تھا جس وقت کہ ہم کشتی میں بیٹھ کر عازم الہ آباد ہوئے۔ وہ بارود کا ڈھیر جو شفاخانے (انگریزوں کی پناہ گاہ) میں محافظوں کی غفلت سے جل اٹھا، ہندوستانیوں نے خیال کیا کہ انگریز لوگ پھر جنگ پر آمادہ ہو گئے ہیں اور ابھی کان پور سے باہر نہیں گئے۔ جنرل ہیولاک کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ وجہ تھی کہ ہم سب لوگ

---

[1] ہورسٹ انگلیسی لکھتی ہے — "میں اور میرے بچے ایک گاڑی میں اور دوسرے لوگ اور گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دریا کے کنارے کی طرف جہاں بہت سی کشتیاں موجود تھیں۔ چلے جاتے تھے چوں کہ نانا راؤ نے عہد کر لیا تھا کہ ہم کو نہایت عزت و آبرو کے ساتھ اپنی حفاظت میں گنگا کے پار آمادہ گا اس لیے ہماری حفاظت کو دونوں طرف مسلح سپاہی شفاخانے سے گنگا کے کنارے تک کھڑے ہوئے تھے اور ان کے پیچھے ایک کثیر جماعت شہر کے تماشائیوں کی کھڑی ہوئی ہمارے چلنے کا تماشا دیکھ رہی تھی" /۱۷

کے قتلِ عام کا حکم دیا گیا۔ لیکن بعد میں جب ہم لوگوں کی بے گناہی معلوم ہوئی تو نانا راؤ نے اُن لوگوں کو جو قتل سے محفوظ رہے تھے نجات دی "۔

متعصب انگریز مورخ دیکھیں کہ خود ان ہی کی ایک عورت ان کے ریت کے بنے ہوئے محل مسمار کر رہی ہے۔ کاش ۔ یہ گہر افشانیاں کرتے وقت یہی سوچ لیتے کہ جس نانا کو خود ان کے قلم نے پاک باز، سخی، مہربان اور بلند کردار لکھا، پسندیدہ عادات کا حامل بتایا، نامعقول باتوں سے بری قرار دیا۔ جس نانا نے حملے سے پہلے ویلر کو آگاہ کیا، جس نے انگریز جاسوس کو جو ہندوستانی لباس میں پکڑا گیا تھا گولی مارنے کے بجائے قید کر دیا، جس نے پروردگار عالم کو درمیان کر کے ان کی حفاظت کا وعدہ کیا ــــ وہ اور انگریزوں سے بدعہدی کرے؟ ــــ وہ بلند کردار، جو ان سے یہ کہے کہ "اپنی عورتوں اور بچوں کو الہ آباد چھوڑ آؤ بعد میں آکر لڑنا ہے ــــ ان نہتوں کو قتلِ عام کرے؟ کس قدر عجیب بات ہے کہ پناہ گاہ سے نکلتے وقت تو ان فتنہ پردازوں کو چھوڑ دے اور جب عزت و احترام کے ساتھ گاڑیوں اور ہاتھیوں پر بٹھا کر خوب ضرورت کشتیوں میں سوار کرا دے، اناج، کھانے اور دیگر ضروری سامان مہیا کر دے تو ان کے قتلِ عام کا حکم دے ــــ! گویا نانا صاحب نے یہ سب تماشہ ان کو قتل کرنے کے لیے کیا تھا۔ اور ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ جب یہ نہتے اور بے کس انگریز کشتیوں میں سوار ہو جائیں تو ان پر بم باری ہو ان کی عورتوں اور بچوں کو مارا جائے ــــ اگر قتل ہی کرنا تھا تو پناہ گاہ سے نکلتے وقت کیا ان کی ایک دبی بھی ہاتھ آ سکتی تھی؟ ۔ اور کیا یہ مٹھی بھر خوف زدہ انگریز انقلابیوں کا کچھ بگاڑ سکتے تھے؟ ۔ پھر یہ کہ جب یہ سب پناہ گاہ سے دریا کو جا رہے تھے تو شہر کے تماشائیوں کا ہجوم تھا جس نے دریا پر پہنچنے تک "چوں" بھی نہ کی ۔ حال آں کہ اس وقت کان پور

میں الہ آباد اور بنارس کے بے شمار ستم رسیدہ جمع تھے۔ جن کی جائدادیں پھونک دی گئی تھیں جن کے بیٹوں کو زندہ جلا دیا گیا تھا یا جن کے باپوں کو "8" اور "9" کی شکل بنا کر پھانسیاں دی گئی تھیں۔ جن کے ننھے ننھے معصوم بچوں کو آگ میں بھون دیا گیا تھا جن کے مذہب کو پاؤں تلے روندا گیا تھا، جن کی قوم کو غلام بنا لیا گیا تھا —— اور یہ وہ تھے جن کے سینوں میں انتقام اور اشتعال کی آگ لگی ہوئی تھی۔!! قتل کرنا ہوتا تو یہ مشتعل ہجوم راہ میں ہی تکا بوٹی کر سکتا تھا۔ مگر جھوٹے کو یاد نہیں رہتا کہ وہ خود کیا کہہ گیا۔ انگریز مورخین کو تو فقط نانا صاحب پر کیچڑ اچھالنا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ان کے ہی منھ پر آ پڑی۔!

قتل عام کے بعد

مختصر یہ کہ جب اس طرح ستی چورا گھاٹ پر انگریزوں کا قتل عام شروع ہوا تو عوام اور سپاہی بے تحاشا ان پر ٹوٹ پڑے۔ جو انگریز بچ کر بھاگے اُن کا پیچھا کیا اور پکڑ پکڑ کر قتل کیا لیکن غلط فہمی معلوم ہوئی تو باقی کو پناہ دی گئی جو تقریباً ایک سو پچیس تھے اور ان میں زیادہ عورتیں تھیں نانا صاحب کا اشارہ پاتے ہی انگریزوں کے قتل عام کے لیے اٹھے ہوئے لاکھوں ہاتھ فوراً ساکت ہو گئے[1]۔ یہ لوگ قیدیوں کی طرح شہر میں لائے گئے اور ایک انگریز کے مکان میں رکھے گئے یہ مکان بی بی گڈھ کے نام سے مشہور ہے لیکن بعض کتابیں "اسمبلی روم" نام بتاتی ہیں۔ اس مکان میں ہر طرح کا سامان اور آسانیاں فراہم کی گئیں،

---

[1] چناں چہ پور میں عورت ہو دست لکھتی ہے۔ "اس درمیان میں نانا راؤ سرداروں کی ایک جماعت کے ساتھ وہاں وارد ہوا۔ اس کے ایک اشارے سے تمام تلواریں نیام میں چلی گئیں اور نانا راؤ ہم سب کو اپنے آگے کر کے مثل قیدیوں کے شہر کی طرف روانہ ہوا۔" (ص ۱۷۰)

انگریزوں کی خدمت کے لیے نوکر رکھے گئے، ان قیدیوں میں ایک انگریز عورت اپنے بیان میں کہتی ہے :

"جو بہشتی نانا صاحب نے قیدیوں کو پانی پلانے کے واسطے ملازم رکھا تھا وہ میرے مالک کا قدیم نوکر تھا" [1]

لیکن ان تمام آسانیوں کے ساتھ یہ حکم بھی تھا کہ یہاں سے یہ لوگ باہر نہ نکلیں۔ ساتھ ہی نانا صاحب نے دہلی کو اطلاع دی کہ اتنی انگریز عورتیں ان کے پاس قید ہیں ان کا کیا کیا جائے۔

جب باقی بچے ہوئے یا بھاگتے ہوئے انگریز گرفتار کر کے نانا صاحب کے سامنے لائے گئے تو انھوں نے کہا کہ "ان کو قتل نہ کرو بلکہ قید رکھو"۔ جب جنرل ویلر پابہ زنجیر حاضر کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ — "جنرل صاحب کے ہاتھ کھول دو"۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے اس پُر آشوب اور ہیجان انگیز دور میں بھی نانا صاحب نے اپنے اُس دشمن کے ساتھ جس نے ان کی قوم، ملک اور مذہب کو سو سال تک روندا، اُس ظلم و ستم کا عُشرِ عشیر بھی نہیں کیا جو ایسے موقعوں پر دنیا میں ہوتا ہے۔ جو سیکڑوں بار انگلستان نے ہندوستان کے ساتھ کیا، آسٹریا نے اٹلی کے ساتھ کیا، اسپین نے مُورس (MOORS)

---

[1] "محاربہ عظیم"، ۱۲۷ - اسی طرح انگلیسی لکھتی ہے — "اس کے حکم سے ہم لوگوں کو ایک انگریز سردار کے مکان میں جگہ دی گئی جہاں ہماری آسائش کا کافی سامان مہیا تھا لیکن ساتھ ہی اس کے یہ بھی حکم تھا کہ اس مکان سے نکل کر کہیں باہر نہ جائیں"۔ (۱۴۰)

سے یا یونان نے ترکوں سے کیا تھا۔

نانا صاحب کی تخت نشینی

۲۸ر جون کو نانا صاحب نے دربار کیا، سب سے پہلے شہنشاہِ ہند بہادر شاہ ظفر کی سلامی کے لیے ایک سو اکیس توپیں داغی گئیں، پھر فوجی پریڈ ہوئی، جب نانا صاحب کیمپ میں آئے تو خوشی کے نعرے بلند ہوئے اور اکیس توپوں کی سلامی دی گئی۔ پہلی جولائی ۱۸۵۷ء کو نہایت شان و شوکت سے نانا صاحب کی تاج پوشی کی رسم ادا کی گئی فوج کو انعامات تقسیم ہوئے، شادیانے بج اُٹھے۔

انگریز حملے کی اسکیم بنا رہے تھے، الہ آباد سے رینارڈ آرہا تھا لہٰذا نانا صاحب نے بھی دشمنانِ وطن کی سرکوبی کے لیے اپنی زبردست فوجیں روانہ کیں۔ رینارڈ اب موت کے منہ میں تھا لیکن ہیولاک فوراً مدد کو آگیا۔ فتح گڈھ میں دونوں فوجیں یکجا ہو گئیں اور کان پور کی طرف بڑھیں۔ دریائے پانڈو کے کنارے بالا صاحب کی سرکردگی میں کان پور کی فوجوں نے دشمن سے مقابلہ کیا، سخت جنگ کے بعد بالا صاحب زخمی ہو گئے اور ۱۵ر جولائی کو انگریزی فوجیں کان پور کے قریب آگئیں۔

انگریز عورتوں کی شرارت

قتل عام کے بعد جن عورتوں کو قید کیا گیا تھا ان کے بارے میں خود انگریزوں کے متعدد بیانات (مثلاً ٹیل کی رپورٹ) سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا گیا اُن سے محنت نہیں لی گئی، بچوں کو دودھ دیا جاتا تھا، رکھوالی کے لیے آیا مقرر تھی، ہر روز تین بار تازہ ہوا کھلانے کے لیے باہر لایا جاتا، اچھے کپڑے دیے جاتے تھے، اس کے ساتھ ہی باہر نکلنے کی سخت ممانعت تھی، اگر کچھ انگریز عورتیں ہیولاک سے سازش

کرنے لگیں، انھوں نے پتھروں میں خطوط باندھ کر باہر پھینکے اور ان کو جاسوسوں نے ہیولاک تک پہنچایا۔ یہ واقعات بھی مسز انگلیسی کی زبانی سنیئے:

"اس درمیان میں کسی قسم کی تکلیف ہم کو نہیں ہوئی، بہت آرام سے زندگی بسر کی لیکن باوجود اس کے گو نانا راؤ نے اس مکان سے باہر جانے کی سخت ممانعت کر دی تھی۔ چند انگریز عورتیں پھر بھی احاطے سے باہر چلی گئیں اور باہر کے لوگوں سے نامہ و پیام کرنے لگیں خطوط پتھروں میں باندھ کر پھینکے جاتے تھے، اسی طرح باہر کے خطوط اندر آتے تھے بعض خطوط سے معلوم ہوا کہ انگریز فوج نے نانا راؤ کو شکست دی" (صفحہ ۱۷۱)

یہ حرکتیں یقیناً ایسی نہ تھیں کہ نانا صاحب اور انقلابی سپاہی ان عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتے جنھوں نے اتنا آرام اٹھا کر بھی یہ دغابازی شروع کی تھی، اور یقیناً اگر وہ ان سب کو قتل کرا دیتے تو بھی کسی کو انگلی اٹھانے کی گنجائش نہ تھی مگر نانا صاحب کی انصاف پسندی اور رحم دلی دیکھو کہ صرف ان ہی عورتوں کو پکڑ کر قتل کرایا جن پر الزام پوری طرح ثابت ہو چکا تھا لیکن چونکہ شہر کے عوام اس کمینگی پر بے حد غضب ناک ہو گئے تھے اور دوسری طرف ان ہی خطوط نے انگریزی فوجوں کی کان پور کی طرف پیش قدمی کرنے میں رہنمائی کی تھی لہٰذا ان لوگوں نے غصے میں آ کر تمام عورتوں کو کاٹ کر رکھ دیا[1]۔ صرف ایک عورت زندہ بچی۔ اور یہ

---

[1] فرانسیسی عورت لکھتی ہے ——— "اس کے بعد پھر بہت سے شہر والے ہمارے مجلس میں گھس آئے اور حملہ پر حملہ کرنا شروع کر دیا۔ آہ! اس وقت ہماری بے بسی قابلِ دید تھی" (۱۷۱)

وہی فرانسیسی نسل کی عورت ہورٹشٹ انگلیسی تھی جس نے اپنی سرگذشت میں اُن من گھڑت افسانوں کی دھجیاں اڑائیں جو بی بی گڈھ کے حادثے پر تراشے گئے تھے اور مکر و فریب کے وہ پردے اپنے قلم سے چاک کر دیے جو متعصب انگریزوں نے نانا صاحب کے گرد ڈال دیے تھے، چناں چہ یہ عورت، نانا صاحب کے بارے میں لکھتی ہے:

"میں نے نانا راؤ کو اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا، لوگ جو کچھ اس کی نسبت بیان کرتے ہیں اس کو وہ جانتے ہیں، مگر میں یہ کہتی ہوں کہ اس قتل و غارت کا باعث وہ نہیں تھا یہ شخص زیادہ سے زیادہ تیس برس کی عمر کا ہوگا، چہرہ نہایت کشادہ صورت نہایت شگفتہ، طبیعت نہایت اچھی، عادات پسندیدہ"۔ (۱۷۱)

نانا صاحب کی شکست

انگریز فوجیں جب کان پور کے قریب پہنچیں تو ہیولاک نے اپنے جاسوس نانا صاحب کی فوج میں بھیجے اور مکمل معلومات پا کر حملہ شروع کر دیا۔ انقلابیوں کے بائیں بازو پر دوپہر میں حملہ شروع ہوا۔ جنگ گھمسان کی تھی۔ انقلابی فوجیں کٹھن بردوش تھیں، ان کے بہادرانہ مقابلے انگریزوں کی زبردست اور مسلح فوجوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا رہے تھے۔ نانا صاحب گھوڑے پر سوار اپنی فوجوں کے دل بڑھا رہے تھے۔ انگریزی دستہ پسپا ہونے لگا تو ہیولاک اپنی تمام فوج لے کر بڑھا۔ انقلابیوں کا بایاں بازو اس حملے کو نہ روک سکا اور کان پور کی سڑک پر پیچھے ہٹنے لگے تو نانا صاحب نے فتح اور کام یابی کی امید بندھا کر اکٹھا کیا اور پوری قوت سے دوبارہ حملہ کیا۔ انقلابی فوجیں مسرت انگیز بہادری سے لڑیں مگر پھر بھی پسپا ہونے پر مجبور ہوئیں اور بٹھور چلی گئیں۔ انگریز کان پور میں فاتحانہ داخل ہوئے تو یہاں کے تمام انگریزوں کا خاتمہ ہو چکا تھا اور صرف ایک عورت یہ

داستان سنانے کے لیے زندہ تھی۔ جب فوجوں کو شہر کی لوٹ مار کا حکم ملا تو سکھ اور انگریز سپاہی کان پور پر اس طرح گرے جیسے زخمی شیر پر بھو کے بھیڑیے۔

عام شہریوں پر مظالم

عام باشندوں پر ہولناک مظالم ہوئے۔ برہمنوں کو انگریزوں کا خون چاٹنے اور ان کو دھونے کا حکم ہوا۔ ایک انگریز افسر کا جوش انتقام ملاحظہ ہو:

> ہم اس وقت تک صحیح معنوں میں بدلہ نہیں لے سکتے جب تک کہ ان کے تمام مذہبی جذبات کو پھانسی سے پہلے اپنے پاؤں سے روند نہ ڈالیں، تاکہ اُن کو مرتے وقت یہ اطمینان حاصل نہ ہو سکے کہ وہ ہندو رہتے ہوئے مر رہے ہیں"۔[1]

بے قصوروں کے گروہ کے گروہ روزانہ پھانسی پانے لگے۔ مگر ان بہادروں نے پھانسی کے پھندے کس جرأت و استقلال سے اپنے گلوں میں ڈالے اور ملک و قوم پر قربان ہوئے؛ چارلس بال سے سنیئے۔

> "بعض انقلابیوں نے ضبط و استقلال کی جو مثال مرتے وقت پیش کی وہ ایسی ہی تھی جیسی کہ کسی بلند اصول سے عقیدت رکھنے والے شہیدوں کی ہوا کرتی ہے۔ ایک شخص جو نانا صاحب کے دور میں کان پور کا مجسٹریٹ تھا گرفتار ہوا اور مقدمہ چلایا گیا مگر وہ تمام کارروائی کو اس قدر لاپرواہی سے دیکھ رہا تھا جیسے کہ یہ سب کچھ کسی اور کے ساتھ ہو رہا ہے۔ جب اس

1 Savarkar - 370 , 375.

کے لیے جزائے موت کا فیصلہ سنا دیا گیا تو وہ اٹھا اور پھانسی کی طرف، جو اُس کے لیے تیار تھی نہایت استقلال کے ساتھ بڑھا۔ جب اُس کو پھانسی دینے کی آخری تیاریاں کی جا رہی تھیں تو وہ ان تمام کاموں کو پُرسکون اور فطری انداز میں دیکھ رہا تھا اور ذرا سی بھی چوں چرا کیے بغیر وہ پھانسی کے تختے پر اس طرح چڑھ گیا جیسے کوئی جوگی سمادھی میں داخل ہو رہا ہو"۔[1]

تانتیا ٹوپی[2]

تانتیا ٹوپی، جس نے اب تک ایک کلرک کی زندگی گذاری تھی، ان بہادروں میں سے ہے جن پر مادرِ وطن کو ہمیشہ فخر و ناز رہے گا اور آنے والی نسلوں کے لیے اس کا ناقابلِ شکست جذبہ، غیر متزلزل عزم و ہمت اور دشمنانِ وطن سے آخر دم تک دلیرانہ مقابلہ مشعلِ راہ بنے گا، وہ مسلسل شکستوں، ناکامیوں اور مایوسیوں سے دوچار ہوا مگر ہراس، ناامیدی اور نراشا اُس کے پاس بھی نہ پھٹکے کان پور میں انقلابی فوجوں کی شکست کے بعد تانتیا ٹوپی شیوراج پور پہنچا اور وہاں

[1] (I. BALL. VOL. I. P. 388)

[2] نام رام چندر راؤ پانڈورانگا والد پانڈورنگ پنت باجی راؤ ثانی کے ملازم تھے۔ پیدائش ۱۸۱۲ء۔ ذات مرہٹہ برہمن۔ ۱۸۱۸ء میں اس کا خاندان باجی راؤ کے ساتھ بٹھور آ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ پیشوا باجی راؤ نے چہرے پر شان و شوکت کے آثار دیکھ کر ایک ٹوپی دی۔ جس میں قیمتی ہیرے جڑے تھے۔ اور تانتیا نے یہ ٹوپی پہن لی، اُس وقت سے تانتیا ٹوپی مشہور ہوا۔ یعنی وہ شخص جو ٹوپی پہنتا ہے ("ملاپ" ۱۵ اگست ۱۹۵۷ء)

ایک نئی فوج تیار کرلی۔ اب وہ دشمنان وطن پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار تھا۔ بہتر ہے کہ پہلے اودھ کے حالات پر نظر ڈال لی جائے تاکہ واقعات کا تسلسل برقرار رہے۔

"فوج نے ہمارے خلاف بغاوت کی، عوام نے غلامی کی بیڑیاں توڑ کر پھینک دیں لیکن ان میں سے کسی نے بدلہ نہیں لیا، کسی نے ظلم نہیں کیا، ایک دو کے علاوہ تمام بہادر باغیوں نے بھاگتے ہوئے انگریزوں کے ساتھ صاف رحم دلی کا برتاؤ کیا"۔

——— جارج فارسٹ

(State Papers, Vol. II, p 37)

اودھ

مولٰنا احمد اللہ شاہؒ اور بیگم حضرت محل

اودھ کی حالت

اودھ ہر حیثیت سے بہتر اور زرخیز علاقہ گنا جاتا تھا۔ انگریزوں کی حریص نگاہوں اور لالچی نظروں کا شکار ہونے کے لیے یہ وجہ بہت کافی تھی۔ چناں چہ شروع ہی سے ایسٹ انڈیا کمپنی اس بدنصیب سرزمین کو ناپاک ریشہ دوانیوں کا تختۂ مشق بنائے ہوئے تھی جب ہیسٹنگز نے نواب وزیر سے پچاس لاکھ روپیہ رشوت لے کر روہیلوں کو پامال کیا تو انگریزی نمایندہ اور "امدادی فوج" حکومت اودھ کے خرچ پر وہاں رہنے لگی اور یہیں سے اودھ کی تباہ حالی اور بے کسی کی داستان غم شروع ہوئی۔ نواب اودھ سے پے در پے مطالبے ہونے لگے، کمپنی کا اقتدار بڑھنے لگا۔ جب نواب وزیر کا ۱۷۹۷ء میں انتقال ہوا تو کمپنی نے تمام معاہدے (سوائے ادائیگی نقد کے) منسوخ کردیے اور نئی شرائط منظور کرنے پر زور دیا، نیز امدادی فوج کے خرچ میں بھی اضافہ کردیا گیا۔ نواب کو مجبور کیا کہ بنارس کمپنی کے حوالے کردے جس کی

آمدنی بائیس لاکھ تھی۔ جب نواب[۲] کے خزانے کا حال معلوم ہوا جو دو کروڑ[۲] تھا تو اور بھی رال ٹپکی۔ مگر اس تفصیل کے لیے نہ ہمارے پاس وقت ہے اور نہ گنجائش۔ ۱۷۹۲ء میں سر جان شور گورنر جنرل ہو کر آیا تو اس نے نواب اودھ سے طے شدہ رقم سے زیادہ کا مطالبہ کیا اور انکار کرنے پر اس کے وزیر لال کھاؤ کو گرفتار کر لیا۔ آصف الدولہ پر جب کافی دباؤ پڑا تو شرطیں منظور کرنا پڑیں۔ آصف الدولہ کے جانے پر پہلے تو وزیر علی کو جانشین تسلیم کیا گیا مگر بعد میں سعادت علی کو گانٹھ کر انتہائی ڈھٹائی اور بے شرمی سے "عدم مداخلت" کے اصول اور معاہدے کی خلاف ورزی کر کے اس کو تخت نشین کر دیا۔ سعادت علی سے اپنی جو من مانی شرائط تسلیم کرائیں ان میں سے چند بطور نمونہ ملاحظہ ہوں —— ملک کی حفاظت کے لیے دس ہزار انگریزی فوج رکھی جائے گی جس کا خرچ پینتیس لاکھ نواب اودھ ادا کرے۔ اودھ کی فوج پینتیس ہزار سے زیادہ نہ ہو گی، الہ آباد کا قلعہ اور دس لاکھ روپیہ نقد کمپنی کے حوالے کیا جائے۔ نواب کسی اور سلطنت سے خط و کتابت نہ کرے —— ان غلامانہ شرائط کی منظوری پر گویا نواب اودھ پر انگریزی تسلط قایم ہو گیا اور انگریزوں کے علاوہ تمام یورپین باشندوں کو اودھ سے نکال دیا گیا۔

بڑھتے ہوئے مطالبات

امدادی فوج کے لیے جو رقم منظور ہوئی تھی وہ پینتیس[۳۵] لاکھ ہی نہیں رہی بلکہ بڑھتے بڑھتے چھتر[۷۶] لاکھ ہو گئی۔ پھر بھی یہ شرط تھی کہ رقم اور بھی بڑھائی جا سکتی ہے —— ! ولزلی نے نواب اودھ کو مجبور و بے کس پا کر ایک نیا مطالبہ (۱۸۰۱ء) پیش کیا یعنی وہ اپنی غیر قواعد داں فوج کو ختم کر دے اور مزید پچاس لاکھ روپیہ سالانہ "امدادی فوج" کی نذر کرے

جس کی تعداد بڑھا دی جائے گی۔ اس طرح اودھ کی فوجی طاقت پوری طرح کمپنی کے ہاتھ میں آجاتی مگر نواب نے یہ ماننے سے صاف انکار کر دیا تو ولزلی نے فرضی الزام رکھ کر انگریزی فوجیں اودھ میں زبردستی داخل کر دیں اور نواب کو حکم ہوا کہ ان کے خرچ کا انتظام کرے۔ نواب نے عاجزی اور لجاجت سے احتجاج کیا تو ولزلی نے تمام مراسلات یہ لکھ کر واپس کر دیے کہ "ان کا طرز خطاب ہندوستان کے سب سے بڑے برطانوی حاکم کی شان کے خلاف ہے"۔ ۱۸۰۱ء میں نواب کو بے بس کر کے ایک اور معاہدہ ہوا اور بہت سا علاقہ کمپنی نے "امدادی فوج" کی کفالت کے نام سے ہضم کر لیا۔ مارش مین کہتا ہے۔

"اس ترکیب سے نواب بالکل بے بس ہو گیا کیوں کہ اس توڑ جوڑ کے مقابلے میں جیت جانے کا ڈھب اس کی سمجھ میں نہ آسکا اور ۱۳ نومبر ۱۸۰۱ء کو مجبور ہو کر اس نے ایک معاہدے پر دستخط کر دیے جس کی رو سے ایک کروڑ پینتیس لاکھ سالانہ آمدنی کے اضلاع پر کمپنی کی حکومت تسلیم کرنا پڑی" (۲۵۵)

مختصر یہ کہ ان بڑھتے ہوئے مطالبات نے اودھ کو کھوکھلا کر کے بد انتظامی پیدا کی اور اس طرح یہ "انگریزی دیمک" اس سب سے زیادہ زرخیز خطۂ زمین کو چاٹ گئی۔ نواب کے لیے ناممکن ہو گیا کہ وہ اپنی سلطنت میں اصلاحات اور انتظام کر سکے۔ عوام کی خوش حالی کے لیے جو قوانین نافذ تھے وہ کمپنی نے ختم کر دیے اور نئے جاری کیے گئے جس کی بدولت عوام کو اس قدر پریشان کن نتائج بھگتنا پڑے کہ دس سال بعد کمپنی نے بھی اپنی غلطی تسلیم

1. Marshman - 255

کی۔ خزانہ خالی ہونے کے بعد جب نواب نے اپنی رعایا پر ٹیکس لگایا تو کمپنی نے بد انتظامی کا الزام عاید کیا اور اگر کبھی عوام ان مظالم کے خلاف آواز اٹھاتے تو انگریزی سنگینیں اور تلواریں ان کو کچلنے پر تیار ہو جاتی تھیں۔ اس طرح ایک طرف تو نواب کے لیے انتظام سلطنت کی اصلاح کو ناممکن بنادیا گیا اور دوسری طرف اودھ میں بہتر انتظام اور اصلاحات کے متواتر مطالبات کو رفتہ رفتہ زیادہ سختی سے پیش کیا گیا۔ چارلس بال کو اقرار ہے

"حقیقت یہ ہے کہ عوام کو خوش حال بنانے والی اصلاحات رائج کرنے کا صحیح اور موثر طریقہ یہ تھا کہ برطانوی نمایندے کو واپس بلا کر نواب کو آزادانہ طور پر انتظام کا موقع دیا جاتا، لہٰذا حدود ریاست کی اندرونی بے چینی کی تمام تر ذمہ داری کمپنی کے سر ہے"۔ (جلد اول/۱۵۲)

الحاق کا فیصلہ

جب واجد علی شاہ (نواب اودھ) نے کچھ اصلاحات رائج کرنا چاہیں تو کمپنی کے نمائندے نے مجبور کرکے روک دیا مگر انتظام میں اصلاح کا مطالبہ کمپنی کی طرف سے دن بہ دن زور دار بنایا جانے لگا۔ بالآخر وہ ۱۸۳۷ء کے معاہدے سے بھی انکاری ہو گئی اور ۱۸۵۶ء میں الحاق کا فیصلہ کر لیا گیا۔ بہانہ پہلے ہی موجود تھا کہ "واجد علی شاہ انتظام سلطنت کو درست نہیں کر رہا ہے"۔ رزیڈنٹ کو خفیہ احکامات بھیجے گئے اور انگریزی فوجیں اودھ کی سرحد پر جمع ہونے لگیں۔ جب واجد علی شاہ نے رزیڈنٹ سے اس کا سبب دریافت کیا تو کہا گیا کہ راجہ نیپال اپنی عبادت گاہ کو جا رہا ہے اس لیے فوج جمع ہوئی ہے[۵]۔ پہلے وزیر اودھ علی نقی خاں کو لالچ

۵۔ نجم الغنی: تاریخ اودھ، جلد ۵/ ۲۴۹ - ۲۸۶

دے کر کام نکالنے کی کوشش کی گئی مگر جب انھوں نے نواب کے سامنے وہ ذلیل شرائط پیش کیں تو نواب نے صاف انکار کر دیا چند شرطیں ملاحظہ ہوں —— شاہ کا خاندان لکھنؤ سے نکل جائے، زمین دار اپنی جاگیروں سے بے دخل ہوں، شاہی عہدے دار قید ہوں۔

شاہ اودھ کے انکار پر انگریزی فوجیں لکھنؤ کے سر پر سوار ہو گئیں تو رزیڈنٹ نے شاہ کو دھمکیاں دینا شروع کر دیں کہ شاہی خاندان کو لکھنؤ سے نکال دیا جائے گا۔ شاہ کی والدہ نے صاف صاف کہا کہ:

"جو خرابی اس گھر کی تمھاری بدولت ہونی تھی، ہو چکی اس سے بدتر اور کیا ہوگا رہا قیام، وہ اس شہر کا یا کسی اور شہر کا دونوں برابر ہیں"۔

اودھ کی جبریہ ضبطی کا اعلان ہوا (فروری ۱۸۵۶ء)، بد انتظامی کے حیلے سے ملک چھین لیا گیا شاہی محلات اور سامان کو لوٹا گیا، بیگموں کی بے عزتی کی گئی۔ کل کے شاہی محلات آج انگریزی فوجیوں کے اصطبل تھے —— اور کل کے امیر آج کے فقیر —— پرانے نوابوں اور شرفاء کی اولادیں دربدر ماری پھریں، ان کو احساس ہو گیا کہ غلامی کی زندگی سے موت بھی کہیں بہتر ہے[1] —— عوام کے دل کی گہرائیوں میں آزادی اور انتقام کی آگ سلگ اٹھی۔

---

[1] اس زمانے میں انگلینڈ میں ایک بنگالی ہندو نے اپنے مضمون میں لکھا —— "آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ کس طرح بے شمار بھولے اور رحم دل عوام۔ جنھوں نے نہ کبھی شاہ کو دیکھا تھا اور نہ شاید کبھی دیکھتے —— شاہ کی الم ناک داستان سن سن کر اپنی جھونپڑیوں میں روئے اور آپ کو معلوم نہیں کہ کتنے ہی سپاہی بہتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان

خفیہ تیاریاں

لکھنؤ میں انقلاب اور آزادی کی خفیہ تیاریاں بہت پہلے سے ہو رہی تھیں، چناں چہ یہاں کی انقلابی جماعت نے کابل کے امیر دوست محمد کو خط لکھا جس میں آنے والے انقلاب کے لیے مدد مانگی گئی تھی۔ یہ خط اگست ۱۸۵۵ء میں انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا۔ لکھا تھا کہ اگر لکھنؤ کے لوگ بغاوت پر اٹھے تو ہم کس حد تک آپ سے امداد کی امید رکھیں[۵]۔

بعض ذرائع سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ میں ۱۸۵۶ء میں خفیہ بھرتی شروع ہو گئی تھی اس بھرتی میں ایک فقیر قادر علی شاہ بہت سرگرم تھے۔ "طلسم" لکھنؤ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو

"چناں چہ جابہ جا متفرق خفیہ بھرتی ہونے لگی، عہد و پیمان کے ساتھ اسم نویسی ہونے لگی، عشرے کا روز ٹھہرا، حسب وعدہ لوگوں کے جماؤ ادھر اُدھر ہوئے مگر حکام خبردار تھے، کچھ بن نہ پڑی ارادے سے باز رہے منتشر ہوئے"۔

("طلسم" ۱۹ ستمبر ۱۸۵۶ء)

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ عشرہ محرم ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۲ ستمبر ۱۸۵۶ء کا دن کسی شورش اور ہنگامے کے لیے مقرر ہوا تھا۔ اس تمام خفیہ کارروائی میں محمود حسین خاں کمیدان اور نواب محسن الدولہ وغیرہ شریک تھے، تقریباً بارہ ہزار آدمی اس طرح خفیہ بھرتی ہو گئے تھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۹) اس بے عزتی کا بدلہ لینے کی اس طرح روزانہ قسم کھاتے تھے جیسے کہ وہ ان کی ذاتی تکلیف و مصیبت ہو۔

(ساورکر ۵۱۶)

۱۰. Savarkar - 145

حکام نے کافی دوڑ دھوپ شروع کردی قادر علی شاہ نے اقرار کیا کہ شہر میں بھرتی ہوئی اور ڈھائی سو آدمی میں نے بھی نوکر رکھے تھے۔ جب محمود حسین خاں کمیدان کے مکان کی تلاشی لی گئی تو ہتھیاروں کا ذخیرہ دست یاب ہوا۔

پُراسرار شاہ صاحب

اسی زمانے میں وطن کا ایک مرد مجاہد اپنے سر میں آزادیٔ وطن اور حفاظتِ دین کا سودا لیے ملک میں بے قرار پھر رہا تھا اور غالباً اکتوبر یا نومبر ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ میں وارد ہوا معتمد الدولہ کی سرائے میں ٹھہرا اور اس کے بعد گھسیاری منڈی کو قیام گاہ بنایا، وہ فقیروں کے لباس میں تھا، اور سب جانتے ہیں کہ وہ مولانا احمد اللہ شاہؒ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔ ہفتہ وار "طلسم" لکھنؤ یہ واقعات بتا کر لکھتا ہے۔

"دو شنبے اور پنجشنبے کو وہاں مجمع کثیر ہوتا ہے، شہر کا برنا و پیر ہوتا ہے، مجلس حال و قال کی ہوتی ہے لیکن نئی چال کی ہوتی ہے کہ عین جوش حال میں فرش پر آگ گراتے ہیں...... نہ کپڑے پر دھبہ لگتا ہے۔ نہ حلق میں چھالے نظر آتے ہیں"۔

(۲۱ر نومبر ۱۸۵۶ء)

اسی طرح لکھنؤ میں بھی خفیہ انقلابی کارکن فقیرانہ لباس میں اپنا کام کر رہے تھے اور عوام کو بغاوت کی تلقین کرتے تھے۔ جب انگریز حکام کو شبہ ہوا تو انھوں نے ان فقیروں کو ہٹانا شروع کیا اور پابندی لگادی کہ ان کے پاس مجمع نہ ہو، مگر بغاوت کا پرچار کرنے والے یہ انقلابی فقیر اپنے کام سے باز نہ آئے ایک جگہ سے ہٹتے تو کچھ دن بعد دوسری جگہ جا کر دھونی رما دیتے مولانا احمد اللہ شاہؒ کو بھی ۲۰ر جنوری ۱۸۵۷ء کو پریشان کیا گیا اور کوتوال نے آکر باز پرس کی، مولانا نے بلا تامل اور ڈنکے کی چوٹ کہا کہ:

"تم بھی مسلمان ہو، اگر شرع کا دھیان ہو اور سامان اور اسباب ضرورت
مہیا ہو، فرمایئے اس وقت تم پر جہاد فرض نہ ہو گیا ہو۔ اس طرح میں بھی جہاد
کو فرض جانتا ہوں بے سامانی سے ناچار ہوں، اگر ہم پہنچے تو تیار ہوں" [1]

کوتوال کی ہمت نہ پڑی کہ اس مردِ میدان سے آنکھ ملاتا، چناں چہ رخصت ہوا مگر پہرہ لگا دیا گیا۔ کچھ دن بعد یہاں سے مولانا احمد اللہؒ بہرائچ اور فیض آباد روانہ ہو گئے وہ تقریر بھی کرتے اور پمفلٹ بھی تقسیم کرتے، ان کے ایک ہاتھ میں قلم تھا تو ایک ہاتھ میں تلوار ـــــ انھوں نے ملک میں خفیہ انجمنوں کے جال بچھائے تھے۔

سپاہیوں کا جوشِ انتقام

اپریل کے آخر میں پیشوا نانا صاحب اور عظیم اللہ خاں لکھنؤ آئے، تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ یکم مئی ۵۷ء کو سپاہیوں نے چربی والے کارتوس لینے سے انکار کر دیا [2]۔ ان میں صوبے دار سرنام سنگھ جمع دار شیو دین، مغل بیگ، بھیروں سنگھ اور گلزار خاں وغیرہ نے آپس میں مشورہ کر کے

---

[1] یہ حالات اس دور کے اخبار "طلسم" سے ماخوذ ہیں۔ (بحوالہ "نیا دور" لکھنؤ اگست ۱۹۵۷ء)

[2] "طلسم" کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یکم مئی سے پہلے ہی بغاوت کے آثار تھے اور وہ ایک ڈاکٹر کی شرارت کا سبب تھا۔ "طلسم" کے الفاظ یہ ہیں۔ "ظاہرا ڈاکٹر کی دوا نے یہ اثر دکھایا ہے بلکہ بھی اس کا جلا اس پر بھی کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا، ہنگامہ مچایا ہے ڈاکٹر نے عمداً ہندو مسلمان کا ایمان بگاڑا تھا، دبے ہوئے فتنے کو اکھاڑا تھا۔"
(یکم مئی ۱۸۵۷ء)

بغاوت کی اسکیم بنائی اور دوسری پلٹنوں کے نام خط روانہ کیے، ۲۹ مئی کو یہ پر جوش سپاہی ایک انگریز افسر کے خیمے میں گھس گئے اور اس کو قتل کرنا چاہا مگر اس کے گڑگڑانے پر چھوڑ دیا ادھر ہٹیس پلٹن کے نام ایک خط انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا جو منڈیاؤں کی چھاؤنی میں بھیجا گیا تھا انھوں نے خفیہ سازش کرنے والوں کو گرفتار کر لیا، انقلابی سپاہیوں نے اپنے "جرم" کا اقرار کیا اور سازش میں شرکت بھی تسلیم کرلی، اب وہ علی الاعلان بغاوت پر آمادہ ہو گئے، بارک سے بندوقیں اٹھالیں اور میگزین پر قبضہ کر لیا۔ ۲۹ مئی کو موسیٰ باغ میں تمام فوج کو جمع کیا گیا اور گورا فوج کی سنگینوں اور توپ خانے سے گھیر لیا گیا؛ ہندوستانی فوج محاصرے میں تھی، توپوں کی مہتابیں روشن کی گئیں تاکہ انقلابی سپاہیوں کو کارتوس استعمال نہ کرنے کی سزا دی جائے۔ یہ دیکھ کر سپاہی جان بچانے کے لیے بھاگنے لگے تو "بہادر" گوروں نے پیچھا کر کے قتل کیا اور پھر ہر روز سیکڑوں گرفتار ہونے والوں کو پھانسی دی جانے لگی۔ باغی سپاہیوں کو شہر کے مرکزی مقام پر عوام کے سامنے پھانسیاں دی گئیں۔ چند دن بعد شہر کی سڑکوں پر باغیانہ اشتہارات پائے گئے۔

لارنس کی تقریر

فوج کی بغاوت کے یہ آثار دیکھ کر انگریزوں کو تشویش ہوگئی، آتش بغاوت کی شعلہ بار چنگاریاں ہتھیاروں سے نہ بجھائی جا سکتی تھیں لہٰذا دوسرے حربے بھی استعمال کیے چنانچہ ۱۲ مئی ۱۸۵۷ء کو ہنری لارنس نے دربار کیا، تقریر کی اور انقلابیوں کا اتحاد پارہ پارہ کرنے کے لیے تعصب اور خباثت سے مجبور ہو کر اورنگ زیب عالم گیر، رنجیت سنگھ اور حیدر علی پر جانب داری اور دوسرے مذہب والوں پر ظلم کرنے کے کمینہ الزامات لگائے مگر اتحاد و بھائی چارے کا وہ نشہ ایسا نہ تھا جس کو یہ "ترشی" اتار دیتی۔ پھر بھی ۳۰ مئی تک فضا پرسکون رہی اور

انگریز ریذیڈنسی میں اپنی حفاظت کا انتظام کرنے لگے۔

مولانا احمد اللہ گرفتار

مولانا احمد اللہ شاہ رح[1] برابر اپنے کام میں مصروف تھے، وہ دس دس ہزار کے مجمعوں میں تقریریں کرتے اور عوام مبہوت ہو کر سنتے تھے، فروری ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ سے فیض آباد چلے گئے۔ انگریز حکام نے مجبور ہو کر ان کی گرفتاری کا حکم دے دیا مگر پولس نے گرفتار کرنے سے انکار کر دیا تو مسلح دستے روانہ کیے گئے، مولانا اور ان کے ساتھیوں نے مقابلہ کیا، بہت سے قربان ہوئے، انگریزی دستے بندوق کی باڑ مارتے اور مولانا کے پانچ ہمراہی تلوار سے لڑ رہے تھے چناں چہ لکھنؤ کا اخبار "طلسم" (۶ مارچ ۱۸۵۷ء) یہ خبر سنا کر لکھتا ہے:

> "مثل مشہور ہے تلوار اور گولی کی لڑائی کیا، دو سے پانچ آدمی کی صف آرائی کیا، زخموں سے چور ہوئے بادۂ اجل سے مخمور ہوئے..... شاہ صاحب نے جرأت سے جھپٹ کر ہاتھ مارا، تلوار کا پھل ٹوٹ گیا، مجبور ہوئے جی چھوٹ گیا، اس پر گولی کا زخم سینے پر کھایا..... شاہ صاحب ہنستے گرفتار ہوئے"۔

بعض روایتیں ہیں کہ وہ لکھنؤ میں گرفتار ہوئے۔ بہر حال ان کی گرفتاری نے عوام کو اور بھی مشتعل کر دیا۔

---

[1] نام سید احمد علی، پیدائش ۱۲۰۴ھ بمقام چینا پٹن مدراس، والد ایک معزز رئیس اور سلطان ٹیپوؒ کے درباری تھے مولانا احمد اللہ گوالیار کے ایک بزرگ حضرت محراب شاہ قلندرؒ سے بیعت تھے وہ بمبئی، ج پور، ٹونک، دہلی، آگرہ، گوالیار وغیرہ میں دورے اور بغاوت کی تنظیم کر چکے تھے تمام انگریز مورخوں نے جرأت سے ان کی بہادری، صلاحیت اور حب الوطنی کو سراہا ہے۔ فیض آباد میں وہ چوک کی سرائے میں ٹھہرے اجب وہ کہیں جاتے تو آگے ڈنکا بجتا ہوا ہمراہ چلتا تھا۔ مزید حالات کسی آئندہ باب میں بیان ہوئے ہیں

لکھنؤ میں بغاوت

لکھنؤ کی دیسی سپاہ کارتوسوں پر پہلے ہی بگڑ چکی تھی، اب حالات اور بھی نازک ہونے لگے، بالآخر ۳۰ مئی ۵۷ء کو رات کو نو بجے توپ چلی اور منڈیاؤں کی چھاؤنی میں بغاوت شروع ہوگئی، اگلے دن تحریک ولی اللٰہی کے رہنماؤں نے جلوس نکالا، تقریباً پندرہ سو آدمی ان کے ساتھ تھے لیکن منڈیاؤں کی باغی فوجیں شہر کی طرف نہ آسکیں اور تھوڑی سی شورش کے بعد انگریزوں نے اپنے ہندوستانی ”وفاداروں“ کی مدد سے قابو پالیا، قیدیوں کو عبرت ناک سزائیں دی گئیں، انھیں مچھی بھون کے سامنے برسر عام پھانسیوں پر لٹکادیا گیا۔ اس بربریت نے عوام کو اور بھی مشتعل کر دیا۔ کمشنر ہنری لارنس نے پہلے ہی خطرے کے آثار دیکھ کر ریذیڈنسی اور مچھی بھون میں پناہ گاہ بنالی تھی۔ ادھر پورے اودھ میں بغاوت جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے لگی، ۳ جون کو خیرآباد ڈویژن کے ہیڈ کوارٹر سیتا پور میں بغاوت پھوٹ پڑی اور اکثر انگریز قتل کر دیے گئے، بہرائچ اور گونڈہ بھی آزاد ہوگئے۔

فیض آباد

فیض آباد کے عوام مولانا احمد اللہؒ کی گرفتاری پر پہلے ہی مشتعل ہو چکے تھے مولانا پر مقدمہ چلا کر موت کی سزا تجویز کی گئی لیکن قبل اس کے کہ اس فیصلے کی تکمیل ہو، فیض آباد میں ۸ جون کو بغاوت شروع ہوگئی، تمام شہر مع فوج کے بہ یک وقت کھڑا ہوگیا، صوبے دار دلیپ سنگھ نے رہنمائی کی، انگریز افسروں کو قید کیا، مولانا کو جیل سے چھڑایا، اور اپنا لیڈر بنالیا، انگریز افسروں کو فیض آباد سے نکلنے کے لئے کہا گیا پہرہ لگایا گیا کہ ان کی لوٹ مار نہ ہو، ذاتی سامان لے جانے کی اجازت دی گئی۔ ان کے لیے کشتیاں تیار کرا کر ان کو نو سو روپے اخراجات کے لیے دیے گئے۔[1]

---

[1] محاربۂ عظیم، ۵۴ - ۳۵۳؛ سین/ ۱۸۶

جب انگریز افسروں نے فوج سے تعمیل حکم کے لیے کہا تو سپاہیوں نے ادب سے جواب دیا کہ "اب ہندوستان آزاد ہے، ہم اپنے ملکی افسران کے ماتحت ہیں اور یہاں واجد علی شاہ کی حکومت ہے"۔ فیض آباد کے بھاگے ہوئے انگریز عورتوں اور بچوں کو راجہ مان سنگھ نے اپنے شاہ گنج کے قلعے میں پناہ دی، ہنومنت سنگھ[1] اور سردار رستم شاہ نے بھی ایسا ہی کیا، گورکھپور کے ناظم میر محمد حسن نے کرنل لی نوکس کے خاندان کو پناہ دی اور بہ حفاظت گورکھپور کے کلکٹر کے پاس روانہ کر دیا، شاہ گنج کے انگریزوں کو مان سنگھ نے داناپور بھیج دیا۔ راستے میں گوپال پور کے راجہ مادھو پرشاد نے بھی ان کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کیا۔ حالانکہ ان سب نے بغاوت میں نمایاں حصہ لیا۔ کرنل لی نوکس کا بیان ہے کہ خود مولانا احمد اللہ نے اس کے خاندان کو پناہ دینے اور بچانے کی پیش کش کی تھی[2]۔ یہ تمام حالات انگریزوں کے ہی بیان کردہ ہیں جو شاید اپنی پوری قوم کی تاریخ سے دشمن کے ساتھ اس فیاضانہ برتاؤ کی مثال پیش نہیں کر سکتے۔

قرب و جوار میں

فیض آباد وغیرہ میں یہ حالات پیش آ رہے تھے اور ساتھ ہی تمام اودھ بغاوت کے شعلوں میں گھرا ہوا تھا۔ منڈیاؤں کی چھاؤنی کے انقلابی دستے مدکی پور پہنچے اور وہاں سے باغی سپاہ کے ہمراہ سیتاپور

---

[1] جب انگریزوں نے اپنا ساتھ دینے کی امید ظاہر کی تو ہنومنت نے صاف کہا کہ "آپ اس ملک میں آئے اور ہمارے بادشاہ کو نکال دیا۔۔۔ میں نے آپ کو پناہ دی ہے مگر اب میں اپنی فوج کے ساتھ لکھنؤ جا کر آپ کو ملک سے نکالنے کی کوشش کروں گا"۔ (بہ حوالہ سین / ۱۸۸)

[2] سین / ۱۸۷

چلے گئے، ادھر لکھنؤ میں غیرت مندوں کے خون کھول رہے تھے، تقریباً پانچ ہزار جوان تلواریں اور نیزے سنبھال کر تیار ہو گئے، انھوں نے کوتوالی پر حملہ کیا، انگریزوں نے گولہ باری کی، آخر کار وسط جون تک انگریزی اقتدار کا جوا اودھ کی گردن سے مکمل طور پر اتر گیا۔ اب آس پاس کے ضلعوں کی باغی فوجیں بیس میل دور نواب گنج میں جمع ہو کر لکھنؤ پر حملہ آور ہونے کو تھیں، کان پور میں انگریزوں کے خاتمے کی اطلاع نے انقلابی صفوں میں خوشی کی لہر دوڑا دی تھی اب وہ چنہٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

چنہٹ کی لڑائی

۳۰ جون کو جب انقلابی فوجیں لکھنؤ سے بارہ میل دور چنہٹ پر آگئیں تو ہنری لارنس کچھ فوج لے کر نکلا سخت معرکہ ہوا مگر انگریزی فوج نے بری طرح شکست کھائی اور اوپر سے سورج کی قیامت خیز گرمی نے بھون ڈالا۔ لارنس اپنی توپیں تک چھوڑ کر بھاگ آیا۔ انگریز اب رزیڈنسی میں پناہ گزیں ہو چکے تھے۔ انقلابیوں کے حوصلے بڑھ گئے وہ لکھنؤ میں فاتحانہ طور پر داخل ہوئے، "قیصر التواریخ" میں ہے کہ مولانا احمد اللہؒ بھی چنہٹ کی جنگ میں شریک تھے اور ان کے پاؤں میں گولی لگی تھی، انگریزی صفوں میں انتشار پیدا ہو گیا لیکن انقلابی اس سے پورا فائدہ نہ اٹھا سکے کیوں کہ انھوں نے بھاگتے دشمن کا پیچھا نہ کیا۔

محاصرہ

۵ جولائی ۵۷ء کو واجد علی شاہ کے ایک گیارہ سالہ بیٹے برجیس قدر کو لکھنؤ کا حکمراں بنایا گیا اور تمام انتظامات ان کی والدہ بیگم حضرت محل[۱] نے

۱؎ بیگم حضرت محل کا نام امراؤ بیگم تھا وہ دربار اودھ کی ایک رقاصہ تھیں، شاہ نے ان کو اپنے حرم میں داخل کر لیا اور حضرت محل کا خطاب دیا تھا۔ بڑی بہادر، منتظم اور روشن دماغ محب وطن خاتون

سنبھالے۔ رزیڈنسی کا محاصرہ کر لیا گیا۔ انقلابیوں کے پاس صرف چند کم زور توپیں تھیں جب کہ رزیڈنسی کے کونے کونے پر بڑی توپیں موجود تھیں، چاروں طرف اونچے اونچے دھس اور کھائیاں بنا کر ایک مضبوط قلعہ بنا دیا گیا تھا، اندر کھانے پینے کا سامان حتیٰ کہ شراب بھی بہ کثرت جمع تھی، اس پر بھی انقلابیوں نے متعدد بار (ایک بیان کے مطابق سینتیس[۳۷] بار) اسے بارود سے اڑانے کی کوشش کی اور قریبی مکانات سے زبردست فائرنگ کیا۔ مگر انگریزوں کے سکھ ساتھیوں نے ان کی تمام کوششیں ناکام بنا دیں، اگرچہ انگریزوں کا بھی بے حد نقصان ہوا اور ہنری لارنس بھی کام آگیا، ۱۰ اگست کو انقلابیوں نے ایک سرنگ اڑا دی، دیوار میں شگاف ہو گیا، باغی سپاہی اندر آنا شروع ہوئے، لیکن اندر سے انگریزوں نے استقلال سے مقابلہ کیا اور سکھوں کی مدد سے پیچھے دھکیل دیا۔ محاصرہ جاری رہا، ۵ ستمبر کو پھر ایک بھرپور حملہ کیا گیا۔ اس محاصرے میں مولانا احمد اللہ بھی شریک تھے، انگریزوں کے جاسوس اس دوران میں انتہائی کوشش کرتے رہے کہ آنے والی انگریزی فوج سے رابطہ قایم کریں بالآخر دو[۲] ہندوستانی انگد تیواری اور قنوجی لال کام یاب ہوئے اور جان پر کھیل کر رزیڈنسی کے انگریزوں کی باہر سے خط وکتابت کرا دی۔ ادھر انقلابی کیمپ میں آس پاس کی باغی فوجیں اور تعلقہ داروں مثلاً متھولی کے راجہ لونی سنگھ، محمود آباد کے راجہ نواب علی اور رام نگر کے گربخش سنگھ وغیرہ کی فوجیں جمع ہونے لگیں چوں کہ راجہ محمود آباد کے کمانڈر خاں علی خاں

تھیں، ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کا لوہا انگریز مورخوں نے بھی مانا ہے، وہ دو سال دشمنانِ وطن سے جنگ آزما رہیں۔ بیٹے کا نام برجیس قدر رمضان علی تھا۔

کی کمان میں تھیں جب کہ باغی سپاہ کی سید برکات احمد کمان کر رہے تھے

ہیولاک مصیبت میں

اِدھر ہیولاک زبردست فوجیں لے کر کان پور سے لکھنؤ کی طرف بڑھ رہا تھا مگر اودھ میں داخلہ آسان نہ تھا، انقلابی عوام چپے چپے پر خون چھڑکنے کو تیار تھے۔ چناں چہ جیسے ہی ہیولاک نے (۲۸ ، ۲۹ جولائی) گنگا پار کر کے قدم بڑھایا اس کو جگہ جگہ سخت مقابلہ کرنا پڑا، زمینداروں اور تعلقہ داروں نے چھوٹی چھوٹی فوجیں جمع کر لی تھیں اور جنگ پر آمادہ تھے۔ اہم معرکے اناؤ اور بشارت گنج میں ہوئے، اناؤ میں شہر کے مکانات کی دیواروں میں سوراخ تھے اور اُن میں سے بندوق کی نالیں دشمنانِ وطن پر گولیاں برسا رہی تھیں، انقلابی فوجیں نہایت پامردی اور استقلال سے لڑیں، انگریزوں کا سخت نقصان ہوا، اس کے بعد نسخ پور رچورا سی پر تصادم ہوا جہاں انقلابیوں کی رہ نمائی جتا سنگھ کر رہے تھے، اسی طرح بشارت گنج پر انقلابی فوجوں نے انگریزوں کے چھکے چھڑا دیے۔ ہیولاک کو بھڑ دن کے اس چھتے میں آگے بڑھنا ناممکن ہو گیا اور اپنی فوج کا چھٹا حصّہ ضایع کر کے کسی نتیجے پر پہنچے بغیر پیچھے (منگل وار) ہٹ آیا۔ ۳ر اگست کو اسے کچھ فوجی امداد مل گئی۔

جب ہیولاک کان پور سے روانہ ہوا تو نانا صاحب پھر کان پور آ گئے اور اس کو ہم اگست تک گنگا کے کنارے پڑے رہنے پر مجبور کر دیا۔ اب ان کے ساتھ گوالیار اور ساگر کی فوجیں بھی تھیں، اُدھر دانا پور کی تین رجمنٹوں نے بھی بغاوت کر دی تھی، انقلابی فوجیں پھر بشارت گنج پر قابض ہو گئیں اور ہیولاک سے دوبارہ تصادم ہوا۔ انقلابی پسپا ہوئے مگر ہیولاک کو بھی تارے نظر آ گئے، وہ کان پور کی طرف واپس لوٹ گیا جہاں بٹھور میں نانا صاحب اپنی فوجوں کے ہمراہ موجود تھے اور قریب تھا کہ نیل پر ٹوٹ

پڑیں۔ ۱۶؍ اگست کو نانا صاحب کی فوجوں سے گھمسان کی جنگ ہوئی، انقلابی سپاہی بہادری سے لڑے، انگریزوں کی رسد کاٹ دی، آگے اور پیچھے دونوں طرف سے حملہ کیا مگر پیچھے ہٹنا پڑا۔ ابھی نانا صاحب کی ایک اور فوج کالپی میں موجود تھی اور ہیولاک چاروں طرف سے گھر گیا تھا۔

لکھنؤ میں جنگ

۲۰؍ ستمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزی فوجیں پھر لکھنؤ کی طرف بڑھیں، راہ میں شدید ظلم توڑے، سڑکیں معصوموں کے خون سے رنگین کر دیں، ہیولاک کے ساتھ اب اوٹرام بھی تھا اور اس کی تازہ دم فوجیں بھی[۵] ۲۳؍ ستمبر کو چارباغ پر سخت تصادم ہوا۔ یہاں تک کہ رات میں بھی جنگ جاری رہی۔ دہلی کی شکست نے انگریزی کیمپ میں خوشی اور انقلابی حلقوں میں مایوسی کی لہر دوڑادی تھی مگر بہادر انقلابی کم ہمت اور بودے نہیں تھے، انھوں نے قدم قدم پر خوفناک مقابلہ کیا، انگریزی فوج عالم باغ سے غیر معروف راہ سے (نہر غازی الدین کے کنارے) قیصر باغ پہنچی، یہاں پھر خوں ریز معرکہ ہوا۔ ہیولاک کے سات سو بائیس[۲۲] آدمی ختم ہو گئے، مکانات اور در و دیوار سے گولیوں کی بارش ہو رہی تھی، خون کے دریا بہہ گئے خاص بازار میں بریگیڈیر نیل بھی ایک گولی کا شکار رہا —— ہیولاک کی باقی بچی فوج جیسے ہی رزیڈنسی میں داخل ہوئی انقلابیوں نے دوبارہ محاصرہ کر لیا، اب پرانی اور نئی دونوں فوجیں اندر بند ہو گئیں، ادھر کچھ انگریزی فوج عالم باغ میں رہ گئی کیوں کہ

---

[۵] سر جیمس اوٹرام ایران سے واپس ہو کر کلکتے پہنچا اور اودھ کا چیف کمشنر بنا۔ ۱۶؍ ستمبر کو اپنی فوج لے کر کان پور آیا تھا۔

درمیان کا پل اڑا دیا گیا تھا۔ انقلابیوں کی بنائی ہوئی سرنگیں دیکھ کر دشمن بھی حیران تھے[۵۱] شہر کی اس جنگ میں عورتوں نے بھی حصہ لیا اور مکانوں سے پتھر برسائے۔ سڑکوں پر دو دن جنگ ہوئی۔

لکھنؤ پر دوبارہ حملہ

انگریزی فوجوں کا نیا کمانڈر ان چیف کولن کیمپبیل کلکتے میں زبردست تیاریاں کر رہا تھا۔ اس نے مدراس سیلون اور چین سے آنے والی فوجیں جمع کیں، نئے ہتھیاروں سے مسلح کیا اور ۳ نومبر ۱۸۵۷ء کو کان پور پہنچا۔ وہاں ونڈہم کی سرکردگی میں کچھ فوج چھوڑ کر ۹ نومبر کو لکھنؤ پر چڑھ آیا۔ عالم باغ میں انگریزی فوجوں کا پڑاؤ تھا اور ادھر ریزیڈنسی کے انگریزوں کو تمام اطلاعات مل رہی تھیں۔ اب ایک ایسے رہنما کی ضرورت تھی جو کولن کیمپبیل کی فوج کو لکھنؤ کا راستہ وغیرہ بتا سکے چناں چہ ریزیڈنسی کا ایک انگریز ہندوستانی لباس تبدیل کر کے اور اپنے منھ پر سیاہی لگا کر اس کام پر آمادہ ہوا اور پرانے "وفادار" قنوجی لال کے ہمراہ رات کی تاریکی میں وہاں سے نکل کر انگریزی کیمپ میں آ گیا[۵۲]۔ سر کولن یہ رہنمائی پا کر ۱۲ نومبر کو روانہ ہوا مگر انقلابی فوجوں نے اس قدر دلیری سے مقابلہ کیا کہ دشمن

---

[۵۱] "دشمن کی توجہ خاص طور سے سرنگیں کھودنے میں رہی جن کو اس درجۂ کمال تک پہنچا دیا تھا کہ جیس اوٹرام کی رائے میں اس زمانے کے فنِ جنگ کے اعتبار سے بے نظیر تھیں"۔ (مارش مین/ ۵۱۲)

[۵۲] اس کام پر بہ طور انعام اس انگریز کو بیس ہزار روپے نقد کے علاوہ وکٹوریہ کراس دیا گیا اور اسسٹنٹ کمشنر کا عہدہ بھی۔ قنوجی لال کو غداری کا انعام صرف تحصیل داری اور پانچ ہزار چاندی کے ٹکڑے ملے تھے۔ (سین/ ۲۲۸)

فوجیں دل کشا باغ سے آگے نہ بڑھ سکیں، لامارٹینر بھی انگریزی قبضے میں آچکا تھا۔ اب کولن کیمپل کا نشانہ موتی محل تھا جہاں طے شدہ پروگرام کے مطابق اوٹرام کو ملنا تھا لیکن اس نے انقلابیوں کو دھوکا دینے کے لیے بیگم کوٹھی پر فائرنگ کی۔ ۱۶ ر نومبر کو اس نے نہر پار کی اور سکندر باغ پر حملہ آور ہوا۔ جہاں تین ہزار انقلابی یہ قسم کھا کر جمع تھے کہ یا تو فتح پائیں گے اور یا ان کے خون کا آخری قطرہ تک اسی زمین پر بہے گا۔ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ اُن میں سے ہر ہر فرد نے اپنا یہ عہد پورا کیا اور اپنی جانیں قوم و وطن کی آن پر نچھاور کر دیں۔ سکندر باغ پر گھمسان کا رن پڑا، انگریزوں نے باغ کی فصیل توڑ کر داخل ہونا شروع کر دیا ان کے پاس فوج اور ہتھیاروں کی کمی نہ تھی، بڑی بڑی توپیں تھیں، نیا سامان جنگ تھا جب کہ دوسری طرف تلواریں اور توڑے دار بندوقیں تھیں پھر بھی کئی بڑے افسر مثلاً کوپرا اور لمس ڈاؤن وغیرہ جان گنوا کر اور بے شمار جانیں دے کر یہ معرکہ سر کر سکے، انقلابیوں کا ہر فرد مسکرا کر موت سے ہم کنار ہو گیا۔ میلیسن کا اندازہ ہے کہ وہ دو ہزار تھے اس کے بعد شاہ نجف اور قدم رسول وغیرہ مقامات پر بھی ایسے ہی خوں ریز معرکے ہوئے اور اگلے دن موتی باغ پر اس قدر سخت تصادم ہوا کہ سکندر باغ کا معرکہ بھی ماند ہو گیا۔ تب کہیں انگریزی فوجیں رزیڈنسی تک پہنچیں۔ سکندر باغ کا معرکہ تاریخ میں یادگار رہے گا۔ یہاں مردوں کے دوش بدوش کئی عورتیں بھی مصروف جنگ تھیں۔ فوربس مچل نے بھی ایک عورت کا ذکر کیا ہے جو پیپل کے درخت پر چڑھی ہوئی تھی اور اس نے بے شمار انگریزی سپاہیوں کو گولی کا نشانہ بنایا۔[1]

---

1. Sen - 242

سکندر باغ لکھنؤ:۔ جہاں ۱۶ر نومبر ۱۸۵۷ء کو دو ہزار انقلابی قربان ہوئے۔
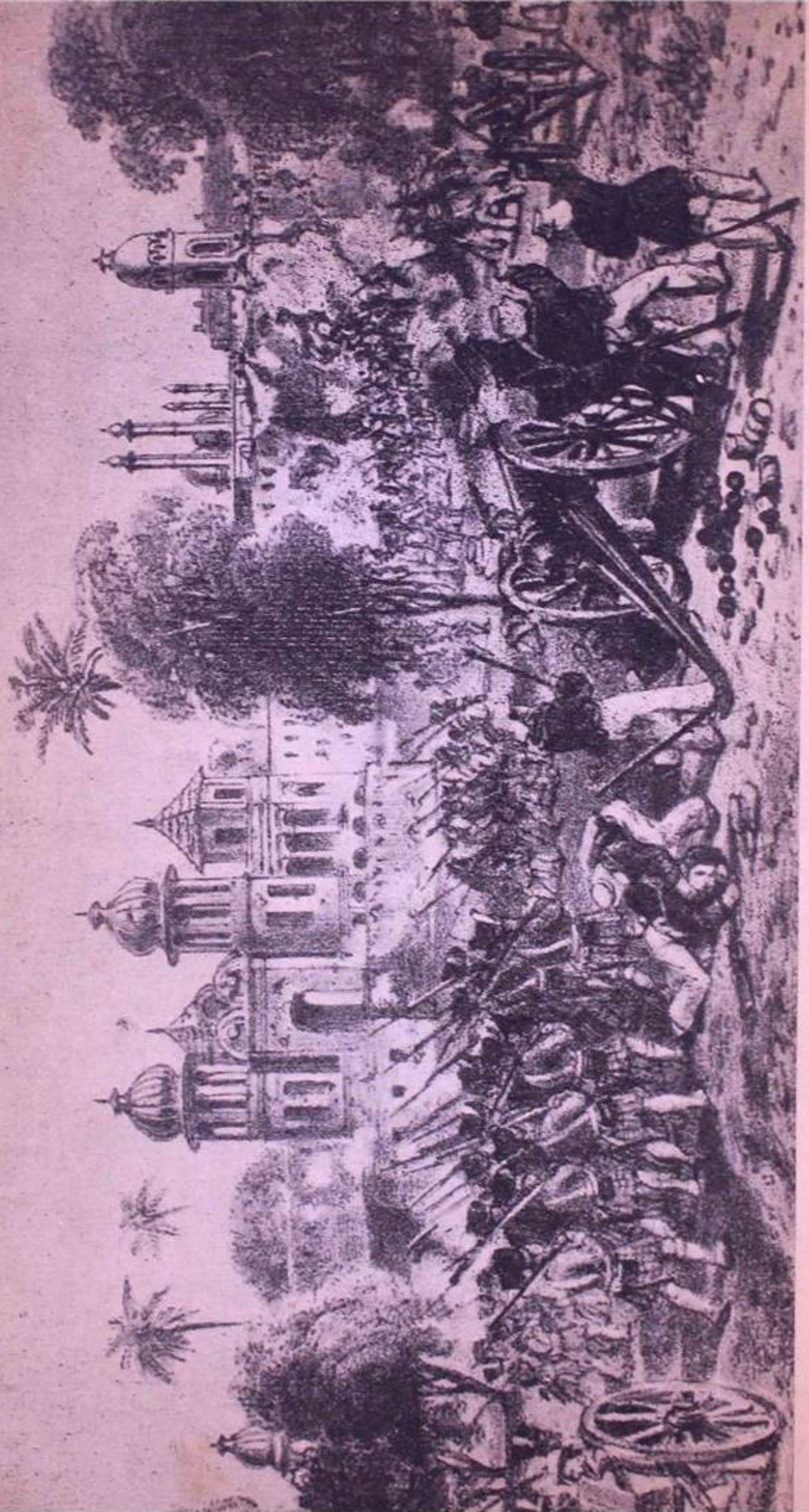
کان پور ـــ لکھنؤ

لکھنؤ کے بعد کولن کیمبل پھر کان پور کی طرف بڑھا جہاں تانتیا ٹوپی موجود تھا۔ فتح گڑھ میں بھی تصادم ہوا، انقلابی پسپا ہو گئے۔ انگریزوں نے یہاں نادر خاں کو پھانسی دی جو نانا صاحب کے ساتھ جنگوں میں شریک ہوا تھا۔ پھانسی پاتے وقت اس بہادر نے ہم وطنوں سے پکار کر کہا:-

"اپنی تلواریں اس وقت تک میان میں نہ کرنا جب تک انگریزوں سے آزادی حاصل نہ ہو جائے"۔ [1]

کان پور پر انقلابی پرچم

۱۶ر اگست کو کان پور میں انقلابی فوجوں کی شکست کے بعد تانتیا ٹوپی نے گوالیار جا کر فوج جمع کی اور کالپی تک لے آیا، یہاں کان پور میں کولن کیمبل کچھ انگریزی فوج کو ونڈہم کی ماتحتی میں چھوڑ گیا تھا جب تانتیا ٹوپی کو اطمینان ہو گیا کہ کولن لکھنؤ پہنچ کر جنگ میں الجھ چکا ہے تو وہ فوراً کان پور کی طرف بڑھا اور شیو راج پور پر قبضہ کر لیا، انگریزی فوج کی رسد کاٹ دی ۱۹ر نومبر ۱۸۵۷ء ادھر سے انگریزی فوجیں بھی تانتیا کا مقابلہ کھیل سمجھ کر بڑھ رہی تھیں چناں چہ ۲۶ر نومبر کو پانڈو ندی کے قریب تصادم ہوا۔ انگریزی فوجیں بدحواس ہو کر پسپا ہو گئیں اب آدھا کان پور آزاد تھا۔

کان پور میں مقابلے

اگلے دن انگریزی فوجوں نے پھر حملہ کیا مگر اس بار پہلے سے بھی زیادہ بری طرح شکست نصیب

1. Savarkar - 324

ہوئی، بڑے بڑے افسر مارے گئے، فوج بری طرح تباہ ہوگئی، کولن کیمپبل لکھنؤ سے پھر کان پور کی طرف آرہا تھا کہ تانتیا کی فوجوں نے اس کو راستے ہی میں جا لیا تاکہ پل پار نہ کر سکیں، دشمن بھی ارادہ بھانپ گیا اور ۳۰ر نومبر کو پل پار کرکے کان پور میں داخل ہوا۔ نانا صاحب اور کنور سنگھ بھی کان پور میں موجود تھے۔ یکم اور ۲ر دسمبر ۱۸۵۷ء کو جنگ ہوئی، کولن نے انقلابی فوج کی داہنی سمت کم زور دیکھ کر اس طرف سے حملے کا ارادہ کیا مگر براہ راست مقابلہ دشوار تھا لہٰذا اس نے پہلے بائیں بازو اور قلب پر بناوٹی حملہ شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر انقلابیوں نے اپنی پوری طاقت اسی طرف مرکوز کر دی اس طرح انقلابی فوجوں کو غلط سمت میں الجھا کر انگریزی فوجیں داہنی طرف سے اچانک ٹوٹ پڑیں مگر یہاں گوالیار کے دستوں نے خوفناک آگ برسانا شروع کر دی تو سکھ فوجیں پیل کی سرکردگی میں آگے بڑھیں اور گوالیار کی فوجیں پیچھے ہٹ گئیں —— چند معمولی تصادموں کے بعد ۹ر دسمبر کو شیوراج پور پر پھر تانتیا کی فوجیں دشمنان وطن کے مقابل ہوئیں اور یہاں بھی انھیں پسپا ہونا پڑا سر کولن اب بٹھور آیا، نانا صاحب کے عالی شان محلات کو لوٹا اور مسمار کیا، مقدس مندروں کو زمیں بوس کر دیا۔ نانا صاحب اور تانتیا ہاتھ نہ آ سکے تو ان کا بدلہ "شریف

سلہ ۱ھ "اگر سر کولن کی آمد سے جنرل ونڈھم کو وقت پر امداد نہ پہنچ جاتی تو اس کا بھی وہی حشر ہوتا جو جنرل وہیلر کا ہوا تھا مگر کولن ایسے وقت گنگا کے کنارے پہنچ گیا کہ اس نے کشتیوں کے پل کو تباہ ہونے سے بچا لیا ورنہ اس کے تباہ ہونے سے کولن بھی منھ دیکھتا ہی رہ جاتا"۔

(مارش مین/ ۵۱۳)

اور "مہذب" انگریزوں نے ٹھور کے در و دیوار سے لے لیا۔

دہلی دوبارہ انگریزی پنجوں میں آچکا تھا، کان پور میں ہزاروں بہادر انقلابی نثار ہو چکے۔ لکھنؤ کے بے شمار سورماؤں نے جام شہادت نوش کر لیا، مگر اُن کی ہمتیں بدستور بلند ہیں وہ اپنے قوم و ملک پر قربان ہوں گے، چپے چپے پر اپنے خون سے گل کاریاں کر کے دنیا کو بتائیں گے کہ ہندوستان نے ــــ مفلس اور بے کس ہندوستان نے ــ انگریزی سامراج کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لیے اپنی پوری طاقت لگائی ہے۔

کولن کیمپبل کو اب بھی غضب ناک انقلابیوں کا مقابلہ دشوار تھا اور اب جب کہ وہ کان پور چلا گیا تھا انقلابی فوجیں مولانا احمد اللہؒ اور دوسرے رہنماؤں کی سرکردگی میں دشمنان قوم کو پھر سر میدان للکار رہی تھیں۔ انگریزوں نے راجہ نیپال سے مدد مانگی اور تحریک آزادی کا سر کچلنے کے لیے ۲۳ دسمبر ۱۸۵۷ء کو اس کی فوجیں اودھ کی طرف بڑھنے لگیں اس دوران میں بینی مادھو، راجہ نادر خاں اور محمد حسین نے بنارس کے قرب و جوار کا علاقہ آزاد کرا لیا تھا۔

کولن کیمپبل اب فتح گڈھ پر اچانک حملہ کرنا چاہتا تھا تاکہ باغیوں کو چاروں طرف سے گھیر لے۔ قریب ہی قلعہ فرخ آباد میں انقلابیوں نے گولہ بارود اور کارتوسوں کا زبردست کارخانہ بنایا تھا۔ یہاں کے باغی یہ تمام سامان برباد کیے بغیر ہی فرار ہو گئے حتیٰ کہ انھوں نے کشتیوں کا پل بھی برباد نہ کیا، اس طرح ۳ جنوری ۱۸۵۸ء کی شام کو انگریزی فوجیں فرخ آباد کے قلعے پر قابض ہو گئیں۔ اب اس علاقے میں "امن" قایم کرنے کا کام شروع کیا گیا اور یہ کام بھی حسب دستور انگریزی فوج نے انتہائی تن دہی سے انجام دیا۔ سیکڑوں بے گناہ شہر کے چوک میں پیپل کے درخت کی شاخوں پر پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔[۱]

[۱] سین / ۲۳۶

روہیلکھنڈ اور اودھ اب بھی باغیوں کے قبضے میں تھے لیکن فتح گڈھ کی شکست نے روہیلکھنڈ کا راستہ صاف کر دیا اس لیے اب کیمپبل پہلے بریلی اور شاہ جہاں پور کی طرف بڑھنا چاہتا تھا لیکن گورنر جنرل کی رائے میں اودھ زیادہ اہمیت رکھتا تھا لہٰذا انگریزی فوجیں اودھ کی طرف بڑھیں اور ۱۹ فروری ۱۸۵۸ء کو چاندا پر انقلابیوں سے تصادم ہوا جن کی کمان بندہ حسن اور مہدی حسن کر رہے تھے۔ دوسری بار سلطان پور میں سخت مقابلہ ہوا۔ یہاں غفور بیگ انقلابی دستوں کے سالار تھے۔

امبرپور کے بہادر سپوت

۲۵ فروری ۱۸۵۸ء کو انگریزوں اور نیپال کی متحدہ فوجیں دریائے گھاگرا پار کر کے امبرپور آئیں اور ایک قلعے پر حملہ آور ہوئیں جس میں صرف چونتیس ۳۴ آدمی تھے مگر یہ چونتیس جاں باز مقابلہ پر ڈٹ گئے، آخر دم تک پامردی اور استقلال سے مقابلہ کرتے رہے یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک موت سے ہم کنار ہو گیا۔ دوسری طرف جنرل فرینک اپنی فوجیں لے کر بڑھ رہا تھا جو سلطان پور اور بدایوں میں کمانڈر بندہ حسن اور ناظم محمد حسین سے جنگ کر چکا تھا۔ لکھنؤ سے بھی ایک فوج مقابلے کے لیے گئی مگر ۳ فروری کو اس کو پسپا ہونا پڑا۔ اس طرح انگریزی فوجوں کے دستے جو لکھنؤ پر مختلف سمتوں سے بڑھ رہے تھے قریب تر ہونے لگے۔

مولانا احمد اللہ کی سرگرمیاں

علاقۂ اودھ کے راجہ، نواب، تعلقدار اور جاگیردار شانہ بہ شانہ جنگ کر رہے تھے[1]

---

[1] ان میں سے اکثر کو انگریزی حکومت سے نقصان نہیں، بلکہ فائدہ ہی پہنچا تھا، سوائے چند

مولانا احمد اللہ اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں سے فرزندان اودھ کے دلوں میں آگ لگا رہے تھے، ساورکر نے لکھا ہے :-

"یہ غیر معمولی شخص چار مہینے سے بجلی کی سی تیزی سے اِدھر اُدھر پھر رہا تھا اور اپنی موجودگی سے جوش و احساس کی روح پھونک رہا تھا میدانِ جنگ میں بھی اور کونسل ہال میں بھی"۔ (۴۳)

ان کو صرف یہ فکر تھی کہ کسی طرح دشمن کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا جائے کیوں کہ کولن کان پور جاتے وقت اوٹرام کو عالم باغ میں چھوڑ گیا تھا اور انگریزی فوج کی تعداد یہاں زیادہ نہ تھی وہ چاہتے تھے کہ جس طرح نانا صاحب نے دشمن کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس کو دوبارہ کان پور سے نکال باہر کیا تھا اسی طرح لکھنؤ بھی فائدہ اٹھائے مگر ان کی پوری کوشش اور محنت کے باوجود بھی آپس کے اختلافات نے ایسا نہ ہونے دیا۔ ہر چند، دوسرے علاقوں کی انقلابی فوجیں اور عوام لکھنؤ میں جمع ہو رہے تھے مگر ان میں بدنظمی، اختلافات اور انتشار تھا جس طرح آگ جلاتی اور پانی ڈبوتا ہے اسی طرح قدرت کا مسلمہ اصول ہے کہ جو قوم اپنے دشمن کے خلاف متحد و متفق نہیں ہوتی، اتفاق اور بھائی چارہ نہیں رکھتی وہ تباہ و برباد ہوتی ہے، تاریخ نے بارہا اپنے کو دہرایا ہے۔ بارہا آپس کی پھوٹ اور جھگڑوں کی بدولت قومیں صفحۂ ہستی سے مٹی ہیں اور ملک غلام بن گئے ہیں۔ پھر اگر ہندوستان میں

کے جن کی جاگیریں چھینی تھیں مگر ان سب کی فوجیں برابر انقلابیوں کے ساتھ تھیں۔ یہ واقعات وحالات گیننگ نے اوٹرام کو اپنے ایک خط میں لکھے۔ (ساورکر، ۱۴۴)

بھی تاریخ نے یہی تماشا دکھایا تو کون سی عجیب بات تھی۔ مگر کیا فرزندان وطن نے کوئی سبق حاصل کیا؟ تاریخ کے صفحات اس کا جواب نفی میں دے رہے ہیں۔

مولانا احمد اللہ اس نفاق اور پھوٹ سے بددل نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے اندھیرے کو اجالے میں تبدیل کر دیا۔ اِس محب وطن مولوی نے لاکھوں فرزندان وطن کے دلوں میں اپنی شعلہ بار تقریروں اور اپنی شخصیت سے قومی غیرت و حمیت کی لہر دوڑا دی[1]۔ انھوں نے منتشر فوج کو ایک بار پھر منظم کیا مگر ان کی راہ میں بے شمار مشکلیں تھیں۔ ان کی ہر دل عزیزی دیکھ کر بعض لوگوں کو حسد پیدا ہو گیا، ان کو گرفتار کر کے قید کر لیا گیا مگر مولانا سے عوام اور سپاہی والہانہ عقیدت رکھتے تھے چناں چہ بیگم حضرت محل پر زور ڈالا گیا اور آخر کار مولانا کو رہا کرنا پڑا، حالات اب مایوس کن تھے، مگر مولانا احمد اللہ ہار جیت کی خاطر نہیں، بلکہ آزادیٔ وطن کے لیے جہاد کو اپنا فرض سمجھ کر لڑ رہے تھے[2]۔ انھوں نے ۲۲ر دسمبر کو بڑا اچھا جنگی پلان بنایا۔ ان کو

---

[1] شری رتن لال بنسل ایک مضمون میں لکھتے ہیں ــــ "دس دس ہزار آدمیوں کی بھیڑ ان کی تقریر سننے کے لیے اکٹھی ہوتی تھی، مولوی احمد شاہؒ ان کو بتلاتے کہ انگریز کس طرح اس ملک میں ڈٹے گئے اور اگر پورا ملک ان کے قبضے میں چلا گیا تو اس کا نتیجہ عام جنتا کے لیے کیا ہوگا .... اور مولوی احمد شاہؒ کی زبان میں کچھ ایسا جادو تھا کہ کئی کئی گھنٹے یہ ہزاروں آدمی بت بنے ہوئے ان کی تقریریں سنتے رہتے تھے ..... اس زمانے میں مولوی احمد شاہ شاید پہلے آدمی تھے جنھوں نے اپنے پرچار کا یہ نیا طریقہ اپنایا تھا ..... اس طرح ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے دل میں مولوی احمد شاہ نے دیش بھگتی کا سچا جذبہ پیدا کر دیا" (نیا ہند، ستمبر ۱۹۴۷ء) [2] مولانا سے جب حالات کی

انگریزی فوجوں کے پیچھے سے حملہ کرنا تھا اور بہ یک وقت عالم باغ کی انقلابی فوج کو سامنے سے — انھوں نے اپنا کام نہایت کامیابی اور قابلیت سے انجام دیا مگر دوسرا انقلابی سردار جسے آگے سے حملہ کرنا تھا، اپنی فوج کو قابو میں نہ رکھ سکا اور پلان کا ناس ہو گیا۔

مولانا احمد اللہ زخمی

۱۵ جنوری ۱۸۵۸ء کو جب خبر ملی کہ انگریزی فوج کان پور سے تازہ کمک اور امداد لے کر آ رہی ہے تو دوسرے سردار اس بحث میں الجھ گئے کہ اس رسد کو کیسے روکا جائے مگر مولانا جانتے تھے کہ اگر دیر کی گئی تو کامیابی کا امکان نہ رہے گا، لٰہذا وہ ان بزدلوں کی کم ہمتی سے متنفر ہو کر اپنے مٹھی بھر جاں بازوں کے ہمراہ اس مہم پر روانہ ہو گئے وہ اپنی نقل و حرکت کو انگریزوں سے پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے مگر ہندوستانی جاسوسوں نے اوٹرام کو خبر کر دی، اور اس نے ایک فوج ان کے مقابلے کے لیے بھیج دی، جنگ شروع ہو گئی، مولانا سب سے آگے نظر آ رہے تھے اور پوری قوت سے جنگ کر رہے تھے کہ ان کے ہاتھ پر گولی لگی اور وہ زخمی ہو کر گر پڑے - انگریز اپنے اس سب سے بڑے دشمن کو گرفتار کرنے کے لیے بے چین تھے مگر انقلابی جاں نثاروں نے پھرتی سے ڈولی میں بٹھا کر لکھنؤ پہنچا دیا، آپ کے زخمی ہو جانے سے انقلابی حلقوں میں فکر و تشویش کی لہر دوڑ گئی ہر شخص خیریت معلوم کرنے کے لیے بے چین تھا۔

بابت پوچھا گیا تو انھوں نے کہا — "مبارک اور پُر امید لمحات گذر چکے ہیں، حالات بے جوڑ ہیں مگر اب ہمیں صرف اس لیے لڑنا ہے کہ یہ ہمارا فرض ہے"۔ (ساورکر -)

جاں باز برہمن

مولانا سے عقیدت واحترام کے اظہار کا سب سے اچھا طریقہ یہ تھا کہ وہ کام پورا کیا جائے جو انھوں نے شروع کیا تھا۔ چناں چہ اس کا بیڑہ ایک دلیر برہمن ویدی ہنومان نے اٹھایا جس نے ۱۰؍جنوری ۱۸۵۷ء کو انگریزوں پر حملہ کیا۔ یہ بہادر برہمن صبح سے شام تک لڑتا رہا اور شام کو زخمی ہو کر گرفتار ہو گیا۔ مولانا زخمی پڑے تھے اور تقریباً ایک ہفتے تک کسی جنگ میں حصہ لینے سے معذور رہے۔ ان کے زخمی ہو جانے سے مایوسی پیدا ہو چلی تھی مگر بیگم حضرت محل بہادری سے اپنی جگہ جمی رہیں، وہ ناکامیوں اور مایوسیوں سے دل شکستہ ہونا نہ جانتی تھیں۔ رسل لکھتا ہے۔

"بیگم نے بڑی طاقت اور اہلیت کا مظاہرہ کیا..... ان رانیوں اور بیگموں کے جوشیلے کردار دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ سے اپنے زنانے حرموں میں رہتے ہوئے بھی کس قدر عملی اور دماغی قوتوں کی مالک رہی ہیں"۔

مولانا احمد اللہ پھر میدان میں

ان ہی مایوس کن حالات میں حضرت محل کے وزیر مال راجہ بال کرشن سنگھ کا انتقال ہو گیا۔ مولانا احمد اللہ بہ مشکل ٹھیک ہوئے تھے کہ جہاد حریت کا جذبہ ۱۵؍فروری ۱۸۵۸ء کو پھر میدان میں لے آیا وہ کولن کیمبل کے پہنچنے سے پہلے اوٹرام کو مزہ چکھانا چاہتے تھے انقلابی سپاہیوں میں بزدلی اور مایوسی کے آثار بڑھتے ہی جا رہے تھے اور مولانا کی تمام کوششیں اب خاک میں مل رہی تھیں انقلابیوں کو پسپا ہونا پڑ رہا تھا مگر مولانا اسی عزم واستقلال کے ساتھ مصروف جنگ تھے ہومز کو تعجب ہے کہ ـــــ

"اگرچہ باغی عوام بزدل تھے مگر ان کا لیڈر جذبات اور قابلیت دونوں

اعتبار سے ایک بڑی تحریک کو چلانے اور ایک بڑی فوج کی کمان سنبھالنے کی پوری اہلیت رکھتا تھا اور یہ فیض آباد کا مولوی احمد اللہ تھا"۔

۲۵ر فروری کو بیگم حضرت محل برجیس قدر کو لے کر خود میدان جنگ میں آئیں، ان کی موجودگی سے جوش وخروش میں اضافہ تو ہوا لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

لکھنؤ کی شکست

ادھر ۱۱ر مارچ سے پہلے انگریزی تلواریں لکھنؤ کی آزادی غصب کرنے کے لیے بے نیام ہوگئیں اور اُدھر لکھنؤ کا بچہ بچہ ملک وقوم کی حفاظت پر تُل گیا —— کولن کیمپبل عالم باغ کی انگریزی فوجوں سے آملا۔ انقلابیوں نے مایوسی اور نفاق کے باوجود اپنی حفاظت کا پورا سامان کیا اور شمالی سمت کے علاوہ تمام طرف سے محفوظ بنالیا۔ کولن کیمپبل نے انقلابیوں کے اس کم زور پہلو سے فائدہ اٹھایا۔ اس سے پہلے کبھی اس طرف سے حملہ نہ ہوا تھا اور چوں کہ اس طرف گومتی ہے اس لیے انقلابی فوجوں کو اطمینان تھا مگر جیسے ہی انگریزی فوج ادھر سے حملہ آور ہوئی تمام دوسری پیش بندیاں بے کار ہوگئیں۔ پھر بھی لکھنؤ کے انقلابی عوام اور سپاہ دس دن تک دن رات لڑتے رہے، شہر کے چپے چپے پر شہیدان وطن کے پاک خون کی گل کاریاں ہوگئیں، دشمن کی متحدہ تازہ دم اور نئے ہتھیاروں سے لیس، فوجیں بڑھتی ہی جارہی تھیں۔ دل کشا باغ، قدم رسول، شاہ نجف، بیگم کوٹھی اور دوسرے مقامات پر قبضہ ہوتا چلا گیا، انقلابی اب بھی جنگ کر رہے تھے۔ بعض مقامات پر خود بیگم حضرت محل ہاتھی پر سوار جنگ میں مصروف نظر آئیں۔ ۱۰ر مارچ کو دہلی کے شہزادوں کا خون پینے والا ہڈسن گولی کا نشانہ بنا۔ انگریزی فوج قلعے میں داخل ہوئی۔ لیکن انقلابیوں نے ہتھیار نہ ڈالے، انگریزی دستوں نے گھیرنا چاہا تو ان کو چیر کر نکل گئے

اس وقت لکھنؤ میں تقریباً تمام انقلابی لیڈر نانا صاحب، عظیم اللہ خاں، بخت خاں، مولانا سرفراز علیؒ، مولانا فیض احمد، ڈاکٹر وزیر خاں، نواب تفضل حسین فرخ آبادی شہزادہ فیروز، مولوی لیاقت علی الہ آبادی وغیرہ جمع تھے اور ان بہادروں نے ایسے مایوسانہ دور میں بھی اکثر جگہ انگریزوں کو ناکوں چنے چبوا دیئے، نواب گنج میں کامیابی ہوئی، رسدخانے تک انقلابیوں کا قبضہ ہو گیا تھا اور لکھنؤ مولانا احمد اللہ کے ہاتھوں میں تھا مگر حضرت محل کے مقرر کردہ منتظم ممو خاں کی مخالفت اور نالائقی نے کامیابی دشوار بنا دی، "چکر" والی کوٹھی پر خود مولانا نے مورچہ سنبھالا تھا اور انقلابی فوجیں داد شجاعت دے رہی تھیں۔ آخری جنگ عیش باغ پر ہوئی۔ جب محل کا محاصرہ ہو گیا اور جنگ کی کوئی صورت نہ رہی تو بیگم حضرت محل اپنی دو ساتھی عورتوں اور برجیس قدر کے ہمراہ پیچھے سے نکل کر پیدل دوسرے محلے میں گئیں اور تین دن تک منتشر فوجوں کو دوبارہ جمع کرنے کی ناکام کوشش کے بعد لکھنؤ سے باہر چلی گئیں۔

مولانا احمد اللہؒ پھر لکھنؤ میں!

جنگ کا پانسا پلٹ گیا مگر مولانا احمد اللہؒ ابھی تک مصروف جنگ تھے۔ ساورکر لکھتے ہیں:-

"ہر شخص کو اس سب سے بڑے ہیرو کے احترام میں اپنا سر جھکا لینا چاہیئے جو اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کے ہمراہ پھر لکھنؤ میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے"۔

اور آخر کار یہ تقدس مآب مولوی اپنے ان ہی مٹھی بھر جاں بازوں کے ہمراہ موت و زلیست سے بے پرواہ ہو کر سعادت گنج میں داخل ہو گیا وہ ایک محفوظ اور مضبوط عمارت

میں دو توپوں اور اپنے چند جاں بازوں کے ہمراہ ۲۱ مارچ تک موجود تھے[1] لیکن جب تمام جاں بازوں نے دین و وطن کے لیے قربانی پیش کر دی اور لکھنؤ میں آزادی کا پرچم بلند رکھنا دشوار ہو گیا تو مولانا یہاں سے نکل گئے۔ دشمن نے چھ میل تک ناکام پیچھا کیا وہ اب قرب و جوار کے دیہات میں مصروفِ جنگ تھے۔

بیگم حضرت محل کی شرافت

لکھنؤ پر انگریزی قبضہ ہو جانے کے بعد اُس انتقام کی داستان قلم کو خون میں ڈبو کر لکھنا پڑے گی جو لکھنؤ اور اُس کے باشندوں سے لیا گیا اور جس کے سامنے دہلی کی سفاکیاں بھی گرد ہو کر رہ گئیں۔ اس ہولناک ڈرامے کے چند مناظر تو ہم کسی اور جگہ پیش کریں گے مگر انقلابیوں کی رواداری کی یہ مثال بیان کر دینا یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جب انگریزی فوجیں بے قصوروں اور باغیوں کا یکساں قتلِ عام کرتی ہوئی لکھنؤ

---

[1] میلیسن لکھتا ہے ــــــ "باغیوں کا سب سے زیادہ ضدی اور ہٹیلا سردار مولوی پھر لکھنؤ لوٹ آیا اور اس کے قلب یعنی شہادت گنج کی ایک مضبوط قلعہ بند عمارت میں موجود تھا، اس کے پاس دو توپیں تھیں، اسے نکالنے کے لیے ۲۱ مارچ کو لوگارڈ بھیجا گیا جس نے پہلے دن بیگم کوٹھی پر قبضہ کیا...... باغیوں نے کبھی اس قدر ثابت قدمی اور استقلال کا مظاہرہ نہ کیا تھا جیسا کہ یہاں دیکھنے میں آیا۔ انھوں نے یہاں بے مثال بہادری سے اپنا دفاع کیا اور اس وقت تک نکالے جا سکے جب تک انھوں نے ہمارے بہت سے آدمیوں کو ختم اور زخمی نہ کر دیا"۔

---

1. [Keye and Malleson, vol. IV, P. 286
Savarkar 410, 411

میں سرکولن کی ماتحتی میں داخل ہوئیں تو انقلابی سخت غضب ناک ہوئے اور محل میں جا کر اُن انگریز مرد عورتوں سے بدلہ لینا چاہا جو یہاں قید تھے، چند انگریز افسران تو اُن کے حوالے کر دیے گئے جن کے خون سے انھوں نے اپنی پیاس بجھائی مگر جب یہ اصرار کیا گیا کہ عورتیں بھی ختم کر دی جائیں تو —— کسی اور کی نہیں، چارلس بال کی زبانی سنیے کہ ——

"عورتوں کا احترام کرتے ہوئے بیگم نے صاف انکار کر دیا اور ان کو فوراً اپنی نگرانی میں زنانے محلات میں بلا لیا"۔ (جلد دوم ۹۸)

گوریلا جنگ

لارڈ کیننگ نے دہلی کی شکست کے بعد اعلان کیا کہ باغیوں کی جائدادیں ضبط ہو جائیں گی اور جو لوگ ہتھیار ڈال دیں گے اُن کو معاف کر دیا جائے گا مگر انقلابی صفوں میں مایوسی اور ہراس کا شائبہ بھی نہ تھا وہ بہ دستور جنگ میں مصروف رہے۔ لکھنؤ شکست ہوا تو قرب و جوار میں جنگ کرتے رہے۔ اب انھوں نے گوریلا طریقۂ جنگ اختیار کر لیا تھا، انقلابی سرداروں کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ کھلی جنگ نہ کی جائے بلکہ دشمن کی نقل و حرکت کی نگرانی ہو اور اس کا سلسلۂ رسل و رسائل کاٹ کر معطل کر دیا جائے، مولانا احمد اللہ نے فوراً ان تجویزوں پر عمل شروع کر دیا اور لکھنؤ کے برطانوی کیمپ کو معطل کر دینے کی کوشش شروع کر دی۔ انھوں نے لکھنؤ سے ۱۹ میل دور باڑی میں کیمپ لگایا اور بیگم حضرت محل بٹولی میں خیمہ زن ہو گئیں۔ ادھر لکھنؤ سے ہوپ گرانٹ بھاری سامان جنگ اور مسلح فوجیں لے کر باڑی کی طرف بڑھا۔ مولانا نے اپنے کچھ اسکاؤٹ روانہ کیے تاکہ انگریزی فوجوں کے متعلق معلومات کریں۔ یہ اسکاؤٹ بے دھڑک

چکر کوٹھی :- لکھنؤ میں مولانا احمد اللہ شاہؒ کی قیام گاہ
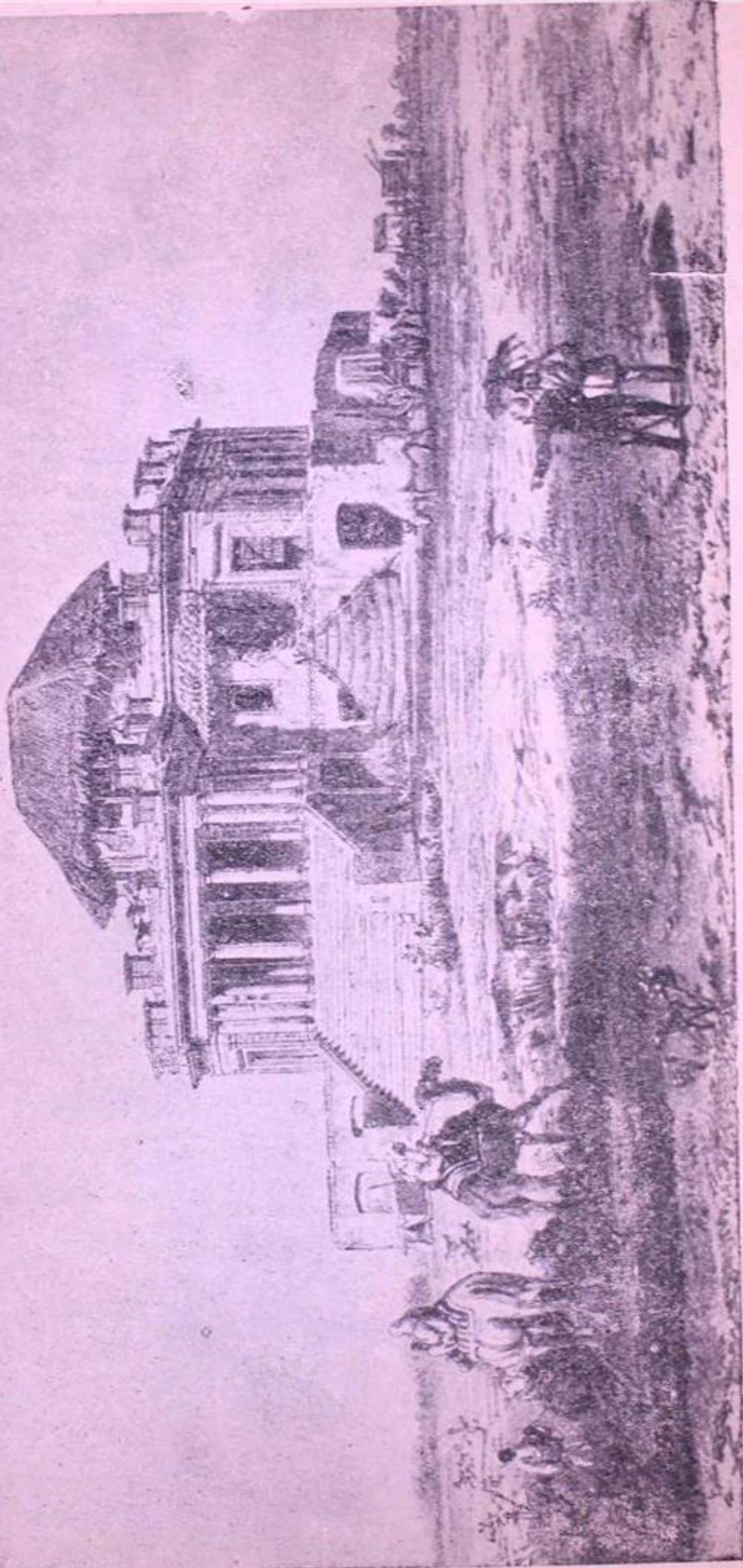
انگریزی کیمپ میں داخل ہوگئے۔ چوکی دار نے پوچھا ——— "کون جاتا ہے؟" ——— جواب ملا ——— "ہم ہیں ۱۲۔ رجمنٹ کے آدمی" ——— "ٹھیک ہے چلے جاؤ" ——— چوکی دار نے جانے دیا۔ اسکاؤٹ واقعی ۱۲۔ رجمنٹ کے آدمی تھے جو انقلابیوں کے ہمراہ تھی۔ چناں چہ اس باہمت گروپ نے تمام ضروری معلومات فراہم کر کے مولانا کو آگاہ کر دیا۔

مولانا احمد اللہ کا پلان

معلومات حاصل کرنے کے بعد مولانا نے ایک لاجواب پلان بنایا۔ وہ آگے بڑھے اور باڑی سے چار میل جاکر ایک گاؤں میں مقیم ہوگئے۔ ان کا پلان یہ تھا کہ جب ان کی انفنٹری (پیادے) اس گاؤں پر قبضہ کرنے تو کیولری (سوار) ایک خفیہ اور پوشیدہ راہ سے بڑھ کر انگریزی فوج کے پیچھے پہنچ جائے اور اس طرح گھیر کر حملہ کیا جائے، ان کو معلوم تھا کہ انگریز جنرل اگلے دن صبح کے وقت اسی جگہ پہنچے گا اور اس پلان سے چوں کہ بے خبر ہوگا، لہٰذا انفنٹری آگے سے اور کیولری پیچھے یا بائیں طرف سے اچانک حملہ آور ہوگی۔ میلیسن نے اس پلان کو بڑا ماہرانہ اور مولانا کی جنگی صلاحیتوں کے کمال کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ لیکن اس پلان کے لیے ضروری تھا کہ مولانا کی اس گاؤں میں موجودگی انگریزوں سے پوشیدہ رہے اور دوسرے یہ کہ پیچھے سے آنے والی کیولری اس وقت تک خاموش رہے جب تک آگے سے حملہ شروع نہ ہو۔ انھوں نے اسی رات کو پلان کے مطابق پوشیدہ راہ سے کیولری کو روانہ کر دیا، خود خاموشی سے اسی گاؤں میں مقیم رہے اور اپنی موجودگی کو اس قدر کام یابی سے چھپایا کہ اگلی صبح کو واقعی بے خبر انگریز جنرل یہاں پہنچ رہا تھا۔ صرف آدھا گھنٹہ اور باقی تھا کہ یہ پلان کام یاب

ہو مگر سوار دستے کی بے صبری سے پلان بکھر گیا۔ ہوا یہ کہ انھوں نے ایک نہایت مناسب مقام پر قبضہ کر لیا تھا جو کہ انگریزی فوج کے (دائیں یا بائیں) پہلو پر تھا۔ وہ حملہ کرنے کے لیے تیار ہی تھے کہ ان کے لیڈر کو کچھ توپیں سامنے نظر آئیں، انھوں نے مولاناؒ کے سخت احکامات کو بھول کر اُن پر دوڑ کر قبضہ کر لیا۔ انگریزوں کو اس آہٹ سے خطرے کا احساس ہو گیا، توپیں دوبارہ چھن گئیں اور سارا پلان خراب ہو گیا۔ انگریز دونوں طرف سے چوکنا ہو گئے تھے۔ مولاناؒ نے اپنے پلان کی اس طرح ناکامی دیکھ کر ایک معمولی تصادم کے بعد گاؤں چھوڑ دیا۔

بہادر نراپت سنگھ

اسی وقت دوسری طرف روئیا کے قلعے پر گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی اور انقلابیوں کو شمال کی طرف دھکیلا جا رہا تھا، مختلف انگریزی فوجیں انقلابیوں سے تصادم کے بعد شمالی سرحد کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ وال پول ۱۵ اپریل ۱۸۵۸ء کو روئیا کے قلعے پر حملہ آور ہوا، جس کا راجہ نراپت سنگھ اپنے کو جنگ آزادی کے لیے پیش کر چکا تھا۔ انگریزوں کی زبردست فوجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے غریب راجہ کے پاس ڈھائی سو آدمی بھی نہ تھے مگر اس نے طے کیا کہ بغیر جنگ کے قلعہ نہ چھوڑے گا۔ کہاں ساز و سامان سے لیس زبردست فوج اور کہاں یہ کم زور مگر بہادر راجہ۔

"مضحکہ اور قطرۂ شبنم کا انگاروں کے ساتھ"۔!

چناں چہ قلعے والوں نے نہایت پامردی سے انگریزی فوج کا مقابلہ کیا، انگریز ایک کم زور مورچے سے بڑھے۔ یہاں بھی تسخیر مشکل تھی، انگریز افسر کام آیا اور فوج پسپا ہونے لگی، ہوپ بھی کام آ گیا جس کی موت پر انگریزوں میں صف ماتم بچھ گئی۔

بہادر نرایت سنگھ نے اب قلعہ چھوڑ دیا اور اپنے چند جاں بازوں کے ساتھ جنگ آزادی میں حصہ لینے کسی دوسری جگہ چلا گیا۔

لکھنؤ کی جاں بازی

لکھنؤ نے جس دلیری اور استقلال سے مقابلہ کیا اس کے متعلق مارشمین سے سنیے :۔

"لکھنؤ میں باغیوں نے جو مقاومت کی وہ ایسی سخت تھی کہ کبھی انگریزی فوج کو سابقہ نہیں پڑا تھا۔ حتیٰ کہ دہلی میں بھی ایسی سخت مقاومت نہیں کی گئی تھی باغیوں کے جوش بیگم اودھ کی موجودگی کی وجہ سے بڑھے ہوئے تھے جو غیر معمولی مستعدی اور سرگرمی کی عورت تھی اور تمام بغاوت کی روحِ رواں رہی . . . .

پورے دس دن تک لڑائی ہوتی رہی جب کہیں جا کر اس مستحکم شہر کی تسخیر مکمل ہوئی"۔ (۵۱)

نیز ایک اور انگریز جان کے کی رائے میں

"دوسری جگہوں پر جنگ کی نوعیت خواہ کچھ بھی رہی ہو، لیکن اودھ میں ہماری حکومت عوامی بغاوت ہی سے دوچار تھی"۔

اٹاوہ کا مقابلہ

لکھنؤ کی شکست کے بعد کولن کیمپبل نے اودھ کو چاروں طرف سے گھیر کر باغیوں کو فتح گڈھ کی طرف دھکیلنے اور تباہ کرنے کا پلان بنایا اور والپول کی سرکردگی میں کان پور سے فوجیں روانہ ہوگئیں مگر انقلابیوں کے ایک چھوٹے سے دستے نے اٹاوہ پر روک لیا۔ نشۂ شہادت سے چور یہ مٹھی بھر سرفروش پرانی قسم کی دستی بندوقیں لے کر مقابلے پر ڈٹ گئے۔ اور ایک عمارت پر مورچا بنا لیا۔ جب گولے پھینکنے اور بھس میں آگ لگا کر دھواں کرنے سے کام نہ چلا تو انگریزوں نے اس

مقام کو اڑا دینے کا ارادہ کیا بالآخر انجینیروں کی مدد سے سرنگ بنا کر بارود سے اڑا دیا گیا اور آزادیٔ وطن کے ان چند متوالوں کو شہادت کا وہ درجہ مل گیا جس کے کہ وہ تمنائی تھے۔

اودھ کے جاگیردار

اودھ کے جاگیرداروں نے جس بے غرض جذبے کے تحت جنگِ آزادی میں حصہ لیا اس پر گورنر جنرل لارڈ کیننگ کا وہ خط کافی روشنی ڈالتا ہے جو اوٹرام کے نام لکھا گیا۔ خط میں لکھا تھا

"آپ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ اودھ کے راجوں اور زمینداروں نے اس لیے بغاوت کی ہے کہ ان کو ہمارے مقرر کردہ محصول کی بدولت ذاتی نقصانات پہنچے لیکن گورنر جنرل کی رائے میں یہ چیز کچھ اور قابل غور ہے۔ شاید ہی کسی جاگیردار کی طرف سے اس قدر شدید نفرت کا اظہار ہوا ہو جتنا کہ چاندا، بھنجا اور گونڈہ کے راجوں کی طرف سے ہوا۔ ان میں اول الذکر کا ایک بھی گاؤں ہم نے نہیں لیا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ اس کا خراج بھی کم کر دیا گیا تھا، دوسرے سے بھی نہایت فیاضانہ سلوک روا رکھا گیا، تیسرے کے چار ہزار گاؤں میں سے صرف تین لیے گئے تھے اور اس کے بدلے میں اس کا خراج دس ہزار روپے کم کر دیا گیا تھا۔ حکمرانوں کی تبدیلی سے کسی کو اتنا فائدہ نہیں پہنچا جتنا کہ راجہ نوپارا کو۔ کیوں کہ جیسے ہی انگریزی حکومت قائم ہوئی، ہم نے اس کو ایک ہزار گاؤں دیے، دوسرے حقوق کے علاوہ، اس کی ماں کو اس کا سرپرست مقرر کیا لیکن اس کی فوج شروع ہی سے لکھنؤ میں ہمارے خلاف برسرِ پیکار رہی۔ راجہ دھورا کو بھی ان تبدیلیوں

سے کافی فائدہ پہنچا لیکن اسی کے اپنے آدمیوں نے کیپٹن ہیرسی پر حملہ کیا ان کی بیوی کو گرفتار اور قید کیا۔ اشرف بخش خاں تعلقہ دار، جس پر اس کے سابق بادشاہ نے ظلم کیا تھا، فوراً اپنی تمام جائداد کا مالک بنا دیا گیا (انگریزی عہد میں) لیکن پھر بھی شروع ہی سے ہمارے خلاف نفرت کے شدید جذبات رکھتا تھا یہ اور ایسی ہی دوسری مثالیں بالکل صاف طور پر ظاہر کرتی ہیں کہ ان زمینداروں اور راجوں کی ہمارے خلاف بغاوت کا سبب صرف ان کا ذاتی نقصان ہی نہیں ہے جو ہماری حکومت کے سبب پہنچا" [1]

---

1. Savarkar _ 401. 402

روہیل کھنڈ

جنرل بخت خاں اور خان بہادر خاں

روہیل کھنڈ بھی عرصۂ دراز سے برطانوی ظلم و استبداد کا شکار تھا۔ ہسٹنگز نے جس سفاکی سے بہادر روہیلہ قوم کو پامال کیا، دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال ملنی دشوار ہے اور پھر یہ وہ قوم تھی جس کی انگریزوں سے کوئی دشمنی یا جنگ نہ تھی، کوئی پرخاش نہ تھی بریلی روہیل کھنڈ کی راجدھانی تھی اور بغاوت کے لیے سب سے زیادہ سرگرم تیاریاں بھی یہیں ہو رہی تھیں، برطانوی حکومت کے بڑے عہدے دار تک انقلابی صفوں میں شامل تھے اور انگریزی حکومت ان تیاریوں سے بے خبر تھی۔ یہاں روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں کے پوتے اور نواب ذوالفقار علی خاں کے بیٹے خان بہادر خاں موجود تھے جو سرکاری عہدے (صدر امین) پر تعینات تھے اور نہایت معقول تنخواہ (ڈھائی سو روپے) پاتے تھے۔ مگر اس تمام عیش و آرام کے باوجود انقلابی سرگرمیوں میں شریک تھے، دوسری محب وطن شخصیت صوبے دار بخت خاں تھے[1]۔ وہ انگریزی توپ خانے

[1] اصل نام محمد بخش عرف بخت خاں والد عبداللہ، اودھ کے شاہی خاندان سے تعلق تھا (باقی)

کے بڑے افسر تھے اور انقلابی جماعت کے رہنما بھی تھے۔ مدار علی خاں اور سوبھا رام ان کے خاص شریک کار تھے۔

بریلی میں بغاوت

بریلی میں بغاوت کی تیاریاں اس قدر خفیہ طریقے پر ہو رہی تھیں کہ انگریزوں کو کانوں کان بھی خبر نہ ہو سکی ۱۵ مئی سے یہاں دوسرے علاقوں کے لوگ آنا شروع ہو گئے تھے اور ایک بار بغاوت کی افواہ بھی اڑی مگر غلط نکلی اور سپاہیوں نے اپنی مکمل وفاداری کا یقین دلایا۔ اچانک طے شدہ تاریخ ۳۱ مئی کو جنرل بخت خاں نے دن کے دس گیارہ بجے کے درمیان توپ سرکی اور فوراً بغاوت شروع ہو گئی تمام سپاہیوں نے گولیاں چلانا شروع کر دیں، انگریز ہکا بکا رہ گئے کچھ قتل ہوئے اور کچھ نینی تال بھاگے، چھاؤنی کو آگ لگا دی گئی۔ میگزین اور خزانہ باغیوں کے ہاتھ آیا۔

جب اس طرح بریلی کی سرزمین انگریزوں سے پاک ہو گئی تو اسی دن نواب خان بہادر خاں جنھوں نے پہلے انگریزوں کی درخواست پر بریلی کا انتظام سنبھالنے سے انکار کر دیا تھا اب جنرل بخت خاں اور دوسرے معززین کی درخواست پر نواب بنائے

یہ خاندان سلطان پور میں آباد تھا۔ بخت خاں نے انگریزی فوج میں ملازمت کی اور ترقی کر کے معزز عہدے پر پہنچ گئے جنگ افغانستان میں نمایاں خدمات انجام دیں، جلال آباد اور نیچ میں بھی بڑے عہدے پر رہے پھر صوبے دار بنائے گئے اور افسر توپ خانہ مقرر ہوئے وہ بہادر اور بے باک تھے سادہ لباس پہنتے اور مذہبی رجحان رکھتے تھے بغاوت کے وقت بریلی میں افسر توپ خانہ تھے۔ بریلی میں اس قدر اچانک اور ڈرامائی انداز میں ان کا توپ چلا کر بغاوت کا آغاز کرنا بالکل صاف بتا رہا ہے کہ خفیہ سازش موجود تھی اور وہ اس کے ایک رکن تھے۔

گئے پرانی کوتوالی کے سامنے تخت نشینی کی رسوم دھوم سے ادا ہوئیں۔ خان بہادر خاں[1]
ایک بڑے جلوس کی شکل میں اپنی قیام گاہ (محلہ بھوڑ) سے کوتوالی آئے۔ ان کے
چہرے پر شان و شوکت برستی تھی۔ سرخ و سفید رنگ، خوب صورت، چمک دار آنکھیں
دراز قد اور سفید ڈاڑھی ـــــ جنرل بخت خاں، دیوان سوبھارام، مدار علی وغیرہ ان
کے ہمراہ چل رہے تھے۔ حکومت سنبھال کر سوبھارام کو دیوان (وزیر اعظم) بنایا۔ جو بڑی
صلاحیتوں کا مالک تھا۔ جنرل بخت خاں نے فوجی انتظامات سنبھالے۔ فوج کی کمان
اپنے ہاتھ میں لے کر انھوں نے اپنے سپاہیوں کے سامنے ایک پُرجوش تقریر میں آزاد
ہندوستان میں ان کے کردار پر روشنی ڈالی اور پھر بگھی میں بیٹھ کر شہر کا دورہ کیا۔[1]
بریلی میں مکمل امن و امان قایم ہوگیا، خان بہادر خاں عوام میں یکساں ہر دل عزیز
تھے۔ ٹھاکر جے مل سنگھ اور رگھناتھ سنگھ بھی مکمل طور پر اُن کے شریک کار اور مختلف
معزز عہدوں پر سرفراز تھے انگریزوں کا خیال تھا کہ بریلی میں راج پوت ٹھاکروں
اور روہیلوں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کر کے کام نکالا جاسکے گا مگر سب
سے پہلے جس شخص نے خان بہادر خاں کو سردار اور حاکم تسلیم کیا وہ ایک راج پوت ٹھاکر
جے مل سنگھ تھا۔ آٹھ ممبران کی ایک کمیٹی انتظامات کے لیے بنائی گئی جس میں دو[2] ہندو

۱۔ بریلی کے کمشنر الگزنڈر نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے، جب ۳۰ مئی کو خان بہادر خاں اس سے
ملے تو انھوں نے ہاتھ ملاتے وقت کہا کہ "اپنی جان بچاؤ" اس واقعے سے ایک دن قبل مختلف
رجمنٹوں نے ان سے ملاقات کی تھی (Sen 348)

2. Savarkar - 172,

اور چھ مسلمان شامل تھے۔ خان بہادر خاں نے اپنے حق میں علمار سے فتویٰ اور برہمنوں سے ویادستھا حاصل کر لیا تھا۔ کچھ تاجر انگریزوں سے ساز باز رکھتے تھے مثلاً بیج ناتھ، جو نہ صرف نینی تال سے نامہ و پیام کرتا رہا بلکہ بدایوں کے کلکٹر ایڈورڈ کی امداد بھی کی مگر انقلابی حکومت اس کی اِن حرکتوں سے بے خبر تھی اور اس طرح یہ ساہوکار فقط مالی نقصان برداشت کرتا رہا جو اس کو چندے کی صورت میں دینا پڑتا تھا۔ چندے وغیرہ وصول کرنے والی کمیٹی کے تمام ممبر ہندو تھے[1]۔

انتظامات درست ہونے کے بعد جنگی تیاریاں ہونے لگیں، توپیں ڈھلیں، فوج منظم ہونے لگی، وار کونسل قائم ہوئی اور تمام روہیل کھنڈ کے ضلعوں میں ناظم مقرر کر دیے گئے مگر اس علاقے میں انگریزوں کے کاسہ لیس بھی نواب رام پور اور اس کے حواریوں کی شکل میں موجود تھے جو انقلابی سرگرمیوں کو نقصان پہنچانے کی دن رات فکر کرتے تھے لیکن روہیل کھنڈ کے تمام علاقوں میں خان بہادر خاں کو شاہِ دہلی کا نمائندہ تسلیم کر لیا گیا۔

خان بہادر خاں نے نینی تال سے انگریزوں کو نکالنے کی کئی بار کوشش کی مگر انگریزی وفاداروں کی بدولت خاص کامیابی نہ ہو سکی۔ فروری ۱۸۵۸ء میں آخری کوشش کی اور انگریزوں کو نیپال کی پوری امداد کے باوجود آگے بڑھنے سے روکا۔

بخت خاں کی روانگی

جنرل بخت خاں بریلی کے انتظامات خان بہادر خاں کے سپرد کر کے لکھنؤ اور دیگر مقامات کے انقلابی

1. Sen - 349-50

دستوں کے ہمراہ دہلی روانہ ہوئے کیوں کہ وہاں ان کا بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا
مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے روہیل کھنڈ کے دوسرے علاقوں پر نظر ڈالی جائے
اس لیے مولانا احمد اللہ شاہؒ وغیرہ کے کارنامے جو انھوں نے شاہ جہاں پور اور بریلی
میں انجام دیے بعد میں بیان کیے جائیں گے۔

روہیل کھنڈ کے تمام چھوٹے بڑے قصبوں اور شہروں میں بغاوت ہوئی
یہاں مثال کے طور پر صرف چند کے مختصر حالات درج کیے جا رہے ہیں۔ تفصیل کی
نہ تو گنجایش ہے نہ ضرورت۔

رام پور

ریاست رام پور کا نواب یوسف علی اپنے انگریز آقاؤں کا وفادار
تھا۔ جیسے ہی بریلی میں بغاوت کی اطلاع ملی، اس نے فوراً یکم جون کو
مراد آباد کے انگریز افسروں کے پاس آدمی دوڑایا تاکہ ضروری انتظامات کر لیں۔
چناں چہ اکثر انگریز اپنی جان بچا کر نینی تال بھاگ گئے۔ اسی دوران میں ۳ جون کو
مراد آباد میں بھی ہنگامہ ہو گیا۔ اب یہ نواب نینی تال کے انگریزوں کی ہدایات اور
اشاروں پر ناچنے لگا۔ مگر رام پور کے غیرت مند عوام مادر وطن سے غداری پر آمادہ
نہ تھے، ان کے سینوں میں وطن عزیز کو آزاد دیکھنے کی تمنا کروٹیں لے رہی تھی۔ جب
انھوں نے یہاں جنگ آزادی شروع کرنے کی صورت نہ دیکھی اور اپنے نواب کو
مخالفت پر آمادہ پایا تو اپنے گھر بار چھوڑ دیے اور دوسرے آزاد علاقوں میں چلے گئے
سپاہی بہ بانگ دہل کہتے تھے کہ ہم خان بہادر خاں کی نوکری کریں گے۔ ۱۲ مئی کو
تقریباً دو سو آدمی رام پور سے خفیہ طریقے سے فرداً فرداً نکلے، باہر جا کر طے شدہ مقام پر
اکٹھا ہوئے اور مراد آباد چلے گئے۔ وہ اپنے کو "غازی" کہتے تھے۔ اسی طرح ہزاروں

رام پور کے باشندے بریلی روانہ ہو گئے۔ عوام نواب اور اس کے ساتھیوں کو اعلانیہ برا بھلا کہتے تھے[1]۔

نواب نے اپنے "سفید آقاؤں" سے روہیل کھنڈ پر حکومت کرنے کی اجازت چاہی مگر صرف مرادآباد کی اجازت ملی چنانچہ اس نے مرادآباد کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا نینی تال کے انگریزوں کو وہ برابر سامان رسد اور روپیہ بھیج رہا تھا چنانچہ ایک بار چار ہزار اشرفیاں بھیجیں کیوں کہ ان کے پاس نہ سامان تھا اور نہ روپیہ۔ اس روپیہ اور سامان سے دشمنانِ وطن اس قابل ہوئے کہ نینی تال میں فوجی تیاریاں کریں، اپنے کو بچائیں اور خان بہادر کا مقابلہ مقابلہ کر سکیں۔

جب بریلی کے انقلابیوں کو معلوم ہوا کہ رام پور کا نواب مادرِ وطن کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے پر تلا ہوا ہے تو انھوں نے پہلے اسی کانٹے کو راہ سے ہٹانا ضروری سمجھا کیوں کہ انگریزوں کا یہ کاسہ لیس نواب روڑے نہ اٹکاتا تو روہیل کھنڈ کی تحریک آزادی شاید ناکام نہ ہوتی۔ "اخبار الصنادید" کے مصنف کو اقرار ہے کہ:

> "اس میں شک نہیں کہ اگر ریاست کا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو روہیل کھنڈ میں انگریزوں کو کسی جگہ پناہ ملنا محال تھا اور دوبارہ حکومت نہایت دقتوں سے قایم ہوتی۔" (۴۵)

بریلی سے صوبے دار بخت خاں کے فوج لے کر آنے کی خبر سن کر نواب رام پور حواس باختہ

---

[1] "گلی کوچوں میں نواب اور اس کے معتمدین کو اعلانیہ سخت و سست الفاظ کہے جاتے تھے، اس کو "کرشتان" کہا جاتا تھا۔ (اخبار الصنادید"/ ۲۷ و ۴۴۴)

ہوگیا اس کی فوج کے بارہ تیرہ ہزار سپاہی اس قابل نہ تھے کہ انقلابیوں کے سامنے چند منٹ بھی ٹھہر سکتے اور ریاست کے عوام بھی نواب کے خلاف تھے لہٰذا جب ۹ رجون کو انقلابی فوجیں شہر سے باہر (گنیش گھاٹ) آکر ٹھہریں تو اس نے اپنے گورے آقاؤں کے مشورے کے مطابق انقلابی لیڈروں کو اسلحہ اور چھ سات ہزار روپیہ دے کر بہلا لیا اور جنرل بخت خاں نے یہ سب سے بڑی غلطی کی کہ اس نواب کو اسی طرح بہ دستور چھوڑ کر ۱۳رجون کو مراد آباد روانہ ہوگئے۔

مراد آباد میں بغاوت

مراد آباد کے انقلابی رہنما بغاوت کی خفیہ تیاریاں ایک عرصے سے کر رہے تھے۔ سرکردہ رہنماؤں میں مولوی وہاج الدین عرف مولوی منّو، مولانا کافی، مولانا سید عالم علی اور چند دیگر علماء خصوصاً پیش پیش تھے۔ مولوی منّو نے خفیہ انقلابی جماعتوں کا جال بچھادیا، دورے کیے، تقریریں کیں اور پمفلٹ تقسیم کرائے، قرب و جوار میں ان کا بڑا اثر تھا۔ مسجدوں میں ہر جمعے کو نماز کے بعد جہاد اور آزادی کی اہمیت پر وعظ ہوتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کا زمانہ قریب آیا تو خفیہ سرگرمیاں اور بھی تیز ہوگئیں۔ ۱۲رمئی کو میرٹھ اور دہلی کی خبریں آئیں تو انقلابی حلقوں میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی۔ ۱۸رمئی کو میرٹھ کے کچھ انقلابی سپاہی مراد آباد کے قریب پانچ میل کے فاصلے پر گانگن ندی کے کنارے آکر ٹھہرے۔ انگریز افسران نے فوج بھیجی اور ان کو بھگا دیا مگر باغی سپاہی مراد آباد میں فوج کی قیام گاہ میں بھی موجود تھے اور سپاہ کو بغاوت پر آمادہ کر رہے تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ کچھ "غدار" بھی تھے یعنی کچھ لوگ انگریزوں سے خفیہ خط و کتابت رکھتے اور تمام خبریں پہنچا دیتے۔

۱۹رمئی ۱۸۵۷ء کو مراد آباد کے عوام بھی میدان میں آگئے، انھوں نے جیل خانہ

توڑ کر قیدی رہا کرائے۔ مختلف علاقوں میں اپنے وفد روانہ کیے۔ ضلعے کا انتظام کرافٹ ولسن کے سپرد تھا جس نے یہ شورش دیکھ کر دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ اُدھر مولوی منّو نے رام پور سے امداد طلب کی چنانچہ ۲۱ مئی کو رام پور کے انقلابیوں کی ایک جماعت جو اپنے کو 'غازی' کہتے تھے رام گنگا کے کنارے آکر ٹھہری، اور مولوی صاحب سے پیام رسانی شروع کی لیکن انگریزی فوج نے قبل اس کے کہ وہ کوئی مدد کر سکیں منتشر کر دیا۔

اس دوران میں انگریزوں نے حالات پر عارضی قابو پالیا اور آس پاس کے علاقوں میں بھی بغاوت دبانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ۱۳ مئی کو بریلی میں بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ مراد آباد کے انقلابی عوام یہ خبریں سن کر زیادہ انتظار نہ کر سکے فوج بھی باغی ہو گئی اور ۳ جون کو اعلان کیا گیا کہ تمام انگریز دو گھنٹے کے اندر شہر خالی کر دیں چنانچہ انگریز نینی تال کو بھاگ گئے اور اس دو گھنٹے کے بعد جو پایا گیا وہ قتل کیا گیا۔ خزانہ لٹا اور جب خزانچی اور دو انگریز افسروں کو انقلابی عوام نے قتل کرنا چاہا تو ایک حوالدار نے روک کر کہا۔

"تم نے عہد کیا ہے کہ کسی انگریز کو نہ مارو گے۔ اس عہد کو یاد رکھو"۔

یہ سن کر انقلابیوں نے اِن سب کو چھوڑ دیا[1]۔ مراد آباد انگریزی پنجے سے آزاد ہو چکا تھا۔

رام پور کا نواب برابر نینی تال کے انگریزوں سے خفیہ پیام رسانی کر رہا تھا اُسے ایسے نازک وقت میں بھی مادرِ وطن کا ساتھ دینا اور اپنے آقاؤں کو چھوڑنا گوارا نہ تھا وہ اُن کے اشارے پر ۶ جون کو مراد آباد آیا جہاں نواب مجّو خاں کا اقتدار تھا۔

---

[1] "محاربۂ عظیم" / ۲۲۳

نواب نے انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر مجو خاں کو ضلعے کا ناظم مقرر کیا اور بہت سے انقلابیوں کو قید کر لیا۔

بخت خاں کی آمد

۲ر جون ۱۸۵۷ء کو جنرل بخت خاں اپنی عظیم الشان فوج کے ساتھ مراد آباد میں داخل ہوئے تو انھوں نے انتظام درست کیا، نواب نے جن لوگوں کو قید کر دیا تھا ان کو رہا کیا اور نواب مجو خاں کو دوبارہ نواب بنایا۔ نواب مجو خاں کے پاس کچھ انگریز عورتیں قید تھیں جن کو نواب رام پور کے پاس بھیج دیا گیا[1]۔ اور مراد آباد کو اس طرح آزاد کرانے کے بعد انقلابی فوجیں جنرل بخت خاں کے ہمراہ ۸ر جون کو دہلی روانہ ہو گئیں۔

---

[1] ایک افواہ جس نے روایت کا رنگ اختیار کیا، یہ ہے کہ مجو خاں کی قیدی انگریز عورتوں کے ساتھ بد سلوکی کی گئی اور انھیں کی شکایت پر مجو خاں کو قتل کیا گیا مگر یہ افسانہ انگریزوں کی "من گھڑت" ہے۔ کیوں کہ مراد آباد کے انگریزوں نے اپنے چشم دید بیانات میں کہیں اس طرف اشارہ بھی نہیں کیا (ملاحظہ ہو محاربہ عظیم)۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہوتا تو انگریز مورخین زمین آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ اس کے برعکس خود ایک انگریز کا مورخ کا بیان ہے کہ — "اگرچہ قتل و غارت گری اور ظلم و سفاکی بے انتہا کی گئی مگر انگریز عورتوں کی بے عزتی کی افواہیں جہاں تک میرے شاہدے اور تحقیقات کا تعلق ہے بے بنیاد ہیں اور کسی قابل اطمینان ثبوت سے خالی ہیں" (سر ولیم موئر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی ہیڈ آف دی انٹیلیجنس ڈپارٹمنٹ کی رپورٹ۔ سادر کر۔ ۱۲۵) — ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نانا صاحب کی طرح مجو خاں پر یہ بے بنیاد الزام لگا کر اس لرزہ خیز بربریت کا جواز پیدا کیا گیا ہے جو اُن کے ساتھ روا روا رکھی گئی۔

نواب رام پور نے میدان خالی پاکر پھر مرادآباد کا رخ کیا اور انگریزوں کے ایماپر ۲۴ر جون کو فوج بھیج کر پھر قبضہ کرلیا۔ مجو خاں کو ناظم سنبھل مقرر کیا گیا۔ نواب نے اب کمشنر کے اشارے پر۔ جو نینی تال سے تار ہلا رہا تھا۔ ایک جاسوس دہلی روانہ کرکے بہادر شاہ کو عرضی اور نذرانہ پیش کرایا یہ جاسوس منشی نہال الدین جس کو بخت خاں نے توپ سے اڑانے کا حکم دیا تھا بعض لوگوں کی سفارش پر بمشکل چھوڑا گیا۔ نواب کے جاسوس میرٹھ، کانپور، بجنور، بریلی لکھنؤ وغیرہ میں بھی اپنی مذموم حرکتوں میں خاموشی سے مصروف تھے۔ اسی طرح چندوسی حسن پور سنبھل، ٹھاکردوارہ، امروہہ وغیرہ میں تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے رام پور کی فوجیں بھیجی گئیں، بلند شہر میں نواب کی فوج کو بری طرح شکست ہوئی۔

شہزادہ فیروز

۲۲ر اپریل ۱۸۵۸ء کو شہزادہ فیروز شاہ مرادآباد میں داخل ہوا۔ اور عیدگاہ کے قریب (موجودہ برف خانے کے سامنے) آکر ٹھہرا نواب کو پتہ چلا تو اس نے روکنے کے انتظامات کرنے چاہے مگر تمام شہر شہزادے کے ساتھ تھا۔ ۲۴ر کو رام پور کی فوج سے مقابلہ بھی ہوا مگر نواب کی فوج کو پسپا ہونا پڑا یہ جنگ مزار حضرت شاہ بلاقی رح کے متصل ہوئی۔ شہزادہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ لاپتہ ہوگیا وہ جنگ کے ارادے سے نہ آیا تھا۔ چناں چہ رام پور کی فوج سے اس نے کہا۔

"افسوس ہے کہ دشمن کے بجائے تم اپنے ہی بھائیوں سے لڑتے ہو"۔ [۱]

۲۹ر مئی کو رام پور کی فوجیں اسلام نگر میں بابو رام نرائن اور ان کے انقلابی ساتھیوں کو کچلنے پہنچیں اور ان کو پسپا کردیا۔

---

[۱] اخبار "الصنادید" جلد دوم

امروہہ

جنگِ آزادی کی انقلاب آفریں جھنکار سے امروہہ کے در و دیوار بھی گونجے ۔ چناں چہ جب ۱۲ رمئی کو میرٹھ اور دہلی کی خبریں پہنچیں تو ۱۸ کو درگاہ حضرت شاہ ولایت رح میں شہر کے معززاور سربرآوردہ لوگوں نے جلسہ کرکے انگریزی سلطنت کو ختم کرنے کے بارے میں مشورے کیے ۔ ۱۹ رمئی کو مراد آباد سے سید گلزار علی یہاں آئے جو وہاں مختاری کرتے تھے ، وجیہہ ، شکیل اور بہادر تھے ۔ اس رات کو بھی مشورے ہوتے رہے اگلے دن ۲۰ رمئی کو کئی ہزار انقلابیوں نے تھانہ اور تحصیل پر حملہ کیا اور نذرِ آتش کر دیا ، خزانہ لوٹ لیا گیا ۔ انگریز حکام نے جب فوج بھیجنا چاہی تو کوئی یہاں آنے پر تیار نہ تھا تب گورسہائے کو بھیجا گیا ۔ ۲۵ رمئی ۱۸۵۷ء کو مراد آباد کا جج ولسن بھی آیا ، انقلابیوں کو اندھا دھند سزائیں دیں سیکڑوں مکانات مسمار کر دیے لیکن جلد ہی دوسرے علاقوں میں جب بغاوت کے شعلے بلند ہوئے تو انگریز نینی تال بھاگ گئے اور اس طرح امروہہ بھی انگریزی استبداد کے پُرعذاب چنگل سے آزاد ہو گیا ۔

سید گلزار علی نے فوج بھرتی کی اور ضروری جنگی تیاریاں کیں ، مشاہیر نے بہادر شاہ کو عرضیاں بھیجیں اور وہاں سے جواب بھی آیا[1] ۔ انگریزوں کے "وفادار" بھی اپنی کارروائیوں میں مصروف تھے اور تمام اطلاعات ان کو دے رہے تھے ۔ ۱۹ رنومبر ۱۸۵۷ء کو رام پور کی فوجیں گلزار علی اور مارٹے خاں کو کچلنے آگئیں ۔ گلزار علی نے نواب

---

[1] یہاں کے دوسرے انقلابیوں میں سید شبیر علی ، شیخ افضل صدیقی ، مولوی سید سبحان علی اور شیخ بشارت علی خاں وغیرہ شامل تھے ۔ مولوی سید سبحان علی بہادر شاہ سے جا کر مل بھی چکے تھے ۔

[تاریخ امروہہ جلد اوّل / ۵۶ ، ۵۷ ، ودُرِ مقصود ۱۹۳۰ء]

بہادری سے مقابلہ کیا مگر پسپا ہوئے اور نواب نے یہاں قبضہ کر لیا۔ امروہہ کے عوام گور سہائے کے دشمن ہو گئے اور اس کو یہاں سے بھاگنا پڑا۔

اگلے سال ۲۱ اپریل ۱۸۵۸ء کو شہزادہ فیروز شاہ مراد آباد میں آیا تو امروہہ کی متعین فوج نجیب آباد کے انقلابیوں کے ہمراہ شہزادے سے جا ملی۔ ۲۵ اپریل ۱۸۵۸ء کو مراد آباد پر دوبارہ انگریزی تسلط قائم ہو گیا۔ انقلابیوں کو اندھا دھند پھانسیاں دی جانے لگیں سید گلزار علی ضلع بریلی کے جنگلوں میں روپوش ہو گئے اور ان کا کچھ پتہ نہ چلا۔

نواب مجوّ خاں مراد آباد کے نواب مجوّ خاں کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔[۱] ایک روایت عام طور پر مشہور ہے کہ نواب مجوّ خاں کو ہاتھی کے پاؤں سے باندھ کر شہر میں گھسیٹا گیا اور پھر پکتے ہوئے چونے میں ڈال دیا گیا۔ لیکن بعض لوگوں کا بیان ہے کہ ان کو گولی سے ہلاک کرنے کے بعد یہ "مہذب" برتاؤ ہوا۔ نواب موصوف اور ان کے دوسرے ساتھیوں کی قبریں محلہ گل شہید (مراد آباد) میں واقع ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی سو سالہ یادگار کے موقعے پر ۱۰ مئی ۱۹۵۷ء کو ان قبروں پر ایک میلہ سا لگ گیا تھا۔

بجنور میرٹھ کی خبریں پہنچنے پر انگریز افسروں نے خود ہی نواب محمود خاں کو انتظامات سونپ دیے، ہندو مسلم عوام نے نواب کا خیر مقدم کیا اور حکومت تسلیم کی ماڑے خاں سپہ سالار مقرر ہوا۔ نواب محمود نے امروہہ، مراد آباد وغیرہ میں بھی

---

۱ تاریخ امروہہ / ۷۸

فوج کے دستے روانہ کیے تاکہ تحریکِ آزادی کو تقویت پہنچے مگر یہاں انگریزوں کے معتمد وفادار سر سید اور رحمت خاں وغیرہ برابر تحریکِ آزادی کی پیٹ میں خنجر گھونپنے کی مذموم کوششوں میں مصروف تھے۔ ان کی انگریز حکام سے خفیہ خط وکتابت ہوتی تھی۔ ان لوگوں نے نواب محمود کے خلاف عوام کو بھڑکانا چاہا مگر ناکام ہوئے۔ ۱۵ اپریل ۱۸۵۸ء کو انگریزی فوجیں نجیب آباد کی طرف بڑھیں اور کئی تصادم ہوئے مگر انتشار کی بدولت انقلابیوں کو شکست ہوئی محمود خاں کو گرفتار کر لیا گیا، کالے پانی کی سزا ہوئی مگر میرٹھ جیل ہی میں انتقال ہو گیا۔

بدایوں

بدایوں بھی، روہیل کھنڈ کے دوسرے مقامات کے ساتھ اجنبی اقتدار سے آزاد ہو گیا۔ ۱۷ جون ۱۸۵۷ء کو خان بہادر خاں کی طرف سے عبدالرحمٰن کو ناظم اور جنرل نیاز محمد کو سپہ سالار فوج مقرر کیا گیا جب بخت خاں اور ان کے ساتھی لکھنؤ جاتے ہوئے بدایوں سے گذرے تو جہاد کا فتویٰ تقسیم کرایا جس سے قرب وجوار میں کافی جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ اپریل ۱۸۵۸ء میں ڈاکٹر وزیر خاں، مولانا فیض احمد اور شہزادہ فیروز شاہ وغیرہ پہنچے، ککرالہ کے مقام پر انگریزی فوج سے سخت مقابلہ ہوا۔ اور انقلابیوں کے بلند حوصلے نے دشمن کو پسپا کر دیا تھا کہ کرنل جونس مدد لے کر آ گیا، انقلابی درمیان میں آ گئے اور آخرکار قوم و وطن پر نثار ہو کر امر ہو گئے۔ انقلابی رہنما اس معرکے کے بعد بریلی چلے گئے جہاں ابھی تک خان بہادر خاں کی حکومت تھی اور تقریباً تمام رہنما یہیں جمع تھے۔

بریلی میں فساد کی کوشش

نومبر دسمبر ۱۸۵۷ء میں کیپٹن گوان کو اس کام پر معمور کیا گیا کہ وہ روہیل کھنڈ کے ہندوؤں کو خان بہادر کی حکومت سے بغاوت پر آمادہ کرے اور اس مقصد کے لیے پچاس ہزار روپیہ صرف کرے لیکن افسوس کہ انگریزوں کی یہ کوشش بھی ناکام ہوئی اور گوان نے ۲۴ نومبر ۱۸۵۷ء

کو لکھا کہ میں اپنی کوششوں میں بالکل ناکام ہوا ہوں کیوں کہ ٹھاکر یا تو صرف انگریزوں کے لیے
نیک خواہشات ظاہر کرتے ہیں اور یا شیخی مارتے ہیں جب کہ میرا خیال تھا کہ وہ گورنمنٹ کی
مدد کر سکیں گے [1]۔

---

1. [Foreign Secret Consultations No. 25.
Sen – 352

اودھ اور روہیل کھنڈ کی آخری جنگیں

(۱۸۵۸ء۔ ۵۹ء)

جذبۂ آزادی دہلی انگریزی شکنجے میں آچکا، لکھنؤ کے بہادر عوام پروانہ وار دین اور وطن پر نثار ہو گئے، ملک میں شکست اور مایوسی کی لہر دوڑ چکی، دشمنانِ وطن اپنی مسلح فوجوں، غدّارانِ وطن کی مذموم ریشہ دوانیوں، اور اپنی فطری مکاریوں کی بہ دولت ہر جگہ انقلابی عوام کو کچلنے اور تحریکِ آزادی کا گلا گھونٹنے میں کامیاب نظر آرہے ہیں۔ مگر انقلابی رہ نماؤں میں کم ہمتی اور احساسِ شکست کا شائبہ بھی نہیں ——! ۔ وہ اب بھی سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ وہ آزادیٔ وطن کی خاطر اپنا خون چھڑکنے کے لیے اب بھی اسی جوش و جذبے کے ساتھ تیار ہیں جیسے کہ پہلے تھے —— اس لیے نہیں، کہ ان مایوس کُن حالات میں وہ اپنی جیت کے آرزومند ہیں، بلکہ اس لیے اور صرف اس لیے کہ ہار اور جیت سے بے پروا ہو کر، دین و وطن کے لیے جنگ کرنا اور اسی راہ میں جانیں دے کر امر ہو جانا اپنا مقدس فرض سمجھتے ہیں۔

بہادر بینی مادھو بیسواڑہ راج پوت سردار بینی مادھو سنگھ شروع ہی سے بیگم اودھ کے ساتھ تھے۔ ۲۸ اپریل ۱۸۵۸ء کو ہوپ گرانٹ نے ان کے

قلعہ واقع شنکر پور حملہ کیا لیکن بینی کے دستوں اور فوج کو تباہ نہ کر سکا اور واپس آ گیا کمانڈر انچیف نے جب بینی مادھو کو یقین دلایا کہ اگر خود کو حوالے کر دے تو اس کے مطالبات اور جائداد کی واپسی پر غور کیا جائے گا تو محب وطن بینی مادھو نے صاف کہہ دیا کہ وہ قلعہ حوالہ کر سکتے ہیں جو اُن کی ملکیت ہے مگر اپنے آپ کو حوالے نہیں کر سکتے کیوں کہ ان کی ذات بادشاہ اودھ کی ملکیت ہے[1]۔ انھوں نے رات کے وقت شنکر پور چھوڑ دیا اور دونیا کھیڑے میں آ گئے، انگریزی افسر باوجود پوری کوشش کے ان کا کھوج نہ پا سکے۔ رسل نے لکھا ہے کہ ہمارے خصوصی محکمۂ جاسوسی کی اطلاع یہ تھی کہ وہ بہ یک وقت تمام مقامات پر موجود ہیں، انگریزی دستوں سے کئی تصادم ہوئے مگر بینی ہر مرتبہ نکل گئے۔

بریلی میں خوں ریز جنگ

نانا صاحب، بخت خاں، شہزادہ فیروز شاہ، ڈاکٹر وزیر خاں اور دوسرے انقلابی رہنما بریلی آ گئے تھے۔ شہزادہ فیروز تو بریلی میں رہا اور باقی رہنما مولانا احمد اللہ شاہؒ کی مدد کو پہنچے۔ وطن عزیز کا یہ تقدس مآب مولوی جس کے ایک اشارے پر ہزاروں محبان وطن قربان ہونے کو تیار تھے۔ —— اب شاہ جہاں پور میں تھا (اپریل ۱۸۵۸ء)۔ انگریزی فوجوں سے مقابلے ہوئے بجیوریہ گھاٹ پر انقلابیوں نے خون کے دریا بہا دیے، کالن کیمبل نے شہر کو آ کر گھیر لیا۔ چاروں طرف پہرے بٹھا دیے اور لطف یہ ہے کہ یہ انقلابی رہنما اسی طرف سے صاف بچ کر نکل گئے جدھر خود کمانڈر انچیف نگرانی کر رہا تھا —— چڑیاں اڑ گئیں تو انگریزی فوجیں بریلی کی جانب بڑھیں کیوں کہ نانا صاحب، مولانا احمد اللہ شاہؒ، بالا صاحب، بیگم

1. Forrest - III, P. 517
   Sen - 361

حضرت محل، راجہ تیجا سنگھ اور دوسرے انقلابی رہنما اب بریلی میں آزادی کا بگل بجا رہے تھے ان کی اسکیم یہ تھی کہ اب گوریلا جنگ کا طریقہ اختیار کیا جائے اور شہر خالی کر کے تمام روہیل کھنڈ میں پھیل جائیں تاکہ دشمنانِ وطن کو چین سے نہ بیٹھنے دیں۔ تمام تیاریاں مکمل ہو گئی تھیں مگر جب انگریزی فوجیں شہر کی طرف بڑھیں تو بہادر روہیلے مقابلے پر تیار ہو گئے، ان کے سینوں میں سرفروشی کی مچلتی ہوئی تمنائیں ان کو میدانِ جنگ میں لے آئیں، وہ دشمن کو اپنی تلواروں کا مزہ چکھائے بغیر شہر چھوڑنے پر تیار نہ تھے، مقابلہ برابر کا نہ تھا، فتح ناممکن تھی۔ مگر فتح و شکست کی پروا کسے تھی۔؟ انجام ظاہر تھا، لیکن اگر وہ شہیدانِ حریت خاموشی سے ہٹ جاتے تو شاید آنے والے دور کے مورخ لکھتے کہ محبان وطن نے دشمنوں کی زبردست فوجوں سے خوف زدہ ہو کر بغیر مقابلے کے غلامی کی لعنت قبول کر لی —— انھیں یہ گوارا نہ تھا۔

غازیوں کی جواں مردی

مضبوط، منظم اور نئے ہتھیاروں سے لیس تازہ دم انگریزی فوجیں کالن کیمبل کی رہنمائی میں بریلی کے قریب آ گئیں، خان بہادر خاں کے پاس بڑی توپیں بھی نہ تھیں، پھر بھی انھوں نے شہر سے چار میل دور آگے بڑھ کر نکٹیا ندی کے کنارے دشمن کا مقابلہ کیا، ان میں بہت سے مجاہدین جو جذبۂ شہادت سے سرشار تھے دین اور دیش کے لیے اپنے سروں سے کفن باندھ کر نکلے تھے، صافے اور پٹکے باندھے ہوئے یہ 'غازی' جو قرآن پاک کے الفاظ لکھی ہوئی انگوٹھیاں پہنے ہوئے تھے داہنی طرف سے "دین دین" کے نعرے لگا کر حملہ آور ہوئے، ان کی چمکیلی اور بلند تلواریں سورج کی روشنی میں بجلی کی طرح کوند رہی تھیں۔ رسل نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ وہ اگرچہ تعداد میں

بہت کم تھے مگر اُن کے دلیرانہ حملے نے گوروں کو بدحواس کردیا اور وہ گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ انگریزی فوج کے پہاڑی دستوں نے ان کی پیش قدمی روکنا چاہی مگر موت سے کھیلنے والے غازی آگے بڑھتے چلے گئے اور کچھ تو انگریزی فوج کے پیچھے تک پہنچ گئے۔ اُن میں ایک فرد بھی پیچھے نہیں ہٹا۔ وہ وہیں لڑتے ہوئے ختم ہو گئے مگر گوروں کو بھی نہایت بے دردی کے ساتھیوں کاٹ کر پھینک دیا جیسے گھاس کے پُولے درانتی سے کٹتے ہیں۔ اِن غازیوں میں صرف ایک زندہ بچا تھا چناں چہ کمانڈر انچیف اِدھر آیا تو وہ لاشوں کے درمیان سے اچانک اٹھ کر اس پر ٹوٹ پڑا۔ انگریزی فوج کے ایک سکھ نے بڑھ کر اس آخری غازی کا خاتمہ کر دیا۔

۵ رمئی کو شہزادہ فیروز شاہ میر گنج (ضلع بریلی) میں تھا لیکن اس نے بغیر مقابلے کے اپنا مقام چھوڑ دیا البتہ بریلی میں نکیٹا ندی پر خان بہادر خاں کے ساتھ موجود تھا۔ اور دست بہ دست دادِ شجاعت دے رہا تھا گھمسان کا رن پڑا۔ شہزادہ حیرت انگیز بہادری سے مصروفِ جنگ تھا، اکثر وہ سب کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا مگر غبار کم ہونے پر پھر اس کی تلوار دشمن کے سروں پر بہ دستور کوندتی نظر آتی، عین اسی وقت خان بہادر خاں کا ہاتھی بگڑ کر بھاگ کھڑا ہوا اور فوج میں افراتفری پھیلنے لگی لیکن شہزادہ آخر تک اپنے گھوڑے پر سوار، تیغ آزمائی کے جوہر دکھاتا رہا۔[۵]

آخری جنگ شہر کے متصل موجودہ چھاؤنی کے قریب ہوئی، کچھ نئی فوج بھرتی کر کے مدد کے لیے بھیجی گئی مگر یہ بُزدل میدان سے بھاگے اور تمام جنگ کو خراب کر دیا، نواب کی

۵؎ چشم دید بیان بہ حوالہ "العلم" اپریل تا جون ۱۹۵۷ء

فوجوں کو شکست ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ بلند شہر کے نواب ولی داد خاں نے بھی اس جنگ میں حصہ لیا۔ ایک انگریز افسر اپنی یادداشت میں لکھتا ہے۔

"خان بہادر خاں کی فوج میں 'غازیوں' کی ایک جماعت تھی، یہ شہادت کے نشے میں چور تھے، ان کی داڑھیاں سفید تھیں، انگلیوں میں چاندی کی انگوٹھیاں پہنے تھے جس کے نگینے پر "اللہ" کندہ تھا، ہر غازی کی کمر میں سبز پٹکا تھا، سفید پگڑیاں باندھے تھے جن پر سرخی کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے، ان کے ہاتھ میں تلوار اور پشت پر ڈھال تھی، دین کا نعرہ لگا کر ہمارے سامنے آئے، حملہ آور ہونے سے پہلے ان کا سوار جو ایک بیس سالہ نوجوان تھا اور جس کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا صف سے آگے بڑھ کر ہم سے یوں مخاطب ہوا ـــــ کیا تم میں کوئی حوصلہ مند ہے جو میرا مقابلہ کر سکے ؟ ۔ اگر ہے تو سامنے آئے ـــ!!

اس کی آواز پر ہماری صفوں میں سناٹا چھا گیا، کوئی آگے نہ بڑھا۔ ایک منٹ انتظار کے بعد اس نے پھر چیلنج دیا ـــــ "میں پانچ آدمیوں سے تنہا مقابلہ کر سکتا ہوں" ـــ لیکن پھر بھی کوئی حرکت نہیں ہوئی، آخر جھنجھلا کر تلوار نیام سے نکالی اور ہماری صفوں پر حملہ آور ہوا اور اس شدت سے حملہ کیا کہ چشم زدن میں اٹھارہ آدمیوں کو زخمی کر دیا اس کی بے نظیر شجاعت سے کمانڈنگ آفیسر اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے زندہ گرفتار کرنے کا حکم دیا لیکن نوجوان نے کہا کہ "تم زندہ شیر کو گرفتار نہیں کر سکتے" ۔ چناں چہ زخمی ہو جانے کے باوجود جب کہ اس کے ہر عضو سے خون کے فوارے نکل رہے تھے، اس نے دوبارہ اسی شدت سے حملہ کیا، جب کمانڈنگ آفیسر نے دیکھا کہ اگر اس کو قتل نہ کیا گیا تو شاید ساری کمپنی (سو آدمی)

صفایا کرنے گا تو مجبوراً اس نے حکم دیا کہ "سنگینوں سے خاتمہ کر دو"۔ اپنے مُن کر سپاہیوں نے اسے گھیر لیا اور اپنی سنگینیں بہ یک وقت اس کے سینے میں پیوست کر دیں لیکن جب تک اس کی روح جسم میں باقی رہی وہ برابر اپنی تلوار کے جوہر دکھاتا رہا اس کا ہاتھ اس وقت رکا جب روح پرواز کر گئی۔ اس کے تمام ساتھیوں نے اسی طرح بہادری کے جوہر دکھائے"۔

غازیوں کی اس جواں مردی کے بارے میں ساورکر کی رائے بھی سنیے۔

"دنیا کی تاریخ میں بے مثال بہادری اور شہادت کی مثالوں میں کوئی اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی"۔ (۱۵۴)

آخر کار ان جواں مردوں کی تلواریں ٹوٹ گئیں، توپیں خاموش ہو گئیں اور بہادر انقلابی اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور دلوں میں آزادیٔ وطن کا مقدس جذبہ لیے ہوئے شہید ہو گئے دوسرے دن ۷ مئی کو انقلابیوں نے شہر خالی کر دیا اور انگریز درندوں کی طرح بریلی پر ٹوٹ پڑے۔

مولانا احمد اللہؒ پھر شاہ جہاں پور میں

کالن کیمبل خوش تھا کہ اس نے بریلی فتح کر لیا اور انقلابی جاں بازوں کو شکست دی مگر خان بہادر خاں اور ان کے دوسرے ساتھی صاف بچ کر نکل گئے۔ انگریز افسروں ابھی اپنی اس فتح پر خوش ہونے بھی نہ پائے تھے کہ مولانا احمد اللہؒ نے پھر شاہ جہاں پور پر چڑھائی کا پلان بنا لیا اور وہ یہ تھا کہ انگریز جب شاہ جہاں پور میں تھوڑی سی فوج چھوڑ کر بریلی کی طرف بڑھیں تو انقلابی فوجیں شہر کو گھیر کر حملہ کر دیں اور انگریز فوج کو کچل کر بریلی کا بدلہ لیں۔ تمام حالات اسی طرح ظہور میں آئے اور مولانا احمد اللہ شاہؒ تیزی سے شاہ جہاں پور کی طرف بڑھے۔ آدھی رات کے بعد

اس انقلابی دل نے شاہ جہاں پور سے چار میل دور قیام کیا۔ اس دوران میں انگریزوں کے ہندوستانی جاسوسوں نے شاہ جہاں پور کے انگریز افسران کو اطلاع کر دی جنھوں نے فوراً اپنی حفاظت کا سامان کر لیا اور اس طرح سے اس قیام نے تمام پلان بے کار کر دیا۔ مولانا پھر بھی حملہ آور ہوئے اگرچہ اب دشمن ایک مضبوط پوزیشن میں تھا مگر اس کو پسپا کر کے انقلابیوں نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ مولانا احمد اللہؒ نے شہر کے دولت مندوں پر ٹیکس لگایا تاکہ ان کی فوجوں کو رسد مہیا ہو سکے انگریز مورخ میلیسن نے لکھا ہے کہ

"اور یہ کام درحقیقت یورپ کے جنگی رسم و رواج کے مطابق تھا"۔

اس دوران میں دشمن سے بے ترتیب لڑائیاں جاری رہیں، مولانا احمد اللہ نے آٹھ توپیں مہیا کیں اور انگریزوں پر گولہ باری شروع کر دی۔ سر کالن بریلی سے فوج لے کر آ گیا اور شہر کو گھیر لیا۔ اب مولانا کے بہ ظاہر بچنے کی کوئی راہ باقی نہ تھی۔ ۱۱ مئی کے بعد تین دن تک مسلسل جنگ ہوتی رہی۔ انگریز فوجیں مضبوط تھیں مگر اس کے باوجود انقلابیوں نے بہادری اور استقلال کے بے مثال جوہر دکھائے۔ ۱۵ مئی تک بیگم حضرت محل، شہزادہ فیروز شاہ، بابان صاحب (محمدی کا بادشاہ) نانا صاحب وغیرہ رہنماؤں نے اپنی تمام فوجیں یک جا کر دیں اور سب سے بڑے پُرجوش محب وطن، سب سے زیادہ ہر دل عزیز اور سب سے زیادہ بہادر احمد اللہؒ کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگا دی ——— اس طرح دن اور رات آزادیٔ وطن کے لیے جنگ کرتے ہوئے مولانا احمد اللہؒ انگریزی فوج کے اُس جال سے صاف بچ کر نکل گئے جو ان کے چاروں طرف بچھا دیا گیا تھا۔

احمد اللہ رح بادشاہ

سرکالن نے اس بار بھی ہر طرف سے گھیر رکھا تھا، فوجوں کو مختلف سمتوں سے بھیجا، اس کو یقین تھا کہ اب کی بار مولانا اور ان کے ساتھی بچ کر نہیں جا سکتے مگر یہ تمام تدبیریں دھری کی دھری رہ گئیں اب یہ جاں باز مولوی کمانڈر انچیف سرکالن کی حیرانی و پریشانی کا موجب بن کر اُس اُودھ میں داخل ہو رہا تھا جہاں سے سال بھر کی محنت کے بعد انگریزوں نے انقلابیوں کو دھکیلا کالن کیمبل نے اودھ فتح کیا تھا تو انقلابی فوجیں مولانا کی رہنمائی میں روہیل کھنڈ پر قابض ہو گئیں اور اب سر کالن جب روہیل کھنڈ کو فتح کرنے آیا تو مولانا پیچھے ہٹ کر پھر اودھ میں داخل ہو گئے تھے۔ قصبہ محمدی (لکھیم پور کھیری) میں مولانا احمد اللہ رح کی حکومت قایم ہو گئی۔ نانا صاحب دیوان بنائے گئے، جنرل بخت خاں وزیر دفاع اور مولانا سرفراز علی قاضی القضاۃ مقرر ہوئے، مولوی لیاقت علی مولانا فیض احمد، اور ڈاکٹر وزیر خاں، کونسل کے اراکین تھے۔ سکہ جاری ہوا:

"سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ"

حامی دین محمد، احمد اللہ بادشاہ"

شہزادہ فیروز سندیلے میں

شہزادہ فیروز شاہ یہاں سے سندیلے چلا گیا، اس کے یہاں سے جانے کی وجہ تحقیق نہ ہو سکی مگر قیاس ہے کہ وہ کسی اختلاف کی بہ دولت یہاں سے چلا گیا۔ بہر حال سندیلے میں شہزادہ فیروز نے سرکاری تھانے اور تحصیل پر حملہ کیا اور بانگر مئو صفی پور وغیرہ پر قبضہ کیا۔ کچھ عرصے بعد جب انگریزی فوجوں کے مقابلے میں شکست ہو گئی تو خیر آباد گیا وہاں کے ناظم ہر پرشاد اور مولوی محمد کو راجہ گلاب سنگھ کی مدد کے لیے

بھیجا اور خود فیروز آباد میں مقیم رہا، اسی طرح مختلف مقامات پر انگریزی فوجوں سے جنگ کرتا ہوا محمود آباد آیا۔ ایک طرف تو اس سرفروش شہزادے کا یہ حال کہ دیوانہ وار ملک میں پھر رہا ہے اور دوسری طرف اس کے ہم وطن بزدلوں اور کمینوں کی طرح سے دشمنانِ وطن سے ساز باز کر رہے تھے، فطری طور پر شہزادے کو غصہ اور ملال ہوا، اُس نے باغی افسروں کو جمع کر کے کہا کہ ـــــ "میں نے جان پر کھیلنے کا تہیہ کیا ہے، تم میں جو شخص سرفروشی کا عہد کرے، وہ میرے ساتھ رہے ورنہ جہاں چاہے چلا جائے" ـــــ کہا جاتا ہے کہ جذبۂ حبِّ وطن سے سرشار فیروز اُس دن فاقے سے تھا[۱]۔ مگر تحفظ دین اور آزادئ وطن کا مبارک جذبہ ایسا نہ تھا جو موت وحیات سے بے نیاز شہزادے کو چین سے بیٹھنے دیتا آخر کار چار سو سوار اور دیگر ہمراہیوں (کل ایک ہزار) کو لے کر باڑی روانہ ہوا۔ مشہور ہے کہ شہزادہ بعد میں آکر مولانا کے ساتھ پھر کچھ عرصے کے لیے شامل ہو گیا تھا۔

راجہ پوائن کی غداری

قصبہ محمدی میں مولانا احمد اللہ کی حکومت قائم ہوئے چند دن ہی گذرے تھے کہ کالن کیمپل فوج لے کر چڑھ آیا اور آپس کے اختلافات اور ہتھیاروں کی کمی نے انقلابیوں کو شکست سے دوچار کیا۔ مولانا احمد اللہ اب بھی انگریزوں کے ہاتھ نہ آسکے، سر کالن کی تلوار نے بغاوت تو کچل دی مگر اس باغی مولوی کا سر کاٹنے میں ناکام رہی۔ لہٰذا اس کے لیے دوسری ترکیبیں کی گئیں۔ جب مولانا احمد اللہ اودھ میں دشمن کا مقابلہ کر رہے تھے تو انھوں نے پوائن کے راجہ[۲] کو

---

[۱] "قیصر التواریخ" / ۲۶۶

[۲] یہ راجہ دراصل انگریزوں سے ساز باز کر چکا تھا اور انعام واکرام کے لالچ سے اس کو مولانا کو ختم

جنگ سے بہ مہر پیام بھیجا اور مدد کی درخواست کی ۔ یہ بزدل راجہ جو لڑائی اور میدانِ جنگ کے نام سے بھی لرزتا تھا ۔ بہ ظاہر مدد پر تیار ہو گیا اور اس نے جواب میں لکھا کہ وہ مولانا سے خود ملنا چاہتا ہے ۔ مولانا اُس سے ملنے کے لیے روانہ ہو گئے ۔ جب قلعے کے قریب پہنچے تو اُن کو حیرت ہوئی کہ دروازہ بند ہے اور اس پر مسلح پہرہ ہے!

مولانا کی شہادت

راجہ جگناتھ سنگھ اپنے بھائی کے ہمراہ پہرے والوں کے درمیان دروازے کے اوپر دیوار پر موجود تھا ۔ مولانا نے امداد کے لیے گفتگو کرنا چاہی مگر جب انھوں نے دیکھا کہ وہ سب بہ خوشی دروازہ کھولنے پر تیار نہیں تو اپنے مہاوت کو حکم دیا کہ دروازہ توڑ دے ۔ ہاتھی کی ٹکروں سے دروازہ کھلنے ہی کو تھا کہ راجہ کے بھائی بلدیو سنگھ نے گولی ماری اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا مجاہد اعظم شہید ہو گیا ۔ جس نے کالن کیمپل کو سر میدان للکار کر شکستیں دیں ، جس نے ہنستے دشمن پر ہاتھ نہیں اٹھایا ، جس کا دامن مظلوموں کے خون سے رنگین نہیں ہوا ، جس نے آزادئ وطن کے لیے جہاد کو فرض اولین سمجھ کر آخر سانس تک جنگ کی ۔ اُس کو مادرِ وطن کے ہی ایک ننگِ قوم فرزند نے ختم کر دیا[۱] ۔ (۵ ! جون ۱۸۵۸ء)

...کرنے کے لیے تیار کیا گیا تھا چناں چہ شاہ جہاں پور کے مجسٹریٹ جی پی منی نے جو خط ریل کھنڈ کے کمشنر کو لکھا اس میں صاف تحریر ہے کہ وہ راجہ کو اس کام کے لیے تیار کر چکا تھا ۔ یہ خط نیشنل آرکائیوز نئی دہلی کے ریکارڈ میں ہے اور راقم الحروف کی نظروں سے بھی گذرا ہے ۔ آخری صفحات پر بہ طور ضمیمہ اس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے ۔

[۱] بعض جگہ تاریخ شہادت ۵ر جون ۱۸۵۸ء بتائی گئی ہے مگر مجسٹریٹ شاہ جہاں پور کے خط سے

راجہ اور اس کا بھائی فوراً اتر کر دروازے سے باہر آئے، مولانا دم توڑ
چکے تھے، ان کے خون آلود سر کو تن سے جدا کیا اور قریب کے ایک انگریزی کیمپ میں جو
سے تیرہ میل دور شاہ جہاں پور میں تھا، لے گئے۔ انگریز افسر رات کا کھانا کھا
رہے تھے راجا پوائن نے اندر داخل ہو کر تحفہ پیش کیا اور خون میں لتھڑا ہوا مقدس سر
سے اب تک خون ٹپک رہا تھا زمین پر لڑھکا دیا۔ اگلے دن مولانا کا جسم عام پبلک
سامنے جلا کر راکھ دریا میں بہا دی گئی اور سر کو توالی پر لٹکایا گیا راجہ کی تعریف کرتے
شاہ جہاں پور کا مجسٹریٹ روہیل کھنڈ کے کمشنر کو لکھتا ہے۔

"حکومت نے اس باغی مولوی کی زندہ گرفتاری کے لیے پچاس ہزار روپے
کا جو انعام مقرر کیا تھا وہ پوری رقم ان حالات میں راجہ کو ملنا چاہیے جس کی
بدولت انتہائی مستقل مزاج اور سب سے زیادہ با اثر باغی لیڈر سے نجات
ملی"۔

یہ خبر جب انگلینڈ پہنچی تو انگریزوں کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا کہ ان کا سب سے بڑا
ختم ہو گیا تھا۔ ہومز خوشی سے دیوانہ ہو کر کہتا ہے۔

"شمالی ہند میں برطانیہ کا سب سے زیادہ خطرناک دشمن ختم ہو گیا" (۵۳۹)
میلسن ... بھی اس اقرار پر مجبور رہے کہ:

"مولوی کی زندگی سے عیاں ہوتا ہے کہ اسلام کا سچا پرستار مادر وطن کے لیے

ظاہر ہوتا ہے کہ ۵ جون کے بعد شہادت ہوئی لہذا ۱۵ جون کا بیان زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ مو
مزار احمد پور محلہ جہان آباد (شاہ جہاں پور) میں دفن ہے۔

اپنی زندگی قربان کرنا فخر سمجھے گا۔"

[...]لیسن کی رائے ہے کہ:

"مولوی بڑا عجیب انسان تھا... فوجی لیڈر کی حیثیت سے اس کی قابلیت کے بہت سے ثبوت ملے..... کوئی اور شخص یہ ناز نہیں کر سکتا کہ اس نے سر کالن کیمپبل کو دو مرتبہ سر میدان شکست دی ہے..... اگر ایک انسان کو جس کے وطن کی آزادی بے انصافی سے چھین لی گئی ہو اور جو اسے پھر آزاد کرانے کی کوشش کرے اور اس کے لیے لڑے، محبِ وطن کہا جا سکتا ہے تو بے شک مولوی ایک سچا محبِ وطن تھا اس نے کسی بے کس کی موت سے اپنی تلوار کو کلنک نہیں لگایا نہتے اور بے قصوروں پر ہاتھ نہیں اٹھایا اس نے مردانہ وار ان کے ساتھ اور ڈٹ کر کھلے میدان میں اُن غیر ملکیوں کا مقابلہ کیا جنھوں نے اس کا ملک چھین لیا تھا ہر ملک کے بہادر اور سچے لوگوں کو مولوی کو عزت سے یاد کرنا چاہیئے۔" [۱]

شہادت کے بعد

مولانا احمد اللہ شاہؒ ——— جن پر آنے والی نسلیں بھی ہمیشہ فخر کریں گی ——— دبلے پتلے، لمبے اور گٹھیلے جسم کے انسان [تھ]ے، ان کی آنکھیں بڑی اور گہری تھیں، بھنویں گھنی اور آگے کو نکلی ہوئی تھیں، مڑی ہوئی عقابی ناک تھی، ان کی شہادت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح تمام اودھ میں پھیل گئی انقلابی عوام جوش اور غصے سے دیوانے ہو گئے، ان کے سینوں میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی اور انگریز فوجوں کے ہاتھوں شکستیں اور مظالم اٹھا چکنے کے باوجود اپنے مقدس رہنما کے

---

[۱] بلد چہارم / ۳۸۱

خون کا بدلہ لینے کے لیے آگ اور خون کے دریا میں دیوانہ وار کود پڑے تمام
پھر کامیابی یا ناکامی، امید یا ناامیدی، موت یا زندگی سے بے پرواہ ہو کر دشمن
للکار رہا تھا —— نظام علی خاں پیلی بھیت کی طرف بڑھے، خان بہادر خاں
چار ہزار جاں بازوں کو لے کر میدان میں آگئے، فرخ آباد میں بھی انقلابی د
بڑھنے لگے، نانا صاحب، بالا صاحب اور علی خاں میواتی وغیرہ نے روہیل کھ
اور اودھ میں تین ہزار آدمیوں کے ساتھ زبردست جدوجہد شروع کر دی۔ نو
فرخ آباد اور ولایت شاہ بھی اپنی فوجوں کے ساتھ بڑھ رہے تھے۔ پوائن کا راجہ
ان فوجوں کو بڑھتا دیکھ کر کانپ اٹھا، انگریزوں نے اس کی حفاظت کے لیے د
روانہ کیے۔ انقلابی فوجیں بھی جوش انتقام سے پاگل ہو رہی تھیں۔ گھاگرا ند
کے کنارے چوک گھاٹ پر بیگم حضرت محل اور ممو خاں کے فوجی ہیڈ کوارٹر
ان کے پیچھے راجہ رام بخش، بھونا تھ سنگھ، کنڈا سنگھ، گلاب سنگھ، بھوپال سنگ
ہنومنت سنگھ وغیرہ چھوٹے چھوٹے زمیں دار اپنی چھوٹی بڑی فوجیں لیے ہوئے جنگ
کر رہے تھے۔ بہادر شہزادہ فیروز، جو اس سے پہلے ریاست دھار میں مصروف جنگ
تھا، اب یہیں آگیا تھا، راجہ بینی مادھو اپنے قلعے سے نکل آیا اور غیر معمولی عزم و ہ
کے ساتھ کان پور کی راہ سے لکھنؤ کی طرف بڑھ رہا تھا گونڈہ کے راجہ نے راج
فوج منظم کر کے گھاگرا ندی کے بائیں کنارے انگریزی دستوں کا بہادری سے مقا
کیا، بینی مادھو سنگھ نے گوریلا طریقے سے جنگ شروع کر دی تھی ان کے اسی ہزار سا
اودھ کے چپے چپے پر پھیل گئے اور انگریزی دستوں پر اچانک اور حیران کن حملے
متواتر حملوں سے انگریزوں کو حیران و پریشان کر دیا۔ محمد حسن نے فیض آباد

قرب وجوار میں کئی بار جنگ کی۔ لال مادھو سنگھ نے اپنے قلعے امیٹھی پر دفاع کیا۔ ہری چند نے چھ ہزار آدمی لے کر سندیلے سے دس میل شمال میں گومتی پار کیا اور دوسرے زمین داروں کو لے کر کئی بار برطانوی دستوں کا مقابلہ کیا، ہر بار شکست ہوئی مگر انگریزوں کو بھی سخت نقصان پہنچایا۔ جن جاگیرداروں (مثلاً سراؤں کا رام پر شاد) نے انگریزوں کی حمایت کی ان کو بھی انقلابیوں نے چڑھائی کر کے اس "وفاداری" کا انعام دیا۔ راجہ مان سنگھ (شاہ گنج) کو جو پہلے انقلابیوں کے ساتھ تھا مگر بعد میں خود کو انگریزوں کے حوالے کر چکا تھا حملہ کر کے نقصان پہنچایا۔ پیہم شکستوں اور ناکامیوں کے باوجود بھی ان کے جذبات اٹل اور ہمتیں ہمیشہ کی طرح بلند تھیں[1]۔

جوشِ انتقام انگریزی فوجیں (۱۳ جون کو ـ ؟) ہوپ گرانٹ کی رہ نمائی میں بڑھیں اور انقلابیوں پر اچانک ٹوٹ پڑیں جو لکھنؤ کے قریب نواب گنج میں جمع ہوئے تھے، اس اچانک اور زبردست حملے سے بے خبر انقلابیوں کا منتشر ہو جانا یقینی تھا ـــــ مگر نہیں ـــــ مولانا احمد اللہؒ کے انتقام کا جوش ـــــ جن کو شہادت پائے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے ـــــ ایسا نہ تھا کہ انقلابی پیچھے ہٹ جاتے، چناں چہ ان بہادروں نے ایک بار پھر انگریزی فوجوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلایا، بہادری اور استقلال کا ایسا مظاہرہ کیا جو اب تک کم دیکھنے میں آیا ہے ـ خود ہوپ گرانٹ کو اقرار ہے کہ

"اب بھی ان کے حملے طاقت سے بھر پور تھے ...... اور ان کو دھکیلنے کے لیے

---

1. Majumdar - 80, 81

ہمیں بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ زمیں داروں کی ایک بڑی جماعت نے دو توپوں کے ساتھ ہمارے پیچھے سے حملہ کیا۔ میں نے ہندوستان میں بہت سی لڑائیاں دیکھی ہیں اور بہت سے بہادر جاں بازوں کو بھی دیکھا ہے جو "فتح یا موت" کا عزم کر کے لڑتے ہیں مگر میں نے اتنا شان دار طرزِ عمل آج تک کبھی نہیں دیکھا جیسا کہ ان زمین داروں کا تھا......... دو توپوں کے آس پاس ایک سو پچیس لاشیں ملیں، تین گھنٹے تک جنگ کے بعد ہماری فتح ہوئی۔"[1]

یہ انقلابی بوائن کی طرف بڑھ رہے تھے، لکھنؤ اور سلطان پور میں جنگ ہوئی، انھوں نے انگریزی فوجوں کے راستے روک دیے اور انگریزی کیمپوں کو تباہ و برباد کیا، آخر کار اکتوبر ۱۸۵۸ء میں انگریزی فوجیں چاروں طرف سے گھیرتی ہوئی بڑھیں اور ان کو نیپال کی طرف دھکیلنے لگیں، مگر زندگی اور موت سے بے نیاز انقلابی آخر دم تک جنگ کرتے رہے۔ نومبر ۱۸۵۸ء میں وکٹوریہ کا اعلانِ معافی شایع ہوا، انقلابی عوام انگریزی اعلانات اور وعدوں کی حقیقت اچھی طرح سمجھ چکے تھے لہٰذا جدّوجہد جاری رکھی۔ ۲۴ نومبر کو بینی مادھو سنگھ سے بھی تصادم ہوا ان کا تیزی سے پیچھا کیا گیا مگر وہ گومتی اور گھاگرا پار کر کے اودھ میں چلے گئے اور اپنے وطن بیسواڑہ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ لکھنؤ کی ۴ دسمبر کی رپورٹ یہ تھی کہ ان کی فوج منتشر کر دی گئی لیکن پھر بھی پانچ ہزار آدمی ان کے ساتھ تھے اور چھوٹی چھوٹی پارٹیوں میں تقسیم تھے۔ چند دن بعد اطلاع ملی کہ بینی مادھو بہرام گھاٹ کے پاس متھولی میں موجود ہیں مگر کمانڈر پوری کوشش کے باوجود نہ تو گرفتار ہی کر سکا اور نہ شمال کی طرف سے جانے سے روک سکا

---

1. ["Incidents of the Sepoy War" — 292
   Savarkar — 511

بیگم اودھ کا اعلان

وکٹوریہ کے جواب میں بیگم حضرت محل نے ایک اعلان جاری کیا اور تفصیلی طور پر انگریزی حکومت کی فریب کاری کا پردہ چاک کر کے اعلان کی دھجیاں اڑائیں۔ ان کے اعلان میں کہا گیا تھا کہ ـــــ "کسی کو وکٹوریہ کے اعلان سے دھوکے میں نہیں آنا چاہیئے"

یہ بہادر بیگم اب تک اپنی تلوار بے نیام کیے ہوئے تھی، گھوڑے پر سوار ہو کر میدان جنگ میں نظر آتی، فوجوں کی کمان کرتی ہوئی قربانی اور ایثار کے میدان میں کود پڑتی تھی، شنکر پور دھوبنا کھیڑہ، رائے بریلی، سیتاپور وغیرہ میں برابر جنگ کرتی رہی، یہاں تک کہ وہ ہر طرف سے پسپا ہو کر نیپال جانے پر مجبور کر دی گئی۔ مارش مین لکھتا ہے

"اب اس کا تعاقب ایک مقام سے دوسرے مقام پر ہونے لگا یہاں تک کہ وہ راپتی پہنچ گئی اور باوجود ہر طرف سے گھر جانے کے دریا پار نکل گئی اس کے ساتھ ہی باقی سرغنہ اور اس کے ہمراہی بھی نکل گئے"۔ (۵۱۸)

انقلابی رہنماؤں کا نیپال اور دوسرے مقامات پر کیا انجام ہوا، یہ داستان آئندہ صفحات میں ہماری نظر سے گذرے گی۔ لیکن جس بہادری، استقلال اور عزم و ارادے کے ساتھ اودھ اور روہیل کھنڈ نے طویل عرصے تک جنگ کر کے آزادیٔ وطن کی راہ میں قربانی دی کوئی دوسرا علاقہ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ چناں چہ میکلائڈ اِنس اس اعتراف پر مجبور ہے کہ

"کم از کم اہل اودھ کی جد و جہد کو تو جنگ آزادی کہنا پڑے گا"[1]

---

1. Savarkar — 357.

صوبہ بہار

رانا کنور سنگھ، امر سنگھ اور مولانا پیر علی

خفیہ تیاریاں

بہار کا علاقہ جنگ پلاسی سے پہلے سراج الدولہ کی حکومت میں شامل تھا اور اس کے بعد کمپنی کی حرص وہوس کا شکار بنا رہا چناں چہ یہاں بھی عرصے سے بغاوت کی خفیہ تیاریاں ہورہی تھیں، تحریک ولی اللہی کے مجاہدین خاص طور پر مصروف کار تھے، مولانا پیر علی، مولانا یحییٰ علی اور دوسرے کارکن مختلف علاقوں میں دورے کرتے، لوگوں میں انقلابی جذبات پیدا کرتے اور فوجوں سے خط وکتابت کر رہے تھے۔ ۱۸۴۶ء میں پٹنے کے ایک شخص خواجہ حسین علی خاں پر بغاوت کا الزام لگایا گیا۔[۱] پتہ چلا کہ وہ داناپور کی فوج کو بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا (تفصیلات پہلے گذر چکی ہیں) مولوی احمد اللہ وغیرہ نے ۱۸۵۲ء سے ہی بغاوت کو منظم کرنا شروع کر دیا تھا۔ ۹ راگست ۱۸۵۲ء کو پٹنے کے مجسٹریٹ نے اپنی رپورٹ میں

---

[۱] "تاریخ بہار"، از شاد / ۱۵۹

لکھا تھا کہ یہاں باغی گروہ روز بروز ترقی پر ہے اور شہر کے مقتدر باشندے کھلم کھلا بغاوت کا پرچار کرتے ہیں پولس بھی ان سے ملی ہوئی ہے۔[1] پٹنے کے کمشنر ٹیلر نے دو تین سال قبل پہلی بار جذبۂ بغاوت کا اظہار ہونے پر گورنمنٹ کو رپورٹ کی تھی۔ خفیہ کارکن سیکڑوں کی تعداد میں چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ پولس اور فوج کے ملازمین بھی شریک کار تھے، بڑے سوداگر اور زمیں دار بھی شامل تھے۔ پٹنے کے پٹرول داروغہ مہدی علی کے مکان پر راتوں کو خفیہ جلسے ہوتے تھے اور دہلی و لکھنؤ کی انقلابی جماعتوں اور دانا پور کے دیسی فوجیوں سے پوشیدہ خط و کتابت بھی ہو رہی تھی۔ پٹنہ اس تحریک کا مرکز تھا جہاں پیر علی جیسا عالم و فاضل شخص بہ ظاہر کتابیں بیچنے کا کام کر رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ لکھنؤ سے کسی خاص مقصد کے لیے پٹنہ آئے تھے۔ "تاریخ بہار" کا مصنف لکھتا ہے۔

> "بعض کا بیان ہے کہ پیر علی کتاب فروش فوج کی بغاوت کا محرک تھا اور بعض کنور سنگھ زمیں دار جگدیش پور کو سلسلہ جنباں سمجھتے ہیں"۔[2]

اودھ کے الحاق کا یہ اثر ہوا کہ بہار میں باغیانہ سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں، ادھر دانا پور کی سپاہ میں انقلاب کی لہر دوڑ چکی تھی، میرٹھ سے بغاوت کی خبریں آئیں تو بے چینی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ لکھنؤ وغیرہ کے بہت سے لوگ خفیہ طور پر برابر کام کر رہے تھے اور عوام انگریزوں سے اس قدر متنفر ہو چکے تھے کہ جب حکومت نے دو ہزار سکھ پٹنے بھیجے تو ان کو ہر جگہ ملامت کی گئی، گاؤں والے ان سے پوچھتے تھے کہ ——

1. Datta - 91

۲۔ تاریخ بہار / ۱۶۸

"تم سکھ ہو یا فرنگی ہو گئے ؟" جب وہ پٹنے میں داخل ہوئے تو لوگوں کا جوش وغصہ اور بھی زیادہ ہو گیا، حتیٰ کہ گردواروں کے پجاریوں نے ان کو وہاں داخلے کی اجازت نہ دی۔ پٹنے کا کمشنر ولیم ٹیلر لکھتا ہے۔

"جیسے ہی سکھ داخل ہوئے ایک جنگی فقیر اُن کی طرف جھپٹا، ان کو خوف ناک انداز میں دھمکی کا اشارہ کیا اور غدار کہہ کر گالیاں دیں"۔ [۱]

اسی طرح جب گیا میں سکھ دستے بھیجے گئے تو عوام بے حد مشتعل ہوئے، سکھوں کو عیسائی کہا اور ان کے ساتھ کھانے پینے سے انکار کر دیا، جون کے پہلے ہفتے میں دانا پور کی سپاہ نے بذریعہ خط پٹنہ پولس کو اطلاع دی کہ ہم پٹنے پر حملہ کریں گے تیار رہو تاکہ خزانہ ہاتھ سے نہ نکل جائے، یہ خط حکام کے ہاتھ لگ گیا اور انھوں نے ضروری انتظامات شروع کر دیے۔

رانا کنور سنگھ

جگدیش پور کے جاگیردار کنور سنگھ کو بھی انگریز اب مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے جن پر آج تک حکومت بڑا بھروسا رکھتی تھی رانا کنور سنگھ ضلع شاہ آباد کے جاگیردار اور معزز راجپوت گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ان کے والد صاحبزادہ سنگھ نے ریاست کا بڑا ($\frac{۳}{۴}$) حصہ ان کو دیا اور باقی حصہ تین بھائیوں دیال سنگھ، راج پتی سنگھ اور رام سنگھ میں تقسیم کیا تھا، کنور سنگھ سب سے بڑے تھے، ان کے صرف ایک لڑکا دل بھنجن سنگھ تھا جس کا بیٹا بیر بھنجن سنگھ اپنے بوڑھے دادا کے ہمراہ اکثر موقعوں پر موجود رہا اور بعد میں اس کا انتقال ہوا

۱. [Patna Cricis
Savarkar - 317

ان کی مہر میں "بابو کنور سنگھ بہادر" اردو رسم الخط میں کندہ نظر آتا ہے۔[1] بغاوت شروع ہونے کے وقت کنور سنگھ اسّی سال کے تھے، راجپوتی شان وشوکت اُن میں پوری طرح جلوہ گر تھی۔

بغاوت سے پہلے وہ انگریز افسروں اور خصوصاً کمشنر ٹیلر سے قریبی اور دوستانہ تعلقات رکھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ حالات کے تحت ان کی دوستی انگریز افسروں کو سرد پڑتی دکھائی دینے لگی کیوں کہ ان کی ریاست کے ساتھ بھی غیر منصفانہ برتاؤ کیا گیا تھا ولیم ٹیلر نے گورنر بنگال (فریڈرک ہیلی ڈے) کو احتجاجی خط بھی لکھا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

وارث علی گرفتار

بغاوت کی خفیہ سرگرمیاں جاری تھیں اور حکومت اس کا سراغ پانے کی فکر میں تھی کہ ترہٹ پولس کے جمع دار وارث علی (ساکن دہلی) نے چھٹی کی درخواست دی، انگریز افسر کو کچھ شبہ سا ہوا اور ۲۳ر جون ۵۷ء کو اسے گرفتار کر لیا گیا جب کہ وہ گیا کے خفیہ لیڈر مولوی علی کریم کو خط لکھ رہا تھا۔ تلاشی لینے پر اس کے گھر سے خطوں کا ایک بنڈل برآمد ہوا جس سے باغیانہ سازش کا سراغ لگا۔ لیکن خطوط اشاروں میں لکھے گئے تھے۔ مجسٹریٹ نے اس کو میجر ہومز کے پاس سیگولی بھیج دیا۔ ہومز نے جنرل لائڈ کے پاس داناپور بھیجا اور اس نے ولیم ٹیلر کمشنر پٹنہ کے سپرد کر دیا، کوئی گواہ یا ثبوت مہیا نہ کیا جا سکا اور خود وارث علی نے ان خطوں کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی۔[2] ۶ر جولائی کو پھانسی دی گئی تو

1. Datta _ 50

2. Fast India Copy of letters....

وارث علی نے کہا۔

"کوئی ایسا ہے جو ہمارے مارے جانے کا حال شاہِ دہلی سے بیان کرے؟"[1]

اس کے بعد پٹنے کے ایک معزز رئیس لطف علی خاں کو گرفتار کیا گیا اور باغیانہ الزامات کی بنا پر مقدمہ چلایا گیا۔

مولوی علی کریم

وارث علی کی گرفتاری سے خفیہ تحریک کے ایک اور زبردست لیڈر مولوی علی کریم[2] زمیں دار موضع ڈومری کا سراغ لگا جو گیا میں مقیم تھے۔ جب ان کی گرفتاری کے لیے مجسٹریٹ جیمس لاؤس چند سپاہیوں کو لے کر پہنچا تو وہ ہاتھی پر بیٹھ کر فرار ہو گئے۔ لاؤس نے یکّہ میں بیٹھ کر پیچھا شروع کیا اور ایک پُرجوش دوڑ شروع ہو گئی۔ مولوی علی کریم نے انگریز افسر کو قریب آتا دیکھ کر اپنا ہاتھی سڑک سے کھیتوں میں موڑ لیا۔ یکّہ کھیتوں میں نہ جا سکتا تھا لہٰذا بے چارہ لاؤس نیچے اتر کر پیدل ہاتھی کے پیچھے بھاگا۔ آخر کار جب تھک کر چُور ہو گیا تو تھکن اور مایوسی سے جھنجھلا کر پیچھا کرنا چھوڑ دیا اور اپنے سپاہیوں کو پانچ ہزار روپے کا لالچ دے کر پیچھا کرنے کو کہا

---

[1] تاریخ بہار/ ۱۰۲

[2] مولوی صاحب موصوف نے تحریک میں نمایاں رول ادا کیا، بہار اور دوسری جگہوں پر برابر مصروف رہے، کچھ عرصے وہ کنور سنگھ کے پاس ٹھہرے تھے امر سنگھ سے برابر خط و کتابت کرتے رہے ایک معزز اور شریف گھرانے کے فرد تھے۔ والد کا نام مولوی محمد علی تھا جو صوفی منش انسان تھے اور کلکتے میں وکالت کرتے تھے۔ علی کریم عالم و فاضل تھے، فارسی، عربی کے علاوہ سنسکرت اور نجوم بھی جانتے تھے، انقلابیوں نے ان کو اپنا مشیر قانونی بنایا تھا اور ۲۳ جولائی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو منظم کرنے میں بھی ان کا ہاتھ تھا۔ اعظم گڑھ، گورکھپور وغیرہ میں بھی سرگرم رہے (د ت/ ۱۰۳)

یہ سپاہی بھی انقلابیوں کے ہم درد تھے چناں چہ اگلے دن سنجیدہ صورت بنا کر لوٹ آئے گیا کے عوام نے پیچھا کرتے وقت جیمس لاؤس کو غلط راہ بتا بتا کر خوب پریشان کیا بلکہ آخر میں اس کا ایک ٹٹو بھی غائب کر دیا۔ تاریخ بہار میں اقرار کیا گیا ہے کہ:

"ولیم ٹیلر صاحب کو اس وقت بیشتر اہل شہر پر یقین بغاوت ہو گیا تھا اور شک نہیں کہ اکثر فتنہ پردازوں کے دلوں میں تمرّد اور شرارت تھی"۔

پٹنہ میں بغاوت

اسی زمانے میں کمشنر ٹیلر نے بہت سے معزز اہل شہر کو چالاکی سے مشورے کے بہانے طلب کیا اور اس طرح دھوکا دے کر شہر کے تین علما یعنی مولوی الٰہی بخش، مولوی واعظ الحق اور شاہ احمد حسین کو نظر بند کر لیا (۲۰ جون) اہل شہر سے ہتھیار چھین لیے گئے اور رات کے نو بجے کے بعد ہر شخص کو گھر سے نکلنے کی ممانعت کر دی گئی۔ اب انقلابیوں نے خفیہ پلان بنا کر اچانک بغاوت کا فیصلہ کر لیا اور ۳ جولائی ۱۸۵۷ء کو رات کے آٹھ بجے مولانا پیر علی کی رہ نمائی میں "دین بولو دین" کے نعرے لگاتے ہوئے ایک گلی سے جو "رستم علی کی گلی" کے نام سے مشہور تھی، نکل آئے، ان کے ہاتھوں میں مختلف رنگ کے جھنڈے تھے، آگے ڈنکا بجتا ہوا چل رہا تھا، وہ ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں مشعلیں لیے مختلف ہتھیاروں مثلاً لاٹھی، بلّم، برچھی وغیرہ سے مسلح تھے۔ یہ لوگ پہلے رومن کیتھولک گرجا پر حملہ آور ہوئے جس کا پادری اکثر اسلام اور ہندو دھرم پر طعن زنی کیا کرتا تھا یہاں سے وہ چوک کی طرف آ رہے تھے کہ پولس پہنچ گئی، اسی دوران میں افیون گودام سے ڈاکٹر لائل نکل آیا مگر مولانا پیر علی کے پستول نے اس کا کام تمام کر دیا، باغیوں میں بھی ایک قتل اور کچھ زخمی ہوئے، مولانا پیر علی رائی پور گاؤں سے ۵ جولائی کی شام کو

زخمی ہو کر گرفتار ہوئے۔

سازش کا انکشاف

تقریباً پینتالیس آدمی مختلف جگہوں سے گرفتار کیے گئے، جہان آباد کے تھانے سے بھی کچھ پکڑے گئے اور اُن کے بیانات سے اُس سازش کا انکشاف ہوا جو بغاوت کے لیے کی گئی تھی، ایک گواہ نے بتایا کہ اس کو بُدھوا اور مندولال نامی آدمیوں نے نقارہ بجانے پر مقرر کیا تھا اور کہا تھا کہ جب بندوق کی آواز آئے تو پیر علی کی دوکان پر آجانا، اس نے رجب علی اور گھسیٹا کو سازش کے خاص آدمی قرار دیا۔ گھسیٹا لطف علی خاں رئیس پٹنہ کا جمع دار تھا، اس کے گھر کی تلاشی پر بھی سازش کا مزید سراغ لگا۔ مولانا پیر علی کے ملازم توقیر نے بتایا کہ چند لوگ ان کے پاس مشورہ کرنے آتے رہتے تھے۔ ایک شخص امام الدین محرم شیخ نے جو موقعے پر زخمی ہو کر گرفتار ہوا تھا بتایا کہ وہ اُن چھ سو آدمیوں میں سے ہے جو شاہ دہلی نے اس مقصد کے لیے بھیجے تھے۔ اس نے کہا کہ پیر علی کو علی کریم سے دو ہزار تیس روپے ۲۰۳۰ منصف امجد علی کی معرفت موصول ہوئے تھے اور قاسم شیرے، محبوب شیرے اور شیر علی برابر مولانا پیر علی سے مشورہ کرتے رہتے تھے۔ ایک وکیل احمد اللہ نامی بھی اپنے آدمی رمضان کے ذریعے نامہ و پیام رکھتے تھے، چھیدی گوالا اور رمضان بھی بغاوت میں شریک تھے۔ تجویز یہ تھی کہ بغاوت کامیاب ہونے کے بعد قاسم شیرے کو تخت پر بٹھایا جائے گا۔ قاسم بھی مولانا پیر علی کو برابر روپیہ بھیج رہا تھا اور ان سے برابر مشورے کرتا تھا ایک اور گواہ امیر جان نے کہا کہ ان سب کے درمیان خفیہ جلسے ہوتے تھے مگر وہ جگہ ٹھیک نہ بتا سکا، مجموعی طور پر انیس ۱۹ کو پھانسی، پانچ کو جلا وطنی، دو کو چودہ سال اور تیرہ کو دس سال قید کی سزا دی گئی، نتھو چھوکرے کے کوڑے لگائے گئے۔ جب مولانا پیر علی کو پھانسی

دیتے وقت[1] ان سے خفیہ تحریک کے راز اور ان کے ساتھیوں کے نام بتانے کو کہا گیا تو انھوں نے کہا۔

"زندگی میں ایسے موقعے بھی آتے ہیں جن میں جان بچانا کار ثواب ہوتا ہے اور ایسے بھی آتے ہیں جن میں جان دے دینا ہی سب سے بڑی نیکی گنی جاتی ہے تم مجھے پھانسی دے سکتے ہو مگر اس زمین سے ہزاروں تمھارے خلاف اٹھتے رہیں گے اور اطمینان سے حکومت کرنے کا جو مقصد تمھارے سامنے ہے وہ کبھی پورا نہ ہوگا"

ولیم ٹیلر نے مولانا پیر علی کو پیکر عزم وہمت، خوددار اور عظیم الشان شخصیت کا مالک لکھا ہے۔ چناں چہ جب حاکم نے دھمکی دی کہ تمھارے مکان کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے گی جائداد ضبط ہوگی تو پیر علی اپنی جگہ اٹل تھے۔ ان واقعات کی خبر سن کر دانا پور کی سب سے زیادہ وفادار پلٹن بھی باغی ہوگئی۔ اپنی وردیاں پھاڑ دیں اور سون ندی کی طرف بڑھی[2]۔ اب یہ باغی پلٹنیں جگدیش پور کی راہ پر جارہی تھیں، جہاں کنور سنگھ موجود تھے۔

---

[1] جن لوگوں کو پھانسی ہوئی ان کے نام یہ ہیں:-
پیر علی، گھسیٹا خلیفہ، غلام عباس، چھیدی گوالا، رمضانی، نندولال، جھمن، مدھوا، کلجی خاں، واحد علی غلام علی، محمد اکبر، اصغر علی، اشرف علی، گھسیٹا ولد دمن، کلو خاں، پیغمبر بخش، اوصاف حسین۔۔۔۔
ان کو مختلف تاریخوں میں پھانسیاں دی گئیں

[2] دانا پور کے سپاہی اور عوام بغاوت کا فیصلہ کر چکے تھے لیکن تاریخ پر اختلاف تھا کیوں کہ سپاہی اتوار کے دن ۲۶ جولائی کو بغاوت کرنا چاہتے تھے اور عوام ۲۴ جولائی بروز جمعہ پسند کرتے تھے بالآخرہ ۲۵ جولائی کو ہفتے کے دن بغاوت ہوئی اور اس دن تین رجمنٹوں یعنی ۷، ۸ اور ۴۰ نے بغاوت کی (پارلیمنٹری کاغذات بہ حوالہ چٹوپادھیا / ۱۱۸)

باغی سپاہ کے سردار ہری کرشن سنگھ نے رہنمائی کی۔

کنور سنگھ میدان میں

ہری کرشن نے کنور سنگھ کو خط لکھ کر درخواست کی کہ وہ قیادت سنبھال لیں، چناں چہ ان کی رہنمائی میں یہ باغی پلٹنیں آرہ ضلع شاہ آباد میں آگئیں، جہاں انھوں نے خزانہ لوٹا، قیدی چھڑائے، دفتر اور سرکاری عمارتیں برباد کردیں۔ انگریزوں نے ایک قلعے میں پناہ لی، انقلابیوں نے محاصرہ کرلیا اور گولیاں برسائیں، جب اس طرح کام نہ چلا تو سرخ مرچوں کے تھیلے جمع کرکے ان میں آگ لگادی، انگریز سخت پریشان ہوئے مگر باہر پھر بھی نہ نکلے، توپیں لاکر گولہ باری کی گئی، اس دوران میں انگریزی فوج پیچھے سے آگئی۔ مگر جب وہ قریب آئی تو باغی کہیں نظر نہ آتے تھے اچانک آم کے ہر پیڑ سے انگریزی فوج پر گولیاں برسنے لگیں اور گولیاں چلانے والے نظر بھی نہ آتے تھے کیوں کہ رات کا وقت تھا اور باغی سپاہی درختوں کی آڑ میں چھپے ہوئے تھے، ان کے رنگین کپڑوں کو رات کی سیاہی نے اور بھی چھپالیا تھا، لیکن سفید کپڑوں میں ملبوس انگریزی فوج صاف چمک رہی تھی —— انگریزی فوجیں بدحواس تھیں مقابلہ کریں تو کس سے —— صرف چاند اور تارے ان کی بدحواسی پر مسکرا رہے تھے مجبوراً یہ فوج جس میں سکھ بھی شامل تھے پسپا ہوکر بھاگی، اور جب دریائے سون پر پہنچی تو کشتیاں غائب تھیں۔ باغیوں نے یا تو جلادی تھیں اور یا ریت میں دبادی تھیں صرف دو بہ مشکل مل سکیں ''تاریخ بہار'' میں لکھا ہے کہ باغیوں نے کشتیوں میں سوار ہوتے وقت پھر انگریزی فوج پر حملہ کیا اور کشتیوں میں آگ لگادی، انگریزی سپاہی کچھ ڈوبے کچھ جلے، کچھ مارے گئے اور چار سو میں سے صرف پچاس باقی بچے اس حادثے پر انگریزی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی۔[1]

---

[1] تاریخ بہار / ۱۸۸
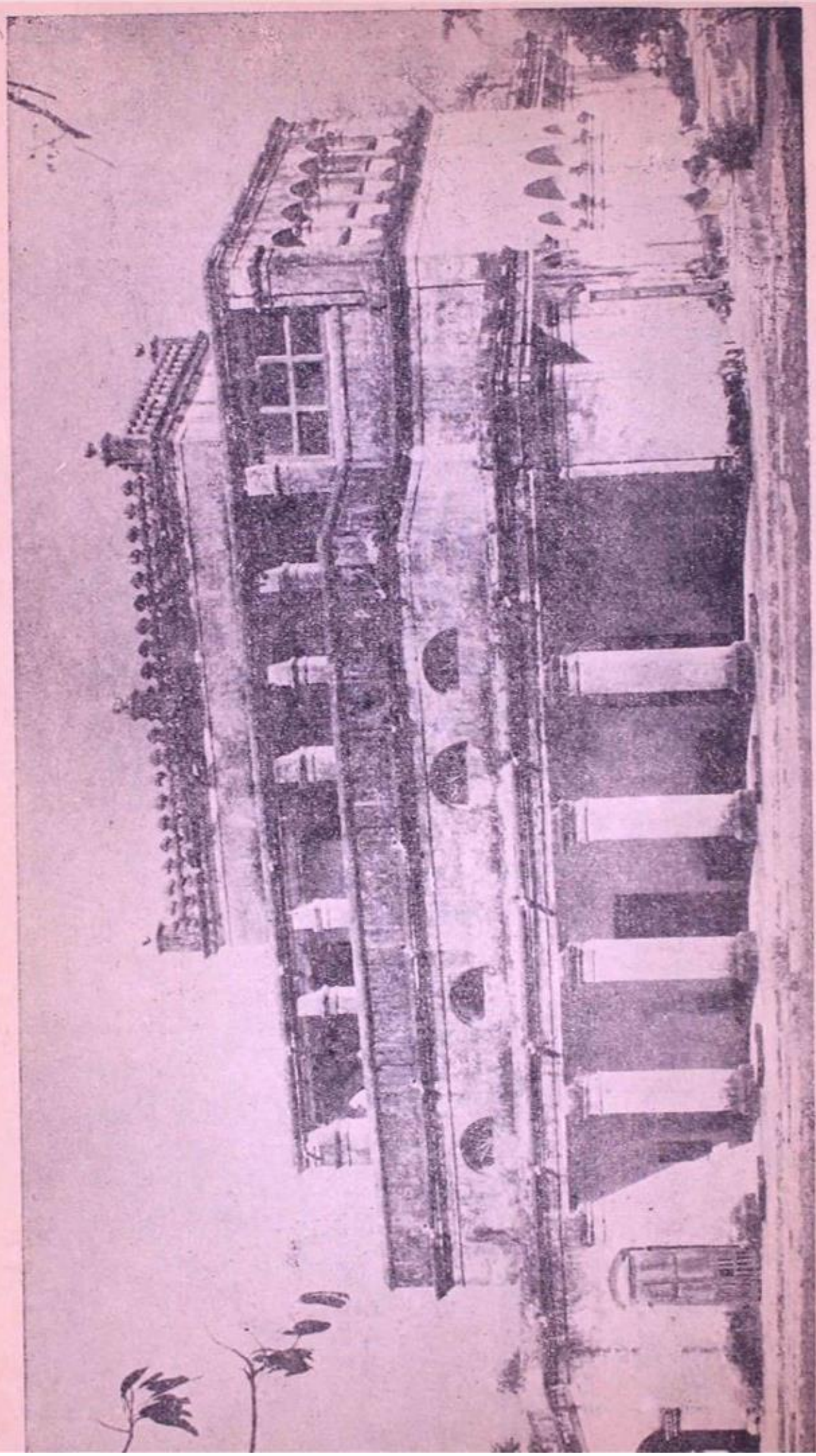
رانا کنور سنگھ کی کچہری (جگدیش پور)

آرہ میں محاصرہ جاری رہا، **بعد میں**، آئر فوج لے کر آیا اور کنور سنگھ سے ۲ اگست کو بی بی گنج کے قریب مقابلہ کیا، باغی یہاں انتہائی بہادری سے لڑے اور تین بار دشمن کی توپوں کے قریب پہنچ گئے، یہ صرف کنور سنگھ کی بدولت تھا جو عمر میں بوڑھے مگر ہمت میں جوانوں سے بھی بازی لے گئے تھے چناں چہ تاریخ بہار میں لکھا ہے کہ

"کنور سنگھ سرغنہ باوجود پیرانہ سالی کے فوج انگریزی کے مقابلے میں ایسا مستعد آمادہ تھا جیسے نوجوان دلیر ہوتے ہیں"۔ (۱۹۳)

جب انگریزی فوجوں کو شکست ہونے لگی تو آئر نے سنگینوں سے حملہ کرنے کا حکم دیا، انقلابی اس حملے کی تاب نہ لا سکے اور پسپا ہو گئے، آرہ پھر انگریزی جنگل میں آگیا، رانا کنور یہاں سے جگدیش پور آ گئے اور دوبارہ فوج جمع کی، آئر جگدیش پور کی طرف آیا تو کنور سنگھ نے گوریلا طریقۂ جنگ اختیار کیا، ۱۱ اگست کو مقابلہ ہوا۔ دو تصادموں کے بعد وہ جگدیش پور سے باہر آ گئے۔ ۱۴ اگست کو انگریزوں نے جگدیش پور میں تباہی مچا دی مگر وہ رانا کو نہ پا سکے البتہ ۱۶ کو معلوم ہوا کہ رانا کنور سہسرام میں موجود ہیں، ۲۰ اگست کو اطلاع ملی کہ وہ رہتاس کے قلعے میں رام گڈھ کے باغی دستوں اور بھاگل پور کے باغیوں کا انتظار کر رہے ہیں سہسرام کا کبیر الدین یہ خبریں سن کر حواس باختہ ہوا اور انگریزوں سے فوجیں بھیجنے کی بار بار درخواست کر رہا تھا تاکہ سہسرام کو بچا سکے۔[1] اُن کے تعاقب میں فوج بھیجی گئی جو ناکام رہی کیوں کہ کنور سنگھ اب دوسرے علاقوں میں آزادی کا پرچم لہرا رہے تھے وہ کان پور میں نانا صاحب اور نواب باندہ سے جا ملے۔ ستمبر ۱۸۵۸ء میں باندہ اور باندے سے لکھنؤ روانہ ہو گئے، دربار اودھ

1. Datta - 138

میں ان کی بڑی عزت کی گئی، شاہِ اودھ کی طرف سے فرمان عطا ہوا اور ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے وطن کی طرف جاکر اُس پر قبضہ کریں، اسی وقت انگریزی فوجیں مشرقی اودھ سے روانہ ہوئی تھیں۔ اس طرح وہ متواتر جنگ کرتے رہے مگر چوں کہ ان کے پاس کثیر فوج اور نیا سامانِ جنگ نہ تھا اس لیے گوریلا طریقہ سے جنگ شروع کرنے کا تہیہ کرلیا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر جنگلوں میں پوشیدہ ہوگئے۔

رانا امر سنگھ

اس دوران میں رانا امر سنگھ جنوبی علاقے میں چلے گئے وہ سہسرام کے قرب وجوار میں جنگ کر رہے تھے اور کیمور کی پہاڑیوں میں اپنی پوزیشن مضبوط کرلی تھی آخر اگست میں وہ سہسرام سے بارہ میل دور کجوہریں میں تھے اور سہسرام آنے کی اطلاع تھی، پٹنے کے کمشنر نے یہ اطلاعات پاتے ہی ۳ ستمبر کو لفٹننٹ سٹین ٹن انجینیر شیر گھاٹی کو لکھا۔

"..... اگر امر سنگھ نے ٹرنک روڈ کے شمالی علاقے پر قبضہ کرلیا، اور جیسا کہ امکان ہے گاؤں کے عوام اس کے ساتھ ہوگئے تو نہ صرف آرہ بلکہ پٹنہ اور گیا کے ضلعے بھی نہایت خطرناک صورتِ حال سے دوچار ہوں گے"۔

اپنے دوسرے خط میں وہ یہ حالات بتاتے ہوئے گورنمنٹ بنگال کے سکریٹری کو (۶ ستمبر) لکھتا ہے۔

"...... امر سنگھ نے اپنے ساتھیوں کے لیے ٹرنک روڈ کے قریب چھاؤنی بنالی ہے۔ خبریں گرم ہیں کہ وہ جگدیش پور لوٹ جانے کا ارادہ رکھتا ہے تاکہ ریاست کا مالیہ جمع کرلے ..... جیسا کہ مجھے شاہ کبیر الدین نے لکھا ہے لفٹننٹ سٹین ٹن کے ۵۰ آدمی کافی نہ ہوں گے ..... اگر آرہ ہاتھ سے نکل گیا تو پٹنے کے بڑے

علاقے اور غالباً گیا کو بھی پر امن رکھنا ناممکن ہو جائے گا۔ بغاوت صرف آرہ تک محدود نہ رہے گی بلکہ سارے بہار میں پھیل جائے گی جہاں کا ہر شخص کنور سنگھ کا نام بہ خوبی جانتا ہے"۔

امر سنگھ کو پکڑنے کے لیے پانچ ہزار روپے انعام کا اعلان کیا گیا، اس کے باوجود امر سنگھ نے گرانڈ ٹرنک روڈ پر نکل کر ٹیلی گراف کے تار کاٹ دیے، ڈاک لے جانے والے تمام گھوڑے ساتھ لے کر پہاڑیوں میں غائب ہو گئے۔ لہٰذا کرنل فشر ۲۳ ستمبر کو ڈیری آن سون پہنچا۔ اس سے پہلے دو ہزار انقلابیوں نے سہسرام پر ماہ اگست میں حملہ کیا تھا اور اب بھی آس پاس کے علاقوں میں بغاوت کا زبردست امکان اور آثار تھے، نواداکے قریب کچھ گڑبڑ بھی محسوس ہوتی تھی مگر سہسرام کے ایک شخص کبیر الدین نے جس کا عام لوگوں پر اثر تھا اور جس کو انگریزوں نے اپنے ساتھ ملا لیا تھا برابر اپنی مذموم کوششیں جاری رکھیں اور یہاں کے اکثر عوام کو میدان میں نہ آنے دیا (بعد میں اس شخص نے اپنی "وفاداری" کا انعام دس ہزار کا خلعت، سند اور خطاب کی صورت میں پایا) افواہ تھی کہ کنور سنگھ بھی شاہ آباد کی طرف واپس آرہے ہیں ۲۸ ستمبر کو لفٹیننٹ بیکر (BAKER) نے امر سنگھ کے گاؤں سرہی پر اچانک حملہ کیا مگر امر سنگھ ہاتھ نہ آسکے وہ شروع اکتوبر میں رہتاس کے قریب موجود تھے۔ اس زمانے میں انگریزوں نے دہلی کے شکست ہونے کی خبریں بڑے اہتمام سے پھیلانا شروع کیں تاکہ مرکز لوٹ جانے کی خبر سن کر باغی دل شکستہ ہو جائیں مگر آنے والے واقعات بتائیں گے کہ موت و حیات سے بے نیاز انقلابی ذرا بھی متاثر نہ ہوئے۔

I. F. No. 182

۲۹ستمبر کو چترا (چھوٹا ناگ پور) میں میجر انگلش اور رام گڈھ بٹالین کے باغیوں سے سخت تصادم ہوا، باغیوں نے یہاں سے ہٹ کر ایک گاؤں اکبر پور میں مورچہ بنا لیا اور یہاں کنور سنگھ کے کچھ آدمی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ کیپٹن ربٹرے نے حملہ کر کے ان کو رہتاس کی طرف دھکیل دیا (۲ر اکتوبر)

جودھر سنگھ

اسی زمانے میں ایک اور شخص جودھر سنگھ انگریزوں کے لیے مصیبت بنا ہوا تھا۔ یہ بہادر باغی سردار جودھ پور کے باغیوں کی رہنمائی کر رہا تھا، ایک دستہ اس کی گرفتاری کے لیے بھیجا گیا مگر ناکام واپس آیا کیوں کہ جودھر سنگھ نے ایک مضبوط اور محفوظ مکان میں مورچہ بنایا تھا اور یہ مکان اونچی کچی دیواروں کے گھیرے میں تھا۔ اندر داخل ہونے کی ہر کوشش ناکامی پر ختم ہوئی اور پسپا کر دی گئی لہٰذا انگریزوں کو فی الحال حملے کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا[1]۔ اگست ۵۸ء میں جودھر سنگھ کے ساتھیوں نے گیا کو آزاد کرا لیا تھا اور آس پاس کے عوام ان کی رہنمائی میں تھے اور اس طرح جودھر سنگھ نے انگریزی راج کو ہلا ڈالا تھا۔

رانی ٹکاری

ضلع بہار میں بھی شورش اور بغاوت کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ آزادیٔ وطن کا جذبہ رانی ٹکاری کو بھی میدان میں لا رہا تھا جو فوج جمع کرنے اور قلعے پر توپیں چڑھانے میں مشغول تھی۔ ڈھاکہ اور چٹاگانگ کی بغاوتوں نے گنگا کے شمالی علاقوں میں ایک نیا خطرہ پیدا کر دیا تھا، کیوں کہ دوسری جگہوں کی فوجوں کے بغاوت کر دینے کا امکان تھا۔ دسمبر میں مختلف انگریزی فوجیں مسلح ہو کر ان علاقوں کی طرف بڑھنے

1. "Bengal Under the Lt. Governors" 77

لگیں ، ساتھ ہی ، اب راجہ نیپال کی فوجیں بھی ان کی مدد کو آچکی تھیں مگر ضلع شاہ آباد میں بغاوت بہ دستور تھی اور خصوصاً سہسرام کے قریبی علاقوں میں ـــــ ڈھاکہ اور جلپا گوڑی کے باغی سوار ترائی کی راہ سے ترہٹ کی طرف بڑھ رہے تھے ۔ گورکھپور کے انقلابی مضبوط پوزیشن میں تھے ۔ ۲۶ دسمبر کو سوہان پور (سرحد گورکھپور) میں انگریزوں کی فوج کا انقلابیوں نے مقابلہ کیا جو نائب ناظم مشرف خاں کی رہنمائی میں تھے ۔ اسی دن صاحب گنج میں بھی تصادم ہوا مگر انگریزوں کے ساتھ اب سکھ اور نیپالی گورکھے اپنے بھائیوں کا سر کچل رہے تھے اور ادھر بہار راجہ بے میٹا غداری پر آمادہ تھا ، چناں چہ انقلابیوں کے لیے ان سب کا مقابلہ دشوار ہو گیا اور شمالی گنگا کے علاقوں میں تحریک کسی قدر دب سی گئی ۔

امر سنگھ پھر سہسرام میں

جنوری ۵۸ء میں امر سنگھ جن کو مرزا پور سے بھیجی گئی انگریزی فوج نے پیچھے دھکیل دیا تھا پھر سہسرام کے قریب موجود تھے اور رہتاس پر قبضہ کر لیا تھا لہٰذا انگریزی دستے سہسرام بھیجے گئے ۔ کرنل بچل رہتاس اور ریڈ سہسرام بھیجا (فروری ۵۸ء)

امر سنگھ اور ان کے ساتھی بغیر مقابلہ کیے وہاں سے ہٹ گئے اور انگریزی فوج نے قبضہ کر لیا مگر ابھی تک انگریز اُن سے خوف زدہ تھے چناں چہ گورنر بنگال اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے :

"مگر یہ خطرہ بہ دستور موجود تھا کہ باغی آئندہ کسی مقام پر قبضہ کریں گے ۔"

اسی دوران میں ڈھاکے کے انقلابیوں نے جو ترائی کی طرف بڑھ رہے تھے گنڈک ندی کو پار کر لیا ۔

کنور سنگھ اعظم گڈھ میں

انگریزی فوجیں مشرقی اودھ سے روانہ ہوئیں تو باغی فوجیں فیض آباد سے نو میل مشرق میں بیلوا کے قریب تھیں اور مہدی حسن ان کی رہنمائی کر رہے تھے جو سلطان پور کے سابق ناظم تھے اور اس سے پہلے بھی کئی بار انگریزی دستوں سے مقابلہ کر چکے تھے وہ گونڈہ اور چاردھا کے راجوں کے ہمراہ بھی رہے، ۵ار مارچ کو انھوں نے انگریزی کیمپ پر پھر حملہ کیا لیکن پسپا ہو گئے یہ منتشر فوجیں جن کے ساتھ اور باغی گروہ شریک ہو گئے تھے اتھرولیا پہنچیں اور وہ سب رانا کنور سنگھ سے جا ملے[1]

مارچ کے شروع میں انقلابیوں کی ایک بڑی ٹولی سے، جو فیض آباد سے گورکھپور ہوتی ہوئی ضلع سارن کی طرف بڑھ رہی تھی —— انگریزی فوجوں کا مقابلہ ہوا اور انقلابیوں نے شکست کھائی مگر ابھی انگریز اس فتح پر مسکرانے بھی نہ پائے تھے کہ اعظم گڈھ پر انقلابی پرچم لہرانے کی خبر نے ہاتھوں کے طوطے اُڑا دیے —— کنور سنگھ نے اتھرولیہ کے قلعے پر کیمپ بنا لیا ۲۲ر مارچ کو انگریزی فوجوں سے مقابلہ ہوا، کنور سنگھ کی فوجیں پیچھے ہٹ گیئں اور انگریزی فوج بڑے اطمینان سے ناشتے میں مشغول ہوئی ہی تھی کہ اچانک کنور سنگھ کے ساتھی اُن پر ٹوٹ پڑے اور گنے کے کھیتوں اور آم کے پیڑوں کی آڑ لے کر گولیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی —— سیکڑوں ناشتہ کرتے ہوئے گوروں کو موت کے دیو نے اپنا ناشتہ بنا لیا —— !۔ بدحواس انگریزی فوجیں بھاگیں اور اپنے کیمپ کو سیلا پر دم لیا مگر کنور سنگھ نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا اور ان کے تمام سامان پر

1. Majumdar _ 82

قبضہ کرکے اس حواس باختہ اور پریشان حال فوج کو اعظم گڈھ تک بھگا دیا۔ اس طرح بہار کے کئی ضلعے اور خصوصاً شاہ آباد پھر باغیوں کے قبضے میں تھا۔ آخر مارچ میں اس علاقے میں انگریزی طاقت کا خاتمہ ہوگیا۔

کنور سنگھ بنارس کے قریب

کرنل ڈیمس اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے ۲۸ مارچ کو اعظم گڈھ سے روانہ ہوا مگر اب کی بار کنور سنگھ کی فوجوں نے ایسی پٹائی کی کہ کرنل سر پر پاؤں رکھ کر واپس بھاگا۔ رانا اعظم گڈھ میں داخل ہوئے اور یہاں محصور انگریزوں کی "مرمت" کا کام اپنے ساتھیوں کے سپرد کرکے بنارس کی طرف بڑھے۔ ان کو بنارس آتا دیکھ کر گورنر جنرل کیننگ حیران اور دہشت زدہ رہ گیا، اسے کنور سنگھ کی حیرت انگیز جرات و بہادری کی بہ دولت آنے والے خطرے کا احساس ہوگیا تھا، لہٰذا اس نے لارڈ مارکر کو حملے کا حکم دیا، ۶ اپریل کو مقابلہ ہوا اسّی برس کا جواں ہمت کنور سنگھ سفید گھوڑے پر سوار جنگ میں مصروف تھا، اس کی فوجیں کم تھیں، توپیں اور نیا سامان جنگ نہ تھا مگر پھر بھی اس جواں ہمت بوڑھے کے جاں باز ساتھی انگریزی فوج کے پیچھے تک جا پہنچے اور منتشر کر دیا جب کہ انگریزی فوجوں نے انقلابیوں کے صرف چند مکانات پر قبضہ کیا، انگریزی گولہ باری کا جواب دینے کے لیے دوسری طرف توپیں نہ تھیں مگر ہمتیں جوان تھیں، دلوں میں وطن کو آزاد دیکھنے کی تمنا تھی اور دشمنانِ وطن سے بدلہ لینے کا جذبہ۔

انگریزوں کو شکست

مارکر اپنی فوج لے کر اعظم گڈھ آیا مگر ابھی پورے شہر پر انقلابیوں کا قبضہ تھا، لوگارڈ اس کی مدد کو آ رہا تھا کنور سنگھ نے نئی فوج بنائی، ایک دستہ تانو ندی کے پل پر متعین کیا جہاں لگارڈ نے

پل پر متواتر حملے کیے مگر موت سے کھیلنے والے انقلابی دستے نے ایک قدم نہ بڑھنے دیا دوسری طرف کنور سنگھ اپنی تمام فوج لے کر اعظم گڈھ سے نکل گئے اور بہ حفاظت نکل جانے کے بعد پل والے دستے کو اشارہ کیا۔ یہ دستہ اپنا کام انجام دے کر واپس ہوا اور کنور سنگھ سے آملا ــــ اچانک اس دستے کو غائب دیکھ کر لگارڈ پل کی طرف جھپٹا مگر اس کی حیرت و تعجب کی انتہا نہ رہی ــــ کنور سنگھ کی تمام فوج غائب تھی ــــ! ۔ گورا فوج کا دستہ پیچھا کرنے کو چلا، بارہ میل دوڑا، مگر رانا کی گرد بھی نہ پائی۔ اور جب پایا تو وہ نہایت مضبوط پوزیشن میں تھے، مقابلہ ہوا تو انگریزوں کو سخت نقصان ہوا، تمام بڑے افسر کام آگئے، فوج پسپا ہوگئی اور کنور سنگھ اب گنگا کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کی گرفتاری کے لیے پچیس[۲] ہزار روپے کا اعلان کیا گیا۔ (وسط اپریل ۱۸۵۸ء)۔

امر سنگھ جگدیش پور میں

اِدھر سہسرام اور اس کے قریبی علاقے ابھی تک باغی تھے اور انگریز اُن پر حملے کی تیاریاں کر رہے تھے، چناں چہ کلکتے سے رجمنٹ ۶ کو جلدی سے یہاں روانہ کیا گیا۔ اس عرصے میں ۲۲ مارچ کی فتح سے انقلابیوں کی طاقت اور ہمت بڑھ گئی، دو توپیں، کچھ ہتھیار اور بارود کا کافی ذخیرہ ان کے ہاتھ آگیا تھا اور وہ جگدیش پور میں اپنی پوزیشن مضبوط بنا رہے تھے نئی فوج جمع ہو رہی تھی اور قرب و جوار کے لوگ کثرت سے بھرتی ہو رہے تھے۔ امر سنگھ بھی اپنے کثیر ساتھیوں سمیت اُن سے آملے تھے۔

کنور سنگھ گنگا پر

اعظم گڈھ سے اب ایک اور انگریزی فوج ڈوگلس کی

1. Malleson. - IV - 330.
Savarkar -

رہنمائی میں بڑھی۔ کنور سنگھ سے مقابلہ ہوا تو رانا نے اپنی فوج کو تین دستوں میں تقسیم کر دیا، ایک دستہ دشمن سے جنگ میں مصروف تھا اور ادھر کنور سنگھ کی بقیہ فوج دو حصوں میں تقسیم ہو کر مختلف راستوں سے آگے بڑھی اور ایک طے شدہ مقام پر آ کر مل گئی اب وہ پھر گنگا کی طرف بڑھ رہے تھے۔ انگریزی فوجیں مقابلے میں پسپا ہو گئیں اور اتھوسی کے جنگل میں رات گذار کر اگلے دن پھر رانا کا پیچھا شروع کر دیا جو اُن سے تیرہ میل آگے جا چکے تھے اور اب غازی پور میں داخل ہو رہے تھے۔ رانا ایک گاؤں مینار (MANIAR) میں ٹھہرے ڈوگلس بھی پیچھا کرتا ہوا پہنچ گیا اور اچانک حملہ آور ہوا۔ تھکی ہوئی انقلابی فوج پسپا ہو گئی مگر رانا کنور نے فوج کو چھوٹے چھوٹے دستوں میں تقسیم کیا اور مختلف راستوں سے پیچھے ہٹا دیا، مختلف دستوں کے سرداروں کو ضروری ہدایتیں دے دی تھیں کہ وہ مقررہ وقت پر طے شدہ مقام پر جمع ہو جائیں اس طرح انگریزوں کی فتح بے کار ہو گئی اور مقررہ وقت پر تمام دستے یک جا ہو کر آگے بڑھنے لگے۔ کنور سنگھ جہاں بھی جاتے عام لوگ ان کا سرگرمی اور جوش سے استقبال کرتے، رسد مہیا کرتے اور ہر طرح امداد پہنچاتے تھے[۱] ـــــ ڈوگلس ہکا بکا رہ گیا، اسے پتہ ہی نہ تھا کہ کنور سنگھ کی فوجیں کہاں ہیں لہٰذا اسی گاؤں میں رکنا پڑا ـــــ اور رانا کی فوجیں اب پھر گنگا کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ آخر کار وہ گنگ کے کنارے پہنچے مگر ڈوگلس کی فوج بھی پیچھے آ رہی تھی

کنور سنگھ زخمی رانا نے مقابلہ مناسب نہ سمجھ کر دوسرے طریقے اختیار کیے۔ ان کے

---

[۱] بریگیڈیر ڈوگلاس اور سارن کے مجسٹریٹ کے خطوط بحوالہ کے۔ کے۔ دتہ / ۱۵۲

اسکاوٹ تمام خبریں پہنچا رہے تھے۔ رانا نے تمام علاقے میں یہ افواہ اڑائی کہ ان کی فوجیں کشتیوں کی کمی کی وجہ سے ہاتھیوں پر بلیلا گھاٹ کے قریب گنگا پار کریں گی ——

انگریزی کیمپ میں یہ خبر پہنچی تو افسران خوشی سے اچھل پڑے کہ اب وہ کنور سنگھ کو مع ہاتھی کے گنگا میں ڈبو دیں گے۔ بڑی پھرتی کے ساتھ انگریز جنرل فوج لے کر بلیلا گھاٹ پر پہنچ گیا اور اپنی تمام فوجوں کو جھاڑیوں اور دوسری جگہوں پر چھپا کر گھات میں بیٹھ گیا کہ کب کنور سنگھ کا ہاتھی دریا پار کرے اور کب وہ اسے مع ہاتھی کے ڈبو دے !۔ کنور سنگھ اور ان کی فوجوں نے گنگا کے کنارے آکر اسے پار کرنا شروع کر دیا۔ مگر کہاں — ؟ - بلیلا پر نہیں، بلکہ یہاں سے سات میل دور شیوا پور پر وہ مع فوج کے کشتیوں کے ذریعے رات کے وقت پار اتر رہے تھے —— انگریزی فوجیں بلیلا پر ہاتھ ملتی رہ گئیں، اور جب ان کو اس دھوکے کی اطلاع ملی تو وہ جھنجھلاہٹ اور غصے سے بے تاب ہو کر شیوا پور کی طرف بھاگیں۔ کنور سنگھ کی تمام فوج پار اتر چکی تھی — صرف ایک کشتی انگریزوں کے ہاتھ لگی۔ رانا اپنی تمام فوج کے ہمراہ دوسرے کنارے پر پہنچنے ہی والے تھے کہ ایک گولی سے زخمی ہوئے، گولی کلائی پر لگی تھی مگر اس دلیر اور جاں باز نے اپنی تلوار نکالی، ہاتھ کو کہنی سے کاٹا اور گنگا کی نذر کر دیا۔

"لو ماتا —!۔ اپنے پیارے بیٹے کی یہ آخری قربانی قبول کرو"

دشمن کی فوجیں دوسرے ہی کنارے پر تلملاتی رہ گئیں اور رانا مع فوج کے پار ہو گئے، وہ یہاں سے پھر اپنے وطن شاہ آباد کی طرف بڑھے اور ۲۲ اپریل ۱۸۵۸ء کو جگدیش پور میں داخل ہو گئے، ان کی ایک ران میں زخم آیا تھا۔

انگریزوں کو شرم ناک شکست

جگدیش پور کی سرزمین اب پھر آزادی کا پھریرا اڑا رہی تھی اور انگریز افسر یہ سن کر دم بخود تھے کہ جس کنور سنگھ کو آٹھ نو مہینے پہلے جگدیش پور سے نکال دیا گیا تھا وہ پھر وہیں موجود تھا۔ ۲۳ اپریل کو لی گرانڈ کی رہنمائی میں زبردست انگریزی فوجیں آرہ سے جگدیش پور پر حملہ آور ہوئیں، کنور سنگھ کی تھکی ماندی فوجوں نے — جو کُل ایک ہزار آدمی تھے — تازہ دم، طاقت ور اور مسلح دشمن کا مقابلہ کیا، انگریزوں نے گولہ باری شروع کردی، کنور سنگھ کے پاس توپیں نہ تھیں، دشمن کی فوج ایک گھنے جنگل میں تھی، کوئی نہیں جانتا کہ کس طرح، مگر چند ہی لمحے بعد انگریزی فوجیں خون زدہ نظر آنے لگیں۔ اب کنور سنگھ اور ان کے جاں باز ساتھیوں نے مغرور انگریزوں کو اس طرح گھیر لیا تھا کہ مقابلہ تو دشوار تھا ہی، مگر بھاگنا اس سے بھی زیادہ مشکل تھا، تمام انگریزی فوج منتشر ہوگئی، کنور سنگھ کی فوجوں نے ان کا پیچھا کیا اور وہ شکاریوں سے بھاگتے ہوئے ہرنوں کی طرح جہاں سینگ سمائے نکل گئے، ایک افسر جو موقعے پر موجود تھا لکھتا ہے۔

> "درحقیقت مجھے اس شکست کا حال لکھتے ہوئے بڑی شرمندگی معلوم ہوتی ہے ہم نے میدانِ جنگ چھوڑ کر بھاگنا شروع کردیا اور دشمن سے مسلسل پٹتے رہے۔ ہمارے آدمی جو پیاس سے مرے جا رہے تھے نہایت ابتری کی حالت میں ایک گندے پانی کے چشمے پر ٹوٹ پڑے مگر اسی وقت پیچھے سے کنور سنگھ کے گھوڑے آپہنچے۔ اب ہماری تباہی و بربادی کی حد نہ رہی اور ہر شخص جہاں پناہ مل سکی فرار ہوگیا، احکام اور تنظیم سب خاک میں گئے .... زخمیوں کا علاج بھی ممکن نہ تھا کیوں کہ دواؤں پر کنور سنگھ کا قبضہ ہوگیا تھا، کچھ وہیں مرے

اور کچھ کو دشمن نے کاٹ ڈالا . . . . . . لی گرانڈ خود ایک گولی سے مارا گیا، سپاہیوں

کو بندوقیں بھی بوجھ معلوم ہوتی تھیں، سکھ ہاتھیوں کو لے کر فرار ہو گئے . . . . . .

دو سو گوروں میں سے صرف اسی باقی بچے، ہم اس جنگل میں گویا بھینسوں کی طرح

داخل ہوئے تھے جو ذبح خانے میں کٹنے کے لیے جاتی ہیں۔" ؎۱

کنور سنگھ کا انتقال

۲۶ اپریل کو وطن کا بہادر سپوت کنور سنگھ ہمیشہ کی نیند سو گیا اور یہ موت اس زخم کی وجہ سے ہوئی جو ہاتھ پر گنگا پار کرتے وقت لگا تھا۔ گورنر بنگال لکھتا ہے۔

"جب کنور سنگھ مرا تو اس کے ساتھیوں نے موت کی خبر کو کچھ عرصے تک نہایت ہوشیاری سے پوشیدہ رکھا کیوں کہ اس کا نام ہمیشہ سے اس علاقے کے باغیوں کے لیے طاقت کے ایک مینار کی طرح رہا تھا۔" ؎۲

کنور سنگھ کے بعد امر سنگھ نے یہ جگہ پر کر دی اور فوج کے ساتھ آرہ کی طرف بڑھے۔ ۳ مئی کو تصادم ہوا، اور اسی طرح بی ہتیا، حاتم پور وغیرہ مقامات پر امر سنگھ نے اپنی فوجوں کو اس قدر حیرت انگیز ہوشیاری سے لڑایا کہ انگریز حیران رہ گئے۔ ۹ مئی کو لگارڈ نے جگدیش پور حملہ کیا اور انقلابی فوجوں کو یہاں سے ہٹنا پڑا مگر ہٹنے کے بعد وہ اُن گھنے جنگلات میں جمع ہو گئے جو چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے اور ۱۱ کو بہ یک وقت دو فوجوں نے حملہ کیا۔

1. Ball - II - 2.
   Savarkar -

2. "Bengal under Governors" - 88.

امر سنگھ کی فوجوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ جب کہ انگریزوں کا بہت کم نقصان ہوا مگر ان کو سورج کی گرمی اور دھوپ بھونے ڈالتی تھی اور اُن میں بہت سے اسی جان لیوا گرمی کا شکار ہوئے، انقلابیوں کی ہمتیں اب بھی پست نہ تھیں، انھوں نے اب اس گھنے جنگل کے جنوبی حصے میں جمع ہو کر اپنے مورچے بنا لیے تھے، ۵ ار کو انھوں نے انگریزی کیمپ پر حملہ کیا۔ اور کچھ دیر کی جنگ کے بعد دھکیل دیے گئے۔ گورنر بنگال رپورٹ میں کہتا ہے۔

"ان کی پوری قوت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا مگر کمشنر کی رائے تھی کہ وہ اب بھی تین ہزار کی تعداد میں جمع تھے جن میں صرف ایک حصہ سپاہی شامل ہیں اور باقی آس پاس کے گاؤں سے جمع شدہ بے قاعدہ دستے تھے۔"

اب غارت گری کی باری تھی چناں چہ باغیوں کے مرکزوں اور گاؤوں کو جلا کر راکھ دیا گیا ۱۸ مئی کو لگارڈ نے پھر حملہ کیا، جگدیش پور سے دو میل دور بتیاہی میں مقابلہ ہوا لیکن انگریزی فوج نئے سازو سامان اور ہتھیاروں نے ان کی جراًت و ہمت کو شکست دی اور وہ پھر جنگل میں غائب ہو گئے۔

باغیوں کی جراًت و ہمت

۲۶ مئی کو لگارڈ نے فوج کے سوار اور پیادوں کا ایک دستہ دلیپ پور کی طرف سے روانہ کیا تاکہ باغیوں کی توجہ اس طرف ہو جائے اور پھر ڈوگلس کی رہنمائی میں پوری فوج نے پیچھے سے حملہ کر دیا۔ یہ واقعہ میتاہی گاؤں میں ہوا جو اس جنگل کے جنوب مغرب میں واقع ہے، جیسے ہی انقلابیوں نے انگریزی فوجوں کو دیکھا، دور گولہ پھینکنے والی دو توپوں سے، جو انگریزوں کی پچھلی شکست سے اُن کے ہاتھ آئی تھیں ــــ آگ برسانا شروع کر دی اور کچھ دیر بعد اُن کو چھوڑ کر منتشر ہو گئے، لیکن اس کے بعد یقین تھا کہ پھر

تقریباً پانچ سو باغی ان ہی جنگلوں میں لوٹ آئے ہیں۔ باغیوں کا پیچھا کرنے پر انگریزی فوجوں کو سوائے مایوسی اور جھنجھلاہٹ کے کچھ ہاتھ نہ آیا، اُن کے گوریلا طریقۂ جنگ نے انگریزوں کی تمام کوششیں ناکام بنادیں، وہ منتشر ہوجاتے مگر پھر یک جا ہوکر مردانہ وار حملہ کرتے تھے، ۲ر ۳ر جون کو بھی لگارڈ نے اُن پر حملے کیے۔

ضلع شاہ آباد پر قبضے کے دوران میں باغیوں نے غداروں سے ہول ناک انتقام لیا چناں چہ ایک برقنداز کو جو آرہ سے ایک خط لے کر جارہا تھا پکڑا اور اس کی ناک اور داہنا ہاتھ کاٹ کر چھوڑ دیا، ۲ر جون کو لگارڈ نے اچانک چھاپہ مارا اور اکروا (Akarwa,) کے مقام پر حملہ کرکے ان کو جنگل کے شمالی مشرقی کونے میں دھکیل دیا، ۳ر کو پھر بھٹورا (Bhitaura,) کے مقام پر حملہ کیا۔ اس رات کو باغیوں نے پسپا ہونے کے بعد امر سنگھ کی رہ نمائی میں جنگل چھوڑ دیا اور سورج پور کی طرف چلے گئے، وہاں سے دھنسولی گاؤں گئے جہاں راجہ ڈمراؤں کے دیوان کا مکان لوٹا، پھر مغربی سمت میں کرمناسا کو پار کرکے ایک گاؤں گومہور (Gomhur) میں قیام کیا۔ لفٹنٹ بیکر ان کے پیچھے نہایت تیزی سے روانہ ہوا مگر گاؤں میں پہنچنے سے نہ روک سکا مولوی علی کریم بھی مع ساتھیوں کے اسی علاقے میں موجود تھے اور بہار واپس آنے کا ارادہ رکھتے تھے، باغی گروہ ڈمراؤں کے آس پاس اب بھی گھوم رہے تھے۔

بہت سے انقلابی دو دو تین تین کی تعداد میں چھپرہ میں داخل ہورہے تھے اور اس دوران میں انھوں نے تاج پور ضلع چھپرہ کے داروغہ کو جس نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا قتل کردیا۔

فتح سنگھ

ایک باغی سردار فتح سنگھ جس نے پچھلے سال انگریزوں کو پریشان کیا تھا، اب پھر کچھ آدمی جمع کر کے ان کے لیے ضلع بہار میں خطرہ پیدا کر رہا تھا مگر انگریزوں کو مقابلے کی ضرورت پیش نہ آئی اور راجہ سون پور اس سے نمٹنے کو تیار ہو گیا چناں چہ اس راجہ نے حملہ کر کے فتح سنگھ کو اس کے مورچے سے ہٹا دیا اور اپنی اس "وفاداری" کے انعام میں گورنمنٹ کی طرف سے "شکریہ" پایا۔

سراسیمہ انگریز

ڈوگلس برابر امر سنگھ کا پیچھا کر رہا تھا، وہ ۹ ر جون کو بکسر پہنچا۔ معمولی تصادم ہوا۔ ۱۱ کو ڈوگلس نے کرمناسا پار کیا تاکہ امر سنگھ کے گاؤں گدھور پر حملہ کرے مگر امر سنگھ نے حملہ ہونے سے پہلے ہی گاؤں چھوڑ دیا اور ایک بار پھر جگدیش پور کے جنگلات میں پلٹ آئے۔ باغیوں کی دوسری پارٹیاں غازی پور میں داخل ہو گئی تھیں، کیپٹن ریٹرے نے روپ ساگر میں کیمپ لگایا، اس کے خیمے پر کئی بار فائر کیے گئے، ۱۵ ر جون کو باغیوں کا ایک دستہ جگدیش پور سے نکلا اور ضلع بہار میں داخل ہوا تاکہ ٹکاری کے قلعے پر حملہ کرے، راہ میں انھوں نے بکرم پور کا تھانہ جلا دیا جو پٹنے سے صرف ۱۹ میل دور تھا، لگارڈ اس دوران میں آرہ آ گیا، اس کی فوج اس قدر پٹی تھی کہ دوبارہ ان باغیوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ تھی مگر بکرم پور کا تھانہ جل جانے سے پٹنہ پر بھی حملے کا امکان تھا اور سارن اور چھپرہ کے ضلعے بھی محفوظ نہ تھے۔ اس دوران میں نشان سنگھ کی گرفتاری نے انقلابیوں کے حوصلے پست کر دیے۔

گیا پھر گیا!

ایک طرف تو یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور دوسری طرف گیا کو پھر انقلابیوں نے تیسری بار آزاد کرا لیا اس سے پہلے اگست ۱۸۵۷ء میں یہاں بغاوت ہو چکی تھی، اس بار پھر جیل خانہ توڑا (۲۱ ر جون کی رات) اور انقلابی پرچم لہرانے لگا۔

گورنر بنگال کے الفاظ میں ——

"حالات عجیب معمہ بنے ہوئے تھے - اندازہ لگایا گیا کہ تمام پہرے دار بھی باغیوں

سے ہم دردی رکھتے ہیں، لہٰذا پہرہ لگانا حماقت تھا اس لیے پٹنہ وغیرہ علاقوں

کے پہرے داروں سے ہتھیار لے لیے گئے کیوں کہ ان پر بھروسا نہ تھا"[1]

جس باقاعدگی اور تنظیم کے ساتھ انقلابیوں نے آزاد کیے ہوئے ضلعوں کا انتظام کیا اس کا

اعتراف خود انگریز کمشنر نے کیا ہے۔ ان اضلاع کا لگان وہ برابر خود جمع کر رہے تھے، تمام

سرکاری عمارتوں اور انگریزی وفاداری کا رجحان رکھنے والے علاقوں کو برباد کر دیا گیا تھا

حتیٰ کہ پولس والے اور وہ تمام لوگ جو انگریزوں کی حمایت کا ذرا سا بھی گمان رکھتے تھے قتل

کر دیے گئے۔ جس ٹھیکے دار نے جگدیش پور میں انگریزی فوجوں کو رسد اور خوراک پہنچائی تھی

اس کو پھانسی دے دی گئی۔ کمشنر پٹنہ اپنے ایک خط میں لکھتا ہے: ۱۸ ؍جون ۱۸۵۸ء کا

"باغی آج کل کو... ان کا سر لانے والے کو انعام پیش کر رہے ہیں۔ ان کا

رویہ ایسا ہے گویا وہ تو صحیح قسم کے انسان ہوں اور ہم چور ڈاکو"۔[2]

امر سنگھ غائب

جولائی میں بغاوت کسی حد تک دب چکی تھی اور اب باغی صرف شاہ آباد میں رہ گئے تھے جہاں وہ ابھی تک مضبوط تھے خصوصاً آرہ اور اس کے جنوبی علاقوں میں انھوں نے کچھ عرصے قبضہ رکھا، بنارس اور

1. Bengal Under the Lt. Governors" p. 93
2. Datta, p. 173

سہسرام کے درمیان سلسلہ رسل و رسائل اور گرانڈ ٹرنک روڈ کو بند کر دیا ، ۲ رجولائی کو انگریز فوجوں نے ان کا پیچھا کیا اور منتشر کر دیا ، امر سنگھ کا گاؤں جلا دیا گیا ۔ لیکن اب وہ جگدیش پور میں تھے اور اپنے تمام مختلف دستوں کو آرہ میں جمع کر لیا تھا ، ان کی گرفتاری پر انعام مقرر تھا ۔

۱۳ ر اکتوبر ۱۸۵۸ء کو جگدیش پور کو ختم کرنے کے لیے سات زبردست اور مسلح انگریزی فوجیں مختلف سمتوں سے جگدیش پور پر چڑھ آئیں ، تمام راستے بند کر دیے گئے ، دائرہ تنگ ہوتا ہو گیا اور ۱۷ ر اکتوبر ۱۸۵۸ء کو پورے طور پر گرفت میں لے لیا مگر امر سنگھ غائب تھے —— وہ گھر جانے کے باوجود اس طرف سے صحیح سلامت نکل گئے جہاں انگریزی فوجیں دیر میں پہنچیں اور انھوں نے اسی دیر سے فائدہ اٹھا لیا ، دشمن کی فوجوں نے امر سنگھ کا پیچھا کیا اور ۱۹ ر اکتوبر کو ایک مقام نونادی میں گھیر لیا ، امر سنگھ کے چار ہزار دیروں نے یہاں مردانگی سے مقابلہ کیا ، جب تین ہزار کام آ گئے تو باقی ایک ہزار نیا جوش اور امنگ لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑے خوں ریز جنگ ہوئی ، گھمسان کا رن پڑا ! ، رانا امر سنگھ آخر تک جنگ کرتے رہے اور جب ان کے اکثر جاں باز ساتھی قوم و وطن پر نثار ہو چکے تو وہ یہاں سے بھی صاف بچ کر نکل گئے وہ ہاتھی پر سے کود کر غائب ہوئے اور کیمور کی پہاڑیوں میں پہنچے ۔ انگریز فوجیں برابر پیچھا کر رہی تھیں مگر ان چند بہادروں نے —— جن میں عورتیں بھی شامل تھیں ہر پہاڑی ہر چٹان اور ہر ٹیلے پر اس وقت تک مقابلہ کیا جب تک ان میں سے ہر ایک ختم نہ ہو گیا رانا امر سنگھ انگریزوں کے ہاتھ اب بھی نہ آ سکے —— کیوں کہ ان علاقوں کے عوام انگریزوں کو کسی طرح یہ بتانے پر تیار نہ تھے کہ باغی کس راہ پر گئے ہیں ، امر سنگھ کی فوج اب بالکل منتشر ہو چکی تھی اور دسمبر ۱۸۵۸ء تک اس علاقے میں امن قایم ہوتا گیا ، باغی سردار پوشیدہ ہو گئے لیکن شاہ آباد کے بہت سے باغیوں نے اب بھی ہتھیار نہ ڈالے تھے کیوں کہ

ان کو اودھ اور گورکھپور سے مدد آنے کی امید تھی ، باغی سردار سید تھا سنگھ ابھی تک پالاموؤ غازی پور اور نیپال کی پہاڑیوں کے درمیان پھر رہا تھا جس کو گاؤں کے لوگ پُرجوش طریقے پر امداد دیتے تھے [1]

کمانڈر نبی بخش خاں

ان تمام معرکوں میں کنور سنگھ اور امر سنگھ کے ساتھ کمانڈر نبی بخش خاں بھی تھے جن کی فوجی قابلیت اور جنگی صلاحیتوں کا لوہا انگریزوں نے مانا ہے ۔ حسب عادت ، نبی بخش خاں کو کنور سنگھ سے علیحدہ کرنے کی بھی کوششیں کی گئیں ، چناں چہ ایک انگریز کمانڈر اپنی مراسلت میں تسلیم کرتا ہے کہ ۔

"میں نے کنور سنگھ اور امر سنگھ کی رفاقت سے جنگجو پٹھان نبی بخش خاں کو چھڑانے کی بہت کوشش کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر ناکام رہا ، بلکہ ذاتی طور پر بھی اس سے ملا اس نے مجھ سے مصافحہ کرنا بھی گوارا نہ کیا ، کمانڈر نبی بخش فنونِ جنگ میں طاق اور تنظیم لشکر میں ماہر ہونے کے علاوہ فطرتاً نڈر اور بے باک ہے ، اس کے مطیع نہ ہونے کے باعث زک پر زک مل رہی ہے" ۔

یوں کام نہ چلا تو دوسری چالیں چلی گئیں ، مندر و مسجد کے جھگڑے کھڑے کرنا چاہے تھیلیوں کا منھ کھولنا چاہا مگر ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا اور پٹھانوں اور راجپوتوں کی مشترکہ فوجیں ہر جگہ انگریزوں کے چھکے چھڑاتی رہیں جب لندن میں یہ مسائل زیر بحث آئے تو ایک انگریز نے کہا ۔

"وہ ہیں کمانڈر نبی بخش کی کہانیاں عجیب و غریب انداز میں سنائی جاتی ہیں جیسے

1 Datta, p 178

وہ کسی سنسنی خیز کہانی کا پُراسرار ہیرو اور لاثانی طاقت کا مالک ہو، ایسی رپورٹوں کا ہی یہ اثر ہے کہ انگریز عورتیں اور بچے اس کا نام سُن کر کانپ اٹھتے ہیں، آخر یہ معمّہ کیا ہے کہ ہمارے نام ور اور بہادر جرنیل بھی اس سے مرعوب ہیں اور اس کی فوجی چالوں کو نپولین اور ولنگٹن سے زیادہ کام یاب بتاتے ہیں ..... ان تینوں کو ناقابلِ تسخیر لوہے کی لاٹ سمجھنا درحقیقت ہماری شکست ہے"[۵]

امرسنگھ کی شکست کے بعد نبی بخش خاں بھی جنگلوں میں روپوش ہو گئے، کہا جاتا ہے کہ ایک جنگلی شیر نے ان کو قیدِ حیات سے آزاد کر دیا۔

دوسرے علاقے

دانا پور میں فوجی بغاوت کی خبر پا کر مختلف مرکزوں پر فوراً ہندوستانی فوجوں نے بغاوت کر دی، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سب لوگ پہلے ہی تمام پروگرام طے کر چکے تھے، ہر جگہ تقریباً ایک ہی سے واقعات رونما ہوئے۔

سیگولی (چمپارن) کی فوج نے ۲۵ جولائی کو دانا پور کے ساتھ ہی بغاوت کی۔ افسروں کو قتل کیا، انگریزوں کے مکانات پر حملہ کیا۔ پہلی اگست کو انگریز افسران گیا سے فرار ہو گئے، ۳ اگست کو قیدی چھڑائے گئے، جیل کو توڑ دیا گیا مگر ۱۱ اگست کو یہاں پھر انگریزی قبضہ ہو گیا، گیا پر قبضہ کر کے انگریزی دستے دوسرے علاقوں میں بھی روانہ کیے گئے، جہان آباد کے قریب ایک گاؤں میں دو سو باغیوں سے تصادم ہوا باغی منتشر ہو گئے۔ نوادا، جہان آباد، راج گر، امرتھو وغیرہ علاقوں میں حیدر علی خاں

---

[۵] روزنامہ "الجمعیۃ": دہلی ۱۵ اگست ۱۹۵۷ء

احمد علی خاں، حگو سنگھ، مہدی علی، ننگو سنگھ، فتح سنگھ، حسین بخش، غلام علی وغیرہ بغاوت کی رہ نمائی کر رہے تھے اور پرگنہ راج گیر میں اپنا راج قایم کرلیا تھا، اُدھر گورکھپور (اودھ) میں میر محمد حسن کی بغاوت اور موجودگی سے انگریز افسر اور ان کے وفادار راجہ پریشان تھے[1] مظفر پور میں باغی رجمنٹ نے خزانے پر حملہ کیا، جج اور کلکٹر کے مکانات لوٹے اور تھانہ کے ایک جمع دار کی رہ نمائی میں وہاں سے چلی گئی، ۸ راگست کو آرہ کے دو ہزار باغیوں نے سہسرام پر حملہ کیا۔ نوادا میں حیدر علی خاں نے باغیوں کی رہ نمائی کی اور بغاوت پر آمادہ کیا ان کے چند ہمراہی گرفتار اور باقی منتشر ہوئے ــ بھاگل پور کی باغی فوج اگست ۱۸۵۷ء میں نوادا ہو کر گیا کی طرف آرہی تھی مگر انگریز مقابلے کی ہمت نہ کر سکے اور باغی گیا کے قریب آگئے۔ یہاں انگریزی فوج سے ایک خوف ناک تصادم ہوا۔ گورنر کی رپورٹ میں لکھا ہے کہ

> " باغیوں نے اگرچہ اس تصادم میں کافی نقصان اٹھایا مگر پولس بٹالین کو بھی زبردست نقصان اٹھانا پڑا اور قبل اس کے کہ بٹالین وہاں پہنچے وہ یہاں سے نکل کر گیا پر قابض ہو گئے ": [2]

گیا پہنچ کر انھوں نے انگریزوں کی ایک پناہ گاہ پر حملہ کیا، جیل چھوڑ کر قیدی چھڑا لیے اور منصف کو قتل کر کے ۸، ۹ ستمبر کو ٹکاری اور سون کی طرف چلے گئے، ان کے روکنے کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوسکی، اس دوران میں مختلف علاقوں میں برابر بغاوتیں ہوتی رہیں

---

1. Datta, pp. 131, 132, 133

2. "Bengal under " p. 76

جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔ جون ۱۸۵۸ء میں پھر جہان آباد کے تھانے پر حملہ کیا گیا۔ سرکاری عمارتیں جلائی گئیں اور داروغہ کو مار کر تھانے کے سامنے ایک درخت سے لٹکا دیا۔

جودھر سنگھ اور حیدر علی

ضلع چھپرہ میں جہاں باغی رفتہ رفتہ جمع ہو گئے تھے ایٹوا (Etwa) کے مقام پر انگریز افسر کے کیمپ پر حملہ کیا گیا (۲۱ جون ۱۸۵۸ء) جو دھکیل دیا گیا۔ ۲۹ جون کو انگریزی فوج نے جودھر سنگھ کے بھائی ہیتم سنگھ کے ساتھیوں پر نماوان (Nimawan) میں اچانک حملہ کیا، باغی وہاں سے ہٹ کر پن پن ندی کے کنارے پہنچے اور منتشر ہو گئے۔ اب کیپٹن ریٹرے ان کی خاص ٹولی کی طرف متوجہ ہوا جو کہ جودھر سنگھ کی رہنمائی میں تھی ۴ جولائی ۱۸۵۸ء کو بہ مقام کسما[1] ایک خوں ریز جنگ کے بعد جودھر سنگھ کو شکست ہوئی لیکن پکڑا نہ جا سکا، رفتہ رفتہ ضلع گیا میں بغاوت کے شعلے مدھم پڑ چکے تھے۔ لیکن بغاوت دور دراز تک پھیلی ہوئی تھی شمال مشرقی علاقے کے باغیوں کی رہنمائی حیدر علی خاں نامی سردار نے کی اور پرگنہ راج گیر کو حاصل کرنے کی کوشش کی تھی، بالآخر گرفتار کر کے پھانسی دی گئی اور گرفتار کرنے پر ایک انگریز کرٹن کو دو سو روپے انعام ملا۔ گیا کے قریب وزیر گنج کے باغی کوشیل سنگھ کی رہنمائی میں تھے جس نے ۴ جنوری ۱۸۵۸ء کو بغاوت کا علم لہرایا اور تمام علاقے میں اپنا نظم و نسق قایم کر دیا تھا[2]۔

۱۔ KUSMA.

2. Chattopadhyaya p. 128

بھاگل پور ڈویژن

داناپور میں فوجوں کی بغاوت سے بھاگل پور کے علاقوں میں بھی خطرے کے آثار نمودار ہو گئے۔ چناں چہ بھاگل پور کی رجمنٹ ۵ کے ہتھیار چھین لیے گئے مگر ۱۴ر اگست کو آدھی رات کے وقت رجمنٹ ۵ نے بغاوت کی اور کوئی نقصان کیے بغیر روہنی کے باغی فوجیوں سے جا ملی جہاں کے باشندوں سے بارہ ہزار روپے جمع کر کے وہ باؤسی چلے گئے۔ ۹ر اکتوبر کو ہندوستانی انفینٹری (۳۲) نے اچانک بغاوت کر دی، افسروں کو قتل کر دیا اور لوٹ مار کے بعد اسی راہ سے روہنی روانہ ہوئی جس پر پہلی باغی رجمنٹ گئی تھی، باقی باغی سپاہیوں نے انگریز افسران کو اُن کے گھروں پر جا کر ہلاک کیا۔ ایک اور دستے نے رام پور ہٹ میں بغاوت کی اور بھاگل پور پہنچا۔ نومبر اور دسمبر میں مزید فوجی دستے باغی ہو گئے اور روانہ ہوئے، ۹ر دسمبر کو انگریزی فوجوں نے ان کا پیچھا کیا اور ۱۱ر کی صبح کو اچانک چھاپہ مارا انقلابی سپاہی بڑی بہادری سے لڑے جس کا خود گورنر ان الفاظ میں اقرار کرتا ہے۔

> "اس موقعے پر انھوں نے اس قدر مستقل مزاجی سے حملہ کیا جو کسی بلند مقصد کے شایانِ شان تھی، ان میں سے کچھ لوگ اور خصوصاً ایک رسالہ دار مختلف چھوٹے دستوں کی کمان کر رہے تھے جو قابلِ تعریف طور پر ترتیب دیے گئے تھے۔"

صرف ایک آدمی انگریزوں کے ہاتھ آ سکا جسے پھانسی دی گئی اور باقی لوگ گھنے کہر میں غائب ہو گئے، ۱۲ر دسمبر کی صبح کو یہ اطلاع ملنے پر کہ یہ سوار ناتھ پور پر کوسی ندی پار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، انگریز افسر انھیں روکنے کے لیے بڑھے۔ یہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ سوار اب ناتھ پور سے چھتیس میل دور چیترا پر ہیں۔ اسی وقت ڈھاکے سے باغیوں کے مقابلے میں مدد کرنے کا پیغام پہنچا اور انگریزی فوج وہیں روانہ ہو گئی، ۲۰ر کو معلوم ہوا کہ ڈھاکے کے باغی

مہانندی پار کر کے دار جیلنگ روڈ پر جا رہے ہیں۔ وہ فوراً وہیں پہنچے، کافی دیر انتظار کے بعد واپسی کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اچانک باغی قریب ہی سڑک پار کرتے نظر آئے، یہاں پھر گورنر بنگال کی زبانی سنیے کہ:

"وہ لوگ ایک چھوٹی سی کھلی ہوئی جگہ سے گذر کر جنگل در جنگل اس قدر تیزی سے جا رہے تھے کہ سٹریوک کی پارٹی کو صرف ایک بار فائرنگ کا موقع مل سکا جس سے صرف ایک آدمی مرا اور وہ سب دوبارہ جنگلوں میں غائب ہو گئے، ڈویا تین میل تک پیچھا مایوس کن اور ناکام ثابت ہوا"۔

انگریز افسر یہاں سے ناکام ہو کر ناتھ پور پہنچے تاکہ ان کو ضلع پورنیا میں داخل ہونے سے روکیں چترا پر تصادم بھی ہوا مگر باغیوں نے پھرتی سے پیچھے ہٹ کر کوسی کو پار کر لیا اور بہت سے گھوڑے جو دریا پار نہ کر سکے وہیں چھوڑ دیئے، میجر رچرڈسن جو کہ دوسرے کنارے پر تھا ان کو نہ روک سکا اور وہ فوراً نیپال کی ترائی کی راہ سے اودھ میں داخل ہو گئے۔

راج شاہی ڈویژن

ڈھاکہ اور دوسری جگہوں کی بغاوتوں سے اس علاقے میں بھی خطرے کے آثار پیدا ہو گئے، یہاں کے انقلا.بی انگریزوں کے اچانک قتلِ عام کی یہ اسکیم بنا رہے تھے کہ افسروں کو کھانے کے کمروں میں قتل کیا جائے۔ مگر جولائی میں یہ اسکیم انگریزوں پر کھل گئی اور انھوں نے گرفتاریاں اور انتظامات کر لیے اور ڈھاکہ سے آنے والی باغی رجمنٹوں کو روکنے کے انتظام میں مصروف ہو گئے۔

ان رجمنٹوں نے ۳ نومبر کو برہمپتر پار کیا اور ضلع رنگ پور میں داخل ہوئیں مگر یہاں جلپائی گوڑی کے لیے مناسب راہ نہ پاکر ۸ دسمبر کو بھوٹان کی سرحد میں چلی گئیں، ۲۰ دسمبر کو انگریزی فوجیں پیچھا کرتی ہوئی ان کے کیمپ کے قریب جا پہنچیں مگر کہر سے تمام فضا دھندلی تھی اور کچھ

نظر نہ آتا تھا جب کہر ہٹا تو انقلابیوں کو انھوں نے امید سے زیادہ مضبوط پوزیشن میں پایا۔ اور انگریزی فوجیں بجائے حملہ کرنے کے واپس لوٹ آئیں انقلابیوں نے فوراً یہ جگہ چھوڑ دی اور ۲۶ دسمبر کو ٹمٹا پار کرکے نیپال کی ترائی میں چلے گئے، انگریز افسر گورڈن نے بہت کوشش کی کہ انھیں روکے مگر اس کے مخبروں نے جو کہ درپردہ انقلابیوں سے ہم دردی رکھتے تھے غلط اطلاعات دے کر چکرا دیا، خصوصاً ایک شخص نے جو بہ ظاہر اسے اطلاعات دیتا تھا اور دراصل باغی سپاہ کی امداد کر رہا تھا انگریز افسر کو بے حد پریشان کیا۔[1]

دسمبر ۵۸ء کے تیسرے ہفتے میں نیپال کا جنگ بہادر بیتیا میں آیا، اس کی فوجیں برابر باغیوں کو کچلنے کے لیے دوڑ دھوپ کر رہی تھیں تب بھی ان سب کی متحدہ فوجیں باغیوں کی پیش قدمی کو فوراً نہ روک سکیں، اوائل جنوری ۵۸ء میں باغیوں نے چونا ہنت کے پختہ اور عالی شان مکان پر قبضہ کر لیا جس میں ایک ہزار آدمی رہ سکتے تھے۔ ان کو پکڑنے کی تمام کوششیں جو متعدد انگریز اور نیپالی افسر کر رہے تھے، ناکام ہوگئیں اور ۲۷ جنوری کو وہ جنگ پور کی راہ سے بڑھے۔ ادھر انگریزی دستے بڑھ رہے تھے تاکہ باغی فوجوں کو گنڈک ندی پار کرنے سے روکیں لیکن وہ بجائے گنڈک پر آنے کے تربینی گھاٹ کی طرف ترائی میں چلے گئے اور یہاں اپنے راستے میں بغیر کسی رکاوٹ کے بڑھتے چلے گئے۔[2]

قومی بغاوت

بہار میں تحریک کی نوعیت سمجھنے کے لیے کمشنر پٹنہ (ای۔ اے سیمول) کا خط کافی ہے جو اُس نے گورنمنٹ بنگال کے سکریٹری کو ۲۵ دسمبر ۱۸۵۸ء

1. Bengal under Governors,
2. Datta, p. 136

کو لکھا۔ اس نے تحریک کو "ہندوستان کی عظیم بغاوت" قرار دیتے ہوئے لکھا کہ "شاہ آباد میں یہ تحریک اپنے اندر قومی بغاوت کے تمام اعلیٰ اوصاف رکھتی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔" [1]

میرٹھ کے باغیوں نے جب اپنے آپ کو بہادر شاہ کے سامنے پیش کیا اور جاگیرداروں اور عوام کے ایک طبقے نے اس کی حمایت کا اعلان کیا تو تحریک نے جلد ہی عوامی بغاوت کی شکل اور سیاسی رنگ اختیار کر لیا؛ اس طرح جو تحریک مذہبی جنگ کی صورت میں شروع ہوئی، آزادی کی جنگ پر ختم ہوئی۔ کیوں کہ اب اس امر میں خفیف سا شبہ بھی باقی نہیں کہ باغیوں کا مقصد اجنبی اقتدار سے آزادی حاصل کر کے پرانا نظام قائم کرنا تھا جس کا جائز نمائندہ شاہ دہلی تھا"۔

—— ڈاکٹر ڈیتیں: ص ۱۱۴

---

1. Datta, p. 112

بنگال اور آسام

بنگال اور آسام جیسے دور دراز علاقے بھی بغاوت کی آگ سے محفوظ نہ رہے۔ چناں چہ سب سے پہلی چنگاری بنگال ہی سے لگی تھی اور اب بھی یہاں انگریزوں کے لیے "خطرے" کے آثار نظر آتے تھے، کیوں کہ بارک پور میں ہندوستانی فوج بگڑی ہوئی تھی پھر، انگریزی ظلم و بربریت کے زندہ نمونے یعنی شاہِ اودھ اور امیران سندھ کلکتے میں مقیم تھے۔ جن کے آدمی خفیہ طور پر باغیانہ سرگرمیوں میں شریک تھے، مثلاً علی نقی خاں کا حال ہم پچھلے صفحات پر دیکھ چکے ہیں۔

کلکتہ باغیانہ خیالات کا پرچار کلکتے میں جاری تھا، فوجیوں اور ہندو مسلمان عوام کو بتایا جا رہا تھا کہ حکومت اپنے مقصد کے لیے ان کا دین دھرم خراب کرنا چاہتی ہے اور مختلف طریقوں سے یہ کام کر رہی ہے۔ ۱۶ رمئی ۱۸۵۷ء کو ایک سرکاری اعلان جاری کیا گیا جس میں چکنے کارتوسوں کی افواہ کو غلط قرار دے کر بتایا گیا تھا کہ یہ افواہیں چند بدمعاشوں نے پھیلائی ہیں، نہ صرف فوج میں، بلکہ عوام میں بھی —— اس کے باوجود جون میں حالت اس قدر غیر یقینی ہو گئی تھی کہ گورنر جنرل نے ۱۳ر جون کو انگریزی

رضاکار بھرتی کرنے کا اعلان کیا ۱۴ رجون کو خطرے کے آثار پورے عروج پر پہنچ گئے تھے خطرہ دور کرنے کے دوسرے انتظامات کے علاوہ ایک کام یہ بھی کیا گیا کہ پریس پر پابندی لگادی گئی اور ہندوستانی پریس کو ۱۸۳۵ء میں جو کسی حد تک آزادی دے دی گئی تھی وہ پھر چھین لی گئی۔ انگریزی اخبار "فرینڈز آف انڈیا" کو ۲۶ رجون کو وارننگ دی گئی جس نے ۲۵ رجون کی اشاعت میں "پلاسی کی ایک صدی" کے عنوان سے ایک ایسا مضمون شایع کیا جس میں "خطرناک" اشارے کیے گئے تھے، اسی طرح تین اور اخبارات کے پرنٹر اور پبلشروں پر باغیانہ مضامین شایع کرنے پر مقدمہ چلانے کا حکم ہوا۔ یہ تین اخبار "دربن"، "سلطان الاخبار" اور "سماچار سدھا برشن" تھے۔ ۳ رجولائی کو ایک اور اخبار "گلشن نوبہار" کے پریس پر چھاپہ مارا گیا اور باغیانہ تحریروں کی بنا پر اخبار بند کردیا گیا۔ ۱۰ رستمبر کو "ہرکارو" بند کر دیا گیا تھا مگر پروپرائٹر کے معافی مانگنے پر چھوڑ دیا گیا۔ ایک خفیہ سازش کا بھی علم ہوا جو شاہ اودھ کو رہا کرانے اور انگریزوں کو سوتے میں اچانک قتل کرنے کے لیے تھی، قلعے کے جنگی گودام کو اڑانے کے لیے بھی سازشیں ہو رہی تھیں۔ انگریزوں نے دہلی سے آئے ہوئے دو پیغام بر بھی گرفتار کیے جو انگریزی جھنڈے کی جگہ ہندوستانی جھنڈا نصب کرنے کی تمام اسکیم طے کرچکے تھے۔ ایک انگریز کہتا ہے ۔

"کینہ مفسدین کا ہماری جانب اس قدر ہے کہ اگر ہو سکے تو ہماری بیخ و بُن اکھاڑ ڈالیں"۔ [1]

---

[1] "محاربہ عظیم" / ۱۳۶

حالات اس قدر خطرناک تھے کہ انگریز ذرا سی افواہوں پر بھاگنا شروع کر دیتے تھے۔
چناں چہ ۱۴ر جون اتوار کے دن بھی وہ اسی طرح پریشان ہو کر بھاگے اور شاید اسی لیے اس
دن کو "تکلیف دہ اتوار" (Panic Sunday) کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ پیش
بندی کے طور پر بارک پور کی ہندوستانی سپاہ سے ہتھیار لیے گئے جو بغاوت کے لیے
موقعے کی منتظر تھی۔ دانا پور کی بغاوت کے بعد دوسری رجمنٹوں سے بھی ہتھیار رکھوا لیے
گئے۔ مقامی باشندے کثیر تعداد میں ہتھیار خرید رہے تھے مگر (نہ جانے کیوں) وہ
خاموش ہی رہے اور انگریزوں کے سر سے خطرہ ٹل گیا۔ گورنر بنگال کی رپورٹ سے
ظاہر ہوتا ہے کہ گورنمنٹ بنگال کا کوئی علاقہ ایسا نہ تھا جو بغاوت کے واقعات یا شورش
کے خطرے سے محفوظ رہا ہو۔

ناڈیا ڈویژن کے دوسرے علاقے

دہلی اور میرٹھ میں تحریکِ آزادی شروع ہونے کی اطلاع پہنچی تو مختلف مقامات
پر انگریز افسروں نے "وفاداری" کے لکچر دیے اور مقامی لوگوں سے ہتھیار چھین لیے۔
۲۳ر جون تک بہرام پور میں امن رہا، اگرچہ مرشد آباد میں باغیانہ اشتہارات پائے گئے
۲۳ر جون کو — جو کہ جنگ پلاسی کی صد سالہ یادگار تاریخ تھی — شورش کے آثار
پیدا ہو گئے اور یقین تھا کہ اس دن فوجیں بغاوت کریں گی مگر مرشد آباد کے نواب نے
انگریزوں کی پوری مدد کی اور اس طرح بغاوت کا امکان ختم ہو گیا، جیسور کے محافظ دستے کی
ایک سازش کا انکشاف ہوا تو ایک جمع دار کو پھانسی دی گئی اور دو سپاہی جلا وطن کرنا
طے ہوئے مگر اُن دونوں نے رات کے وقت، اپنی کوٹھریوں میں خودکشی کر لی، تمام علاقے میں
پولس کے انتظامات مضبوط کر دیے گئے، جیسور کے قریب جنگر گچھہ کے ایک پولس جمع دار

محمد علی نے ایک مذہبی اعلان مشتہر کیا جس میں کہا گیا تھا کہ فیصلہ کا دن آپہنچا۔

ناڈیا ڈویژن کے دیگر علاقوں مثلاً کرشنا گڈھ وغیرہ میں بھی گڑبڑ کے امکانات تھے۔

بردوان ڈویژن

بردوان ڈویژن کے علاقوں میں اگرچہ کوئی زبردست بغاوت نہیں ہوئی پھر بھی، ڈھاکہ، فرید پور، باقر گنج، سلہٹ اور چٹاگانگ وغیرہ میں ہنگامے ہوئے، بیجپٹ کا زمین دار بھی باغیانہ رجحان رکھتا تھا۔

جون میں ضلع ڈھاکہ میں گڑبڑ پیدا ہوئی۔ یہاں مسلمانوں کی ایک جماعت تھی جس کی رہ نمائی کرامت علی نامی ایک مولوی کرتے تھے اور وہی بغاوت کا باعث ہوئے مگر یہ شورش آسانی سے دبا دی گئی۔ کھاسیہ پہاڑوں سے اطلاع ملی کہ یہاں برطانوی راج کے خاتمے کی خبریں پھیلنے پر پہاڑی سرداروں میں جوش و خروش پیدا ہو گیا ہے اور جین تیا کا سابق راجہ اپنی چھنی ہوئی سلطنت دوبارہ حاصل کرنے کے مشورے کر رہا ہے۔ لہٰذا راجہ کو فوراً سلہٹ میں نظربند کر دیا گیا۔ ڈھاکے کی فوجوں نے بغاوت کی اور ایک تصادم کے بعد یہاں سے روانہ ہو گئیں (۲۱ نومبر) اور برہم پتر کو پار کر کے رنگ پور میں داخل ہوئیں۔

چٹاگانگ میں ۱۸ نومبر ۱۸۵۷ء کی رات کو رجمنٹ ۳۴ کی تین کمپنیاں اچانک باغی ہو گئیں۔ انھوں نے خزانہ لوٹا، جیل کو توڑا اور ایک برقنداز کو جس نے انھیں روکنا چاہا تھا، قتل کیا، اور یہاں سے روانہ ہو گئے، اسی طرح مختلف رجمنٹوں نے بغاوت کی اور مختلف ضلعوں میں ان کا پیچھا کیا گیا مگر زیادہ تر ناکامی ہوئی، ۲۳ دسمبر کو باغی دستے کاچار میں داخل ہوئے انگریزی فوجوں نے دو مرتبہ حملہ کیا مگر وہ گھنے جنگلوں میں داخل ہو گئے جہاں پہنچنا انگریزوں کے لیے ناممکن تھا اور کامیابی کی بھی امید نہ تھی، گورنر بنگال کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ باغی اپنی شکستوں سے بے پروا

نظر آتے تھے اور ابھی تک بڑی تعداد میں جمع تھے وہ منی پور کی طرف بڑھ رہے تھے ۱۲ر جنوری ۱۸۵۸ء کو انھوں نے منی پور کی سڑک پر سکھیا پور گاؤں کے قریب ایک مورچہ بنا لیا اور انگریزی فوجوں سے مقابلہ کیا، یہاں تین انگریزی فوجیں بہ یک وقت اُن پر حملہ آور ہوئیں مگر اُن کی بہادری اور جرات کی تعریف گورنر بنگال سے سنیے

"باغی نہایت ہی بہادری اور استقلال سے ڈیڑھ گھنٹے تک لڑے اور اس کے بعد لاشیں چھوڑ کر چلے گئے"۔

۲۲ر جنوری کو چالیس باغیوں کی ایک پارٹی پر حملہ کیا گیا اور اسی طرح ان کو منتشر کیا جاتا رہا۔ سلہٹ سے اطلاع ملی تھی کہ ایک زمین دار حاجی سید بخت ہتھیار جمع کر رہا ہے۔ تحقیقات پر پتہ چلا کہ اس کی پاس چھ توپیں ہیں جن کو وہ ہر سال محرم میں داغتا ہے مگر یہ توپیں اس سے چھین لی گئیں۔

آسام

صوبہ آسام میں ستمبر ۱۸۵۷ء میں بغاوت کے آثار ظاہر ہوئے اور ڈبرو گڈھ کی فرسٹ آسام لایٹ انفینٹری کے سپاہی بغاوت کی خفیہ سازشوں میں شریک تھے اور منظم پلان بنا رہے تھے چناں چہ آرہ اور جگدیش پور سے ان کے پاس خطوط آتے رہتے تھے، نیز تمام ہندوستانی افسران راجہ سارنگ سے بھی خط و کتابت اور تعلق رکھتے تھے جس کا نام کندار پیسور سنگھ تھا اور وہ جورہٹ (Jorhat) میں رہتا تھا اسی راجہ کے مکان میں یہ لوگ راتوں کو خفیہ جلسے کرتے تھے، آسام کی پرانی ملیشیا کے

لوگ بھی مشوروں میں شریک تھے۔

منی رام دت

انگریز حکام کو اس سازش کی قبل از وقت اطلاع مل گئی اور انھوں نے نومبر میں راجہ کو پکڑ لیا، اس کا دیوان منی رام دت کلکتے میں مقیم تھا، راجہ کی تلاشی پر منی رام دت کی باغیانہ خط و کتابت کا سراغ ملا۔ ساتھ ہی کچھ اور خطوط بھی ملے جو نئے بنائے ہوئے طرز تحریر میں تھے اور ان پر دستخط بھی نہ تھے۔ دیوان کو کچھ عرصے علی پور جیل میں رکھا گیا اور پھر فروری میں پھانسی دے دی گئی، راجہ علی پور جیل میں رہا۔

اکتوبر میں پھر ڈبروگڈھ کی فوج میں بے اطمینانی پھیلی، ضلع گول پارا میں ڈھاکہ کی بغاوت کے موقعے پر بغاوت ہوئی، باغیوں نے کوری باری کا تھانہ برباد کر دیا اور لوٹ مار کی۔

چھوٹا ناگ پور اور کٹک

موجودہ صوبہ اڑیسہ کے شمال میں چھوٹا ناگ پور ڈویژن کا علاقہ حکومت بنگال کے تحت تھا جواب بہار میں شامل ہے اس ڈویژن کے تمام علاقوں میں سب سے زیادہ بغاوتیں رونما ہوئیں جن کا ایک ہلکا سا اندازہ گورنر بنگال کے ان الفاظ سے ہوتا ہے

> "بغاوت کے دوران میں چھوٹا ناگ پور ڈویژن گڑبڑ اور بے چینی کا سرچشمہ رہا ہے اور وہ اکثر موقعوں پر نہ صرف الجھنوں اور پریشانیوں کا باعث رہا بلکہ عملی طور پر خطرے کا ذریعہ بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ بنگال کے کسی علاقے میں اس قدر مسلسل شورشیں نہیں ہوئیں جتنی کہ اس علاقے میں ہوتی رہیں۔ یہاں تمام مقامات پر باغیوں

نے محاصرہ کیا، جیل توڑے خزانے لوٹے اور کھلی بغاوت کی، پالامئو میں، چیباسا میں اور سنبھل پور میں زبردست بغاوتیں ہوئیں جن کی بجھتی ہوئی چنگاریاں ابھی تک اندر ہی اندر بھڑک رہی ہیں" [1]

ہزاری باغ اور رانچی

دانا پور میں بغاوت کی خبر سُن کر ۳۰ر جولائی کو ہزاری باغ کی فوج نے بغاوت کی جیل کو توڑا، خزانہ لوٹا اور کافی نقصان پہنچا کر روانہ ہوگئی، انگریزوں نے ڈورانداسے رام گڈھ بٹالین کا ایک دستہ بھیجا مگر راستے میں وہ بھی باغی ہوگیا اور تمام سامان اور میگزین پر قبضہ کرکے رانچی کی طرف چلا تاکہ وہاں انگریزوں کی قیام گاہ پر حملہ کریں اس دوران میں ڈورانڈا میں بھی بغاوت ہوگئی، خزانہ لوٹا گیا، بنگلے جلادیے گئے، قیدی چھڑائے گئے، گرجا کی توپ سر کی گئی اور اس کے بعد انقلابی عوام ڈورانڈا ملٹری اسٹیشن کے فوجی دستوں سے مل گئے (رانچی اور ڈورانڈا تین یا ۴ میل کے فاصلے پر ہیں)۔ ۵ر اگست کو پرولیا میں بھی بغاوت ہوگئی اور یہی واقعات رونما ہوئے۔ انگریز رانی گنج چلے گئے، ادھر سنبھل پور اور چیباسا میں بھی گڑبڑ شروع ہوگئی، چیباسا کا کمشنر رانچی میں بغاوت کی خبر سن کر بھاگ گیا اور راجہ سرائے کھیلا کے پاس پناہ لی جو انگریزوں کا "وفادار" تھا۔

ہزاری باغ کی باغی رجمنٹوں کے متعلق شبہ تھا کہ وہ سنبھل پور کی طرف گئی ہیں مگر اگست ۵۷ء تک یہاں سکون رہا، اگرچہ یہاں صوبے دار بارج گوڑی خاں کو رانچی کے باغی فوجی افسر کا خط ملا (جو وہاں انتظامات سنبھالے ہوئے تھا) جس میں ہدایت

---

1. "Bengal Under " —98

کی گئی تھی کہ خزانہ لے کر آ جاؤ اور قیدی چھڑا دو مگر صوبے دار نے یہ خط انگریز کیپٹن اَپہہ کو دکھادیا ۱۸ اگست کو جب حالات بہت خراب ہوئے تو گورنر بنگال کے حکم سے چھوٹا ناگ پور ڈویژن میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ ۲۸ اگست کو ہزاری باغ دوبارہ انگریزوں کے قبضے میں آ گیا رانچی ابھی تک آزاد تھا مگر ۱۱ ستمبر کو باغی توپیں اور میگزین لے کر پالاموّ کی راہ سے کنور سنگھ سے ملنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ رانچی کے باغی شمال کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لیکن ان کا کہیں پتہ نہ چلتا تھا، کرنل فِشر نے ایک خط میں چیف آف اسٹاف کلکتہ کو لکھا۔

"یہ بات حیرت ناک ہے، مگر حقیقت ہے کہ باغی مع توپوں کے ایک چھوٹے سے صوبے میں گھوم رہے ہیں مگر کوئی فوجی یا غیر فوجی افسر نہیں کہہ سکتا کہ وہ کہاں ہیں" [۱]

وہ چترا پہنچے، میجر انگلش نے یہاں ۲ اکتوبر کو ان پر حملہ کیا اور ایک سخت خوں ریز معرکے کے بعد انقلابی منتشر ہو گئے، دو باغی سردار جے منگل پانڈے اور نادر علی جنگل سے گرفتار ہوئے اور ان کو پھانسی دے دی گئی۔

چے باسا

شروع ستمبر میں چے باسا میں بھی بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے باغیوں نے خزانہ لوٹا، جیل کو توڑ دیا اور یہاں سے روانہ ہو کر راجہ پراہست سے جا ملے اور خزانہ اس کے حوالے کر دیا، اس دوران میں انگریز برابر تیاریاں کر رہے تھے انھوں نے ایک پولس فورس بنائی جس میں کولوں اور سنتھالوں کو بھرتی کیا، ۱۱ ستمبر کو پرولیا بغیر کسی مقابلے کے قبضے میں آ گیا تو اب چے باسا کی فکر ہوئی اور ۱۶ ستمبر کو انگریزوں کی

---

1. K. K. Datta p. 123

فوجیں جن میں کول استعمال، راجہ سرائے کھیلا کے دستے اور کرساواں کے زمیں دار بھی شامل تھے، اچے باسا پر حملہ آور ہوئیں۔ اسی طرح آخر ستمبر تک تمام علاقوں پر دوبارہ قبضہ ہو گیا، مختلف مقامات پر ہنگامے سختی سے دبا دیے گئے۔ لیکن ضلعے کے ایک علاقے میں جو بیچیٹ کی سرحد پر ہے زبردست شورش تھی یہاں کے زمیں دار تحریک آزادی میں شریک تھے جن کو گرفتار کر کے سزائیں دی گئیں، اکتوبر کے آخر تک زیادہ تر مقامات انگریزوں کے دوبارہ قبضے میں آ گئے تھے مگر دو ڈیژن کا جنوبی علاقہ ابھی تک باغی تھا مان بھوم کے سنتھال مشتعل تھے بیچیٹ کا رہنما رگھمانی سنگھ دیو اپنی فوجوں کو مسلح کر کے جنگ کی تیاریاں کر رہا تھا سنگھ بھوم میں راجہ پوراہت انگریزوں کے لیے مصیبت بنا ہوا تھا، نومبر میں بیچیٹ کا زمیندار اچانک فوج بھیج کر گرفتار کر لیا گیا، کچھ دن بعد راجہ پوراہت نے بھی ہتھیار ڈال کر معافی مانگ لی۔ خزانہ اور بہت سے سپاہی انگریزوں کے حوالے کر دیے جن میں سے اکثر کو پھانسی اور باقی کو قید کر دیا گیا۔

دیوان جگو

کہا جاتا ہے کہ راجہ پوراہت کا دیوان جس کا نام جگو تھا، اس علاقے میں تحریک آزادی کا اصل محرک تھا، اس نے کولوں کو بغاوت پر آمادہ کیا تھا اور اسی نے راجہ کو بغاوت میں حصہ لینے کو تیار کیا اور راجہ پر پورا زور ڈالا کہ وہ اپنے کو انگریزوں کے حوالے نہ کرے مگر نادان راجہ نہ معلوم کیوں اچانک غداری پر آمادہ ہو گیا تو دیوان جگو اکیلا ہی باغی فوجوں کی قیادت کرتا رہا، اس کی گرفتاری کے لیے انعام مقرر تھا۔ نومبر کے آخر میں کپتان برچ نے انقلابی فوجوں پر حملہ کیا جو دیوان جگو کی رہنمائی میں تھیں مگر حملے سے پہلے ہی دیوان کو اچانک اُس کی قیام گاہ سے گرفتار کر لیا گیا اور اسے پھانسی دے دی گئی، ظاہر ہے کہ سردار کی گرفتاری کے بعد فوجیں کیا لڑ سکتی تھیں۔

تیر کمان اور توپیں

اِن تمام مایوس کُن حالات کے باوجود ابھی تک شورش کے آثار نظر آتے تھے چناں چہ دسمبر کے آخر میں سنگھ بھوم کے مختلف قبیلوں میں دور تک پھیلی ہوئی بغاوت کی اطلاع ملی۔ انقلابیوں کے رہنما راجہ ارجن سنگھ اور اس کا بھائی تھے۔ انگریزوں کے پاس اب اپنی فوجوں کے علاوہ غداران وطن رجواڑوں کی فوجیں بھی تھیں پھر بھی بہادر کولوں کو آسانی سے دبایا نہ جا سکا جن کو ارجن اور اس کے بھائی نے بغاوت پر آمادہ کیا تھا۔ ان کولوں کے پاس انگریزوں کی توپوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیر اور کمان تھے مگر اس کے باوجود انھوں نے دشمنان وطن کے چھکے چھڑا دیے۔ چناں چہ ۱۴ جنوری کو جب انگریزی فوجیں کولوں کے ایک مجمع کو منتشر کرکے واپس آرہی تھیں تو ایک نالہ پار کرتے وقت انقلابیوں کا ایک زبردست ہجوم نظر آیا جو انگریزوں کی گھات میں چھپا بیٹھا تھا۔ اس ہجوم نے اچانک ان پر حملہ کیا، اور کس طرح؟ گوریز کی زبانی سنیے۔

> "وہ لوگ جو گھات میں بیٹھے تھے حملہ آور ہوئے اور اچانک تین چار ہزار تیروں کی بوچھار کر دی، انھوں نے اپنے نقصان سے بے پروا ہو کر انگریزی دستے کا پیچھا اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک کہ وہ جنگلوں سے کھلے میدان میں آگئے، کوئی افسر بھی زخمی ہوئے بغیر نہ بچا، کیپٹن ہیل کے چار زخم آئے، لفٹنٹ برچ کے بازو میں تیر سے سوراخ ہو گیا۔ صرف دو افسران نسبتاً کم زخمی ہوئے .... کیمپ میں واپس آنے کے بعد طے کیا گیا کہ فوراً چے باسا کو واپس چلنا چاہیے ایسا نہ ہو کر دشمن واپس جانے کا راستہ بھی کاٹ دے"

ان بھاگتے ہوئے انگریزوں کا بھی کولوں نے سات میل تک پیچھا کیا اور اسی دوران میں چکردار پور پر بھی حملہ کیا جو راجہ پراہت کی رہائش گاہ تھی اور اب سرائے کھیلا کا غدار راجہ مع فوج کے مقیم تھا مگر انقلابیوں کے عزم وہمت نے جب دشمنان وطن کو بھگا دیا تو یہ بزدل بھلا کیا ٹکتا!

ان واقعات نے باغیوں کی بڑی ہمت بڑھائی اور انگریزی وقار کو دھکا لگا، راجہ سرائے کھیلا کی شکست اور بھی سونے پر سہاگا ہوگئی۔

انگریزوں کی کامیابی

۱۷ر جنوری سے انگریزوں نے مہم شروع کر دی۔ چکرادر پور میں تقریباً ایک ہزار باغی کرنل فوسٹر نے منتشر کیے اور بے شمار گاؤں جلا کر تباہ کر دیے لیکن ضلعے کے جنوبی علاقوں میں موت و حیات سے بے نیاز باغی کول پھر بڑی تعداد میں جمع ہو گئے جن کو انگریزوں کی ایک زبردست فوج نے ان کے مضبوط مورچوں سے بالآخر باہر نکال دیا۔ سرفروش کول اب بھی خاموش نہ تھے اور سرائے کھیلا کے راجہ کے خلاف جوش و غصے کا اظہار کر رہے تھے، مارچ میں انھوں نے اسسٹنٹ کمشنر کے کیمپ پر حملہ کیا اور مویشی ہمراہ لے گئے، اس کے بعد اپریل اور مئی میں انگریزی فوجوں کو کئی بار سخت مقابلے کرنا پڑے اور ایک مرتبہ ایک پہاڑی وادی کے جنگل میں انھوں نے انگریزی فوجوں کو پھر گھیر لیا اور اونچی چٹانوں سے ان پر تیروں کی بے پناہ بوچھار کی، انگریزی فوجیں بدحواس ہو کر بھاگیں۔ ۹ر جون کو پھر ہزاروں کولوں نے چکرادر پور کے نیول بریگیڈ کا کیمپ گھیر لیا اور تین دن تک سخت جنگ ہوئی، ۱۲ر کو جب انگریزوں کی کئی فوجیں مدد کو آئیں تب کہیں جا کر وہ پسپا ہوئے اور ظاہر ہے کہ اب مقابلہ ناممکن تھا۔

سنبل پور اگست ۱۸۵۷ء میں یہاں بغاوت کا خطرہ پیدا ہوا اور انگریزوں نے انتظامات شروع کر دیے اور اکتوبر میں دو بھائیوں سریندر سہائے اور اودنت سہائے نے آدمی جمع کیے اور موقع پا کر سریندر سہائے ۳۱ر اکتوبر کو سنبل پور سے نکل کر اپنے بھائی سے بہ مقام کھنڈ اجا ملا۔ انگریزی فوجیں پیچھا کرتی ہوئی پہنچیں کئی مقابلے ہوئے مگر ان کو نہ پا سکیں۔ یہاں کے زمیں دار بھی بغاوت پر آمادہ تھے۔ اور حکومت سے مقابلے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اب سنبل پور کے قرب و جوار کا علاقہ باغیوں کے ہاتھ میں تھا، جس کا اڈا یہاں سے تین چار میل دور تھا اور روزانہ رات کو انگریزی مورچے پر گولیاں برساتے تھے۔ انگریز بالکل بے دست پا ہو گئے مگر دوسرے مقامات پر ان کی زبردست فوجیں اور خصوصاً بھاری اور بڑی توپیں وہاں لائی گئیں کیوں کہ گورنر نے مرکزی حکومت سے مدد چاہی تھی۔ گورنر بنگال کو خود اقرار ہے کہ اگر یہ فوجیں اور مدد نہ آتی تو ——

"ملک کے ایک بڑے حصے سے گورنمنٹ کا اقتدار اور اختیار بالکل ختم ہو جاتا اور اس کو دوبارہ قایم کرنا کوئی معمولی کام نہ ہوتا"

چناں چہ ۲۹ر دسمبر کو انگریزی فوجیں مکمل طور پر تیار ہو کر انقلابیوں پر اچانک حملہ آور ہوئیں اور درختوں کے ایک جھنڈ میں ان کو گھیر لیا، یہاں بھی توپوں اور بندوقوں کے مقابلے میں تیر و کمان تھے —— سخت مقابلے کے بعد انقلابی پسپا ہوئے، سریندر سہائے بھاگ گیا، مگر اس پر بھی ان کی ہمتیں نہ ٹوٹیں اور ان کی ایک ٹولی نے سنبل پور اور مدناپور کے درمیان چراپوسا کے ڈاک اسٹیشن پر حملہ کیا، ان کی بڑی بڑی پارٹیاں اب بھی سر میدان جنگ کے لیے موجود تھیں۔ اُن سے انگریز فوجوں کو متعدد مقابلے

کرنا پڑے۔ ۱۴ر جنوری کو کیپٹن بیہہ فوج لے کر گیا۔ باغی پہاڑیوں میں تھے کیپٹن بیہہ کو دیکھ کر وہ مردانہ وار میدان میں آئے اور ایک تصادم کے بعد پھر پہاڑیوں میں چلے گئے۔ ار کو بھی ایک تصادم ہوا، ۱۲ر فروری کو وڈبرج باغیوں کے ایک مرکز پہاڑ سیلنی گور اپر پہنچا مگر انھوں نے ایسی خبر لی کہ یہ کیپٹن خود بھی کام آگیا۔ اس حادثے سے تمام فوج دہشت زدہ ہوگئی اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی دو سپاہی وڈبرج کی ناکام تلاش میں زخمی ہوئے ۱۴ر کو ایک اور زبردست حملہ کیا گیا اور پہاڑیوں کو چاروں طرف سے گھیر کر ان کو منتشر کر دیا گیا مگر باغی اب بھی دوسری پہاڑیوں میں موجود تھے لہٰذا اب اُن پر بھی حملے کر کے وہاں سے نکالا گیا، متعدد گاؤں برباد کر دیے گئے اور بہت سے باغی گرفتار ہوئے۔ سرفار سہائے، اور ادنت سہائے انگریزوں کے ہاتھ نہ آسکے، وہ اب بھی پہاڑیوں میں گھوم کر لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کر رہے تھے اور جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھے مگر پھر کوئی شورش نہیں ہوئی۔

کٹک اس تمام گڑبڑ میں پُرسکون رہا، اگرچہ کبھی کبھی افواہیں پھیلتی رہیں۔

پالامئو

پالامئو میں مختلف ہنگامے ہوئے اور بہ قول گورنر بنگال ---

"دو زمہ میں تو ایسا لگتا تھا کہ تمام علاقہ مسلح ہو کر کھڑا ہو گیا ہے"

باغیوں نے مختلف جگہوں پر حملے کیے ۱۲ر اکتوبر ۵۸ء کو انھوں نے چین پور (ڈالٹن گنج سے ڈمیل) پر حملہ کیا جہاں ٹھاکر رگھبر دیال سے مقابلہ ہوا، پھر وہ شاہ پور کی طرف بڑھے، یہاں کام یابی کے بعد وہ لیسلی گنج (ڈالٹن گنج سے دس میل مشرق) آ گئے، انگریزی پولس اور فوج ان کی آمد پر یہاں سے بھاگ گئی، اس کے بعد رانچی سے انگریزی دستے ان علاقوں میں پہنچے، باغیوں کی سرگرمیاں بہ دستور تھیں، ۲۶ر نومبر کو جودھ سنگھ مع فوج اشاری پہنچا۔

۲۷ نومبر کو باغیوں نے راجھار اور ۲ دسمبر کو منگا اور چھتہ پور کے تھانوں پر حملہ کیا۔ ۸ دسمبر کی جنگ میں انگریزوں نے ان کا سردار دیبی بخش رائے گرفتار کر لیا تو انھوں نے پیچھے ہٹ کر انگریزوں کے ایک "وفادار" کے مکانات پھونک دیے مگر سردار کی گرفتاری نے ان کو دل شکستہ کر دیا تھا اور وہ منتشر ہو گئے، انگریزوں کو باہر سے مدد بھی آ گئی مگر اب ایک اور انقلابی سردار نیلمبر سہائے آدمی جمع کر رہا تھا، وہ جنگلوں میں پوشیدہ رہا اور اپنے اوپر حملے کا موقع نہ دیا، ۱۲ جنوری کو انگریزی فوجیں پالامئو پر حملہ آور ہوئیں، انھوں نے قلعہ گھیر لیا جو انقلابیوں کے قبضے میں تھا مگر آخر کار وہ قلعہ چھوڑ کر ہٹ گئے۔ قبضے کے بعد قلعے میں انگریزوں کو کچھ خطوط ملے جو نیلمبر سہائے اور پیتمبر سہائے کے نام تھے اور ان ہی میں امر سنگھ کے خطوط بھی تھے جن میں کنور سنگھ کی طرف سے فوری امداد کا یقین دلایا گیا تھا، کچھ انقلابی سردار گرفتار کیے گئے مثلاً ونارائن سنگھ اور اس کا دیوان شیخ بھکاری بغاوت میں شریک پایا گیا اور پھانسی دے دی گئی۔

بنگالی عوام

تمام ملک میں بغاوت کی اس قدر آگ بھڑکی لیکن بنگالی علاقے میں اکثر مقامات پر صرف فوجی بغاوتیں ہوتی رہیں، اس کے چند اسباب تھے، اول تو یہ کہ بنگالی فوج کے زیادہ تر سپاہی بنگالی نہیں تھے بلکہ ملک کے دوسرے علاقوں سے تعلق رکھتے تھے اس لیے وہ بنگالیوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے، دوسرے ہندوستانی تاجروں کا ایک طبقہ ایسا تھا جس کا مفاد ایسٹ انڈیا کمپنی سے وابستہ تھا اور یہ طبقہ فطری طور پر کمپنی کا اقتدار پسند کرتا تھا، پھر آبادی کا بڑا حصہ سو سالہ انگریزی رہن سہن، اقتدار و حکومت کی بدولت اسی تہذیب و تمدن کی طرف مایل تھا۔ بہت سے لوگ پادریوں کی

مسلسل کوششوں کے نتیجے میں عیسائیت کی طرف راغب تھے، اسی بنا پر بنگال کے بعض مقامات مثلاً ڈھاکہ وغیرہ میں صرف فوجوں نے بغاوت کی اور عوام خاموش رہے۔

"جو حالات فراہم کیے گئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی اچانک یا الگ تھلگ واقعہ نہیں تھا بلکہ ملک بھر کے لیڈر ملک کو آزاد کرانے کے لیے یک جا ہو گئے تھے غیر ملکی حکمرانوں کو نکالنے کی یہ پہلی منظم کوشش تھی۔ تحریک کا مقصد یہ تھا کہ سارے ملک کو آزاد کرا کے ایک خود مختار حکومت قائم کی جائے جس کا حاکم اعلیٰ بہادر شاہ ہو۔"

——— ایس۔ ایم گھوش، تقریر ۱۶ دسمبر ۱۹۵۳ء

(سکریٹری فریڈم ہسٹری بورڈ)

وسطِ ہند

رانی جھانسی اور شہزادہ فیروز

ملک کے وسطی علاقوں میں تقریباً تمام جگہوں پر بغاوتیں ہوئیں اور اگرچہ یہ تمام علاقہ براہ راست انگریزی گرفت میں نہ تھا بلکہ زیادہ تر چھوٹی بڑی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا لیکن عوام اور فوجوں نے تحریکِ آزادی میں مردانہ وار حصہ لیا۔

یہاں تین اہم فوجی اسٹیشن یعنی اجمیر، نصیرآباد اور نیمچ واقع تھے۔ میواڑ میں رانا سروپ سنگھ کی حکومت تھی، جے پور میں رام سنگھ کی، الور میں جنی سنگھ۔ جودھ پور میں تخت سنگھ اور بیکانیر میں اس خاندان کی ایک شاخ کا راج تھا، ہاڑا راج پوت کوٹہ اور بوندی کی گدی پر تھے اور ٹونک پنڈاری لیڈر امیر خاں کے وارثوں کا تھا۔ ڈاکٹر سریندر ناتھ سین کا خیال ہے کہ:

> ”اگر یہ راج پوت والیانِ ریاست دین کی آواز سن لیتے تو دہلی سے گجرات تک کے علاقے سے برطانوی اقتدار ختم ہو گیا ہوتا“ (۳۰۸)

جب ان علاقوں میں بغاوت کا بگل بجا تو گورنر جنرل کا نمائندہ جارج پیٹرک لارنس آبو پہاڑ پر گرمیاں گذار رہا تھا قریبی علاقے میں سوائے ڈیسا کے کہیں گورہ فوج موجود نہ تھی، بغاوت شروع ہونے پر تمام دیسی رجمنٹوں پر شبہ کیا گیا اور لارنس نے ڈیسا سے گورہ دستے طلب کرنے کو لکھا۔ مگر اس سے پہلے ہی کمشنر اجمیر نے میواڑ سے ایک فوج طلب کر کے اجمیر کی پیادہ رجمنٹ نمبر ۱۵ کی جگہ مقرر کر دیا۔

وطن کا مردِ مجاہد

وسط ہند کی تحریک آزادی کی داستان چوں کہ شہزادہ فیروز شاہ[1] سے متعلق ہے اور اسی کے گرد گھومتی ہے اس لیے ہم ان حالات کو شہزادے کی آمد سے شروع کر رہے ہیں جو ۱۸۵۵ء میں دہلی سے روانہ ہوا مختلف مقامات کے علاوہ مکہ معظمہ بھی گیا اور حج کیا۔ شہزادے کے اس دورے کا مقصد کیا تھا، تاریخ اس بارے میں خاموش ہے مگر تحریک آزادی میں اس کی غیر معمولی سرگرمی، جوش وخروش اور عزم وہمت دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وطنِ عزیز کی غلامی کا احساس اسے کشاں کشاں ان ممالک میں لے گیا ہوگا، پھر مئی ۱۸۵۷ء میں اس کا واپس آنا اور فوراً شریکِ جنگ ہو جانا اس خیال کو اور بھی تقویت پہنچاتا ہے کیوں کہ بمبئی پر اترنے کے بعد جب اسے اطلاع ملی کہ ملک میں جنگ آزادی کا بگل بج چکا ہے تو وہ فوراً دہلی کی طرف بڑھا

---

[1] اصل نام فیروز بخت، والد ناظم بخت (نواسہ فرخ سیر) ۱۸۵۷ء میں عمر بیس پچیس کے درمیان تھی۔ رجحان مذہبی تعلیمات کی طرف تھا، مغل شہزادوں سے بالکل جداگانہ طبیعت اور مزاج پایا۔ بعض لوگ اسے فرخ سیر کا نواسہ بتاتے ہیں یہ بات تاریخ کی روشنی میں غلط ثابت ہوتی ہے اغلب ہے کہ ناظم بخت فرخ سیر کا نواسہ ہوگا۔

نصیر آباد اور نیمچ

سب سے پہلے نصیر آباد میں گائے اور سور کی ہڈیاں ملے ہوئے آٹے کی افواہوں سے ہیجان پھیلا لیکن باقاعدہ طور پر ۲۸ر مئی کو بغاوت شروع ہوئی کیوں کہ انگریز حکام خفیہ طور پر ڈیسا سے گورا فوج بلوا رہے تھے چھاؤنیوں میں تیاریاں ہو رہی تھیں، فوجی پہرے بڑھا دیے گئے تھے، توپوں کو منا سب جگہوں پر تیار حالت میں رکھ دیا گیا تھا۔ یہ تمام انتظامات دیکھ کر اور بھی بے چینی پیدا ہوئی اور جیسے ہی ڈیسا سے گورا فوج بلوانے کا راز کھلا، بغاوت شروع ہو گئی، باغیوں نے توپوں پر قبضہ کر لیا، جب انگریز فوج مقابلے پر بھیجی گئی تو انھوں نے شدید گولہ باری کی اور شکست دی[1]۔ بہت سے افسران قتل ہوئے، کچھ بھاگ گئے اور باغی فوجیں نہایت باقاعدگی کے ساتھ دہلی روانہ ہو گئیں

نیمچ میں جو یہاں سے ایک سو بیس میل جنوب میں واقع ہے، ۳ر جون کو اچانک بغاوت شروع ہوئی جس کا آغاز رات کے گیارہ بجے توپ چلنے سے ہوا، انگریز افسران قتل ہونے لگے، بنگلوں اور دفتروں میں شعلے نظر آنے لگے، علاقے کا انتظام شیخ ارادت علی کے سپرد ہوا جنھوں نے بڑا خیمہ لگا کر جھنڈا نصب کیا، شاہ دہلی کی طرف سے احکام جاری کر دیے اور باقاعدہ افسر مقرر کر کے انتظام درست کر دیا انگریزوں نے جب یہاں کے باغیوں کو سمجھانا چاہا اور وفاداری کا وعدہ یاد دلایا جو انھوں نے کرنل ایبٹ کے سامنے ۲ر جون کو کیا تھا، تو انھوں نے متفقہ جواب دیا ایک روایت یہ ہے کہ ایک سوار

---

[1] لفٹننٹ پریچارڈ کا خیال تھا کہ اس فوج نے باغیوں کا دانستہ پورا مقابلہ نہ کیا کیوں کہ در پردہ اُن سے ملی ہوئی تھی (سین ۴۰۸)

محمد علی بیگ نے آگے بڑھ کر کہا،

"تم نے کیوں اودھ سرکار ...... سے عہد شکنی کی اور اب تم ہمارے مذہب میں دخل انداز ہونا چاہتے ہو؟ ۔ مگر یہ نہ ہوگا، ہم تم سے اپنے قول و قرار کیوں قائم رکھیں جب کہ تم نے اپنی قسم توڑی ہمارے افسروں نے ہم سے کیا عہد کیا تھا؟ ۔۔۔" [۱]

یہاں کی باغی فوجیں بھی آگرہ ہوتی ہوئی دہلی پہنچیں۔

شہزادہ فیروز کی آمد

مئی ۱۸۵۷ء میں شہزادہ فیروز شاہ بمبئی آ کر اترا، ملک میں تحریک آزادی شروع ہو جانے کی اطلاع پا کر دہلی کی طرف بڑھا اور ماہ جون میں سیتا مئو کے قریب نمودار ہوا، یہاں سے مندسور آ گیا اور آزادی وطن کی جدوجہد میں عملی طور پر شریک ہو گیا، اس نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا لیکن مندسور کے گورنر نے اس کو شہر سے دھکیل دیا تو وہ ایک غیر معروف سی مسجد میں بھیس بدل کر پوشیدہ ہو گیا اور اپنے کام میں مشغول رہا اس کی انقلابی سرگرمیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی عوام کی ایک بڑی تعداد اس کے ساتھ ہو گئی جن میں زیادہ تر افغانی اور مکرانی تھے جنھوں نے شہزادے کی سرکردگی میں شہر پر قبضہ کر کے گورنر اور کوتوال کو قید کر لیا اور فیروز شاہ کی حکومت کا اعلان کر دیا گیا، ایک شخص مرزا جی جس کے باپ دادا یہاں کے اجارہ دار تھے وزیر مقرر ہوا [۲] - یہاں کے حالات نے انگریزی اقتدار

---

[۱] "محاربہ عظیم" ۳۲۵/، سین کی کتاب صفحہ ۳۱۰

2. Sen, p. 310

کے لیے خطرے کی گھنٹی بجادی، آس پاس کے مقامات پر بغاوت ہونے لگی۔ ریاست دھار کا راجا، وزیر رام چندر، راجا کی ماں اور چچا وغیرہ بغاوت میں سرگرم عمل تھے۔ اگست میں مالوہ میں بغاوت نے انگریزوں کے لیے خاصی تشویش ناک شکل اختیار کر لی۔ یہاں بھی شہزادے نے انقلابیوں کی رہنمائی کی اور تمام انتظامات نہایت خوش اسلوبی سے سنبھال لیا جس کی وجہ سے دکھن سے انگریزوں کا سلسلۂ آمد و رفت بالکل ٹوٹ گیا۔

شہزادے کی انقلابی کارروائیاں

شہزادے نے قرب و جوار کی ریاستوں مثلاً پرتاب گڈھ، جاورا، سیتامئو اور رتلام وغیرہ کو اپنی نئی حکومت کی طرف سے خطوط روانہ کیے اور ان کو اپنے ساتھ جنگ میں شرکت کی دعوت دی۔[1] مگر سوائے جاورا کے شاہی خاندان کے ایک فرد عبدالستار کے اور کسی کا جواب نہ آیا۔ نومبر میں شہزادے کی طاقت کافی بڑھ گئی اور اس نے نیمچ کو اپنے فوجی دستے بھیجے جنھوں نے جیران کے مقام پر انگریزی فوجوں کو شکست دی اور قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن ہنری ڈورمینڈ کے پہنچنے پر ــــ جو وسط ہند میں گورنر جنرل کا ایجنٹ تھا اور جس کا ہیڈ کوارٹر اندور تھا ــــ یہ محاصرہ اٹھا لیا گیا۔ اسی دوران میں مہو میں بغاوت ہوئی اور باغی یہاں سے اندور چلے گئے اور پھر جلد ہی گوالیار آ گئے۔ شہزادہ اس وقت دھول پور اور گوالیار میں مصروف تھا اور گوالیار کنٹنجنٹ کو بغاوت پر آمادہ کر رہا تھا۔ تاکہ وہ اس کے ساتھ ہو کر آگرے پر حملہ کریں۔ یہاں سے انقلابی فوجوں کو لے کر اُس نے

---

1. Sen p. 310

دریائے چمبل کو کچا پل بنا کر پار کیا اور دھول پور کی تحصیل پر حملہ کیا، جس میں کافی روپیہ ہاتھ آیا اور فوج کی طاقت بھی بہت بڑھ گئی۔ شہزادے کی کارکردگی اور لیاقت نے اس علاقے کے مسلمانوں میں جہاد کی آگ بھڑکا دی اور وہ دین و وطن کی خاطر سر بکف ہو کر نکل آئے۔ دھول پور میں کچھ دن رکنے کے بعد وہ آگرے کی طرف بڑھا۔ اب نیمچ اور نصیر آباد کے باغی دستے بھی اس کی کمان میں تھے آگرے میں گرتھیڈ کی فوجوں نے ۱۰ اکتوبر ۱۸۵۷ء دہلی سے آکر انقلابیوں کو محاصرہ اٹھانے پر مجبور کر دیا اور گیر دریا پر شکست دی۔ گیر دریا کی شکست نے شہزادے کی پوزیشن مندسور میں، جو اس کا ہیڈکوارٹر تھا، کم زور کر دی، وہ یہاں سے پہلے ہی ہٹ کر اندور کے انقلابیوں کی کمان سنبھالنے کے لیے گوالیار آگیا تھا۔

گوالیار کی بغاوت

گوالیار میں ۲۷ مئی ۱۸۵۷ء سے ہی بغاوت کی علامتیں ظاہر ہونا شروع ہو گئی تھیں مگر باقاعدہ طور پر ۱۴ جون سے شروع ہوئی جب کہ شام کو چھاؤنی اور مسکوٹ گھر میں آگ لگی اور پھر دوسرے بنگلوں میں بھی شعلے نظر آئے، اسی رات کو فوج میں بغاوت ہو گئی، توپ خانہ تک بگڑ گیا، انگریز افسران کچھ قتل ہوئے اور کچھ نے بھاگ کر جان بچائی، گوالیار کا راجہ اگرچہ انگریزوں کا وفادار تھا مگر عوام اور فوج اس کے مخالف اور جنگِ آزادی میں سب سے آگے تھے رانی بیجا بائی بھی جن کو انگریزوں نے اجین میں قید کر دیا تھا انقلابی صفوں میں شامل تھیں۔ دہلی کے ایک اخبار میں ۳ اگست ۱۸۵۷ء کو یہ اطلاع شایع ہوئی۔

خبر گوالیار —— زبانی خاص آیندہ گوالیار کی مدرک ہوا کہ سات آٹھ ہزار سپاہ کنٹنجنٹ، باقی مجاہدین، سب مل کر بارہ ہزار آدمی شاہ جہاں آباد کی

روانگی پر مستعد ہیں مگر ان کو صرف انتظار یہ ہے کہ ایک کمپو دکن اور دوسرا اندور کا آجائے ...... راجہ صاف دم نصرت نصاریٰ بھرتا ہے مگر نتیجہ اس کا یہ ہے کہ خود بدولت اب تک روپوش ہو رہے ہیں اور بیجا بائی صاحبہ جو مدت تک اوجین میں بہ قید فرنگ رہی ہیں وہ دہلی آنے پر تیار ہیں مگر ضعف و نقاہت بہ باعث طوالت عمر کہ قریب پچھتر برس کی ہے مانع آمد ہے" [1]

اندور اور مہو

مہاراجہ اندور انگریزوں کا وفادار تھا مگر اس کی فوج اور عوام، جن کا ظاہر ہے کہ انگریزوں سے کوئی نقصان نہ پہنچا ہوگا اپنے ملک کے آزادی پسند عوام کے ساتھ تھے، وہ مہاراجہ پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ بغاوت کر کے ان کے ساتھ دہلی چلے مگر مہاراجہ نے مجبوری ظاہر کی کہ نہ تو مجھ میں اتنی طاقت ہے کہ فوج بھرتی کروں اور نہ جسونت راؤ ہلکر اتنا روپیہ چھوڑ رہے ہیں، پھر بھی اندور کے باہری علاقوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ ہلکر باغیوں کے ساتھ ہے اور اس افواہ نے باغیوں کی بڑی ہمت افزائی کی [2]

یکم جولائی کو اندور میں بغاوت ہوئی، باغی سپاہ اور عوام نے رزیڈنسی پر حملہ کیا، انگریزوں کو قتل کیا اور خزانے چھاؤنی کو لوٹ لیا۔ یہاں انقلابیوں کی رہنمائی رسالدار محمد سعادت خاں کر رہے تھے۔ جنھوں نے تقریباً بارہ ہزار آدمی جن میں سپاہی، عوام اور مجاہدین وغیرہ شامل رہے۔ جمع کر لیے تھے اور مہو کے باغیوں کے ہمراہ دہلی روانہ ہوئے۔ ڈورینڈ اپنے سکھ اور بھوپالی دستوں کے ساتھ سیہور میں پناہ گزیں تھا۔ اندور کے علاوہ

---

[1] "صادق الاخبار" دہلی ۳ اگست ۱۸۵۷ء

[2] کنہیا لال / ۳۴۲ — [3] ڈاکٹر سین / ۳۱۰

ڈونگ، کوٹہ، بھوپال اور بھرت پور کی فوجوں نے بھی بغاوت کی جب کہ والیان ریاست "وفادار" رہے۔

اندور کے فوراً بعد مہو میں بھی شورش ہوئی، افسران قتل ہوئے اور آگ لگائی گئی، باغی فوجیں اور عوام اندور روانہ ہوگئے اور وہاں سے گوالیار ہوکر دھول پور پہنچے گوالیار میں ان کی قیادت شہزادہ فیروز نے سنبھالی۔

ریاست دھار اور کوٹہ

ریاست دھار کا راجہ تو کم سن تھا لیکن اس کی ماں اور چچا دونوں نے انقلابی جدوجہد میں حصہ لیا خصوصاً اس کی فوج کے عرب اور افغان دستوں نے جیسے ہی اندور کی رزیڈنسی پر حملے کی خبر سنی بغاوت شروع کردی۔ اندور یہاں سے صرف ۳۲ میل دور ہے۔

۱۵ر اکتوبر کو کوٹہ میں بغاوت ہوئی تو پولیٹیکل ایجنٹ میجر برٹن مارا گیا اور دیگر افسران بھی قتل ہوئے اس کے بعد یہاں کے انقلابیوں نے جن کی رہنمائی محراب خاں اور لالہ جے لال کر رہے تھے رزیڈنسی پر حملہ کیا۔ راجہ مہاراؤ نے اپنے ایک ایلچی دیوی لال کو بھیجا تاکہ باغی دستے پولیٹیکل ایجنٹ برٹن کو نہ ماریں مگر وہ بھی قتل کردیا گیا اور جے لال نے تمام انتظامات اپنے ہاتھ میں لے کر مہاراؤ کو ایک اقرار نامے پر دستخط کرنے پر مجبور کیا جس میں تمام حادثات کی ذمہ داری لی گئی تھی۔ لارنس اس وقت مجبور تھا اور وہ مارچ ۱۸۵۸ء تک کوٹہ میں نہ پہنچ سکا۔

نواب باندہ

باندہ کے نواب علی بہادر خاں[1] اپنے علاقے کے انقلابیوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ باندہ میں بغاوت کا آغاز اُس وقت ہوا

[1] نواب علی بہادر ثانی بن ذوالفقار بہادر ۱۸۳۹ء میں تخت نشین ہوئے، ان کی رگوں میں

جب فتح پور کے انقلابی ۸ جون ۱۸۵۷ء کو یہاں پہنچے۔ یہ بغاوت جلد دھیمی پڑ گئی لیکن جب کانپور کی خبریں ۱۴ جون کو پہنچیں تو پھر بے چینی پیدا ہوئی اور کھلم کھلا بغاوت شروع ہو گئی۔ سپاہیوں نے حسب دستور انگریزوں کے مکان لوٹے، خزانے پر قبضہ کیا اور میگزین وغیرہ لے کر کانپور پہنچے۔ نواب نے انگریز عورتوں اور بچوں کو اپنے محل میں پناہ دی لیکن دوسری طرف وہ آزادیٔ وطن کی جد و جہد میں بھی پیش پیش رہے۔ انھوں نے فوج منظم کر کے راج گڑھ کے قلعے پر حملہ کیا اور فتح پائی۔ ۱۱ ستمبر ۱۸۵۷ء کو راجا کنور سنگھ مع فوج کے یہاں پہنچے اور اس موقعے پر کنور سنگھ کی فوج نے بہادر شاہ کو ایک اطلاع بھیجی جس میں انگریزوں کی بہار میں شکست اور اپنے باندہ پہنچنے کے حالات تحریر کیے[1]۔ اکتوبر میں اودھ گروہ کے انقلابی بھی باندہ میں جمع تھے۔

ساگر اور جبل پور

ہندوستانی سپاہیوں میں بغاوت کی چنگاریاں اپنا کام کر رہی تھیں اور جب وہ آپس میں ملتے تو جنگ کا پلان بناتے تھے۔ ادھر للت پور سے بغاوت کی خبریں آنے لگیں جہاں راجہ بانپور نے قبضہ کر لیا تھا۔ اسی علاقے کی ایک چھوٹی سی گڑھی بالا بیٹ پر بھی انقلابیوں کا قبضہ ہو گیا مگر جلد ہی انگریزی فوجوں نے حملہ کر کے گڑھی چھین لی اور سولہ[2] انقلابی گرفتار کیے۔ راجہ بانپور نے چھاؤنی کی سپاہ سے نامہ و پیام شروع کر دیا تھا۔ ساگر سے ۳۰ میل دور میتھن میں سپاہی بظاہر وفاداری کا

مرہٹہ خون دوڑ رہا تھا۔ وہ بڑے بہادر، فیاض اور وجیہہ شکیل تھے۔ شاعری سے بھی ذوق رکھتے اور نواب تخلص کرتے تھے۔ (تفصیل کے لیے "آج کل" دہلی: فروری ۱۹۵۸ء)

[1] یہ خط نیشنل آرکائیوز میں موجود ہے

یقین دلاتے رہے لیکن مقررہ دن پر بغاوت کی۔ انگریزوں سے جنگ کرنے سے پہلے انھوں نے عبادت گاہوں میں دعائیں کیں۔ مقابلہ بہت سخت تھا دونوں طرف سے گولہ باری ہوئی اور انقلابی فوج سامانِ جنگ کی کمی کے باوجود جنگ کرتی رہی۔

آس پاس کے علاقوں کی بغاوت نے جبل پور کے عوام کو بھی ابھارا۔ دموہ اور ساگر میں بغاوت کر کے انقلابیوں نے نہ صرف ان علاقوں کو بلکہ نربدا کا تمام شمالی علاقہ آزاد کرا لیا تھا اور اس کے بعد جبل پور روانہ ہو گئے۔ ان کے جبل پور پہنچنے کی خبروں نے انگریزوں کو سخت پریشان اور بدحواس کر دیا اور عام طور پر خوف و ہراس پھیلا گیا۔ بالآخر ستمبر آ گیا غیرت مند انقلابی اب زیادہ انتظار نہ کر سکتے تھے۔ ان کے رہنما راجہ شنکر شاہ نے، جو پنشنر تھے اور جبل پور کے علاقے پوروا میں رہتے تھے خفیہ طریقے سے بغاوت کا پلان بنایا لیکن ڈپٹی کمشنر کیپٹن کلارک کو اس سازش کا پتہ چل گیا اور شنکر شاہ کی قیام گاہ کو اچانک گھیر کر انھیں گرفتار کر لیا۔ ان کی گرفتاری نے انقلابی حلقوں میں جوش و غصے کی لہر دوڑا دی اور وہ انھیں چھڑانے کے لیے جدوجہد کرنے لگے۔ انگریزوں سے مقابلہ ہوا، گولیاں چلیں اور آگ لگائی گئی۔ کمشنر نے محفوظ دستہ طلب کر لیا تھا۔ شنکر شاہ اور ان کے بیٹے پر ایک نمائشی مقدمہ چلا کر توپ سے اڑا دیا گیا۔

شنکر شاہ کی قربانی سے باغیوں کا جذبۂ غیرت اور بھی ابل پڑا۔ رجمنٹ ۵۲ نے میگزین پر قبضہ کر کے کھلم کھلا بغاوت کر دی۔ سلیمن آباد کے سپاہی بھی میدان میں آ گئے۔ ان میں سے کسی نے اپنے انگریز افسر کو قتل نہیں کیا بلکہ بہ حفاظت جہاں وہ چاہتے تھے پہنچا دیا، ہاتھ ملا کر ان کو رخصت کیا اور سامان گاڑی میں رکھوا کر روانہ کر دیا۔ بان پور اور شاہ گڑھ کے راجوں نے بھی انگریزوں کو صحیح و سالم نکل جانے دیا۔ حالانکہ یہ دونوں محب وطن سپاہیوں

کے ساتھ تھے۔

ویر مہارانی لکشمی بائی[1]

راجہ گنگادھر راؤ کے اولاد نہ تھی ۱۸۴۲ء میں انھوں نے ایک آٹھ سالہ لڑکی منو بائی سے شادی کی مگر پھر بھی کوئی اولاد تخت و تاج کی وراثت کے لیے زندہ نہ رہی چناں چہ اس زمانے کے رسم و رواج کے مطابق اور شاستروں کی ہدایات کے بہ موجب انھوں نے ایک بچے کو گود لے کر اپنا وارث بنایا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو جو کہ اب ملک میں سب سے بڑی حکم راں طاقت تھی، اس پر کوئی اعتراض نہ تھا، اور ہوتا بھی کیسے؟۔ وہ خود ۱۸۳۵ء میں راجہ کوٹہ کو ۱۸۳۷ء میں راجہ اوچھا کو اور اسی طرح کئی بار حلیف راجوں کو گود لینے کی اجازت دے چکی تھی۔ جھانسی بھی کمپنی کی حلیف ریاستوں میں تھی مگر ۱۸۵۳ء میں گنگادھر راؤ کی موت پر ان کا لے پالک بیٹا دامودر راؤ گدی کا حق دار تسلیم نہیں کیا گیا کیوں کہ اب

---

[1] اصلی نام لکشمی بائی، بچپن کا نام منو بائی اور چھبیلی، پیدائش بہ مقام ورا ناسی ۱۸۳۵ء میں چمناجی آپا کے ملازم مورو پنت تامبے اور بھاگیرتی بائی کے گھر میں۔ تین سال کی تھی تو یہ خاندان بنارس سے آگیا، وہاں سے باجی راؤ کے دربار بٹھور آیا یہاں ناناصاحب کے ساتھ پلی بڑھی۔ سات آٹھ سال کی عمر میں جھانسی کے راجہ سے شادی ہوئی۔ ناناصاحب اس وقت اٹھارہ سال کے تھے۔ بعض انگریز مورخ اس کو بغاوت کی سازش میں شریک بتاتے ہیں (مثلاً میلیسن) مگر اس کا کوئی ٹھیک ثبوت یا قیاس نہیں ہے۔ کچھ لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ رانی شروع ۱۸۵۸ء تک انگریزوں سے خط و کتابت کرتی رہی اس سے رانی کے بلند کردار اور شجاعت و دلیری پر آنچ نہیں آتی۔ پھر یہ کہ وہ ایسے وقت میں انگریزوں سے لڑی جب باغیوں کی فتح کا گمان بھی نہ ہو سکتا۔ پھر کون سا جذبہ تھا جو اس کو جھانسی کے بعد کالپی اور گوالیار میں لیے پھرتا رہا؟

ڈلہوزی کی حریص نگاہیں "دوست" ریاستوں کو بھی نشانہ بنانے لگی تھیں اور گود لینے کی رسم ناقابلِ قبول بن چکی تھی۔ چناں چہ جھانسی کو زبردستی انگریزی سلطنت میں شامل کرلیا گیا۔[1] انگریزی علاقوں کی جو حالت تھی وہ ہر شخص بہ خوبی جانتا تھا لہٰذا ان حالات نے جھانسی کے عوام کو بھی انقلابی صفوں میں کھڑا کردیا اور وہ اپنی رانی کی خاطر جان تک دینے کو تیار ہو گئے۔

جھانسی آزاد

تمام خفیہ اسکیمیں مکمل ہونے کے بعد ۴ جون کو جھانسی کے عوام بھی میدان میں آگئے، انھوں نے میگزین پر قبضہ کرلیا اور اپنا جھنڈا لگایا بعد میں باغی سپاہ بھی ان کے ساتھ ہوگئی، قیدیوں کو چھڑایا اور انگریزوں کے مکانات جلانا شروع کردیے۔ وہ "دین کی جے" کے نعرے لگاتے ہوئے شہر میں آگئے، انگریز قلعے میں پناہ گزیں تھے، ۷ جون کو انقلابی سردار کالے خاں رسالدار اور تحصیل دار محمد حسین خاں کی رہنمائی میں قلعے پر حملہ کیا، انگریزوں نے مقابلہ ناممکن دیکھ کر صلح کا جھنڈا بلند کردیا۔ ایک ممتاز شہری حکیم صالح محمد نے جاں بخشی کا وعدہ کیا تھا، مگر جب انگریز باہر نکلے تو بپھرے ہوئے انقلابی عوام، جو اپنے ہم وطنوں پر انسانیت سوز مظالم کی جگر خراش

---

[1] جھانسی کے الحاق پر رانی نے پُرزور احتجاج کیا اور ڈلہوزی کو ایک خط لکھا، یہ خط انگریزی میں لکھا گیا ہے اور آخر میں رانی کی چوکور شکل کی مہر ثبت ہے جس میں "لکشمی بائی سمت ۱۹۰۱" - مہر کے اوپر یہ عبارت تحریر ہے۔ "عریضہ مہارانی لچھمن بائی صاحبہ اہلیہ مہاراج اور براج راؤ گنگادھر راؤ صاحب بیکنٹھ باس راجہ جھانسی"

داستانیں سن چکے تھے، اُن پر ٹوٹ پڑے سات سب انگریزوں کو ایک جلوس کی شکل میں جوکن باغ میں لے جایا گیا اور وہ ڈلہوزی کی جابرانہ پالیسی کے ردعمل کا شکار ہو گئے۔ اب جھانسی آزاد تھا۔ لہٰذا اعلان کیا گیا کہ

"خلقت خدا کی، ملک شہنشاہ کا اور حکومت رانی لکشمی بائی کی" لے

انقلابی عوام جب رانی کے محل کے سامنے جمع ہوئے تو بہادر رانی نے ان کی مذمت کی کہ انھوں نے نہتے انگریزوں کو قتل کر دیا۔ انقلابیوں نے رانی سے بغاوت میں حصہ لینے اور دہلی چلنے کے لیے کہا اور دھمکی بھی دی کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ شہر کو لوٹ لیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ رانی نے اپنے زیورات اُن کے سامنے ڈال دیے کہ وہ شہر کو ہاتھ نہ لگائیں۔ انگریز مورخین رانی کو قلعے کے پناہ گزین انگریزوں کے قتل کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں مگر یہ بالکل غلط ہے اور اس بارے میں خود چشم دید بیانات بھی ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں۔ جن پر پروفیسر مجمدار نے اپنی کتاب میں مفصل بحث کی ہے۔ کئی انگریزوں کے چشم دید بیانات بھی اس قتل عام سے رانی کو بے خبر ٹھہراتے ہیں مثلاً ایک عورت مسز مٹلو اپنے بیان میں کہتی ہے

"مسٹر اسکین اور مسٹر گورڈون رانی کے پاس گئے اور اس نے تقریباً پچاس ساٹھ توپیں، گولہ بارود وغیرہ اور اپنے پچاس آدمی قلعے میں ہماری حفاظت کے لئے دیے"

اس کے علاوہ مسٹر روبرٹ ہملٹن جس نے تقریباً سال بھر بعد ان واقعات کی تحقیقات کی تسلیم کرتا ہے کہ

"کسی بیان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ قتل کرنے سے پہلے کسی شخص سے بھی کوئی توہین آمیز برتاؤ کیا گیا ہو۔ اور نہ صرف اس کی کوئی شہادت نہیں، بلکہ یہ بات بہت آسانی

لے ساورکر/ ۲۴۱

سے دیکھی جا سکتی ہے کہ قتل کے بعد کسی لاش کے ٹکڑے کرنے یا بگاڑنے کی کوشش نہیں کی گئی یہ ضرور ہوا کہ اُن میں سے کچھ کے کپڑے چرا لیے گئے تھے"

اس کے بعد باغی عوام اور سپاہی رانی کے محل پر جمع ہوئے اور اسے اپنے ساتھ شامل ہونے کے لیے زور ڈالا تو رانی نے ان کو سامانِ جنگ اور روپیہ دیا جسے لے کر انقلابی فوج ۱۲ جون کو دہلی روانہ ہو گئی۔

ڈاکٹر سین کا خیال ہے کہ رانی اور باغی سپاہ کے درمیان بغاوت کے لیے کوئی رابطہ نہ تھا اور اس نے ان کے مجبور کرنے پر انتظام سنبھالا تھا کیوں کہ ساگر ڈویژن کے کمشنر ارسکائن کو جو خطوط رانی نے لکھے ان میں امن بحال کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔ اگر وہ باغیوں سے سازباز رکھتی ہوتی تو انگریز حکام کو خط لکھنا کیا معنی رکھتا ہے؟

انگریزوں کی کوشش

وسطی علاقوں میں بغاوت کی آگ بھڑکنے پر انگریز افسر حواس باختہ ہو گئے تھے، کیوں کہ گورنر جنرل کا ایجنٹ جارج پیٹرک لارنس آبو پہاڑ پر گرمیاں گذار رہا تھا اور ڈیسا تک گورا فوج کے دستے کہیں نہ مل سکتے تھے، دیسی فوج بھروسے کے قابل نہ تھی، تمام علاقوں میں بغاوت ہونے لگی تھی حتی کہ دسمبر ۵۸ء میں جودھ پور کے کچھ باغی آبو پہاڑ پر بھی پہنچ گئے اور گہرے کہر کے اندھیرے میں سوتے ہوئے انگریزوں پر کھڑکیوں میں سے اچانک گولیاں چلانا شروع کر دیں، اسی دوران میں امجھیرہ کے راجہ نے ایک قصبہ بھوپاور پر حملہ کیا، یہاں کے انگریز اگر کچھ اعتماد کر سکتے تھے تو وہ فرقہ بھیل کی مختصر سی فوج پر تھا۔ مگر یہ بھیل بھی اپنے ہم وطن انقلابیوں سے لڑنے کو تیار نہ تھے اور رات کے وقت بنیئے کے علاوہ تمام لوگ غائب ہو گئے، انگریزوں نے راجہ جھبوا کے پاس پناہ لی، مگر اس کے عرب دستوں نے اُن کی موت کا مطالبہ کیا، ان کی ناراضگی اور

جوش و خروش دیکھ کر راجہ نے حفاظتی دستے مقرر کیے اور ہلکر نے سوار بھیج کر ان پناہ گزین انگریزوں کو نجات دی۔

اس دوران میں ڈورینڈ برابر بغاوت کو دبانے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا، اس نے ڈڈبرن پر زور ڈالا کہ وہ مالوہ پر چڑھائی کرے مگر وہ بے چارا اپنی خرابی صحت کا بہانہ کر کے مستعفی ہو گیا تو ۱۲ر جولائی ۱۸۵۷ء کو بمبئی کالم نے میجر اسٹوراٹ کی سرکردگی میں اسیر گڈھ ہو کر مہو پر بڑھنا شروع کیا۔ اور ۲۲ر کو اسیر گڈھ پہنچا، ڈورینڈ بھی یہاں سے مل گیا اور ان مشترکہ فوجوں نے ۲ر اگست کو مہو فتح کیا جیسے جیسے موسم سدھرتا گیا، یہ انگریزی فوجیں دھار کی طرف بڑھنے لگیں جو ریاست دھار کی راجدھانی تھا۔ ۲۲ر اکتوبر کو ڈورینڈ کی رہنمائی میں یہ فوجیں یہاں پہنچیں، بہادر انقلابی مقابلے پر ڈٹ گئے، انگریزی فوجوں نے محل کو گھیر لیا مگر قبل اس کے کہ اسے فتح کیا جائے تمام انقلابی خفیہ طریقے سے نکل گئے اور انگریزوں کے ہاتھ نہ آسکے، البتہ کم سن راجہ اُن کا استقبال کرنے کو نکل آیا، اس کا قلعہ مسمار کر دیا گیا، اور جائداد ضبط کر لی گئی۔

دھار کو ختم کر کے اِن انگریزی دستوں نے مندسور کی طرف مارچ کیا جو شہزادہ فیروز شاہ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ گیرو ریا پر شہزادے کی فوج کو شکست ہوئی اور مندسور میں اس کی پوزیشن کم زور ہو گئی، اس دوران میں راج پوتانہ بھی خاموش نہ تھا جہاں کے راجہ تو "وفادار" تھے مگر عوام اور فوج اپنے دین اور دیش کی آن پر مٹنے کے لیے تیار! اجمیر جیل میں ایک معمولی سی بغاوت ہوئی جو جلد دبا دی گئی (اگست ۱۸۵۷ء) دسمبر میں آبو پہاڑ کے انگریز پُر اسرار طریقے پر گولیوں کا نشانہ بنے اور وہ "مجرم" ہاتھ نہ لگے جو ایرن پورہ میں آ گئے تھے۔ کوٹہ کا حال پہلے ہی گذر چکا ہے۔ انگریزوں نے انتہائی

کوشش کی کہ وہ نزدیہ بھیل کے لوگوں کو ہندو مسلم محبان وطن کے خلاف جنگ پر آمادہ کردیں۔ مگر بھیل جو انگریزوں کے وفادار تھے، اپنے اُن آزادی پسند بہادروں کا مقابلہ کرنے کو آمادہ نہ تھے جو اپنا خون پانی کی طرح بہا رہے تھے، ۳۰ر مارچ ۱۸۵۸ء کو جب بمبئی سے امدادی دستے پہنچے تو کوٹے پر دوبارہ قبضہ کرکے "وفادار" مہاراؤ کو بحال کردیا گیا۔ دسمبر میں ڈور نیڈا اندور چلا گیا۔

شہزادہ فیروز کا اعلان

وسط ہند سے نکل کر شہزادہ لکھنؤ پہنچا تھا لیکن تاریخوں کے بارے میں اختلاف ہے، میلیسن کا بیان ہے کہ وہ دہلی کے قریب پہنچ گیا۔ اور وہاں شکست ہونے پر دہلی سے واپس آتی ہوئی فوجوں کے ساتھ متھرا پہنچا تھا، شہزادہ صوبے دار ہیرا سنگھ بھی آکر مل گیا تھا، تھامپسن نے بھی لکھا ہے کہ وہ دہلی آگیا تھا اور بچ کر نکل گیا، جنوری فروری ۱۸۵۸ء میں اطلاع تھی کہ شہزادہ جھانسی میں موجود ہے۔ اس نے فروری میں ایک اعلان جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ

> "انگریزوں کی شکست میں اُن لوگوں کی وجہ سے دیر ہو رہی ہے جنھوں نے اپنے رہنماؤں کے احکام کی تعمیل نہیں کی اور معصوم بچوں اور عورتوں کو قتل کیا ہمیں ان حرکات سے بچنا چاہیئے اور تب جہاد کا اعلان کرنا چاہیئے مجھے یقین ہے ہم ایک نہ ایک دن انگریزوں پر فتح پائیں گے" [1]

قیصر التواریخ میں بتایا گیا ہے کہ شہزادہ میوات اور فرخ آباد ہوتا ہوا لکھنؤ پہنچا اور حضرت محل کا

1. Foreign Secret Consultations No. 122
   Sen p. 381

مہمان رہا -

رام گڈھ کی بہادر رانی

رام گڈھ ضلع منڈلہ کی ایک چھوٹی سی جاگیر ہے مگر یہاں کی دلیر رانی بھی تاریخ کے صفحات پر اپنا نام چھوڑ گئی اور دشمنان وطن کے مقابلے میں اس نے شجاعت و بہادری کی مثال قایم کی ہے -

۱۸۵۰ء میں یہاں کے جاگیردار لکشمن سنگھ کے مرنے پر ان کے بیٹے کی کم سنی کا بہانہ کر کے کمپنی نے یہ جاگیر ضبط کر لی (کیا عجیب دلیل تھی جاگیر ضبط کرنے کی!) رانی نے اس پر سخت احتجاج کیا مگر بے کار ثابت ہوا، مجبوراً رانی نے براہ راست کارروائی کا فیصلہ کیا، اس نے تحصیل دار کو نکال کر تمام انتظام خود سنبھال لیا، اس زمانے میں شنکر شاہ کی ظالمانہ موت نے رانی کو اور بھی مشتعل کر دیا، کیوں کہ وہ ان کو احترام کی نظروں سے دیکھتی تھی، اس نے عوام کو بغاوت پر آمادہ کرنا شروع کر دیا، رام گڈھ کی مورچہ بندی شروع کر دی - خود فوجی لباس پہنا اور گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے فوجیوں کا دل بڑھانے لگی، یکم اپریل ۱۸۵۸ء کو جب بارٹن کی رہ نمائی میں انگریزی فوجیں منڈلہ سے رام گڈھ کی طرف بڑھیں اور دو طرف سے حملہ آور ہوئیں تو رانی چوں کہ اس حملے کی تاب نہ رکھتی تھی اس لیے پسپا ہونا پڑا لیکن انگریزی فوجوں کو جنگلوں میں کافی پریشان کیا، آخر کار انگریزی فوجوں نے بہادر رانی کو چاروں طرف سے گھیر لیا بچ کر نکلنا ناممکن تھا، مگر غیور رانی دشمن کے ہاتھوں میں جانے پر موت کو ترجیح دیتی تھی اس نے اپنے ایک ساتھی سے تلوار لے کر اپنے سینے میں پیوست کر لی، انگریزی فوجیں جب قریب پہنچیں تو رانی اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہی تھی [1]

---

[1] الجمعیۃ ۱۹ اگست ۱۹۵۷ء

مہدپور

عوام اور انقلابی سپاہیوں نے ——— جو مکرانی تھے ——— عمل دار کی سرکردگی میں، مہدپور پر حملہ کیا، صبح سات بجے سے تین بجے دوپہر تک انگریزی فوجوں سے سخت اور مسلسل جنگ ہوتی رہی، آخر باغیوں نے انگریزوں کی توپیں چھین لیں اور پسپا کر دیا (ممکن ہے کہ اس حملے میں شہزادہ فیروز بھی شریک رہا ہو) انگریز افسر کچھ قتل ہوئے اور کچھ فرار، ہندوستانی فوج باغیوں سے جا ملی[1]

ہیوروز کی پیش قدمی

جھانسی کے حالات اور ماہ جون ۱۸۵۷ء کے واقعات ہماری نظر سے گذر چکے ہیں۔ اس دوران میں جھانسی آزاد رہا، اور دوسرے مقامات پر بھی زبردست بغاوتیں ہوتی رہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ جب دشمنان وطن ملک کے دوسرے حصوں میں تحریکِ آزادی کو کچلنے میں کامیاب ہو گئے تو جنوری ۱۸۵۸ء میں ان کی فوجیں مکمل طور پر تیار ہو کر وسطی علاقوں میں آزادی اور انقلاب کی آگ بجھانے کے لیے دونوں طرف سے بڑھیں اور مختلف حصوں میں روانہ کی گئیں، اُن کے ہمراہ اس علاقے کے اکثر رجواڑوں کی فوجیں بھی تھیں جنھوں نے قدم قدم پر انقلابیوں کو کچلنے میں انگریزوں کی مدد کی، ان ریاستوں میں بندیلہ، کچھ، گوالیار، اندور اور بھوپال وغیرہ شامل ہیں۔

وائٹ لاک جبل پور اور اس کے آس پاس کے علاقوں کی طرف بڑھا اور ہیوروز نے حیدر آباد اور بھوپال کی فوجوں کی شامل کر کے جھانسی پر چڑھائی کی۔ وہ ۶؍ جنوری کو مہو سے بڑھا اور معمولی جنگ کے بعد راٹے گڈھ، بانا پور اور چندیری کے قلعوں کو فتح کیا اور

---

[1] "محاربۂ عظیم" / ۲۶۸

ان مقامات پر دوبارہ قبضہ کر کے ۲۰ مارچ کو جھانسی سے چودہ میل دور لگیا۔ ٹیڑھی اور گوالیار کے راجے بھی اس کی مدد پر آمادہ تھے۔ اور اب وہ جھانسی سے قریب تر ہو رہا تھا۔

خوں ریز معرکہ

۲۴ مارچ ۱۸۵۸ء کو جھانسی کی توپوں نے آگ اگلنا شروع کر دی انقلابی فوجیں دشمنانِ وطن پر موت و حیات سے بے نیاز ہو کر ٹوٹ پڑیں، دشمن کے پاس بھاری فوجیں تھیں تو ان کے پاس ہمت اور مردانگی ـــــ اس کے پاس بربادی کی طاقت تھی تو اُن کے پاس زندگی کی امنگیں ـــــ رانی کے توپچی غلام غوث خاں اور کنور خدا بخش اس قدر شدید گولہ باری کر رہے تھے کہ انگریزوں کا سب سے بڑا توپچی مارا گیا، سخت نقصان ہوا اور بہت سی توپیں خاموش ہو گئیں۔ رانی ہر مقام پر خود نگرانی کر کے بجلی کی طرح تمام مورچوں پر دیکھ بھال کرتی اور تمام کام انجام دیتی تھی ـــــ شدید گولہ باری کے بعد جھانسی کی بھی بہت سی توپیں خراب ہو گئیں اور قلعے کی دیواروں میں شکستگی کے آثار پیدا ہو گئے مگر رات کے وقت رانی نے معماروں کو بلوا کر مرمت کرائی اور صبح کو انگریزوں نے دیکھا کہ توپیں اور تمام چیزیں پھر اپنی اصلی حالت پر ہیں۔

تانتیا ٹوپی کا حملہ

رانی نے تانتیا ٹوپی کو اپنی مدد کے لیے بلوایا، وہ راجہ چرکھاری کو شکست دیتا ہوا کالپی آ گیا۔ اور اب جھانسی آ کر انگریزی فوج پر پیچھے سے حملہ آور ہوا مگر اس موقع پر اس کی فوج نے نہایت بزدلی کا مظاہرہ کیا، انگریزی فوج سے جب مقابلہ ہوا تو ایک توپ تک نہ چلائی ـــــ نہ جانے یہ خوف تھا یا غداری ـــــ دشمن کی فوجوں کو فتح ہو گئی اور انقلابی فوجیں بری طرح پسپا ہوئیں۔ یکم اپریل ۱۸۵۸ء کو یہ جنگ بیتوا ندی کے کنارے ہوئی۔

جھانسی کی شکست

۲ر اپریل کو انگریزوں نے آخری حملہ کیا، غوث خاں اور خدابخش نے قہر کی گولہ باری شروع کر دی، انگریزی فوج قلعے کی دیوار تک آگئی اور سیڑھیاں لگا کر چڑھنے لگی۔ ادھر سے انقلابی بہادروں نے سیکڑوں کا گولیوں سے صفایا کر دیا، سیڑھی ٹوٹ گئی اور انگریز بدحواس ہو کر بھاگے مگر جنوبی دروازہ ایک غدّار نے دغابازی سے توڑ لیا اور انگریز اندر داخل ہو گئے۔ چاروں طرف شعلے نظر آنے لگے، عمارتیں گرنے لگیں — رانی اپنے بقیہ ساتھیوں کو لے کر انگریزوں پر ٹوٹ پڑی۔ خون کے دریا بہہ گئے مگر بہادر انقلابی ایک ایک انچ پر مقابلہ کر رہے تھے۔ غلام غوث خاں اور خدابخش نے اپنی جانیں مادرِ وطن پر نثار کر دیں اور آخر کار انگریزی فوجیں شہر کو آگ لگا کر بے گناہ شہریوں سے انتقام لینے لگیں —— رانی نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے پندرہ بیس جاں بازوں کے ہمراہ کالپی روانہ ہو گئی تاکہ جھانسی کی شکست کا بدلہ لینے کی تدبیر کرے۔ انگریزوں نے رانی کا پیچھا کیا اور ایک افسر بوکر اس کے قریب پہنچ گیا، رانی نے مقابلہ کیا اور بوکر کا سر اڑا دیا، اب اس کے کچھ اور ساتھی اپنی جانیں نثار کر چکے تھے راتوں رات ایک سو بیس میل کا فاصلہ طے کر کے اب وہ کالپی پہنچی اور تانتیا ٹوپی کے مشورے سے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔

باندہ پر جنگ

دوسری طرف وائٹ لاک ساگر میں داخل ہوا اور راورچھ کے راجہ کی مدد سے باندہ کی طرف آیا۔ باندے کے نواب علی بہادر خاں جو اس علاقے کے انقلابیوں کی رہنمائی کر رہے تھے دشمنانِ وطن کے مقابلے پر سینہ سپر ہو گئے اپنی بے سروسامانی کے باوجود وائٹ لاک کو شکست دی، کئی بار جنگ ہوئی اور آخر کار ۱۹ر اپریل کو انگریزی فوجیں باندہ میں داخل ہوئیں، نواب یہاں سے چلے گئے اور

رانی جھانسی اور تانتیا ٹوپی سے کالپی میں جا ملے۔

انقلابی رہ نما کالپی میں

اس وقت کالپی کی مبارک سرزمین اس علاقے کے تمام انقلابی جاں بازوں کے قدم چوم رہی تھی، یہاں تانتیا ٹوپی، رانی جھانسی، نواب باندہ، راجہ شاہ گڈھ اور راجہ بان پور وغیرہ جمع تھے، انھوں نے جنگ کی تیاری کے بعد یہاں سے چالیس میل دور کونچ کی طرف رُخ کیا یہاں ہیوروز بھی اپنی فوج لے آیا، تصادم ہوا، غیر منظم انقلابی فوجیں پسپا ہو کر کالپی آگئیں۔ آپس میں اختلافات پیدا ہو گئے تھے مگر پست ہمتی اور مایوسی کی ذرا سی بھی جھلک نہ تھی تانتیا ٹوپی گوالیار کی طرف چلا گیا۔ بہادر رانی جذبۂ حب الوطنی اور نشۂ شجاعت سے سرشار تھی اس نے فوج کو پھر منظم کر کے میدان میں کھڑا کر دیا، راؤ صاحب رہ نمائی کر رہے تھے رانی خود بھی مردانہ لباس میں گھوڑے پر سوار حسبِ معمول جنگ میں شریک تھی، اس کی تلوار بجلی کی طرح کوند رہی تھی — کون تھا جس کا لہو اکیس۲۱ سالہ بہادر رانی کو میدانِ جنگ میں تلوار چلاتے دیکھ کر ابل نہ پڑتا چنانچہ اب کی بار دشمن کو تارے نظر آگئے، کچھ توپیں بھی رانی کے ہاتھ لگیں لیکن ہیوروز کی اونٹ سوار فوج نے اچانک حملہ کر کے نقشہ بدل دیا اور انقلابی فوجیں ۱۶ مئی کو پھر کالپی کی طرف پسپا ہو گئیں، ہیوروز اب کالپی کی طرف بڑھا انقلابی فوجوں نے قدم قدم پر سخت مقابلہ کیا، انگریزی فوجیں ۲۴ مئی کو کالپی میں داخل ہوئیں جہاں ہتھیاروں اور میگزین کا بڑا ذخیرہ ان کے ہاتھ آیا مگر انقلابی رہ نما ہاتھ سے نکل گئے اور گوپال پور پہنچے، جہاں تانتیا ٹوپی گوالیار سے ایک نئی فوج منظم کر کے لے آیا تھا۔

گوالیار میں تصادم

گوپال پور سے یہ فوجیں راؤ صاحب، نواب باندہ، رانی جھانسی اور تانتیا کی رہنمائی میں گوالیار پر حملہ آور ہوئیں اور قبضہ کرلیا یہاں کا راجا سندھیا انگریز کا "وفادار" تھا۔ یہ کائر راجہ یکم جون ۱۸۵۸ء کو فرار ہو کر انگریزوں کی پناہ لینے آگرے چلا گیا۔ کالپی کی شکست کے بعد اب گوالیار میں انقلابی فوجیں دشمنان وطن کو للکار رہی تھیں، راؤ صاحب کی پیشوائی کا اعلان ہو گیا تھا ——

مارشمین کو حیرت ہے ——

"یہ بات نہایت تعجب خیز تھی کہ باغی سپاہی شکست کے بعد نہایت ہی عجلت کے ساتھ پھر جمع ہو جاتے تھے اور تازہ تر اور قوی تر صف آرائی کے ساتھ پھر مقابلے کے لیے آموجود ہوتے تھے"۔

۱۶ جون کو ہیوروز سندھیا کو ساتھ لے کر گوالیار کی طرف بڑھا، رانی نے بھی مردانہ لباس پہنا گھوڑے پر سوار ہوئی اور دشمن کی فوج پر دلیرانہ حملہ کیا —— آج اس اکیس سالہ نوجوان عورت کی بہادری نے ہندوستان کی لاج رکھ لی —— اس کے ساتھ اس کی دو سہیلیاں کاشی اور مندر بھی، دن بھر مردانہ وار جنگ کرتی رہیں، اور آخرکار شام ہوتے ہوتے انگریزی فوجیں پسپا ہونے لگیں۔

رانی کی قربانی

اگلے دن ۱۸ جون ۱۸۵۸ء کو انگریزوں نے اپنی تمام کوششیں ختم کردی تھیں، وہ چاروں طرف سے قلعے پر بڑھے، رانی آج چندیری صافہ باندھے تھی جس پر زردوزی کا کام ہو رہا تھا، وہ مردانہ لباس میں اپنی فوج کے سب سے آگے نظر آتی تھی، اس کی تلوار بجلی کی طرح کوند کر دشمنوں کا صفایا کر رہی تھی —— انگریزی فوجیں آج پھر پیچھے ہٹنے لگیں —— مگر آج

جان بوجھ کر ایسا کیا جا رہا تھا —— بہادر رانی نے دشمن کو پسپا ہوتے دیکھ کر پیچھا شروع کر دیا، انقلابی فوجوں میں بھی خوشی کی لہر دوڑنے لگی، مگر طے شدہ پروگرام کے مطابق پیچھے سے ہیوروز خود اونٹ سوار فوج لے کر بڑھا —— رانی اور اس کے جاں باز ساتھی درمیان میں آ گئے، وہ برابر جنگ کرتی ہوئی انگریزی فوجوں کے درمیان سے صاف بچ کر نکل گئی۔ اس دوران میں اس کی ساتھی مُندر بھی کام آ چکی تھی اور وہ اکیلی ہی دشمن کے ٹڈی دَل سے مقابلہ کر رہی تھی کہ پیچھے سے اس کے سر پر داہنی طرف سے ایک چوٹ پڑی جس سے اس کی دائیں آنکھ کو سخت چوٹ پہنچی —— اتنے میں ایک اور چوٹ سینے پر لگی، جاں باز رانی نے ایسے وقت میں بھی ہاتھ نہ روکا اور اپنے دشمن کا خاتمہ کر دیا جس نے اس پر حملہ کیا تھا —— رانی —— محبانِ وطن کی سب سے بہادر سردار لکشمی، اب اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہی تھی —— چراغ حیات گُل ہوا چاہتا تھا کہ ایک خادم گل محمد[1] قریب ہی ایک فقیر کی جھونپڑی میں لے گیا اس کو بستر پر لٹا دیا گیا، مگر کچھ دیر بعد وہ ہمیشہ کے لیے سو گئی۔[2]

اس کی رحلت کے بعد وصیت کے مطابق وہیں گھاس پھونس کا ڈھیر بنا کر آخری رسمیں ادا کی گئیں تاکہ اس کے پوتر اور پاک جسم کو دشمن کا ہاتھ نہ چھو سکے ——

رانی کی موت کے ساتھ آزادیٔ وطن کی یہ جنگ بھی اپنے آخری سانس لینے لگی اور رفتہ رفتہ بظاہر سکون سا ہوتا گیا۔

ویر مہارانی —— ! تو آج اس دنیا میں نہیں ہے

---

[1] "نیا ہند" دسمبر ۱۹۴۹ء۔ بعض مقامات پر خادم کا نام رام چندر راؤ لکھا ہے۔ [2] ساورکر/ ۴۹۳

تیرے جاں باز ساتھی حب الوطنی اور اتحاد کا زرّیں درس دے کر قوم و وطن پر نثار ہو گئے ــــ مگر تیرے جذبات نے ــــ تیرے زندہ جاوید اور امر جذبات نے آزادی کی جو مشعل کروڑوں فرزندان وطن کے دلوں میں جلائی تھی وہ آخرکار اپنی روشنی پھیلا کر رہی، تیری روح ضرور دیکھ رہی ہوگی کہ ہم چین سے نہیں بیٹھے ــــ اور ــــ آ ــــ! اپنے وطن کی طرف دیکھ کہ تیرے ہم وطن انقلابیوں نے ہندوستان کو انگریزی پنجوں سے نوّے سال بعد آزاد کرا لیا ہے ــــ مگر تیرے دشمن نے بھی اس بدنصیب سرزمین سے دل کھول کر انتقام لے لیا۔ اتحاد اور ایکتا کو پارہ پارہ کیا، فرقہ پرستی کی آگ لگائی اور تیرے محبوب وطن کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے چلا گیا ــــ تیرے پاس تو تعصب اور فرقہ پرستی کا شائبہ بھی نہ تھا۔ تیرے ذہن کو مذہبی تعصب اور تنگ نظری چھو بھی نہ گئے تھے۔ مگر آج تیری یادیں منانے والے دماغ ان ہی ملعون اور قابلِ نفرت جذبات سے بھرپور ہیں۔ تیرا نام لینے والے دلوں میں اتحاد اور بھائی چارے کے مبارک جذبات برائے نام بھی باقی نہیں ہیں ــــ تیری روح یہ دیکھ کر ضرور بے چین ہو اٹھی ہوگی ــــ کاش۔ اِکہ تو ایک بار پھر جنم لے سکتی اور ہمیں اتحاد و اتفاق کا سبق دے کر جینا سکھا دیتی ــــ

داموردر راؤ مہارانی کی رحلت کے وقت متبنّیٰ داموردر راؤ گوالیار میں ایک سردار ننھے خاں کی حفاظت میں تھا۔ ننھے خاں وہاں سے روانہ ہوا۔ اور عرصے تک جنگلوں میں پوشیدہ رہا۔ داموردر کو اپنے ساتھ رکھا، کافی تکلیفیں اٹھانے اور انگریزوں سے کسی امداد کے سلسلے میں مایوسی اٹھانے کے بعد ایک انگریز نے رحم کھا کر اندور میں رہنے کا انتظام کر دیا اور داموردر راؤ کی زندگی یہیں گذری، آج بھی بوڑھے

لکشمن راؤ یہاں موجود ہیں جو دامودر راؤ کے بیٹے ہیں اور جنھوں نے سہراب مودی کی فلم "جھانسی کی رانی" کا افتتاح کیا تھا۔

"نہ صرف گنگا پار کے ضلعوں میں، بلکہ دونوں دریاؤں کے درمیانی علاقوں میں بھی دیہاتی عوام نے بغاوت کی اور تھوڑے ہی عرصے میں شاید ہی کوئی آدمی ہندو یا مسلمان ایسا بچا ہو جو ہمارے خلاف کھڑا نہ ہو گیا تھا"

——— جون ولیم کے

(جلد دوم ص ۱۹۵)

دکھنی علاقے

جس طرح شمالی ہند میں انگریزوں کو نکالنے کی جد و جہد ہو رہی تھی اسی طرح دکھن کے عوام بھی آزادیٔ وطن کے لیے کوشش کر رہے تھے، علمار اور پنڈت خاموشی سے اپنے کام میں مصروف تھے اور فوج میں بغاوت کے عَلَم بلند کر رہے تھے، چناں چہ پونا، ستارا، دھاروار، بیلگام اور حیدر آباد کی فوجیں آپس میں خط و کتابت کے ذریعے بغاوت کا پلان بنا رہی تھیں، انھوں نے طے کیا تھا کہ جیسے ہی شمالی علاقوں میں آزادی کی جد و جہد شروع ہوگی دکھنی علاقے بھی میدان میں نکل آئیں گے مگر نہ جانے کن وجوہ کی بنا پر ایسا نہ ہو سکا کیوں کہ جب شمالی علاقوں میں بغاوت کے شعلے بلند ہوئے تو دکھن نے انتظار کیا کہ شمال میں یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اس انتظار نے جنگِ آزادی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا کیوں کہ دکھنی علاقوں اور "وفادار" ریاستوں سے دشمنانِ وطن کو فوجی امداد مل گئی جو ان علاقوں میں سکون ہونے کی وجہ سے شمالی علاقوں کی بغاوت کچلنے میں کام آئی۔

وقت سے پہلے جنوبی علاقے بھی اگر شمال کے ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوتے تو شاید نقشہ ہی کچھ اور ہوتا، دوسری خرابی یہ ہوئی کہ مقررہ تاریخ

یعنی ۱۰ اگست سے پہلے ہی ۱۸ جولائی کو کولہاپور میں بغاوت پھوٹ پڑی اور جس طرح میرٹھ کی قبل از بغاوت نے جنگ آزادی کو کامیابی سے دور کر دیا اسی طرح دکھن کی قبل از وقت بغاوت نے انتشار اور بدنظمی پیدا کر دی اور دشمنان وطن نے نہایت آسانی سے کچل دیا۔

کولہاپور میں انقلابیوں نے شیر سال کی رہنمائی میں انگریزی فوجوں سے زبردست مقابلے کیے مگر چند ماہ بعد گوا کے پرتگالیوں کی مدد سے انگریزوں نے شکست دی، باقی فوجوں سے ہتھیار چھین لیے اور ان کے لیڈروں کو گولی سے اڑا دیا۔ ۱۵ دسمبر ۱۸۵۷ء کو دکھن کے راجوں نے پھر فوج جمع کر لی اور انگریزی فوج سے جنگ آزما ہوئے، انگریزی فوجوں نے سخت خوں ریز جنگ کے بعد ان کو منتشر کیا مگر سازش کرنے والوں اور انقلابی لیڈروں کا پتہ چلانے میں ناکام رہے۔

حیدرآباد ریاست حیدرآباد کا حکمراں افضل الدولہ اور اس کا وزیر سالار جنگ دشمنان وطن کا ساتھ دے رہے تھے، ان کی فوجیں انقلابیوں کو مختلف جگہوں پر کچل رہی تھیں، اور ان کا روپیہ وطن کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کے لیے خرچ ہو رہا تھا، مگر وہ حیدرآبادی عوام کے سینوں میں بغاوت کے امنڈتے ہوئے جذبات دبانے میں کامیاب نہ ہو سکے، حیدرآباد کے غیور فرزند اپنے وطنی بھائیوں کے ہمراہ جنگ آزادی میں حصہ لینے کے لیے بے قرار تھے۔ ۱۲ جون کو مشہور علماء کے دستخطوں سے اعلانات شائع ہوئے، مسجدوں میں جلسے ہونے لگے، مکہ مسجد اور چار مینار پر اشتہارات چسپاں کیے گئے ان میں سے ایک میں لکھا تھا۔

"پیچ رمضان المبارک کے دہلی پر تروار (تلوار) چلی اور سوائے اس کے دس جلسے

ہتھیار چلا گیا ابھی تک ریاست میں دکھن کے ڈھیل ہے اس کا کیا سبب ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دہلی کا تخت آباد ہونا ...... ریاست والوں کو منظور نہیں، مگر لازم یہ ہے کہ سرکار جلدی تمام کے زمین داران و قاضیان وغیرہ ...... حکم جہاد کا دینا مناسب ہے نہیں تو برس دو برس میں افضل الدولہ بہادر کو اور سالار جنگ کو مٹرک کی مٹی ڈھونا لگے گا۔ اس پر بھی حکم جہاد کا نہ کریں گے تو تمھاری نوابی پر لعنت ہے اور دیوان کے حسب نسب پر طلاق"[1]

اسی طرح کے ایک اور اشتہار کے الفاظ یہ ہیں۔

"کیوں تامل اور ڈھیل کر رہے ہو یہ وقت فرصت کا ہے، ایسا وقت کبھو میسر نہیں ہوگا اور کیوں غافل ہو تم لوگ دیکھو افسوس کرو گے ..... بتاریخ پچیسویں ۲۵ شوال ۱۲۷۳ھ بروز جمعہ کو جمع ہو کر تم قلعہ اوپر سے کرو ادھر سے ہم غلبہ کرتے ہیں ......"

ان سرگرمیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کے عوام بغاوت پر آمادہ ہو گئے چناں چہ سب سے پہلے اورنگ آباد کے انقلابی میدان میں آئے یہاں توپ خانے کا ایک سپاہی اور ایک پیادہ رجمنٹ کا آدمی پیش پیش تھے اور سپاہ کو بغاوت کی ترغیب دے رہے تھے، چناں چہ تمام سپاہ آمادۂ بغاوت ہو گئی۔ ۲۳ جون کو انھیں توپ خانے اور گورا فوج سے گھیر کر ہتھیار چھین لیے گئے لیکن ایک ٹروپ نے ہتھیار نہیں دیے اس پر گولہ باری کی گئی اور پیچھا کر کے فائر کیے مگر ان میں زیادہ بچ کر فرار ہو گئے۔ اور کچھ لوگ جب حیدرآباد گئے تو سالار جنگ (وزیر اعظم) نے گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا یہ دیکھ کر خاص حیدرآباد کے عوام بھی جوش و غصے سے دیوانے ہو اٹھے۔ چناں چہ ۱۶ جولائی ۱۸۵۷ء کو ایک بڑا مجمع جو کئی ہزار انقلابیوں پر مشتمل تھا دہلی دروازے

---

[1] یہ اشتہار کی بجنسہ نقل ہے جو نیشنل آرکائیوز میں محفوظ ہے

(موجودہ منٹے پل) سے باہر نکلا، مولانا علاؤالدین[1] اس انقلابی گروہ کے رہنما تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پانچ آدمی لے کر روانہ ہوئے تھے مگر رفتہ رفتہ مجمع بڑھتا گیا اور پانچ ہزار ہو گیا اور ایک بہادر پٹھان جمع دار طرّہ باز خاں اپنے سپاہیوں کو ساتھ لے کر شامل ہو گئے وہ ایک مقتدر اور بااثر شخصیت کے مالک تھے۔ یہ انقلابی گروہ اب ریزیڈنسی کی طرف جا رہا تھا جہاں انگریز رہتے تھے چناں چہ جب یہ لوگ اس کے قریب (موجودہ محلہ گولی گوڑہ) پہنچے تو ریزیڈنسی سے گولہ باری ہونے لگی مگر پھر بھی ان بہادروں نے جان پر کھیل توپوں پر حملہ کیا، ریزیڈنسی کا پھاٹک توڑ ڈالا۔ نظام کے عرب ملازموں نے بھی انگریزوں کا حکم ماننے اور انقلابیوں کا مقابلہ کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر کار رات بھر کی مسلسل گولہ باری سے انقلابی عوام پسپا ہوئے، کچھ شہر میں آ گئے اور کچھ فرار ہو گئے۔ ان کے رہنما اب بھی خفیہ اسکیمیں بنا رہے تھے اور انگریز دوبارہ حملے کے ڈر سے بدحواس تھے، طرّہ باز خاں کی گرفتاری کے لیے مسلح آدمی بھیجے گئے اور مغل گڈھ میں ایک تصادم کے بعد زخمی ہو کر گرفتار ہوئے ان کو کالے پانی بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا مگر وہ جیل سے غائب ہو گئے اور جنگلوں میں پوشیدہ رہ کر آزادیٔ وطن کے لیے جنگ کی تدبیریں کرتے رہے۔ بالآخر حیدرآبادی عوام کا یہ انقلابی رہنما توپران کے جنگل میں دشمنانِ وطن کا مقابلہ کرتا ہوا شہید ہو گیا اور ۲۴؍ جنوری ۱۸۵۹ء کو لاش تھانے میں لا کر پہچانی گئی۔ ان کی گرفتاری پر پانچ ہزار روپے انعام مقرر تھا۔[2]

---

[1] مولانا علاؤالدین کا مفصل تذکرہ "باغی علما" کے بیان میں ملے گا۔

[2] "آج کل"۔ دہلی ستمبر ۱۹۵۷ء

انقلابی راجہ

ایک طرف تو حیدرآباد کا نظام دشمنانِ وطن سے "وفاداری" کی مثال قایم کر رہا تھا اور دوسری طرف اسی کی ریاست کے قریب زوارپور (شولاپور؟) کے راجہ نے جنگِ آزادی کے لیے عربوں، روہیلوں اور پٹھانوں کی ایک فوج تیار کرکے جرأت، بہادری اور حب الوطنی کی روشن مثال قایم کی۔ وہ پہلے ہی نانا صاحب کی خفیہ انقلابی جماعت میں شریک تھا۔ رائے پور کے علماء اور برہمن پوری طرح امداد و حمایت کر رہے تھے اور انقلابی اسکیمیں بنانے میں شریک تھے مگر جب اس بہادر راجہ نے بغاوت کی تو نظام اور اس کی شریک فوجیں اسے کچلنے آگئیں، راجہ نے اپنے کو کم زور دیکھ کر اور مقابلہ مناسب نہ سمجھ کر فروری ۱۸۵۸ء میں حیدرآباد کا رُخ کیا تو نواب سالار جنگ نے گرفتار کرکے انگریزوں کے حوالے کر دیا، جب اس راجہ سے انقلابی سازش اور لیڈروں کا نام وغیرہ بتلانے کے لیے کہا گیا تو اس نے صاف انکار کر دیا اسے جاں بخشی کا لالچ دیا گیا مگر اس دلیر راجہ نے جو جواب دیا وہ سنہرے حرفوں سے لکھنے کے قابل ہے۔ اس نے کہا۔

> "پھانسی کے پھندے، توپوں کے دہانے یا کالا پانی، کوئی چیز اس قدر ہولناک نہیں ہو سکتی جتنی کہ غداری اور دغابازی .... میں چور، ڈاکو نہیں ہوں اس لیے پھانسی نہ دو بلکہ مجھے توپ سے اڑا دو۔ اور تم دیکھنا کہ میں کس قدر استقلال اور خاموشی کے ساتھ توپ کے سامنے کھڑا ہو جاؤں گا" [1]

اس کو کالے پانی کی سزا دی گئی مگر اس غیور اور خود دار راجہ نے ایک پہرے دار کا پستول لیا

۱؎ ساورکر/ ۵۰۷

اور اپنی زندگی کا خاتمہ کرکے قیدِ حیات سے بھی آزاد ہوگیا۔

راجہ نرگنڈ

نرگنڈ کے راجہ نے بھی بغاوت کی، مگر اس وقت کہ جب شولا پور کو کچلا جاچکا تھا یعنی مئی ۱۸۵۸ء میں اس راجہ نے اپنی مختصر فوج سے دشمن کو شکست فاش دی اور انگریز افسر مونسن کا سر کاٹ کر اپنی ریاست میں لٹکایا مگر اس کا سوتیلا بھائی انگریزوں سے مل گیا لہٰذا دوبارہ تصادم میں شکست ہوئی، راجہ بھیس بدل کر نکل گیا چند دن بعد گرفتار کرکے ۱۲ جون کو پھانسی دے دی گئی، اس کی ماں اور رانی پانی میں چھلانگ لگا کر ہمیشہ کی نیند سوگئیں [۱]

مدراس

۸ اگست کو ایک رجمنٹ نے بغاوت کی۔ اس رجمنٹ نے خود ہی درخواست کی تھی کہ ہمیں باغیوں کے مقابلے پر بھیجا جائے اور انھیں منگلور سے مدراس ہوکر کلکتے بھیجا جارہا تھا مگر کلکتے بھیجے جانے کی خبر سُن کر انھوں نے درخواست کی کہ ۱۸۳۴ء کے احکام کی رو سے ان کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے اور بھتہ ملے۔ انگریز افسروں نے اس وقت خیریت اسی میں دیکھی کہ ان کو وقتی طور پر تسلّی دے کر بہلادیں اور مطمئن کردیں چناں چہ ایسا ہی کیا گیا مگر اس فوج نے صاف صاف اعلان کردیا کہ وہ اپنے وطنی بھائیوں سے لڑنے کو تیار نہیں ہیں اور آگے نہ جائیں گے لہٰذا ان کو توپ خانے سے گھیر کر زبردستی گھوڑے اور ہتھیار چھین لیے گئے۔ یہ پونامالی کے مقام پر ہوا جو مدراس سے ۱۳ میل دور ہے

پونا

پونا میں نانا صاحب کا ایک اشتہار انگریزوں کے ہاتھ لگا جس میں وہاں کے عوام سے بغاوت کردینے کی اپیل کی گئی تھی اور انگریز افسروں کے قتل پر باقاعدہ انعام

---

[۱] ساورکر/ ۵۰۷

کا اعلان تھا۔ اشتہار میں یہ بھی لکھا تھا کہ نانا صاحب کثیر فوج کے ساتھ عن قریب ہی پونا آرہے ہیں اور جب تک وہ آئیں تمام انگریزوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ کوئی اور قابل ذکر واقعہ پونا میں پیش نہیں آیا کیوں کہ انگریزوں نے حفاظتی تدابیر کر کے بغاوت کو اٹھنے سے پہلے ہی دبا دیا۔

بمبئی پریسیڈنسی

اس علاقے میں کولھاپور، ستارا اور ساونت وادی میں بغاوت ہوئی، مقررہ تاریخ سے پہلے ہی ۳۱ر جولائی کو کولھاپور میں بغاوت کے شعلے بلند ہو گئے۔ ادھر ستارا میں ایک ہندوستانی چپراسی گرفتار کیا گیا جو ۲۲۔ پیادہ بمبئی رجمنٹ کو بغاوت کی ترغیب دے رہا تھا جب اسے پھانسی دی گئی تو اس نے پھانسی کے تختے سے چلّا کر کہا۔

"اگر وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے سپوت ہوں گے تو بغاوت کر دیں گے اور اگر عیسائیوں کی اولاد ہوں گے تو خاموش رہیں گے"۔[1]

چناں چہ ستارا کے غیور ہندو مسلم سپوتوں کا خون کھول اٹھا اور انھوں نے بغاوت کر دی۔

بمبئی کے ہندوستانی سپاہی بھی بغاوت کی اسکیم بنا رہے تھے، ان کا پروگرام یہ تھا کہ پہلے بمبئی میں بغاوت کریں اور پھر پونا پر قبضہ کر لیں مگر انگریز افسر فارسٹ نے بھیس بدل کر انقلابی رہنماؤں اور خفیہ اسکیموں کا پتہ لگا لیا اور اس طرح اس بغاوت کو اٹھنے سے پہلے ہی دبا دیا گیا۔ اسی طرح ناگ پور اور جبل پور میں مدراس سے فوج بلا کر

1. Foreign Secret Consultation No. 634
Sept. 25, 1857, Sen p. 409.

کچل دی گئی [1]

ساونت وادی میں اس سے پہلے ۱۸۳۰ء سے لے کر ۱۸۳۶ء تک تین چار بار بغاوت ہو چکی تھی اب جب کہ تمام ملک آزادی کی جدوجہد شروع کر چکا تھا معزول راجہ کے بھائی نے اس موقعے سے فائدہ اٹھایا اور ۱۸۵۸ء میں ایک زبردست بغاوت کی رہنمائی کی جو ساونت وادی سے کنارا تک تمام ساحلی اور سرحدی علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی اور ۱۸۵۹ء تک دبائی نہ جا سکی [2].

---

[1] ساورکر / ۵۰۸

[2] مجمدار / ۲۸

بُجھتی ہوئی چنگاریاں

تانتیا ٹوپی، راؤ صاحب اور نواب باندہ

تقریباً تمام ملک پر دوبارہ انگریزی تسلط قایم ہو چکا تھا اور انقلابی سرداروں کو اپنی فتح کی کوئی امید باقی نہ تھی۔ لیکن اُن کے عزم و استقلال میں ذرا سا بھی فرق نہ آیا۔ تانتیا ٹوپی جھانسی کی شکست کے بعد صاف بچ کر نکل گیا اور سی پی (وسط ہند) کے جنگلات میں باغیانہ سرگرمیاں شروع کر دیں۔ اس کے علاوہ نواب علی بہادر خاں (نواب باندہ) راؤ صاحب اور شہزادہ فیروز شاہ برابر انگریزی فوجوں کو حیران و پریشان کیے ہوئے تھے۔ شہزادہ اس سے پہلے ریاست دھار، مہد پور، گوریا اور دوسرے مقامات پر بغاوت کو منظم کر چکا تھا، اُس نے متعدد بار انگریزی فوجوں سے دلیرانہ جنگ کی اور ہر بار صاف بچ کر نکل گیا۔ نواب باندہ، جو جھانسی وغیرہ کی جنگوں میں شریک ہوئے تھے، اب تانتیا اور راؤ صاحب کے ہمراہ تھے۔ اُدھر اودھ میں بغاوت کے شعلے ابھی سرد نہ ہوئے تھے۔ باغیوں نے راجہ نیپال کو وطن کا ہمدرد سمجھ کر گورکھا دربار میں اپنے سفیروں کے ذریعے امداد حاصل

کرنے کی ناکام کوشش شروع کر دی تھی ۔[1]

ہمّت اور استقلال

انقلابی رہنماؤں نے جن میں تانتیا ٹوپی، راؤ صاحب اور نواب باندہ شامل ہیں، اب نئی فوج منظم کر کے گوریلا طریقے سے جنگ کا فیصلہ کیا۔ پہلے انھوں نے بھرت پور کی طرف آنے کا ارادہ کیا مگر یہ معلوم ہونے پر کہ وہاں زبردست انگریزی فوجیں موجود ہیں، جے پور کا رخ کیا۔ جے پور کے دربار میں تانتیا کے خفیہ آدمی موجود تھے جن سے خط و کتابت بھی ہو رہی تھی۔ انگریزوں نے ان باغی سرداروں کے آنے کی اطلاع پا کر نصیر آباد سے فوج روانہ کر دی۔ یہ دیکھ کر انقلابی رہنما دکن کی طرف چلے گئے۔ کرنل ہوم اور اس کی فوج نے پیچھا کیا مگر وہ اچانک ٹونک میں داخل ہو گئے۔ نواب ٹونک محفوظ مقام پر پناہ گزیں ہو گیا اور اس کی فوج باغیوں سے مل گئی۔ یہ نئی فوج لے کر انقلابی رہنما دکن کی طرف بڑھنے لگے اور اندرگڑھ میں قیام کیا۔ انگریزی فوجیں ان کو گھیرتی ہوئی بڑھ رہی تھیں اور آگے چمبل ندی تھی، اس لیے وہ بوندی کی طرف چلے گئے۔ اس کے بعد نیمچ اور نصیر آباد آ کر بھیل واڑ نامی گاؤں میں کیمپ لگا لیا۔ ۷؍ اگست ۱۸۵۸ء کو رابرٹ فوج لے کر حملہ آور ہوا مگر وہ اپنی فوج مع توپوں کے کوٹرا اودے پور لے گیا۔ انگریزی فوج یہاں بھی آ پہنچی، ۱۴؍ اگست کو تصادم ہوا اور انقلابی فوجوں کی پسپائی کے بعد تانتیا ٹوپی دریائے چمبل کی طرف نکل گیا، دشمن کی فوجیں چمبل پر بھی پہنچ چکی تھیں جن کا تانتیا اور اس کے ساتھیوں نے دلیری سے مقابلہ کیا اور ان کو چیرتے پھاڑتے جھل راپٹن پہنچے جہاں سے ایک نئی تازہ دم فوج ان کے ساتھ

---

[1] سین / ۳۵۸

ہو گئی ، توپیں ، آدمی ، روپیہ سب کچھ مل گیا ۔ اب ان سب نے دکن جانے کا پروگرام بنایا ، اور مالوہ میں داخل ہوئے ، پھر اچانک راے گڑھ آگئے ان کا پیچھا کرنے کے لیے چھ انگریز کمانڈر اپنی فوجیں لے کر بڑھ رہے تھے وہ سب یہ سُن کر حیران اور سراسیمہ ہو گئے کہ تانتیا اور اس کے ساتھی اندور آرہے ہیں ۔ بھاگم بھاگ اُن میں سے ایک مہو چلا گیا دوسرا ایل کھیڑہ پہنچا اور تیسرا سوچتا ہی رہا کہ کیا کرے ۔ ایک نے پہاڑی سے تانتیا کو مع فوج کے آتے دیکھا مگر انگریزی فوج تھک کر چور چور ہو چکی تھی اور ایک قدم نہ بڑھ سکی ۔ انقلابی رہنما بیتوا کے کنارے جنگل میں آگئے اور دوسری طرف سرونج کے مقام پر نکل آئے یہاں ان کو پھر چار توپیں مل گئیں ، ایک ہفتے بعد وہ پھر شمال کی طرف بڑھنے لگے ۔ شہر عیسٰی گڑھ پر حملہ کیا اور چھین لیا ۔ اب یہ انقلابی فوج دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اور دشمن سے منگرولی اور سندھوا وغیرہ میں مختلف معرکوں اور گوریلا جنگوں کے بعد للت پور آکر مل گئی ۔ انگریزی فوجیں ان کو چاروں طرف سے گھیر کر آ پڑی تھیں ، وہ سب کاجوری آگئے ۔ اور یہاں ایک تصادم کے بعد بیتوا ندی پار کر کے دکھن کی طرف چلے گئے ، انھوں نے ہوشنگ آباد کے قریب نربدا پار کیا اور ناگ پور کے نزدیک پہنچے ، انگریزی فوجیں دم بہ دم گھیرے میں لیتی ہوئی بڑھ رہی تھیں مگر یہ بہادر انقلابی کبھی تار کاٹتے کبھی ڈاک لوٹ لیتے اور اس طرح بڑودہ جانے کا ارادہ کر رہے تھے ۔ اس دوران میں ایک گاؤں کرگن میں جنگ ہوئی ۔ انقلابی فوج توپیں چھوڑ کر نربدا میں کودی اور پار ہو کر وسوارا کے جنگلات میں پہنچی ۔ اس موقعے پر ملکہ وکٹوریہ نے عام معافی کا اعلان کیا اور نواب باندہ نے ہتھیار ڈال دیے ۔ راؤ صاحب اور تانتیا ٹوپی اودے پور کی طرف بڑھے ۔ انگریزوں کی کئی فوجیں یہاں ان پر ٹوٹ پڑیں ، سخت مقابلہ ہوا مگر یہ دونوں

انگریزی فوجوں کا گھیرا توڑ کر صاف نکل گئے

شہزادہ فیروز شاہ

حضرت محل اور اُن کے ساتھی جب نیپال کی طرف جانے پر مجبور ہو گئے تو شہزادہ فیروز شاہ نے اپنے دو ہزار ساتھیوں کے ہمراہ پیچھے ہٹ کر گنگا کو پار کیا اور اٹاوہ میں نمودار ہوا۔ انگریز بریگیڈیر جنرل اور ان کی زبردست فوجیں بھی شہزادے کو روکنے یا گرفتار کرنے میں ناکام رہیں۔ وہ اب کالپی کے ایک مقام کونچ کی طرف بڑھ رہا تھا، انگریز کمانڈر نیپیر فوراً اسے روکنے کے لیے بڑھا مگر وہ پر اچانک تصادم ہوا کیوں کہ دونوں ایک دوسرے کی نقل و حرکت سے بے خبر تھے۔

فیروز شاہ نے اپنی فوج کے ساتھ ارونی کے جنگلات میں پناہ لی۔ یہاں بھی کیپٹن رائس نے اس کا پیچھا کیا اور وہ یہاں سے نکل کر آخر دسمبر ۱۸۵۸ء میں تانتیا ٹوپی اور راؤ صاحب سے جا ملا۔

۱۳؍ جنوری ۱۸۵۹ء کو تینوں انقلابی رہنما اندرا گڈھ پہنچے۔ ۱۶؍ جنوری کو چے پور اور بھرت پور کے درمیان ایک مقام ڈوسہ میں اپنے خیمے میں دشمنانِ وطن سے جنگ کا پلان بنا رہے تھے کہ اچانک انگریزی دستوں نے چھاپہ مارا مگر انقلابی رہنما آن کی آن میں غائب تھے۔ وہ ۲۱؍ جنوری ۱۸۵۹ء کو جے پور کے قریب سیکر میں موجود تھے اور انگریزی فوجیں اِدھر اُدھر سراسیمہ و حیران پھر رہی تھیں۔ بالآخر انھوں نے پھر چھاپہ مارا، انقلابی فوج پھر تباہ ہو گئی مگر وہ تینوں یہاں سے بھی بچ کر نکل گئے۔ اب ان سب نے الگ ہو جانے کا فیصلہ کیا کیوں کہ چھوٹے دستوں میں تقسیم ہو کر اس کا امکان تھا کہ وہ دور کے جنگلات یا پہاڑیوں میں پوشیدہ ہو جائیں مگر یک جا رہنے کی صورت میں دشمن کے ہاتھ پڑ جانے کا زیادہ اندیشہ تھا، لہٰذا تانتیا ٹوپی اُن سے علیحدہ ہو گیا۔ راؤ صاحب اور شہزادہ فیروز نے انگریزی فوجوں کو چکرا چکرا کر حیران و پریشان کر دیا اور اپنی گرفتاری

یا گھیر لینے کی تمام کوششیں خاک میں ملا دیں۔ انھوں نے چتر بھج سے ہو کر سیرونج کے جنگلوں کے بیچ میں ایک محفوظ پناہ گاہ بنا لی۔ انگریز افسران بھی تاک میں تھے، انھوں نے اس جنگل کو گھیر لیا اور گھیرے میں لے کر اس کا کونہ کونہ چھان مارا اور آخر کار انقلابیوں کا کیمپ ان کو مل گیا مگر راؤ صاحب اور شہزادہ یہاں سے بھی غائب تھے۔ [۱]

صلح کی بات چیت

اب صلح کی گفتگو ہونے لگی، شہزادے کے ایک ساتھی ڈاکٹر وزیر خاں کا ایک خط انگریزوں کو ملا جس میں لکھا تھا کہ اگر راؤ صاحب اور شہزادے کی جاں بخشی کا یقین دلایا جائے تو تمام لوگ بہ خوشی جنگ بند کر دیں گے۔ انگریز افسران راؤ صاحب کی جاں بخشی کے لیے اس شرط پر تیار تھے کہ مقررہ مقام پر (نظر بند) رہنا ہوگا اور یہ کہ نانا صاحب یا بالا صاحب کے لیے کوئی وعدہ نہیں کیا جائے گا۔ راؤ صاحب نے ان شرائط کو نہ مانا۔ فیروز شاہ نے اس شرط پر صلح چاہی کہ اس کی نقل و حرکت پر پابندی نہ ہو، اُسے ہر جگہ جانے کی اجازت ہو اور اس کے ساتھیوں سے ہتھیار نہ لیے جائیں۔ کیوں کہ اتنی مصیبتیں اٹھانے کے باوجود بھی شہزادہ یہ نہ بھولا تھا کہ اس کی رگوں میں تیموری خون دوڑ رہا ہے اور وہ بابر اور ہمایوں کے خاندان کا ایک فرد ہے۔ وہ اب بھی انگریزوں سے دب کر صلح کرنا نہ چاہتا تھا۔ چناں چہ اس نے ۱۲ جون ۱۸۵۹ء کو اپنے رفیق ڈاکٹر وزیر خاں کے ذریعے یہ شرائط پیش کیں [۲] مگر پُر غرور انگریزی دماغوں پر شہزادے کا یہ شاہانہ کردار گراں گذرا۔ وہ اس کو نقل و حرکت کی آزادی دینے

---

[۱] سین / ۳۷۴

[۲] " / ۳۷۵

کو تیار نہ تھے اور شہزادہ فیروز جیسا جہاد پیشہ انسان کسی مقررہ جگہ قید ہو جانے کے لیے تیار نہ ہو سکتا تھا، اس کو ہولناک ترین مصیبتیں اٹھا کر مرجانا منظور تھا مگر دشمن کے آگے عاجزانہ انداز میں جھکنا گوارا نہ تھا۔

۱۸۶۶ء میں جموں کے ایک مقام چنانی سے راؤ صاحب کو گرفتار کر کے کان پور میں پھانسی دی گئی، ان کی گرفتاری کے بعد شہزادے کو احساس ہوا کہ ہندوستان میں رہنا اس کے لیے خطرے سے خالی نہیں ہے۔ سیر و سیاحت کا شوق اسے پہلے بھی دور دراز مقامات کی راہ دکھا چکا تھا، چناں چہ نوجوان شہزادہ حیدرآباد سندھ سے ہو کر دریائے اٹک کے پار اترا۔ "تبصر التواریخ" میں یہ حالات اس طرح بیان کیے گئے ہیں۔

"پھر فوج مکن پور درگاہ مدار و حوالی اٹاوہ وغیرہ لوٹتی ہوئی شیر پور گھاٹ دریائے جمن سے اتر گیا، راہ میں اکثر مقامات پر لڑائی بھی ہوئی خوب بہادری سے لڑا اور بہ سلامت نکلا چلا گیا، کئی بار جمالی جنگل جے پور بیکانیر یا دامن کہسار دکن میں سرگرداں رہا وہاں قوم بھیل بھی شریک ہوگئی آخر کار اٹک دریا وغیرہ اتر کر کابل سے ہو کر ایران میں داخل ہوا.........." (۲۶۶)

ہندوستان سے باہر شہزادے کی سرگرمیاں آیندہ صفحات پر بیان ہوں گی۔

اودھ کے انقلابی

اودھ کے انقلابی عوام اور ان کے رہ نما جن میں بیگم حضرت محل کے علاوہ راجہ بینی مادھو سنگھ، میر محمد حسن، نانا صاحب خان بہادر خاں، دیوی بخش، امر سنگھ، مہدی حسن وغیرہ شامل تھے، برابر آزادیِ وطن کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ ان کو انگریزوں کی طرف سے پیغامات بھیجے گئے، جان بخشی اور جائداد کی واپسی کے یقین دلائے گئے لیکن ان کو اب انگریزی حکومت اور اس کے

وعدوں پر بھروسا نہ تھا وہ جس مقصد کے لیے اٹھے تھے اسی کے لیے اپنی جانیں دے دینا چاہتے تھے اور ان سب کی رہ نمائی بیگم اودھ کر رہی تھی۔

انگریزی فوجیں اب ان کو چاروں طرف سے گھیر کر بڑھنے لگی تھیں، انگریزوں نے انقلابی راج پوت سرداروں کے قلعے مسمار کرنا شروع کر دیے جس میں سب سے پہلے خان پوریہ خاندان کے مسکن رام پور کیسیہ کی باری آئی اور اس کے بعد راجہ لال مادھو سنگھ کے قلعے امیتھی کا نمبر تھا، پھر شنکر پور نشانہ بنا، بینی مادھو سنگھ کا پیچھا کیا گیا، تلسی پور کی بیوہ رانی کی خبر لی گئی اور آخر کار جب انقلابی رہ نما شمالی علاقے میں ترائی کی طرف چلے گئے تو دشمنان وطن یہاں بھی ان کا پیچھا کرتے رہے چناں چہ ۱۱ دسمبر کو سر کالن بہرائچ پہنچا، کیوں کہ اس کو یہاں نانا صاحب اور بیگم حضرت محل کی موجودگی کی اطلاع ملی تھی مگر وہ دونوں اس کے ہاتھ نہ آسکے۔ انگریزی فوجیں یہاں پانچ دن تک مقیم رہیں اور اس دوران میں صلح کی بات چیت بھی ہوئی، بیگم حضرت محل جسے انگریزوں کے پُر فریب وعدوں کی حقیقت معلوم تھی، اُن پر اعتبار کرنے کو تیار نہ تھی اور جب تک بیگم کے ہاتھ میں تلوار اور پاؤں رکاب میں ہیں راجہ بینی مادھو بھی ہتھیار ڈالنے پر تیار نہ تھے، نانا صاحب وکٹوریہ یا وائسرائے کی طرف سے اپنی جاں بخشی کا وعدہ اور اُس پر کسی تیسری طاقت کی تصدیق اور ضمانت چاہتے تھے۔

سر کالن اس کے بعد نان پارہ پہنچا جہاں باغی سردار جمع تھے مگر ۲۶ کو جاسوسوں نے اطلاع دی کہ وہ یہاں سے بھی چلے گئے، البتہ نان پارہ میں گھنے جنگل سے گھرے ہوئے قلعے پر راجہ بینی مادھو نے اپنے تھوڑے سے لشکر سے زبردست انگریزی فوجوں کا مقابلہ کرنے کا ایک بار پھر ارادہ کیا لیکن بارودیہ کی جنگ میں شکست ہو گئی

اور بینی مادھو یہاں سے بھی ہٹ گئے۔ انگریز ان کی گم شدگی پر حیران تھے، ان کو اطلاع ملی کہ نانا صاحب ایک قریبی قلعے میں پناہ گزیں ہیں، تمام انگریزی فوجیں اس طرف جھپٹیں، قلعے پر قبضہ کیا اور کھود کر زمین کے برابر کر ڈالا مگر یہ بھی بے کار ثابت ہوا۔ ۲۹ دسمبر کو جب کمانڈر انچیف نان پارہ لوٹا تو اسے پھر پتہ چلا کہ نانا صاحب اور بینی مادھو سنگھ یہاں سے بیس میل دور ایک مقام بنکی میں راپتی کے کنارے موجود ہیں اس نے رات کے وقت اچانک حملے کا حکم دیا، اُدھر نانا صاحب کو پتہ چل گیا، انھوں نے دریا پار کیا لیکن باغی فوج یہاں پھر انگریزی دستوں کا مقابلہ کیے بغیر پیچھے نہ ہٹی، اس جنگ کے بعد فرخ آباد کے نواب تفضل حسین اور چند دوسرے باغی لیڈروں نے ۷ جنوری ۱۸۵۹ء کو ہتھیار ڈال دیے، ان میں مہدی حسن کی پنشن مقرر کر کے انھیں اپنے وطن سے دور فیض آباد میں رہنے کا حکم ہوا۔ نواب فرخ آباد پر مقدمہ چلا کر سزائے موت کا حکم ہوا لیکن ہتھیار ڈالتے وقت چوں کہ جاں بخشی کا یقین دلایا گیا تھا اس لیے عرب بھیج دیا گیا۔ مین پوری کے راجہ تیج سنگھ نے ۱۱ جون کو ہتھیار ڈال دیے تھے، ان کو بنارس بھیج دیا گیا اور ان کی ریاست ”وفادار“ بھوانی سنگھ کو دے دی گئی۔

گورکھپور کے سابق ناظم میر محمد حسن کو وہاں کے متعینہ ڈپٹی مجسٹریٹ نے ۱۳ نومبر ۱۸۵۸ء کو غالباً حکومت کے ایما پر خط لکھا کہ حکومت چاہتی ہے باغی موجودہ طریقہ کار کو چھوڑ دیں جو صرف تباہی کی طرف لے جا سکتا ہے، تم نے انگریز افسروں کی جان بچائی ہے اور کسی کو قتل نہیں کیا[1]۔ اس لیے تمھاری جان بخشی کی جائے گی لیکن میر محمد حسن نے اس کے جواب میں

---

[1] بغاوت کے ابتدائی زمانے میں انھوں نے چند انگریزوں کی جان بچائی تھی اور ان کی ہر طرح

انگریزوں کی وعدہ خلافیاں اور پُر فریب اعلانات یاد دلائے، انھوں نے صاف لکھا کہ میں نہ موت سے ڈرتا ہوں اور نہ گرفتاری سے خوف ہے مجھے صرف خدا کی طاقت پر بھروسا ہے میں اپنے دین و وطن کی خاطر لڑ رہا ہوں، اگر اس راہ میں مارا گیا تو دونوں جہان میں سرخ رو ہوں گا۔ آخر میں انھوں نے لکھا۔

"ہمارا فرض ہے کہ دنیا اور عقبیٰ میں سرخ رو ہونے کے لیے اپنے وطن کی حفاظت کی پوری کوشش کریں اور اُن حملہ آوروں کا مقابلہ میں جو یہاں قدم جمانے کی کوشش کر رہے ہیں اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو ہم غدار ہیں اور دونوں جہان میں ہمارا منھ کالا ہوگا۔ میں ہرگز ہتھیار نہ ڈالوں گا۔ یا تو میں اپنا مقصد حاصل کروں گا یا مٹ جاؤں گا"۔ [۱]

اس کے جواب میں ڈپٹی مجسٹریٹ خیرالدین نے نہایت پُر غرور لہجے میں لکھا کہ تم اب تک حماقت میں مبتلا ہو بہتر یہی ہے کہ ہتھیار ڈال دو ورنہ انگریزی فوجیں تمھارا تیا پانچا کر دیں گی میر محمد حسن نے جو جواب دیا اس کا کچھ اقتباس انھی کی الفاظ میں یہ ہے۔ خط میں ربیع الثانی سنہ ۱۲۷۵ھ تحریر ہے۔

"خط آپ کا جواب میں ہمارے خط کے آیا وہ تمام و کمال مملو ہے نخوت اور غرور سے اور تہدید و تخویف کے سوا کچھ اس میں مندرج نہیں ہے ایسی باتوں کا جواب

کی جہاں وہ چاہتے تھے پہنچا دیا، ساتھ ہی ساتھ وہ تحریک میں شروع ہی سے شریک تھے چناں چہ راجہ نیپال کے گورکھا دستے سب سے پہلے میر محمد حسن کی فوجوں سے نبرد آزما ہوئے تھے۔

[۱] سین / ۳۶۷

پہلے خط میں جو آپ کی خدمت میں روانہ کیا مندرج ہو چکا اعادہ اور تکرار محض فضول ہے

ہمارا ملجا و ماوی نہ جنگل ہے اور نہ فوج باغی پر کچھ بھروسہ، صرف خدائے قادر و توانا

پر نظر ہے اور وہ حافظ ہے، ہر حال میں اگر وہ حافظ ہے تو کسی دشمن سے کچھ نہیں ہو سکتا

اور اگر حفاظت اس کی نہیں تو کوئی قوت اور زور کام نہیں آتا ...... اور ہم کو

ہرگز توقع اور گمان عوض آپ کی سرکار سے نہیں ہے کس واسطے کہ جب احساناتِ

عظیمہ پر کہ جو تمام عالم پر ظاہر اور معلوم ہے نظر نہ کر کے نسبت میں اپنے محسنین کے

کوئی دقیقہ ظلم و ستم کا باقی نہ رکھا پس ایسے ناحق شناسوں سے فقط جان بچانے کر لی

لیک اور دو بیبیوں کے کسی طرح کی امید رکھنا محض نادانی ہے ...... اگر

ایمان سے جان کو اور دنیا کو عزیز رکھتے تو بے شک پیروی آپ کی کرتے اور یہاں

تو ساتھ ایمان کے پاس نمک ولی نعمت بھی شریک ہے ......"

اس جذبۂ خودداری نے گورنر جنرل لارڈ کیننگ کو بھی متاثر کیے بغیر نہ چھوڑا۔ اس نے لکھا کہ ان خطوط کی نقلیں کمانڈر انچیف کو بھیج دی جائیں اور محمد حسن چاہے گرفتار ہوں یا خود شرائط صلح طے کریں، ان کی جان محفوظ رہے گی، وہ آزاد ہیں لیکن گورکھ پور کا کمشنر اتنا نرم دل نہ تھا، اُس نے محمد حسن پر قتل کے الزام لگائے اور مقتول انگریز کا نام بھی بتایا۔ اتفاق کی بات کہ وہ انگریز زندہ نکل آیا اور جس خدا کی ذات پر میر محمد حسن نے بھروسا کیا تھا اُس نے ان کو ہر بلا سے محفوظ رکھا۔ بعد کے حالات میں صرف اتنا معلوم ہے کہ ان کو پنشن مقرر کر کے ضلع سیتاپور بھیج دیا گیا اور انھوں نے اپنی بقیہ عمر وہیں بسر کی۔ ڈاکٹر سین اُن کی خط و کتابت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"...... (خیر الدین کی) دھمکیوں کا اُن پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ اپنے اصول پر

ثابت قدم رہے، ان کے جوابات نہایت سنجیدہ اور عالی شان تھے ....
اودھ کے رہنماؤں کے عقیدے اور اصول کی نمایندگی اِن خطوط سے بہتر
کوئی نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے بادشاہ اور دین کے لیے لڑے تھے اور ان کا دین
ان کو اپنے بادشاہ سے وفاداری سکھاتا تھا۔" [1]

---

[1] سین / ۳۶۷

۱۸۵۷

تاریخِ جنوں یہ ہے کہ ہر دورِ خرد میں
اک سلسلۂ دار و رسن، ہم نے بنایا

انقلابیوں کا انجام

اِدھر آ، ستم گر ہنر آزمائیں
تو تیر آزما، ہم جگر آزمائیں

نیپال میں

انقلابی عوام جن کو انگریزوں نے چاروں طرف سے گھیر کر جنوری ۱۸۵۹ء میں نیپال میں ترائی کی طرف دھکیل دیا، اندازاً ساٹھ ہزار تھے اُن کے سرداروں میں بیگم حضرت محل مع برجلیس قدر، نانا صاحب، بالا صاحب، میر محمد حسن، بینی مادھو سنگھ، دیوی بخش، بخت خاں، امر سنگھ، خان بہادر خاں، ممّو خاں، جوالا پرشاد اور دوسرے رہنما شامل تھے۔ اُن کے حوصلے اب بھی پست نہ تھے۔ جب تک اُن کے خون میں روانی، بازوؤں میں جنبش اور دل میں حوصلے موجود ہیں وہ برابر اپنے دشمن سے جنگ کرتے رہنا چاہتے تھے۔ چناں چہ جیسا کہ پہلے ذکر آیا، انھوں نے جنگ بہادر (راجہ نیپال) سے فوجی امداد کے لیے بات چیت کی لیکن یہ راجہ جو برائے نام ہی "جنگ اور بہادر" تھا، نہ صرف امداد پر تیار نہ ہوا بلکہ انگریزوں کو اپنے علاقے میں داخل ہونے اور انقلابیوں کو سزا دینے کی اجازت دی جس کی وجہ سے ان مستقل مزاجوں پر مصیبت اور تکلیف کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، ایک طرف تو انگریزی فوجیں

ان کا پیچھا کر رہی تھیں اور دوسری طرف خود نیپال کے گورکھا دستے اِن مٹھی بھر بلند ہمت انقلابیوں سے برسرِ پیکار تھے۔ اتنا ہی نہیں، ترائی کے جنگلات کی وبائی بیماریاں، کیڑے، بھنگے، مچھر اور جنگلی درندے الگ اپنا شکار بنا رہے تھے، وہ مختلف مقامات مثلاً چتون، بھٹول اور نیسا کوٹ کے درمیان پھرتے رہے۔ ان کی ہولناک مصیبتوں کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بعض دفعہ تو سپاہیوں کو کھانا خریدنے کے لیے اپنے ہتھیار بھی بیچ دینا پڑے۔

حکومت کی طرف سے نہ صرف وکٹوریہ کے اعلان کی روشنی میں عام معافی کا اعلان کر دیا گیا تھا بلکہ خیرالدین نے میر محمد حسن کو یہ بھی لکھا تھا کہ باغی اپنے گھروں کو لوٹ آئیں، اُن سے کوئی باز پرس نہ ہوگی، اس کے باوجود اُن کی غیرتوں نے گوارا نہ کیا کہ جس عظیم مقصد کے لیے سردھڑ کی بازی لگائی ہے اس کے عبرت ناک انجام کو یوں ادھورا چھوڑ دیں۔ چناں چہ نیپال کے پہاڑوں میں بھی انقلابی سپاہیوں اور ان کے سرداروں کی دلیرانہ جدوجہد جاری رہی!! اسی دوران میں تحریک کے ایک ہیرو راجہ بینی مادھو سنگھ جنھوں نے آخری سانس تک حضرت محل کی رفاقت سے منھ نہ موڑ کر وفاداری اور حب الوطنی کی روایات کو چار چاند لگا دیے، جنگ کرتے ہوئے ڈانگ وادی میں کام آئے، گونڈا کے دیوی بخش، خیرآباد کے چکلہ دار ہر پرشاد اور بیبوا کے گلاب سنگھ کا کیا انجام ہوا، کوئی نہیں جانتا، بونڈی کے ہردت سنگھ بھی کام آگئے، ترائی کے ملیریا نے بالا صاحب کو شکار بنایا، جوالا پرشاد کو گرفتار کر کے ۳ مئی ۱۸۶۰ء کو کانپور میں پھانسی دی گئی۔

عظیم اللہ خاں اکتوبر ۵۹ء میں بہ مقام بھٹول موت سے ہم کنار ہوئے، میر محمد حسن کا حال پہلے گذر چکا ہے، ممو خاں ۵۹ء میں نیپال سے گرفتار ہوئے اور ۱۰ دسمبر ۵۹ء کو جیل

بھیج دیے گئے۔ شیخ سکھن رسال دار بھی ان کے ساتھ تھا، اُن پر مقدمہ چلا، پھانسی کی سزا تجویز ہوئی مگر لبعد میں انڈمان بھیج دیے گئے اور غالباً ۱۸۶۶ء میں جزیرہ سراوک میں فوت ہوئے [1]

ناناصاحب

اپریل ۱۸۵۹ء میں ناناصاحب اور بالاصاحب سے صلح کے لیے خط وکتابت ہوئی لیکن ناناصاحب سر جھکانے پر آمادہ نہ تھے انھوں نے عاجزانہ انداز میں رحم کی درخواست نہیں کی، کان پور کے قتل عام میں اپنی شرکت یا ذمہ داری سے انکار کیا، انھوں نے لکھا۔

> "تم نے سب کے جرم معاف کر دیے ہیں اور نیپال کا راجہ تمھارا دوست ہے۔ اس کے باوجود تم کچھ نہ کر سکے، تم نے سب کو اپنی حمایت میں لے لیا اور میں اکیلا رہ گیا ہوں لیکن تم دیکھو گے کہ وہ سپاہی جن کو میں دو سال سے محفوظ کیے ہوئے ہوں کیا کر سکتے ہیں ہم پھر ملیں گے اور تب میں تمھارا خون بہاؤں گا جو گھٹنوں تک بہہ رہا ہوگا۔ میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔ موت تو ایک دن آنی ہے موت سے کیا ڈر۔" [2]

رچرڈسن نے، جس کو یہ خط ایک برہمن نے دیا تھا، جواب میں لکھا کہ وکٹوریہ کا اعلان عام ہے اور اگر تم نے کسی انگریز کا خون نہیں کیا تو بے خوف آجاؤ۔ ناناصاحب نے

---

[1] یہ حالات ڈاکٹر سین کی کتاب اور "قیصر التواریخ" وغیرہ سے ماخوذ ہیں۔

[2] Foreign Political Consultations No. 66
Sen p. 369

وکٹوریہ کا دستخطی خط طلب کیا کیوں کہ وہ اس فریب میں آنے والے نہ تھے۔ انھوں نے اپنے خط مورخہ ۲۰ اپریل ۱۸۵۹ء میں اس کا جواب دیا۔ خط کے آخری جملے یہ ہیں۔

"جان یک روز بھی جائے گی۔ پر اس طرح عزت کھو کر کیوں مرنا۔ اور آپ سے اور ہم سے لڑائی فساد ..... جب تک رہے گا، ہم چاہے مارے جائیں چاہے قید ہوں چاہے پھانسی، جو لکھا ہوگا سو ہوگا اور ہم سے جو کچھ ہوگا سو تلوار سے ہوگا"[1]

انگریزوں کو نانا صاحب کی سب سے زیادہ تلاش تھی مگر وہ ہاتھ نہ آسکے۔ ان کا آخری خط جو ہوپ گرانٹ کو ملا اس میں انگریزوں کے ظلم و ستم پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا تھا۔

"تمھیں ہندوستان پر قبضہ جمانے اور مجھے غیر قانونی قرار دینے کا کیا حق ہے؟ تمھیں کس نے ہندوستان پر حکومت کا اختیار دیا ہے؟ تم فرنگی تو بادشاہ! ۔ اور ہم اپنے ملک میں چور اور ڈاکو ۔!!"[2]

ان کی آخری زندگی کے بارے میں کوئی تصدیق شدہ بات معلوم نہیں، وہ بٹھور سے کان پور فرخ آباد، بریلی، بہرائچ اور پھر ترائی میں آئے تھے، ان کے خاندان کی عورتیں کچھ گوالیار میں آگئی تھیں اور کچھ نیپال میں رہیں، انگریزوں نے ان کی گرفتاری کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، چناں چہ متعدد لوگ دھوکے میں گرفتار کیے گئے مگر بے کار ثابت ہوا، اکتوبر ۱۸۶۲ء میں افواہ تھی کہ وہ بھوٹان کی پہاڑیوں میں پوشیدہ ہیں۔ ایک اطلاع یہ بھی ہے کہ وہ سادھو کے بھیس میں سوراشٹر کے ایک مقام موروہی میں آگئے تھے اور نگر سیٹھ کے یہاں مقیم رہے۔

---

[1] یہ خط اس کتاب میں بہ طور ضمیمہ شامل ہے اور نیشنل آرکائیوز میں اصل خط موجود ہے۔

[2] یہ خط ساورکر نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔

ان کی زندگی کے آخری دن یہیں تمام ہوئے۔ [1]

جنرل بخت خاں

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، جنرل بخت خاں دیگر رہنماؤں کے ساتھ نیپال چلے گئے تھے۔ ڈاکٹر سین نے حال ہی میں اپنی کتاب (صفحہ ۳۷) میں سرکاری حوالے سے لکھا ہے کہ وہ ۱۳ مئی ۱۸۵۹ء کو ایک جنگ میں کام آئے۔ اس وقت تک تحریک آزادی دم توڑ چکی تھی اس لیے ممکن ہے کہ انگریزوں نے نیپال میں گھس کر انقلابیوں کا جو پیچھا کیا، اس میں جنرل بخت خاں بھی کام آگئے ہوں۔ ایک انگریز مورخ جی۔ ایچ کنش کا کہنا ہے کہ نہ وہ ہاتھ آئے، نہ کوئی خبر ملی۔

بیگم حضرت محل اور برجیس قدر

حضرت محل مع اپنے بیٹے کے راجہ نیپال کی پناہ میں چلی گئیں اور انگریزوں کے اس "وفادار" راجہ نے، جو لاکھوں انقلابیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا، ان کو پناہ دے دی وہیں اپنی بقیہ زندگی کے دن گذار کر یہ غیور اور باہمت بیگم وطن کو آزاد دیکھنے کی تمنائیں اپنے سینے میں لیے ہوئے ۱۸۷۹ء میں اس دنیا سے رخصت ہو گئی کٹھمنڈو کی ایک ویران مسجد میں بیگم کا مزار ——— "بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے" ——— کی تصویر بنا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امن ہو جانے کے بعد ان کو انگریزی حکومت کی طرف سے پنشن وغیرہ پیش کی گئی لیکن انھوں نے ٹھکرا دی۔

ماں کے انتقال کے بعد برجیس قدر رمضان علی نیپال سے ۱۸۹۳ء میں کلکتے آ گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کے لڑکے مہر قدر ناہد علی اور دو پوتے انجم قدر روشن علی

---

[1] بخت سنگھ کی اولاد اب بھی موجود ہے اور یہ حالات وہی لوگ بتلاتے ہیں ("ملاپ" ۱۵ اگست ۱۹۵۷ء)

اور نیر قدر واصف علی موجود ہیں اور کلکتے ہی میں آباد ہیں[1]۔ حال ہی میں حکومت ہند کی طرف سے اِن لوگوں کے وظیفے مقرر کیے گئے ہیں۔

خان بہادر خاں

خان بہادر خاں بھی انقلابی سرداروں کے ساتھ ترائی کے جنگلات میں روپوش ہو گئے تھے۔ وہ ۱۸۵۹ء تک گوریلا طریقے سے جنگ کرتے رہے۔ آخر کار ایک دست بہ دست جنگ میں زخمی ہوئے اور راجہ نیپال کی دغابازی کی بہ دولت گرفتار کر کے انگریزوں کے سپرد کر دیے گئے، ان کو لکھنؤ سے بریلی لا کر مقدمہ چلایا گیا جس میں انھوں نے ایک برجستہ مدلل اور پُر جوش تقریر کی، بالآخر بغاوت کا الزام لگا کر ۱۸۶۰ء میں بریلی کی پُرانی کوتوالی کے سامنے پھانسی دے دی گئی ان کی لاش کو بریلی ڈسٹرکٹ جیل میں ایک نامعلوم جگہ پر دفن کر دیا گیا تاکہ عوام ان کی قبر پر میلہ نہ لگا سکیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ جیل کے دوسرے اور تیسرے پھاٹک کے درمیانی حصے میں دفن ہیں۔ بعض روایات یہ ہیں کہ لاش قلعے میں دفن کی گئی، اُن کی رہائشی عمارتیں مسمار کر دی گئیں۔ دیوان سوبھا رام کو جلا وطن کر کے مولمین (برما) بھیج دیا گیا۔

نواب خان بہادر خاں شاعری سے لگاؤ رکھتے تھے اور مصروفؔ تخلص کرتے تھے، ایک کتاب "مقاصد الصالحین" ان کی تصنیف کہی جاتی ہے۔ ان کے لڑکے جان بہادر خاں کے دو بیٹے یار محمد خاں اور احمد بہادر خاں ہوئے، احمد بہادر کے سلیم بہادر (مقیم راول پنڈی)

---

[1] مہر قدر زاہد علی کی جانب سے حکومت ہند کو ایک عرضی پیش کی گئی جس میں لکھا ہے کہ برجیس قدر نے کلکتے میں آزادی کی تحریک چلانے کی کوشش کی تھی جس کا نتیجہ ان کے لڑکے لڑکی اور دو ساتھیوں کے قتل کی صورت میں برآمد ہوا۔ ("الجمعیۃ"، ۱ اگست ۱۹۵۷ء)

اور کلیم بہادر (بریلی) ہیں۔ یار محمد کے یاور محمد اور دوست محمد وغیرہ ہیں۔[5]

راؤ تلا رام

ریواڑی کے باغی سردار راؤ تلا رام دوران بغاوت میں برابر انقلابیوں کی مدد کرتے رہے انھوں نے بہادر شاہ اور باغی فوجوں کے لیے روپیہ اور رسد وغیرہ کثیر تعداد میں دہلی بھیجا۔ تحریک آزادی میں برابر شریک رہے۔ مگر ناکامی کے بعد ہندوستان سے باہر چلے گئے۔ وہ شہزادہ فیروز شاہ کے ساتھ تھے اور اس زمانے میں ان کے متعلق بھی مختلف خبریں اخبار وں میں نظر آتی تھیں۔ فروری ۱۸۶۳ء میں اطلاع تھی کہ وہ ایران میں ہیں۔ اسی طرح جولائی ۱۸۶۳ء کی خبر تھی کہ وہ ہرات پہنچے۔ اسی سال شہزادہ فیروز بھی ایران اور ہرات میں دورہ کر رہا تھا، لہٰذا یہ بہ آسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ راؤ تلا رام شہزادے کے ہمراہ رہے۔

شہزادہ فیروز غیر ممالک میں

شہزادہ فیروز ملک سے باہر چلا گیا لیکن انگریزوں کی نگاہیں برابر اپنے اس خطرناک دشمن کو تاکتی رہیں، اس کی ہر نقل و حرکت پر برطانیہ کا جاسوسی محکمہ اپنی حیران نظریں جمائے رہا، چنانچہ ۱۸۶۰ء میں شہزادہ قندھار میں تھا اور اس کے بعد ۱۸۶۱ء میں وہ بخارا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ اس زمانے میں اگرچہ مالی پریشانیوں میں تھا اور مقامی حکمرانوں کی امداد پر گذارہ کر رہا تھا مگر مہم پسند فطرت اسے سیماب وار لیے پھرتی تھی اور کسے خبر ہے کہ وہ وطن سے باہر ان ممالک کی خاک کیوں چھان رہا تھا لیکن کیا یہ گمان قرین قیاس نہیں کہ شہزادہ بیرونی ملکوں کی مدد سے دشمنان وطن پر ٹوٹ پڑنے کے امکانات تلاش

---

[5] "الجمعیۃ" ۲۴ دسمبر ۱۹۵۶ء، "العلم" (کراچی)، جنگ آزادی نمبر ۱۹۵۷ء

کر رہا تھا ؟ -

۱۸۶۲ء میں وہ وہاں سے پیچھے کو واپس ہوا اور طہران کا رخ کیا چناں چہ ایران سے ۱۸۶۳ء کے شروع میں حکومت ہند سے یہ تحقیقات کی گئی کہ کیا اس کی گرفتاری پر کوئی انعام مقرر ہے ؟ - ہندوستان کی انگریزی حکومت چاہتی تو یہ تھی کہ لاکھوں روپیہ دے کر بھی اپنے اس سب سے بڑے دشمن کو گرفتار کر لے مگر چوں کہ وہ غیر ممالک کی حدوں میں تھا اس لیے ہاتھ ملنے کے سوا کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ شہزادہ اگلے چند سال ہرات اور بخارا کے درمیان سفر کر رہا تھا اور ۱۸۶۸ء میں وہ خطرناک پوزیشن میں آگیا، یعنی ہندوستان کی سرحد پر وادیٔ صوات میں - کہا جاتا ہے کہ یہاں وہ سید احمد شہید کی جماعت کے رہنما مولانا عبد اللہ سے بھی ملا اور اس کے بعد کابل چلا گیا۔ افغانستان کا امیر اپنے انگریز پڑوسیوں سے خوف زدہ تھا اور شہزادے کی کابل میں موجودگی یقیناً اس کے "سفید دوستوں" کی ناراضگی کا باعث ہوتی لہٰذا امیر افغانستان نے اس کو بدخشاں جانے پر مجبور کیا شہزادہ یہاں بھی زیادہ دیر نہ ٹھہرا اور اس کے بعد سمر قند میں دیکھا گیا ——— اب ایک معمولی عقل و فہم کا انسان بھی یہ بات بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ شیر دل فیروز کو کیا چیز ان ممالک میں لیے پھر رہی تھی، اور یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں کہ افغانستان، ایران، اور وسط ایشیا میں اسے اپنے مقصد میں کام یابی نہ ہوئی - بہت ممکن ہے کہ یہ ناکامی ان حکومتوں میں انگریزی ریشہ دوانیوں کی بہ دولت ہو۔ افسوس ! کہ تاریخ کے صفحات ان حالات سے پردہ نہیں اٹھاتے

ٹرکی میں

اکتوبر ۱۸۷۲ء میں شہزادہ قسطنطنیہ میں تھا جہاں اکثر آزادی پسند ہندوستانی مسلمان جمع ہو گئے تھے۔ ۱۸۷۵ء میں وہاں عام طور پر یہ خیال تھا کہ وہ

مکہ معظمہ چلا گیا لیکن یہ غلط تھا۔ چناں چہ ایک انگریز جاسوس منشر نے جولائی ۱۸۶۵ء میں لکھا ـــــ

"میرے خبر رساں شخص کو سلطان ابراہیم کے ذریعے فیروز شاہ سے ملایا گیا اور وہ اس کے پاس کچھ دیر بیٹھا، وہ بیان کرتا ہے کہ شہزادہ بہ ظاہر نہایت خستہ حال اور درماندہ نظر آتا ہے، وہ تقریباً نابینا ہو چکا ہے اس کی صرف ایک آنکھ باقی ہے اور وہ لنگڑا بھی ہے" [1]

شہزادے کی وفات

جون ۱۸۶۵ء میں شہزادہ مکہ معظمہ چلا گیا اور بالآخر اسی مقدس سرزمین پر ۱۷ دسمبر ۱۸۷۷ء کو ہمیشہ کے لیے سو گیا۔ اپنے آخری ایام میں وہ شریف مکہ کے جاری کردہ وظیفہ پر گزارا کر رہا تھا۔ اس کو کبھی کبھی ہندوستان کے عوام سے بھی مالی امداد پہنچتی رہی۔ اپنی یادگار جو اس نے مکہ میں چھوڑی وہ ایک غم زدہ عورت یعنی اس کی بیوی تھی۔ شہزادے کی عمر پچاس سال سے زیادہ نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر سین اپنی تازہ تصنیف میں لکھتے ہیں۔

"اُس وقت سے ایک صدی پہلے اُس جیسی صلاحیتوں کا مالک انسان یقیناً ایک عظیم الشان سلطنت فتح کرتا اور اس دور سے ایک صدی بعد اگر وہ جنم لیتا تو آج کا ہر دل عزیز رہنما بنتا۔ اس طرح وہ یا تو اپنے وقت سے بہت بعد پیدا ہوا اور یا بہت پہلے .... افسوس ہے کہ اس کی سیر و سیاحت کا کوئی مفصل

---

[1] فارن ڈپارٹمنٹ نمبر ۱۰۵، بحوالہ سین / ۳۸۰

حال محفوظ نہیں جب کہ اس نے اپنی جلا وطنی کی حالت میں مشرق وسطیٰ اور وسط ایشیا کے بڑے حصے پر سفر کیا ہے اور سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ آج اس کے صرف چند ہم وطن اسے یاد رکھ سکے ہیں" (۱۸۱ و ۳۱۰)

آخر میں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ اس کی بیوہ نے حکومت ہند سے اپنے لیے وظیفے کی درخواست کی اور ۱۸۸۱ء میں پانچ روپے ماہوار اس شرط پر مقرر ہوا کہ وہ دہلی آنے کا ارادہ نہ کرے۔ مشہور ہے کہ شہزادے کی دو لڑکیاں تھیں جو فوجی افسران سے بیاہی گئیں۔ انور پاشا اور رفعت پاشا انھی کی یادگار تھے، اور یہ کہ شہزادے کی ایک بہن کلثوم زمانی شکست دہلی کے بعد میرٹھ چلی گئی تھی لیکن یہ باتیں تصدیق طلب ہیں۔

مولوی لیاقت علی

الٰہ آباد کی شکست کے بعد مولوی لیاقت علی دوسرے انقلابی لیڈروں خصوصاً نانا صاحب کے ساتھ رہے محمدی میں مولانا احمد اللہ کی چند روزہ حکومت میں بھی شریک تھے، جب انقلابی رہنما نیپال چلے گئے تو مولوی لیاقت علی بھی ان کے ہمراہ گئے لیکن وہاں ٹھہرے نہیں مشہور ہے کہ وہ پنجاب اور کشمیر ہو کر ترکستان گئے، امیر بخارا کے مہمان رہے اور پھر انگریزوں کے خلاف مدد لینے ٹرکی بھی گئے (یہ بات تحقیق طلب ہے) بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ سرحد میں روپوش رہے، وہ سندھ اور ملتان میں بھی دیکھے گئے، بڑودہ میں ایک سال مقیم رہے ۱۸۵۹ء میں لاج پور ضلع صورت میں ایک خفیہ انقلابی تحریک کا مرکز قایم کیا اور وہاں دس سال تک رہے، یہیں ایک ٹیلے کے نیچے توپوں کا خفیہ کارخانہ بھی بنایا گیا تھا۔ انگریز افسران اُن کو گرفتار کرنے کی تاک میں

ف شہابی: "غدر کے چند علما"

تھے اور نئی نئی ترکیبیں کر رہے تھے۔ آخر کار ۱۸۶۹ء میں سچالی کے ایک مشہور و معروف ریلوے اسٹیشن پر بمبئی پولس نے پکڑ لیا اور الہ آباد لا کر مقدمہ چلایا گیا۔ عدالت میں انھوں نے ڈنکے کی چوٹ کہا۔

"اگر میں چوہا بھی ہوتا تو انگریزوں کی نس نس کاٹ کر رکھ دیتا"۔

بغاوت کے جرم میں کالے پانی بھیجے گئے اور وہیں ۱۸۹۲ء میں انتقال کیا۔ ان کا وقت انڈمان میں بھی زیادہ تر عبادت و ریاضت اور مذہبی اصلاح و تربیت میں گذرتا تھا۔ حال ہی میں حکومت ہند کی طرف سے ان کے تین نواسوں کے لیے وظیفہ مقرر کیا گیا ہے۔ یہی نواسے اب ان کی یادگار ہیں جن میں دو الہ آباد اور ایک احمد آباد میں ہیں [1]

رانا امر سنگھ

دسمبر ۱۸۵۸ء میں کیمور کی پہاڑیوں سے نکالے جانے کے بعد بھی مئی ۱۸۵۹ء تک بہار کے باغی برابر سرگرم عمل رہے۔ نہ صرف شاہ آباد بلکہ حاجی پور، چھپرہ، سیوان، چمپارن اور بھاگل پور وغیرہ میں بھی ان کی سرگرمیاں جاری تھیں انگریزوں کو اب بھی ان کے حملے کا دھڑکا لگا ہوا تھا ان کو یہ بھی اطلاع ملی کہ نیپالی عوام اپنے ان مصیبت زدہ مگر پُر حوصلہ باغی بھائیوں کی پوری طرح مدد کر رہے ہیں امر سنگھ بھی برابر ایک جگہ سے دوسری جگہ گھوم رہے تھے۔ ۲۴ نومبر ۱۸۵۸ء کو کھاروندا (ضلع پالامئو) میں ان کے ہمراہ زبردست فوج تھی۔ نانا صاحب کے نیپال جانے کے بعد وہ اکتوبر ۱۸۵۹ء میں ترائی کے علاقوں میں چلے گئے تاکہ انقلابی فوج کی کمان سنبھال سکیں لیکن وسط دسمبر ۱۸۵۹ء میں جنگ بہادر نے ان کو گرفتار کر لیا اور گورکھ پور جیل میں رکھا گیا۔ ابھی مقدمہ کی تیاریاں

---

[1] "الجمعیۃ" ۱۷ر اگست ۱۹۵۷ء

رہی تھیں کہ وہ پیچش میں مبتلا ہوئے اور جیل کے ہسپتال میں داخل کر دیے گئے جہاں ۵ رفروری ۱۸۶۰ء کو انھوں نے اپنے غلام وطن اور قوم سے ہمیشہ کے لیے منھ موڑ لیا۔[1] ان کے ساتھیوں میں ہری کرشن سنگھ ۱۲ اگست ۱۸۵۹ء کو گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا کر جگدیش پور میں پھانسی دی گئی (دسمبر ۱۸۵۹ء)۔ للمبر سہائے، پتمبر سہائے، امراؤ سنگھ اور اس کے دیوان شیخ بھکاری کا بھی یہی انجام ہوا، نادر علی اور جے منگل کو اکتوبر ۱۸۵۷ء میں پھانسی دی جا چکی تھی

نواب ولی داد خاں

نواب ولی داد جو دہلی کے شاہی خاندان کے رشتہ دار تھے اور بہادر شاہ کی طرف سے بلند شہر کے ناظم مقرر ہوئے تھے، ستمبر ۱۸۵۷ء تک گلاؤ ٹھی، مالاگڑھ اور بلند شہر کے مختلف علاقوں میں دشمنان وطن سے جنگ کرتے رہے۔ یکم اکتوبر ۱۸۵۷ء کو ان کا قلعہ مالاگڑھ مسمار کر دیا گیا جس کے کھنڈر اب بھی اس کی گذشتہ عظمت یاد دلا رہے ہیں تو وہ اپنی فوجوں کو لے کر منتشر ہو گئے لیکن اس کے بعد بھی ان کے بیٹے اسمٰعیل خاں نے آگرے کے قریب ایک مقام ملسی میں دشمنوں کا مقابلہ کیا اور بالآخر، ۸ ر دسمبر کو مکمل شکست ہوئی۔[2] ولی داد خاں اس کے بعد بریلی میں خان بہادر خاں سے جا ملے اور آخری معرکوں میں حصہ لیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء ختم ہونے پر انقلابی رہنماؤں کے ہمراہ نیپال چلے گئے۔ مالاگڑھ اور اس کے قرب و جوار میں ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ نواب کچھ عرصے بعد بنجاروں کے بھیس میں قلعے کے قریب آ کر مقیم ہوئے تھے اور یہاں سے خفیہ طور پر خزانہ کھود کر اپنے ہمراہ لے گئے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے اٹاوہ میں سکونت اختیار کر لی تھی مگر یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ نواب کے چار بیٹے اسمٰعیل خاں، صمد خاں، محسن علی خاں اور احمد یار خاں تھے

[1] دتہ / ۱۷۹ [2] چودھری / ۸۱

مولانا احمد اللہؒ

تحریک ۱۸۵۷ء پر کسی بھی ہندوستانی یا انگریز مصنف کی کتاب اٹھا کر دیکھیے تو پوری تحریک میں، اس کی تنظیم اور جدوجہد میں مولانا احمد اللہ شاہ دلاور جنگ مدراسی کا نام پیش پیش نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود موجودہ دور کے ارباب اقتدار کو مولانا احمد اللہؒ کا نام یاد نہیں۔ مگر ان کے زندہ جاوید کارنامے اور ان کا غیر فانی جذبہ ایسا نہیں ہے جو آنے والی نسلوں سے بھلایا جا سکے۔ صرف ہندوستان ہی نہیں، بہ قول میلیسن دنیا کے آزادی پسند عوام ان کا نام عزت و احترام سے یاد رکھیں گے

مولانا کا جسم جلا کر راکھ دریا میں بہادی گئی تھی لیکن ان کا سر شاہ جہاں پور کی مسجد جہان آباد میں دفن ہے۔ ان کے ابتدائی حالات کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا کا پورا نام سید احمد علی عرف ضیاء الدین خطاب دلاور جنگ تھا۔ جلال الدین عادل کے پوتے اور ابوالحسن تانا شاہ والیٔ گول کنڈہ کے پرپوتے تھے، سولہ سترہ سال کی عمر میں ہی طبیعت دولت و امارت سے بیزار ہو گئی تھی، کچھ عرصے ریاست حیدرآباد میں فوجی خدمات انجام دیں، بہادری کا شہرہ لندن تک ہو گیا "سوانح احمدی" (مصنفہ فتح محمد تائب) میں ہے کہ لندن کے بعض رئیسوں نے وہاں آنے کی دعوت دی، اور آپ لندن گئے۔ واپسی میں مختلف ملکوں کی سیاحت کی، حج کیا، ایران بھی گئے اور ہندوستان لوٹے تو سانبھر چلے گئے وہاں چلہ کشی کی، جے پور میں میر قربان علی کی صحبت میں رہے جو ایک مجذوب فقیر تھے۔ ٹونک میں تھے کہ گوالیار کے حضرت محراب شاہ قلندرؒ کا شہرہ سنا تو ان کے پاس پہنچے۔ یہ بزرگ ایک رئیس مسمی سنتولے کے پیادوں میں ملازم تھے۔ انھوں نے مولانا کو مرید کیا اور مشہور ہے کہ جہاد کی ترغیب دی انھی کی ہدایت پر دہلی آئے اور پھر آگرے وغیرہ کا دورہ کیا۔ آگرے کے بابو بینی پرشاد کیل آپ کے بڑے معتقد تھے۔ مولانا قوالی کی محفلیں جماتے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ادراں کے مرید

جلتے کوئلوں پر یا ہی بے آب کی طرح لوٹتے تھے مگر جسم پر نشان تک نہ پڑتا تھا[1]۔ اپنے مریدوں کو شہ سواری وغیرہ کی بھی مشق کراتے تھے۔ آگرے کے حکام نے ایک بار مقدمہ بھی قایم کیا مگر بری ہو گئے۔ آگرے سے آپ لکھنؤ چلے گئے تھے۔ باقی حالات پہلے ہی گذر چکے ہیں[2]۔

تانتیا ٹوپی

شہزادہ فیروز اور راؤ صاحب سے علیحدہ ہو کر تانتیا ٹوپی گوالیار کے وزیر مان سنگھ کے پاس چلا گیا جسے انگریزوں نے دغابازی پر آمادہ کر لیا تھا، شہزادے نے تانتیا کو خط لکھا کہ وہ واپس آ جائے۔ تانتیا نے بھروسہ کرتے ہوئے یہ خط مان سنگھ کو دکھایا تاکہ اس سے مشورہ لے۔ مان سنگھ نے اس کو ٹھہرنے کا مشورہ دیا اور چپکے سے انگریزوں کو اطلاع کر دی۔ چناں چہ آدھی رات کے وقت جب کہ شیر دل تانتیا بے خبر سو رہا تھا گرفتار کر لیا گیا (۷، اپریل ۱۸۵۹ء)

تانتیا ٹوپی پر مقدمہ چلایا گیا جس کی کارروائی میں حصہ لینے سے اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ ہر سوال کا جواب دو لفظوں میں دیتا تھا ــــ "معلوم نہیں" ــــ آخر کار سزائے موت کا فیصلہ ہوا اور ۱۸، اپریل ۱۸۵۹ء کو شام کے چار بجے پھانسی دینے کے لیے لایا گیا۔ جب اس کے ہاتھ پاؤں باندھے جانے لگے تو اس نے کہا ــــ "ان رسیوں کی ضرورت نہیں" ــــ اور یہ کہہ کر اپنا گلا خود ہی پھندے میں ڈال دیا۔

مقدمے کے دوران میں ہزاروں آدمی اسے دیکھنے دور دور سے آتے تھے۔

پھانسی سپری کے مقام پر دی گئی اور پھانسی کے بعد اس کے جسم کو سورج ڈوبنے تک

---

[1] اس کی تصدیق لکھنؤ کے ہفت روزہ "طلسم" سے بھی ہوتی ہے جس کے اقتباسات نیا دور (اگست ۱۹۵۷ء) میں شائع ہوئے ہیں [2] یہ حالات "ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء" از شہابی سے ماخوذ ہیں۔

لٹکا ہوا چھوڑ دیا گیا۔ جب اس کے پاس سے پہرے دار ہٹائے گئے تو یورپین تماشائیوں کا گروہ آگے کی طرف جھپٹا اور اس کے سر کے چند بال بہ طور یادگار لینے کے لیے عجیب ہڑبونگ سی مچ گئی۔[1] جیسا کہ پہلے بیان ہوا، اس کے بعد راؤ صاحب کو بھی ۱۸۶۰ء میں پھانسی دے دی گئی۔

۱۸۵۷ء کی خوں ریز جنگِ آزادی کا خاتمہ ہو گیا اور طوفان کے بعد کی سی خاموشی نظر آنے لگی، دریا بہ ظاہر پُرسکون ہو چکا تھا۔ آتش فشاں اپنا لاوا اُگل کر خاموش نظر آ رہا تھا۔ مگر اندر ابھی کیا کچھ موجود تھا۔ کون جانے۔

---

[1] پھانسی سے پہلے اس نے اپنا مفصل بیان اور حالات اردو میں قلم بند کرائے، آخر میں اپنے دستخط مرہٹی میں ثبت کیے۔ یہ بیان نیشنل آرکائیوز میں محفوظ ہے۔

دلیرانِ وطن

جنھیں کوئی نہیں جانتا

تحریک ۱۸۵۷ء کے دوران میں ہمت اور حوصلہ مندی کے بے شمار واقعات ہیں جنھیں بیان کرنے کے لیے ایک علیحدہ کتاب درکار ہوگی اور ایسے دلیروں کی تعداد غالباً لاکھوں تک پہنچے گی جنھوں نے مردانگی کے ناقابلِ فراموش جوہر دکھائے اور اپنے دیش وطن پر قربان ہو گئے۔ چند کے دھندلے سے نقوش تو تاریخ کے صفحات پر چھان بین کے بعد دستیاب ہوتے ہیں لیکن اکثر وہ ہیں جن کے تذکروں سے تاریخیں خالی ہیں اور صرف زبانی روایات تک ہی محدود ہیں۔ یہاں ہم صرف انھی چند دلیرانِ وطن کا تذکرہ کر رہے ہیں جن کا ذکر صفحاتِ تاریخ پر ملتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم ان کی یاد تازہ کریں اور ان کے بہادرانہ کارناموں پر نہ صرف فخر کریں بلکہ ان کے عزم و ہمت سے سبق بھی لیں۔

شاہ مل سنگھ جاٹ

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو جب میرٹھ میں بغاوت کے شعلے بلند ہوئے تو شاہ مل سنگھ بھی میدان میں آ گئے۔ وہ

باغپت، بڑوت اور بجرول کے علاقے میں سرگرم عمل تھے۔ انھوں نے بغاوت میں نمایاں حصہ لیا، انگریزوں کا قتل عام کیا، اور ایک بڑا لشکر جمع کرلیا تھا۔ انگریز شاہ مل سے بے حد خوف زدہ تھے۔ انھوں نے ایک شخص کرم علی کے ذریعے دغا بازی سے شاہ مل سنگھ جاٹ کو ختم کرایا اور اس کا صلہ کرم علی کو چار مواضع اور تحصیل داری ملی۔ ایک گوجر کو جس نے شاہ مل کا سر اپنے پاس رکھا اور اس کو انگریز افسروں تک پہنچایا، جاگیر ملی۔ جن گاؤں کے عوام نے شاہ مل سنگھ کا ساتھ دیا تھا وہ ضبط کرکے نیلام یا نذرِ آتش کر دیے گئے۔ بے شمار گوجروں کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔[1]

اِمّن گوجر

بلند شہر میں نواب ولی داد خاں کو صوبے دار مقرر کیا گیا تھا۔ نواب موصوف کا ایک سالار اِمّن گوجر بھی تھا جس نے قرب و جوار کے لاکھوں گوجروں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرلیا تھا اور نواب کے ہمراہ آخر تک دشمنانِ وطن سے جنگ آزما رہا۔ وہ بڑا ہی شجاع اور بہادر تھا۔ تمام گوجر اس کو اپنا سردار مانتے تھے۔

گلزار علی و شبیر علی

امروہہ کے سید گلزار علی و سید شبیر علی کا نام تاریخ میں یادگار رہے گا۔ جب مرادآباد میں انگریزی راج کا خاتمہ ہو گیا اور ان علاقوں نے آزادی کا پھریرا اڑایا تو سید گلزار علی و شبیر علی نے بھی امروہہ کے انتظامات سنبھالے۔ شبیر علی نے بہادر شاہ کو ایک عرض داشت بھیجی اور اس کا باقاعدہ جواب بھی ان کو موصول ہوا۔ مذکورہ دونوں لیڈروں نے اپنے افسر مقرر کیے، ٹیکس وصول کیے اور شہر پر باقاعدہ حکومت کی۔ جب نواب رام پور کی فوجیں آئیں تو ان بہادروں نے مقابلہ

---

[1] باغی میرٹھ / ۲۹

کیا۔ انگریزی اقتدار دوبارہ مسلط ہو جانے پر شبیر علی کو مقدمہ چلا کر جنوری ۱۸۵۹ء میں انڈمان (کالا پانی) بھیج دیا گیا جہاں انھوں نے غالباً ۱۸۹۰ء میں انتقال کیا۔ گلزار علی فرار ہو گئے مگر ان کے بچ نکلنے کی داستان بھی عجیب ہے، وہ بغاوت کے بعد روپوش ہو گئے تھے اور انگریز حکام اُن کی گرفتاری کے لیے بڑی دوڑ دھوپ کر رہے تھے، چناں چہ ان کے محلے میں پولس چوکی اسی غرض سے قایم کی گئی تھی۔ ان کے اعزا میں سے ایک صاحب نے روزانہ رات کو گھوڑے پر سوار ہو کر نکلنا شروع کیا۔ گھوڑی اِدھر اُدھر دوڑاتے اور آ جاتے۔ پولس کی پوچھ گچھ پر کہہ دیا کہ گھوڑی چاندنی سے ڈرتی ہے۔ عادی بنا رہا ہوں۔ پولس والے مطمئن ہو گئے اور یہ دستور جاری رہا۔ ایک دن وہ گھوڑی حسب معمول اچھلتی کودتی نکلی اور غائب ہو گئی، آج اس پر گلزار علی تھے مگر پولس والے چوں کہ عادی ہو چکے تھے لہٰذا توجہ بھی نہ کی[1]

حکم چند جی اور مرزا شیر

جب ہانسی، حصار، روہتک وغیرہ میں بغاوت ہوئی تو ہانسی کا انتظام حکم چند جی قانون گو نے سنبھالا وہ ایک شہر کے ایک معزز رئیس اور زمیں دار تھے، رفاہِ عام اور دھرم کے کاموں پر روپیہ خرچ کرتے تھے اور اسی وجہ سے عوام میں ہر دل عزیز تھے، ملک میں آزادی کی جدوجہد شروع ہونے پر حکم چند نے اپنے رفیق مرزا شیر بیگ کے ساتھ حصہ لیا اور اپنی خدمات بہادر شاہ کو پیش کر دیں، انھوں نے شاہِ دہلی کو فارسی میں ایک عرض داشت ارسال کی جس میں علاقے کا انتظام سنبھالنے کی اجازت چاہی مگر اس وقت تک دہلی شکست ہو چکا تھا، اس لیے جواب نہ آیا، تو ان دونوں نے انتظام سنبھال لیا۔ بعد کو جب انگریزی

---

[1] "آج کل" آزادی نمبر ۱۹۵۷ء

حکومت دوبارہ قایم ہوئی تو حکم چند اور مرزا شیر کو پھانسی دی گئی اور ان کی جائداد ضبط کر لی گئی۔ حکم چند جی کی اولاد آج بھی ہانسی میں موجود ہے۔

مارڑے خاں

بجنور کے انقلابی سردار نواب محمود خاں کا سپہ سالار مارڑے خاں بہادر اور جری شخص تھا۔ اس نے کئی معرکوں میں انگریزوں کو ناکوں چنے چبوائے اور بجنور کا انتظام مکمل کرنے کے بعد دوسرے علاقوں میں اپنی بلند ہمتی کے جوہر دکھاتا رہا۔ امروہہ میں سید گلزار علی کی بھی مارڑے خاں نے امداد کی تھی اس کی بہادری اور جرأت کے افسانے دور دور مشہور تھے۔

راجہ بینی مادھو سنگھ

بیگم حضرت محل کے ساتھی شنکر پور کے راجہ بینی مادھو کا نام بھی صفحاتِ تاریخ پر امر رہے گا وہ برابر اودھ کی انقلابی سرگرمیوں میں بیش از بیش حصہ لیتے رہے۔ ہوپ گرانٹ نے جب شنکر پور کا رخ کیا تو وہ اُس سے پہلے ہی قلعہ چھوڑ کر چلے گئے اور کمانڈر ان چیف سے کہلا بھیجا کہ "میں قلعے کی مدافعت کرنے سے مجبور ہوں اس لیے آپ کے قبضے میں دیتا ہوں مگر میری ذات میرے بادشاہ کی ملکیت ہے اسے آپ کے حوالے نہیں کر سکتا" ــــ بیگم حضرت محل کے ساتھ ہی نیپال گئے وہاں جب ایک دن دیوگڑھ کے دیوان نے کہا کہ ہم آپ کو انگریزوں سے امان دلوا دیں گے تو بینی مادھو نے صاف جواب دیا کہ "ہم آپ کے قول و قرار سے خوب واقف ہو چکے ہیں"۔ اُنھوں نے اپنی عورتوں کو ہدایت کی کہ وہ بیگم کی رفاقت سے منھ نہ موڑیں، اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ زر و جواہر کے اس انبار سے جس کا جو دل چاہے لے کر چلا جائے ہم خوشی سے اجازت دیتے ہیں اور جس کو مردانہ وار مرنا ہو وہ ہمارے[1]

---

[1] "نیا دور" اپریل ۵۷ء

ساتھ دے"۔ ڈھائی سو میں سے صرف دو آدمی دولت لے کر چلے گئے۔ مادھو سنگھ اپنی مختصر فوج سے نیپال کی زبردست فوجوں کا مقابلہ کرتے رہے اور ۱۸۵۹ء میں جنگ کرتے ہوئے کام آئے۔ ان کا خاندان یعنی بھائی جوگ راج سنگھ، بیوہ اور بارہ[12] یا چودہ[14] سالہ لڑکا دسمبر ۵۹ء تک نیپال میں تھے۔ بعد میں ان کو گذارے کے لیے کچھ زمین دے دی گئی اور سیتاپور بھیج دیا گیا۔[1]

دیوان حکمت اللہ

فتح پور کے ڈپٹی مجسٹریٹ حکمت اللہ انقلابیوں کے رہنما بھی تھے۔ یہاں ۱۲ جولائی ۵۷ء کو نانا صاحب کی فوجوں سے انگریزوں کا تصادم ہوا اور قبضے کے بعد حسب دستور فتح پور کے باشندے ہولناک ظلم و ستم کا نشانہ بنائے گئے۔ دیوان حکمت اللہ نے آخر تک انگریزی فوجوں کا دلیرانہ مقابلہ کیا تھا چناں چہ ان کو بھی پھانسی دی گئی، لیکن کس طرح؟۔ ولیم میور لکھتا ہے۔

> "معلوم ہوتا ہے کہ دیوان کو موت کی سزا دینے میں بڑا بھونڈا طریقہ اختیار کیا گیا۔۔۔ سپاہیوں کو اجازت دی گئی کہ اس بدبخت کے منھ میں سُوَر کا گوشت ٹھونسیں"[2]

راجہ ہنومنت سنگھ

کالا کانکر کے تعلق دار راجہ ہنومنت بھی بیگم حضرت محل کے جاں نثاروں میں سے ایک تھے، ان کی بلند کرداری کی ایک روشن مثال یہ ہے کہ انھوں نے اگرچہ بغاوت میں پوری طرح حصہ لیا

---

1. Sen _ 368

2. ظہیر: ۲۵۸

مگر سالون کے نہتے انگریزوں کو پناہ دی اور ۹ دن اپنے قلعے میں رکھا جب انگریز کرنل نے برطانوی حکومت کی وفاداری کی درخواست کی تو انھوں نے گرج کر کہا۔

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ نے مدد چاہی اور میں نے مصیبت کے وقت مدد کر دی آپ لوگوں نے زبردستی یہاں قبضہ جمایا ہے اور ہمیں تباہی کے غار میں ڈھکیل دیا ہے آپ کے جانے کے بعد میں فوراً شاہی لشکر میں شریک ہو کر انگریزوں کے خلاف جنگ کروں گا اور ان کو اس ملک سے نکالنے کی جد و جہد کروں گا" [1]

چناں چہ انھوں نے جنگ میں حصہ لیا اور برابر بیگم اودھ کے ساتھ رہے۔ مولانا احمد اللہ شاہ کی شہادت کے بعد جو انقلابی سردار انتقام لینے کے لئے میدان میں آئے ان میں ہنومنت سنگھ بھی تھے۔

آغا مرزا

لکھنؤ کے آغا مرزا جو بادشاہ کے زرہ پوشوں میں ملازم تھے، نڈر اور بے باک شخص تھے، وہ انگریزوں کی مخالفت میں بے حد سرگرم تھے اور لوگوں کو بھی غیرت دلاتے تھے۔ چناں چہ "قیصر التواریخ" کے الفاظ ہیں۔

"سب سے زیادہ اجل اس کی دامن گیر ہو گئی تھی، وہ لوگوں کو غیرت دلا کر برانگیختہ کرتا تھا...... اس کے سر پر شیطان سوار تھا"۔

آغا کے پڑوس میں ایک انگریز رہتا تھا جس سے ایک دن سخت کلامی ہو گئی "صاحب بہادر" نے اس "گستاخ" پر فوراً گولی چلائی مگر نشانہ خالی گیا آغا اور اس کے ساتھیوں نے انگریز کو مارا اور سامان لوٹ لیا۔ یہ پہلا انگریز قتل ہوا۔ اس کے بعد آغا مرزا ایک تصادم میں زخمی

---

[1] "نیا دور" اپریل ۱۹۵۷ء۔

ہوئے اور زخم کو چادر سے باندھ کر پوشیدہ ہو گئے دو تین دن بعد حضور نگر سعادت گنج کے کوتوال نے ڈھونڈ نکالا اور گرفتار کر کے پھانسی دے دی گئی۔

محمد شفیع بریلی کے رسالدار محمد شفیع نے بغاوت میں سرگرم حصہ لیا اور انگریز افسروں کو بے حد پریشان کیا وہ بخت خاں کے ان ساتھیوں میں سے ایک تھا جنھوں نے بغاوت کی سرگرمیوں میں جانیں لڑا دیں میکنزی کی کوششوں کو سب سے زیادہ اسی نے ناکام بنایا۔ بغاوت کے بعد وہ خان بہادر خاں کے ساتھ رہا[1]

احمد خاں کھرل ملتان کا احمد خاں کھرل بڑا بہادر انقلابی سردار تھا، ملتان ڈویژن کے علاقے گوگیرہ میں اس نے انقلابیوں کی رہنمائی کی اور ۱۷ ستمبر کو بغاوت شروع ہونے پر اس نے سرگرم حصہ لیا، احمد خاں نے انگریزوں سے متعدد مقابلے کیے اور ان کو نئے سامان جنگ سے مسلح ہونے کے باوجود انتہائی حیران و پریشان کیا، اس نے شاہ دہلی کی حمایت کا باقاعدہ اعلان کیا تھا۔ آخرکار ۱۲ جنوری ۱۸۵۸ء کو زبردست مسلح فوجوں نے اس کا تعاقب کیا، احمد خاں بہادری سے مقابلہ کرتا رہا اور بڑے بڑے انگریز افسران ان تصادموں میں کام آ گئے ایک ایسے ہی زبردست تصادم میں احمد خاں بھی گولی کا نشانہ بن گیا مگر اس کے ساتھیوں نے انگریزوں کا پیچھا نہ چھوڑا وہ لمبی گھاس میں چھپ کر انگریزی سپاہیوں کو گولی کا نشانہ بناتے تھے۔ بڑی مشکل سے ان پر قابو پایا جا سکا[2]

فضل علی ہفتہ وار "طلسم" لکھنؤ (۱۸۵۶-۵۷ء) کے فائلوں میں ایک اور بہادر باغی شیخ فضل کا تذکرہ ہے۔ ان کے حالات کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ

[1] میوٹنی رپورٹس بحوالہ مہر/ ۳۲۳ [2] میلین جلد سوم/ ۲۱۱

لکھنؤ کے ایک جنگ جو شخص تھے۔ انھوں نے (غالباً فروری ۱۸۵۷ء) میں بدھنی ضلع تلسی پور
کے تھانے پر چھاپہ مارا اور دس بارہ سپاہیوں وغیرہ کو مار کر غائب ہو گئے۔ اس کے بعد ایک
مرتبہ مارچ ۱۸۵۸ء میں کمشنر گونڈہ سی۔ اے۔ بابیو سے اچانک راہ میں مڈ بھیڑ ہو گئی، شیخ فضل علی
کمشنر کے کئی ساتھیوں کو قتل و زخمی کر کے فرار ہو گئے۔ انگریز برابر تاک میں تھے بالآخر نیپال کو
لکھا گیا کہ فضل علی ہمارا باغی حدود نیپال میں ہے اس کو یا تو حوالے کیا جائے یا انگریزی
فوج کو نیپال آنے کی اجازت ہو۔ جواب آیا کہ "فضل علی یہاں نہیں ہے۔ انگریز افسر تنہا
ڈھونڈنے آئیں فوج کی اجازت نہیں ہو گی"۔ جون کے آخر میں پھر فضل علی سے مقابلہ
ہوا جو نیپال کی سرحد پر تھے اور اگرچہ انگریزی فوجوں نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا
مگر انھوں نے اپنے جاں باز ساتھیوں کے ہمراہ شمشیر زنی کی۔ کسی نے یہ افواہ اڑا دی کہ
فضل علی قتل ہو گئے اور بعض کہتے تھے کہ وہ پہاڑوں میں پہلے ہی پوشیدہ ہو چکے تھے ــــ
بہر حال، انگریز افسران خوش تھے کہ انھوں نے فضل علی کو مار ڈالا ہے۔[1]

شہزادہ عظیم بیگ

شہزادہ عظیم، احمد شاہ درانی کے بیٹے شاہ زادہ تیمور کا پوتا یعنی
جہاں آختر کا بیٹا تھا، وہ روہتک میں ایک معقول عہدے
پر مامور تھا۔ بغاوت شروع ہونے پر اس نے حصار کے انقلابیوں کی رہنمائی کی اور
انگریزی فوجوں سے متعدد جنگیں کیں جن کا تذکرہ اپنے مقام پر آچکا ہے۔ جب اس کے
اہل و عیال کو انگریزوں نے قید کر کے ہانسی بھیجا تو اس نے روہتک پر قبضہ کر لیا، دہلی کی
شکست کے بعد بہادر شاہ سے وہ مقبرہ ہمایوں میں ملا اور پھر انقلابی فوجوں کے ہمراہ

---

[1] "نیا دور" اگست ۱۹۵۷ء

بریلی و لکھنؤ چلا گیا۔ وہ حضرت محل کے ساتھ بھی رہا ہے

سرنام سنگھ

بہار کے انقلابی سرداروں میں سرنام سنگھ نے نمایاں کارنامے انجام دیے۔ انھوں نے روہتاس کی پہاڑیوں میں دشمنانِ وطن کا دلیرانہ مقابلہ کیا اور ان کے لیے انتہائی پریشان کن ثابت ہوئے۔ آخر کار جب کسی طرح بھی انگریز ان پر قابو نہ پا سکے تو دغابازی سے گرفتار کیا گیا یعنی تقریباً سات ہندوستانی اور ایک [۵۶] رجمنٹ کا سپاہی باغیوں کا بھیس بدل کر گئے اور سرنام سنگھ کے بارے میں معلومات فراہم کر لیں، اس طرح ان کے ساتھیوں کو مار کر سرنام سنگھ کو گرفتار کیا گیا اور توپ سے اڑا دیا گیا

نشان سنگھ

چھپرہ (صوبہ بہار) کے علاقے میں نشان سنگھ نے بغاوت کی ابتدا ہی سے نمایاں حصہ لیا وہ یہاں خاص رہنماؤں میں سے تھے اور کنور سنگھ کے رفیقِ کار تھے۔ انگریزوں نے ان کی گرفتاری پر ایک ہزار روپے کا انعام مقرر کیا تھا۔ وہ ۵ر جون ۱۸۵۸ء کو گرفتار ہوئے جب کہ کیمپ سے نکل کر اپنے گاؤں بردیشی جا رہے تھے۔ ان کی گرفتاری پر انگریزوں کو اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ کنور سنگھ اب اس دنیا میں نہیں ہیں، نشان سنگھ کو گرفتاری سے اگلے دن سہسرام میں توپ سے اڑا دیا گیا۔

راجہ جے لال سنگھ نصرت جنگ

روشن سنگھ نائب جنگ کے بیٹے جے لال سنگھ نے لکھنؤ کی انقلابی سرگرمیوں میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ جب لکھنؤ میں بغاوت ہوئی اور انگریزی اقتدار کے خاتمے پر یہ سوال درپیش ہوا کہ اودھ کا حکمراں کون ہو تو راجہ جے لال ان لوگوں میں سے تھے

---

[۵۶] قیصر التواریخ / ۴۶۳

جنھوں نے دوسرے سرداروں سے مل کر برجیس قدر اور بیگم حضرت محل کو تمام امور کا نگراں بنایا اور تمام بیگمات کو اُن کی تخت نشینی پر رضا مند کیا۔ اس کے بعد ۵ رجولائی ۱۸۵۷ء کو برجیس قدر تخت نشیں ہوئے تو فوج کے سردار راجہ جے لال کی سرکردگی ہی میں دربار میں آئے تھے۔ راجہ برابر بیگم کے ساتھ رہے۔ جب نانا صاحب لکھنؤ آئے تو بیگم کی جانب سے ان کا استقبال کیا۔ ملک پر انگریزی قبضے کے بعد وہ کہیں پوشیدہ ہو گئے تھے، وکٹوریہ کے اعلان پر نکل آئے لیکن گرفتار کرکے انگریزوں کے قتل کا الزام اُن پر لگایا اور مقدمہ چلایا گیا۔ آخر کار یکم اکتوبر ۱۸۵۹ء کو پھانسی دینے کے لئے لایا گیا تو انھوں نے خود بڑھ کر پھندا گلے میں ڈال لیا، پھانسی کے بعد لاش کو دفن کیا گیا۔[۱]

رسول بخش کاکوروی

منشی رسول بخش کے والد فیض بخش، نواب شجاع الدولہ کی فوج میں صوبے دار تھے اور وہ خود بھی شاہ اودھ کی فوج میں ملازم تھے۔ الحاق اودھ کے بعد فوج میں بغاوت پھیلائی اور انقلابی رہنماؤں سے بھی رابطہ قایم کر لیا لیکن ان کی اسکیموں نے ابھی عملی جامہ نہ پہنا تھا کہ کسی نے مخبری کردی اور انھیں مع اٹھارہ ساتھیوں کے پھانسی (بہ مقام شاہ پیر محمد کا ٹیلہ) دے دی گئی ان کا خاندان مدت تک پوشیدہ رہا اور سخت پریشانیاں برداشت کیں۔[۲]

ہری کرشن سنگھ

کنور سنگھ کے خاص ساتھیوں میں ہری کرشن بھی شامل تھے۔ اور انھی نے کنور سنگھ کو بغاوت میں حصہ لینے پر آمادہ کیا تھا۔

---

[۱] "قیصر التواریخ" / ۳۶۱

[۲] "العلم" اپریل تا جون ۱۹۵۷ء

وہ جگدیش پور کے تحصیل دار تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کنور سنگھ نے ان کو داناپور کے حالات کا رُخ دیکھنے بھیجا تھا۔ انھوں نے آخر تک تمام جنگوں میں حصہ لیا، بہار سے باہر بھی وہ کنور سنگھ کے ساتھ رہے۔ ۲۴ر دسمبر ۱۸۵۷ء کو ہتھوا کے راجہ نے رپورٹ کی تھی کہ مشرف خاں اور ہری کرشن ہی باغی فوجوں کی کمان کر رہے تھے جہاں زبردست انگریزی فوجوں کی شکست ان کی حیرت انگیز فوجی قابلیت اور بہادری کا ثبوت ہے۔ دسمبر ۱۸۵۸ء تک وہ برابر سرگرم عمل رہے اور اس کے بعد اندازہ ہے کہ روپوش ہو گئے شاہ آباد میں باغیوں کا قبضہ ہونے پر وہ اس علاقے کے حاکم بنائے گئے تھے اور جب امر سنگھ نے جگدیش پور پر قبضہ کیا تو بھی انتظام انھی کے سپرد ہوا۔ ۲۹ر اگست ۱۸۵۹ء کو وہ بنارس کے پرگنہ بدھول کے موضع دیئھیہ میں گرفتار ہوئے اور آرہ جیل میں رکھے گئے۔ مقدمہ چلا تو اس میں حصّہ لینے سے انکار کر دیا۔ غالباً دسمبر ۱۸۵۹ء میں پھانسی دی گئی۔ ان کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ انھوں نے انگریز عورتوں اور بچوں کے ساتھ رحم دلی کا برتاؤ کیا۔[1]

---

1. Datta, pp. 97, 98. 101, 102........

تحریک ۱۸۵۷ء کے روحِ رواں

علماء اور پنڈت

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ بغاوت کو منظم کرنے اور اس کو قومی بنیادوں پر حرکت دینے ہی میں ہی نہیں، بلکہ اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے اور میدانِ جنگ میں تیغ آزمائی کے جوہر دکھانے میں بھی برہمن پنڈت اور خصوصاً علمائے اسلام سب سے پہلی صفوں میں نظر آتے ہیں یقیناً اگر یہ مذہبی پیشوا صحیح دینی جذبے اور خلوص کے ساتھ اس جدوجہد میں حصہ نہ لیتے اور اپنے فرض سے کوتاہی کرتے تو یہ ایک "فوجی بغاوت" یا "غدر" بن کر رہ جاتی، اور یہ واقعات اگر ہوتے بھی تو نہایت معمولی بغاوتوں کی شکل میں رونما ہوتے جن کا کچل دینا دشمنانِ وطن کے لیے ذرا بھی مشکل نہ تھا۔ مثال کے طور پر، جنگ بکسر کے بعد سپاہیوں کی بغاوت کو جس بے دردی سے دبا یا گیا، ہم اس کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں

پڑھ چکے ہیں، صرف یہی ایک نہیں، متعدد مرتبہ دیسی سپاہ نے انگریزوں کے وحشیانہ برتاؤ اور ظلم وستم سے تنگ آکر سر اٹھایا، ویلور کی بغاوت کو لیجئے جو مذہبی بنیاد پر رونما ہوئی اور نہایت آسانی سے دبادی گئی۔ صرف اس لیے کہ وہ عوامی اور قومی بنیادوں پر نہ تھی، فوج نے بغاوت کی لیکن عوام نے انگریزی بربریت اور ظلم سے متنفر ہونے کے باوجود غیر منظم ہونے کی وجہ سے حصہ نہ لیا۔ اس کے برعکس ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو علماء اور پنڈتوں کی امداد و حمایت حاصل تھی، انھوں نے عرصۂ دراز سے انقلاب کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ خفیہ جماعتوں کا قیام، چپاتیوں کی تقسیم، پوشیدہ جلسوں کا انعقاد وغیرہ۔ جہاد اور آزادیٔ وطن کی جنگ کا پرچار کرنے کے لیے یہ مقدس گروہ ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گیا، سادھوؤں اور فقیروں کا بھیس بنا کر فوجی بارکوں کے قریب پڑاؤ ڈالے اور سپاہ میں جذبۂ حریت اور حب الوطنی کی لہر دوڑا دی۔ مسٹر ساورکر لکھتے ہیں۔

"فقیر، پنڈت، سادھو اور سنیاسی تمام ملک میں بھیجے گئے۔ ان کو سفر کرنے کے لیے ہاتھی اور ساتھ چلنے کے لیے مسلح محافظ دیے گئے۔ مؤثر اور شریف مولوی جہاد کا پرچار کرنے کے لیے مقرر ہوئے اور ان سب نے قصبوں اور گاؤں میں دورے شروع کر دیے ...... ان فقیروں اور پنڈتوں نے فوجی چھاؤنیوں کے گرد چکر لگائے خصوصاً بارک پور سے میرٹھ، انبالہ، پشاور تک انھوں نے خفیہ انقلابی جماعتوں کی بنیاد ڈالی، افسران ان پر شبہ کرتے ہوئے سپاہ کی ناراضگی کی وجہ سے ڈرتے تھے کیوں کہ سپاہیوں کو ان سے بڑی گہری عقیدت تھی"۔

اگر کسی جگہ افسران شبہ کرتے تو یہ کام سپاہیوں کے گھروں میں ہوتا تھا مثلاً میرٹھ میں اسی قسم کے ایک فقیر کو ملٹری چھاؤنی کے پاس سے ہٹ جانے کا حکم ہوا تو یہ فقیر نہایت معصوم

صورت بنا کر اپنے ہاتھی پر سوار ہو کر وہاں سے چلا گیا اور قریب ہی سپاہیوں کے گھروں میں جا کر ٹھہر گیا۔

برہمنوں کی کوششیں

بغاوت کے دوران میں دکھن کے برہمنوں نے کالپی سے ایک اعلان جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ۔

"اگر اس موقعے پر ہم سب ایک ہو جائیں تو یہ ہمارے دیوتا مہا دیو کی خوشی کا باعث ہوگا اور دھرم کا بچاؤ ہو سکے گا، ہمیں امید ہے کہ وہ تمام لوگ جو سولہ (۱۶) اور بتیس (۳۲) سال کے درمیان عمر رکھتے ہیں اور تلوار چلا سکتے ہیں فوجوں میں اپنے سپاہی بھیجیں گے"۔[۱]

(ترجمہ از انگریزی)

مذکورہ اعلان اپریل ۱۸۵۸ء میں برہمن ماسد یو پنت، بشنو پنت، گنگا دھر پنت اور بلونت راؤ کی طرف سے جاری کیا گیا۔ علاوہ ازیں بغاوت کا بہ غور مطالعہ کرنے سے اور بھی ایسے باغی برہمنوں کے تذکرے ملتے ہیں، مثلاً لارڈ کیننگ (گورنر جنرل) نے انڈین ہوم منسٹر کو ایک خط میں لکھا۔

"مجھے کوئی شبہ نہیں کہ بغاوت برہمنوں نے مذہبی بہانوں سے بھڑکائی ہے"[۲]

جبل پور کے انقلابی لیڈر راجہ شنکر شاہ کی قیام گاہ پر چھاپہ مارا گیا تو دوسرے کاغذات کے علاوہ ایک دعا برآمد ہوئی جو شاید مندروں میں پڑھی جاتی ہوگی۔ دعا کا ترجمہ یہ ہے

"...... اے سنگھار کا۔ (دشمنوں کو برباد کرنے والی) ——

---

1 Foreign Supplement No. 651

2 Kave Vol. I, pp. 616-17

انگریزوں کو مار دے۔ ان کو نیست و نابود کر دے۔ دشمنوں کو بچ کر نہ نکلنے دے۔

اور نہ ایسوں کی بیویاں اور بچے

اے سنگھارکا! ــــ شنکر کی مدد کر، اپنے غلاموں کی مدد کر۔

مذہب کی پکار سُن ــــــــ

"مَلکا"۔! ــــ اندھوں کو کھا جا ــــ!

دیر نہ کر ــــ اب انھیں کھا جا

اور وہ بھی جلد ہی ــــ"[1]

کان پور کے برہمن پنڈتوں نے وہاں کے تمام قرب وجوار کے علاقوں میں بغاوت کی آگ لگا دی تھی۔ بنارس اور پٹنہ پنڈتوں اور علماء کے مرکز ہونے کی وجہ سے انگریزوں کے لیے انتہائی خطرناک علاقے تھے۔[2] انھی تمام حالات نے انگلینڈ کے اخبار "مارننگ پوسٹ" کو یہ لکھنے پر مجبور کیا۔

"...... برطانوی حکومت ہندوستان پر ضرور قایم رہنا چاہیئے اگر اور کسی وجہ سے نہیں تو صرف اس وجہ سے کہ مسلمان اور برہمن شیطانوں کو نیست و نابود کر کے جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے"۔ (۵ ستمبر ۱۸۵۷ء)

افسوس ہے کہ اِن باغی برہمنوں کے مفصل تذکرے تاریخ کے صفحات پر نہیں ملتے اور جو کوشش

---

1. "The Times" 31st Oct. 1857

2. Holmes, pp. 518, 209
Kaye, Vol. II, p. 200, Symposium, p. 30

کے باوجود تفصیلی حالات مل سکے لیکن اوپر کے اقتباسات سے ان کی اہمیت اور خدمات کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔

علماء کا جذبۂ آزادی

علماء نے جس جس طرح بغاوت کو منظم کیا اس کو مفصل بیان کرنے کے لیے تو ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے مگر ان کا کچھ تذکرہ اِن صفحات پر کیا جارہا ہے۔ اس حقیقت سے بڑے بڑے مؤرخ بھی انکار کی جرأت نہیں کر سکے ہیں کہ یہ علماء عوام میں بے حد مقبول تھے، ان کی تحریر و تقریر کا بڑا اثر ہوتا تھا چناں چہ دہلی میں جنرل بخت خاں کی تحریک پر مولانا فضل حق خیرآبادی اور دوسرے علماء نے جو جہاد کا فتویٰ دیا اس کے بارے میں مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے بھی اپنی تاریخ میں اقرار کیا ہے کہ اس سے مذہبی جوش و خروش بہت بڑھ گیا تھا متعدد انگریزوں نے تسلیم کیا ہے کہ جب اور جہاں بھی مذہبی جھنڈا بلند کیا جاتا لوگ جوق درجوق جمع ہو جاتے تھے۔ کان پور اور جھانسی کے علماء نے بھی جہاد کا اعلان کیا تھا مولانا احمد اللہ کی شخصیت تو محتاج بیان ہی نہیں رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی ایک ایسا طبقہ تھا جس نے اس ملک گیر تحریک میں جنگِ آزادی اور جہاد کا رنگ بھر دیا۔

ایک انگریز کا بیان ہے کہ جب اُس نے ایک مولوی صاحب سے، جو اُس کے قریبی دوستوں میں شامل تھے، مرتے وقت پوچھا کہ ان کی آخری خواہش کیا ہے تو اُن کے چہرے پر نہایت افسردگی اور ملال کے آثار ظاہر ہوئے۔ وجہ پوچھنے پر اُنھوں نے کہا۔

"یقین جانو، میں بے حد پشیمان ہوں کہ زندگی میں میں نے دو فرنگی بھی نہ مارے"

یہ واقعہ سٹرساورکر نے بھی (صفحہ ۶۱) بیان کیا ہے۔

الہ آباد کے مولوی لیاقت علی نے جب انتظام سنبھالا تو مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کرنے کے لیے نظم و نثر میں پوسٹر تقسیم کیے۔ نظم کے چند شعر یہ تھے

جس کے پیروں پر پڑے گرد صف جنگ جہاد — وہ جہنم سے بچا، نار سے وہ ہے آزاد

اے برادر تو حدیثِ نبوی کو سن لے — باغِ فردوس ہے تلوار کے سائے کے تلے

بات ہم کام کی کہتے ہیں سنو اے یارو! — وقت آیا ہے کہ تلوار کو بڑھ بڑھ مارو

حق تعالیٰ کو بجا ہر وہ بہت بھاتے ہیں — مثلِ دیوار جو صف باندھ کے جم جاتے ہیں

کب تلک گھر میں پڑے جوتیاں چٹخاؤ گے — اپنی سستی کا بجز افسوس نہ پھل پاؤ گے

ایک اور پوسٹر کا کچھ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"....... جو بدعات ظلم و فساد ساری سلطنت ہندوستان میں خصوصاً ضلع الہ آباد میں کفر فخر د نصاریٰ علی العموم اور پر ہر ایک مومنین اسلام کرام کے از قبیل غارت گری و آتش زدگی و قتل و پھانسی و کندیدگی مکان و چھاپہ زنی و خوں ریزی علماء و مشائخان و احراقِ کلام اللہ و احادیث و کتبِ فقہ وغیرہ ہو رہا ہے اظہر من الشمس ہے۔ اس صورت میں ہر ایک مومنین مخلصین کو لازم ہے کہ مستعد جہاد ہو جائیں .... عموماً امداد عساکر، اتواپ و میگزین جناب برجیس قدر دام اللہ حشمہم والیٔ لکھنؤ سے اور ہمراہی تمام راجگان، وقلمرو لکھنؤ و راجگان قرب و جوار الہ آباد وغیرہ اور اخلاق و اتفاق سارے ہندوستان میں باوصف ہونے اختلاف اقوام و مذہب کے سویہ دلائل کامل براہین مدلل کمر بندی اوپر اندفاع اس قوم نصاریٰ طاغی و باغی کے ہے۔ مناسب ہے کہ جو بھائی مسلمان اس خبر فرحت اثر کو سنے وہ فوراً مستعد ہو کر ہمت جہاد پر

باندھیں اور تا شہر الٰہ آباد تشریف لاویں اور قلعہ بند کفار نابکار کو قلع قمع کر کے
بہ زورِ تیغِ بے دریغ اپنی کے خاک میں ملاویں اور باقی ماندوں کو اس ملک سے
بھگادیں ......"[1]

مولانا فضل حق خیرآبادیؒ

یگانۂ روزگار عالم، عربی کے ماہر ادیب و شاعر، بڑے مفکر، مدبر اور سیاست داں تھے ۱۷۹۶ء
میں بہ مقام خیرآباد (ضلع سیتاپور) پیدا ہوئے۔ ان کے والد معزز عہدے پر تھے اور
ممتاز علماء میں شمار ہوتے تھے۔ آپ نسباً فاروقی تھے۔ تیرہ سال کی عمر میں تعلیم مکمل کر کے
درس دینا شروع کر دیا تھا، بعد میں آپ دہلی میں انگریز ریزیڈنٹ کے سررشتہ دار ہو گئے
اور پھر ناظم کر دیے گئے مگر انگریزوں کی نظرِ حقارت کو ناقابل برداشت پاکر استعفےٰ دے دیا
اس کے بعد جھجر، الور، ٹونک، رام پور وغیرہ میں رہے۔ ۱۸۴۸ء میں لکھنؤ آگئے اور صدرالصدور
بنائے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء قریب آنے پر آپ نے اکثر والیانِ ریاست کو بغاوت
پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اگست ۱۸۵۷ء میں دہلی آگئے اور یہاں جنرل بخت خاں کی
تحریک پر جہاد کا فتویٰ مرتب کر کے پیش کیا جس سے مسلمانوں میں بے حد جوش و خروش
پیدا ہو گیا اور نوے ہزار سپاہی جمع ہو گئے لیکن مغل شہزادے اپنے اختلافات، پھوٹ،
اور حسد کی بہ دولت فائدہ نہ اٹھا سکے۔ دہلی کی شکست کے بعد مولانا اپنے خاندان کو
لے کر یہاں سے نکل گئے اور دو سال تک خانہ بہ دوش زندگی گذاری۔ نومبر ۱۸۵۸ء میں
جب وکٹوریہ نے عام معافی کا اعلان کیا تو دھوکا کھا کر نکل آئے۔ چناں چہ گرفتار ہوئے اور لکھنؤ

---

[1] "محاربۂ عظیم" ۳۰۰، ۳۰۳

میں مقدمہ چلا جس میں حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ مولانا بری ہو جائیں مگر آپ نے برسرِ عدالت صاف کہہ دیا کہ "میں نے ہی جہاد کا فتویٰ دیا تھا اور آج بھی میری وہی رائے ہے"[1]۔ عدالت کے فیصلے پر ان کو کالے پانی بھیج دیا گیا جہاں انھوں نے ایک صبر آزما زندگی گذاری۔ اپنی داستان عربی میں "الثورۃ الھندیۃ" کے نام سے نظم کی ہے آخرکار دردناک تکلیفیں اٹھا کر وہیں ۱۲۷۸ھ ۱۸۶۱ء میں انتقال کیا۔ وہ بڑے روشن دماغ، ذہین، عالی ہمت اور رحم دل تھے ان کا عقیدہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوؤں سے اچھے تعلقات رکھنا چاہییں اور ہر ایسی حرکت سے بچنا چاہیے جو انگریزوں کو مداخلت کا موقع دے۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کے والد ماجد آپ کے شاگرد تھے۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

جنھوں نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی، قصبہ نانوتہ ضلع سہارن پور کے رہنے والے تھے۔ مولانا مملوک علی مفتی صدرالدین اور مولانا شاہ عبدالغنی مجددی جیسے علماء سے تحصیل علوم کی ۱۸۵۷ء کی تحریک میں اپنے محترم پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہؒ کے دوش بہ دوش کام کیا اور شاملی کے میدان میں تیغ آزمائی کے جوہر دکھائے۔ حاجی صاحبؒ کے مکہ چلے جانے کے بعد خدمت دین و وطن کا مقدس کام سنبھالا۔ اُس زمانے میں سرسید احمد خاں مسلمانوں کو انگریزوں کا خیر خواہ

---

[1] "باغی ہندوستان" ص ۱۰۰، بہ حوالۂ "سیر العلماء" — مولانا امتیاز علی عرشی (ناظم کتب خانہ رام پور) نے حال ہی میں اِن واقعات کو غلط ثابت کیا ہے اور یہ انکشاف کیا ہے کہ مولانا ایک شخص میر فضل حق ساکن شاہ جہاں پور کے دھوکے میں گرفتار ہو گئے تھے۔ ایک خط سے اس کی تصدیق ہوتی ہے جو انھوں نے نواب رام پور کو لکھا تھا ("تحریک"۔ اگست ۱۹۵۷ء)

بنانے میں سرگرداں تھے لیکن مولانا محمد قاسمؒ ایسے خطرناک زمانے میں بھی یہ چاہتے تھے کہ مسلمان دشمنان وطن کے خلاف جہاد اور آزادئ وطن کے مقدس جذبات سے سرشار ہو کر پھر میدان میں صف آرا ہوں اور یہ جبھی ممکن تھا کہ جب وہ اسلامی تعلیمات سے پوری طرح فیض یاب ہوں چناں چہ اس نظریے کے تحت آپ نے ۱۸۶۷ء میں دارالعلوم کی بنیاد رکھی۔ مولانا کا خواب پورا ہوا اور اس دارالعلوم نے جنگِ آزادی کی آیندہ تحریکوں کے لیے آزمودہ کار رہنما عطا کیے۔ مولانا کے شاگردوں میں حضرت مولانا سید احمد حسن محدث امروہیؒ اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ آپ کے جانشین مانے گئے۔

حضرت حاجی امداد اللہؒ

ملک کے برگزیدہ، مقتدر اور درویش صفت بزرگوں میں حضرت حاجی صاحبؒ نمایاں ترین شخصیت ہیں۔ ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے، ماہر استادوں کی نگرانی میں علوم کی تکمیل کی کچھ دن سید احمد شہیدؒ کی تحریک سے متعلق رہے اور اس کے بعد آپ مکہ معظمہ پہنچے جہاں شاہ محمد اسحاقؒ سے مشورے کے بعد واپس آئے۔ ۱۸۴۶ء میں شاہ اسحاقؒ کا انتقال ہو گیا تو آپ کے جانشین بنائے گئے۔ ہندوستان میں یہ بڑی افراتفری کا دور تھا۔ ملک میں انگریزی ملوکیت کا سیلاب بڑھتا چلا آرہا تھا مگر حاجی صاحبؒ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ دورے کیے اور عوام کو بتایا کہ دشمنان وطن کے خلاف بغاوت کا وقت آگیا ہے۔ ان کی سحر انگیز تقریروں نے عوام اور خصوصاً مسلمانوں کے دلوں میں آزادی اور بغاوت کی آگ لگا دی، ان کی موثر شخصیت نے تحریک کو تقویت پہنچائی اور جب تحریک شروع ہوئی تو آپ نے اپنے عقیدت مندوں کے ہمراہ شاملی (ضلع مظفر نگر) میں جہاد کیا۔ تحریک کی ناکامی پر آپ مکہ معظمہ چلے گئے اور وہیں

حضرت مولانا محمد قاسمؒ اور دوسرے شاگردوں کو ہدایات بھیجتے رہے ۱۸۶۷ء میں وفات پائی۔
شری رتن لال بنسل لکھتے ہیں۔

"...... ۸۴ سال کی عمر میں ہندوستان کا یہ بہت بڑا صوفی، بہت بڑا فقیر، بہت بڑا کرانتکاری، (انقلابی) بہت بڑا عالم اور ولی اللہی جماعت کا چوتھا امام موت کی گود میں جا سویا، مرتے مرتے بھی اُن کے دل میں اپنے وطن کی ایک جھلک دیکھنے کی حسرت تھی پر ساتھ ہی یہ تسلی تھی کہ کم از کم برٹش جھنڈا اُن کے سر پر نہیں اڑ رہا ہے"۔

ہندوستان میں اب بھی آپ کے لاکھوں عقیدت مند اور مرید موجود ہیں۔ خصوصاً علمائے کرام کی موجودہ جماعت جمعیۃ علماء آپ ہی کی ذاتِ والا صفات سے وابستہ ہے۔ مولانا محمد قاسمؒ آپ کے جانشین ہوئے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ

تحریک ۱۸۵۷ء کے اسباب میں عیسائیت کی جبری تلقین بھی شامل ہے چنانچہ ۱۸۵۷ء سے پہلے ملک کو عیسائی بنانے کی مہم زوروں پر تھی، حکومت کے نشے میں سرشار پادری نہ صرف اکڑ اکڑ کر عیسائیت کا پرچار کرتے بلکہ دوسرے مذہبوں اور ان کے بزرگوں پر کیچڑ بھی اچھالتے تھے۔ مولانا رحمت اللہ کا نام ان مجاہدوں کی فہرست میں سب سے نمایاں ہے جنھوں نے ان بے لگام پادریوں کو مردانہ وار مقابلہ کر کے شرمناک شکستیں دیں مولانا نے پادری فنڈر سے وہ یادگار تاریخی مناظرہ کیا کہ اس کو ہندوستان چھوڑ کر فرار ہونا پڑا آپ نے عیسائی پادریوں کے جواب میں کئی کتابیں لکھیں اور جب تحریک ۱۸۵۷ء کا بگل بجا تو آپ میدانِ جہاد میں بھی صف آراء ہوئے، کیرانہ (ضلع مظفر نگر) میں گورا فوج کا مقابلہ کیا، انقلابیوں کی رہنمائی کی مگر مخبروں کی ناپاک سازشوں نے شکست سے

دوچار کیا تو آپ گھسیارے کا بھیس بدل کر گھاس کاٹنے بیٹھنے گئے اور گورہ فوج قریب سے گذر گئی۔ آپ اس کے بعد دہلی آئے، وارنٹ جاری تھا اور ایک ہزار روپیہ انعام گرفتاری پر مقرر تھا مگر مختلف مقامات پر تکلیفیں اٹھاتے ہوئے مکہ معظمہ جا پہنچے جہاں مدرسہ صولتیہ قائم کیا۔

مولانا الحاج رشید احمد گنگوہی رح

حضرت حاجی امداد اللہ رح کے خلیفہ اور بڑے متبحر عالم تھے۔ شاملی میں جہاد کیا، گرفتار ہوئے اور مظفر نگر جیل میں رکھے گئے۔ قریب تھا کہ سزائے موت دی جائے کہ عام معافی کا اعلان ہونے پر چھوڑ دیا گیا۔ رہا ہو کر آپ پھر انقلابی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے اور مولانا محمد قاسم رح کے دوش بہ دوش کام کرتے رہے۔ جب حکومت کے اشارے پر مسلمانوں کی علیحدہ جماعت بنائی گئی تو آپ نے سختی سے مخالفت کی اور فتویٰ دیا کہ مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہونا چاہیے حال آں کہ یہ وہ زمانہ تھا جب آزادی اور انقلاب کا نام لینا بھی جرم تھا اور کانگریس نے بھی مکمل سوراج کو اپنا نصب العین نہیں بنایا تھا مولانا نے ہندوستان کو دار الحرب قرار دیا اور آخری سانس تک آزادئ وطن کے لیے کوشش کرتے رہے۔ بالآخر ۱۱ اگست ۱۹۰۵ء کو بروز جمعہ بہ عمر ۸۹ سال وفات پائی۔

مولانا سید اسحاق رح

ریاست ٹونک کے ساکن تھے۔ بچپن میں والد کا انتقال ہو گیا اور والدہ نے پرورش کی جو ایک عالم و فاضل خاتون تھیں۔ مولانا نے شہ سواری، تیغ زنی، نیزہ بازی وغیرہ کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ علوم دینی کی تکمیل دہلی میں کی۔ ۱۸۵۷ء میں جنگ شروع ہوتے ہی تلوار سنبھالی اور والدہ کی اجازت اور دعائیں لے کر میدان میں آ گئے۔ دہلی میں متعدد بار انگریزی فوجوں کا مقابلہ کیا اور ایک دستے کے افسر مقرر کر دیے گئے فوج کو لوٹ مار

سے روکنے کی انتہائی کوشش کرتے تھے مگر فوجوں کی بدنظمی اور انتشار سے تنگ آکر استعفےٰ دے دیا اور مرزا مغل کے اصرار کے باوجود بھی واپس نہ لیا تاہم ان کے جوش و خروش میں فرق نہ آیا۔ وہ تحریک کو مقدس جہاد سمجھتے تھے ایک بار مسجد میں ایک شخص نے تحریک کو "غدر" کہا تو آپ تلوار کھینچ کر اس پر جھپٹے، لوگ آڑے نہ آتے تو ممکن تھا کہ اس کا سر اڑا دیتے۔ دہلی کی شکست کے بعد دل برداشتہ ہو کر اپنے کو انگریزوں کے حوالے کرنا چاہتے تھے مگر والدہ نے ہمت بندھائی اور آپ ٹونک چلے گئے۔ حکومت کو اطلاع ہو چکی تھی لہٰذا ٹونک میں داخلے سے پہلے ہی ایک دستہ بھیجا گیا آپ نے تلوار سونت کر لڑنا شروع کر دیا زخمی ہو کر گرفتار ہوئے اور اجمیر میں مقدمہ چلا کر سزائے موت کا حکم ہوا لیکن نواب ٹونک کی سفارش اور کوشش سے بری ہو گئے۔ غیور طبیعت نے غلام ملک میں قیام گوارا نہ کیا اور کابل چلے گئے جہاں چند سال بعد وفات پائی [1]

مولوی وہاج الدین عرف منّو

عام طور پر مولوی منّو کے نام سے مشہور تھے، معزز اور باوقار خاندان سے تعلق رکھتے تھے، نہایت فیاض، سیرچشم، مہمان نواز، بے حد عبادت گذار اور شجاع تھے، عربی فارسی کے علاوہ انگریزی پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ تحریک ۱۸۵۷ء میں آپ نے نمایاں حصہ لیا اور مراد آباد میں انقلابیوں کی رہنمائی کی ۱۹ مئی ۱۸۵۷ء کو آپ ہی کی سرکردگی میں جیل خانہ توڑا گیا آپ نے مختلف علاقوں میں تحریک کو مضبوط بنانے کے لیے اپنے آدمی روانہ کیے، خود بھی قرب و جوار کے علاقوں میں دورے

---

[1] "الجمعیتہ" ۳ دسمبر ۱۹۵۶ء

کرکے فرزندانِ وطن کو جنگ پر آمادہ کیا اور پمفلٹ تقسیم کیے۔ جب نواب رام پور کی فوج نے چڑھائی کی تو آپ نے بھی تلوار سنبھالی اور مقابلہ کیا۔ انگریزی حکومت کے دوبارہ تسلط کے بعد پھانسیوں کا بازار گرم ہوگیا تو گرفتاری کے لیے فوجی دستہ بھیجا گیا جس کا آخر دم تک مقابلہ کرتے رہے اور وہیں شہید ہوئے۔ مزار کچہری روڈ کے متصل میدان (نزد مسجد لعل بند کنجرن کی سرائے) میں واقع ہے [1]

مفتی عنایت احمد کاکوروی

۱۲۲۸ھ میں بہ مقام دیوہ پیدا ہوئے۔ تعلیم کاکوری اور رام پور میں حاصل کی۔ دہلی میں شاہ محمد اسحاقؒ سے بھی استفادہ کیا پھر علی گڈھ میں مفتی و منصف کے عہدے پر مامور رہے کچھ عرصے بریلی میں صدر امین رہے جب جنگ آزادی شروع ہوئی تو آپ نے خان بہادر خاں کے ساتھ جنگ میں حصہ لیا۔ زیادہ تر بریلی اور رام پور میں آپ کی سرگرمیاں جاری تھیں انگریزی تسلط کے بعد گرفتار ہوئے اور مقدمہ چلاکر کالے پانی بھیج دیے گئے وہاں بھی تصنیف کے کام میں مشغول رہے۔ چند سال بعد رہا ہوگئے اور حج کو روانہ ہوئے مگر راہ میں جہاز ڈوب گیا اور اس طرح آپ کی وفات ہوگئی۔ یہ واقعہ ۱۷ شوال ۱۲۷۹ھ کو پیش آیا۔ عمر ۵۲ سال ہوئی قریشی النسل تھے، علوم دین پر آپ کی بے شمار تصانیف ہیں جو آج تک قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ [2]

مولوی رضی اللہ بدایونی

بدایوں کے صدیقی شیخ تھے۔ بغاوت میں عملی طور پر سرگرم حصہ لیا جس کی وجہ سے مقدمہ چلا،

---

[1] "الجمعیۃ" ۲۰ مئی ۱۹۵۷ء

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تذکرہ مشاہیر کاکوری اور تاریخ علمائے ہند

حسن اتفاق سے جج آپ کا شاگرد رہ چکا تھا اور چاہتا تھا کہ آپ جرم سے انکار کر دیں، اسی لیے دو دن تک مقدمے کو ٹالتا رہا مگر آپ نے ہر بار جرأت اور بے باکی سے اپنے "جرم" کا اقبال کیا تو مجبوراً اس کو سزائے موت کا حکم سنانا پڑا۔ جب سزا کے لیے پیش ہوئے تو پھر جج نے کہا کہ اگر اس وقت بھی جرم سے انکار کر دیں تو جان بچا دوں۔ آپ نے غضب ناک ہو کر جواب دیا۔

"کیا تمھاری وجہ سے اپنا ایمان اور عاقبت خراب کروں" [۱]

شاہ غلام بولن سیوہاروی

مراد آباد کے مشہور قادری بزرگ حضرت شاہ بلاقیؒ کے پرپوتے تھے۔ خوش اخلاق اور بلند کردار تھے کثیر تعداد میں لوگ آپ سے فیض روحانی حاصل کرتے تھے۔ آپ نے ایک بار باغیوں کو کھانا کھلایا تھا۔ اس "جرم" میں قید کر کے انڈمان بھیج دیے گئے اور وہیں وفات پائی۔

مولوی کفایت علی کافی

مراد آباد کے معزز خانوادۂ سادات کے رکن، عالم و فاضل، خصوصاً طب، صرف و نحو اور ادب میں کمال حاصل تھا۔ زیادہ تر کلام نعتیہ ہے۔ بریلی، بدایوں اور مراد آباد میں تحصیل علم کی۔ تحریک ۱۸۵۷ء میں سرگرم حصہ لیا ہر جمعہ کو جہاد کی اہمیت اور ضرورت پر وعظ کہتے تھے کیوں کہ تمام مساجد میں علماء کو مقرر کیا گیا تھا کہ مسلمانوں میں جہاد کی روح بیدار کریں۔ مولانا کافی کو نواب مجو خاں کی حکومت میں صدر شریعت بنایا گیا۔ وہ عوام میں بیداری پیدا کرنے کے لیے دورے بھی کرتے اور فتوئ جہاد کی نقلیں تقسیم کراتے تھے۔ جب نواب رام پور نے

---

[۱] "الجمعیۃ" ۱۵ر اکتوبر ۱۹۵۶ء

مراد آباد پر قبضہ کرنا چاہا تو آپ خان بہادر خاں سے امداد لینے کے لیے آنولہ ہوتے ہوئے
بریلی پہنچے اور آپ ہی کی فراہم کردہ اطلاعات پر بخت خاں رام پور اور مراد آباد آئے تھے
مولوی کفایت علی ان کے ہمراہ تھے۔ اپریل ۱۸۵۸ء کے بعد مخبروں نے گرفتار کرادیا۔ جب
اپنے بارے میں پھانسی کا حکم سُنا تو بے حد خوش ہوئے اور مقتل کی طرف اپنی نعتیہ غزل
جھوم جھوم کر پڑھتے ہوئے چلے۔ مراد آباد جیل کے سامنے پھانسی دی گئی اور وہیں مدفون ہیں
نظم و نثر میں آپ کی بے شمار تصانیف ہیں جن میں "نسیم جنت" "خیابانِ فردوس" اور
"داستانِ صادق" وغیرہ مشہور ہیں [1]

مولانا یحییٰ علی

عظیم آباد (پٹنہ) کے رہنے والے اور مولوی الٰہی بخش جعفری کے
بیٹے تھے۔ علم و فضل، زہد و تقویٰ اور ایثار و قربانی کا مجسمہ تھے۔
پٹنہ میں انقلابی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ سید احمد شہید کی تحریک کے مجاہدین کے لیے
روپیہ اور آدمی فراہم کر کے سرحد کو روانہ کرتے تھے آپ نے متعدد جگہوں پر جماعت کے مرکز
قایم کیے اور نہایت فہم و تدبر سے ان کو چلایا۔ انبالے میں جو مشہور مقدمہ ۱۸۶۴ء میں ہوا
اس میں آپ سب سے بڑے ملزم تھے۔ پہلے پھانسی کی سزا ہوئی جسے سُن کر آپ انتہائی
خوش تھے کہ شہادت کا مرتبہ حاصل ہوگا لیکن یہ خوشی دیکھ کر انگریز افسروں نے کالے پانی
کا حکم دے دیا۔ عدالت کے فیصلے میں لکھا گیا تھا:

"اس نے اپنے ماتحت ایجنٹ رکھے ہوئے تھے جو روپیہ جمع کرتے اور جہاد
کی تعلیم دیتے تھے اس نے اپنی سازشوں سے حکومت کو ایسی سرحدی جنگوں میں

---

[1] "العلم" اپریل تا جون ۱۹۵۷ء

دھکیل دیا جس میں سیکڑوں جانیں ضائع ہوئیں، وہ بہت تعلیم یافتہ انسان ہے"
فیصلے کے بعد مع دیگر ساتھیوں کے انڈمان بھیجے گئے اور کل جائداد ضبط ہوگئی۔ وہیں
۲۰؍ فروری ۱۸۶۱ء کو وفات پائی۔

مولانا عنایت علی

پٹنہ کے مولانا عنایت علی اور مولانا ولایت علی دونوں حقیقی بھائی تھے اور ممتاز زبیری گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ والد کا نام مولوی فتح علی تھا۔ دونوں بھائی سید احمد شہید کی تحریک سے متاثر ہوکر گھربار عیش و آرام وغیرہ چھوڑ کر جہاد کے لیے ہجرت کرکے سرحد کے آزاد علاقے میں چلے گئے۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد انھی دونوں نے اس جماعت کو منظم کیا۔ مولانا ولایت علی ایک بہترین واعظ اور جادو بیان مقرر بھی تھے۔ مولانا عنایت علی کچھ دن بنگال میں تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف رہے اور وہاں ایسی پنچایتیں قایم کیں جو جھگڑوں کا فیصلہ کریں کیوں کہ آپ کے نزدیک انگریزی عدالتوں میں جانا دین و ایمان کم زور کرنا تھا۔ ۱۸۴۳ء میں دو ہزار مجاہدین کو لے کر سرحد جا پہنچے۔ کئی جنگوں میں حصہ لیا اور پھر وطن لوٹ آئے۔ حکومت نے پابندیاں لگا دی تھیں مگر آپ پوشیدہ طریقے سے دوبارہ چلے گئے اور پھر میدان جہاد میں سربکف ہوگئے۔ ۱۸۵۷ء کا زمانہ قریب آیا تو دونوں بھائیوں میں طریقۂ کار کے بارے میں اختلاف ہوگیا۔ مولانا ولایت علی کے حامیوں نے اس بغاوت میں حصہ نہ لیا جب کہ مولانا عنایت علی نے دشمنانِ وطن کو سرمیدان للکارا اور اپنے مٹھی بھر ایثار پیشہ جاں بازوں کے ہمراہ جنھیں اکثر کھانے کو بھی نہ ملتا تھا دشمن سے جنگ کرتے رہے۔ یہاں بھی غداروں کی سرگرمیاں رنگ لائیں اور آپ کو شکست ہوئی دوسرے یہ کہ بغاوت شروع ہوتے ہی ملک کے مختلف حصوں سے روپے کی آمد بند ہوگئی جس پر اس جماعت کا دارومدار تھا۔ اسی بے کسی کی

حالت میں مارچ ۱۸۵۸ء میں وفات پائی۔ اوکنلے نے لکھا ہے کہ

"انھوں نے اپنے ہمراہیوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی" ۱؎

مولانا فیض احمد بدایونی

بدایوں کے عثمانی شیخ، والد حکیم غلام احمد، پیدائش ۱۲۲۳ھ / ۱۸۰۸ء۔ بچپن میں ماموں نے پرورش کی اور تعلیم دی۔ پندرہ سال کی عمر میں تعلیم مکمل کر لی۔ کچھ عرصے انگریزی ملازمت میں رہے عیسائیت کے مبلغ پادریوں سے مناظروں میں حصہ لیا، بغاوت شروع ہونے پر آگرے میں تھے جہاں مولانا احمد اللہ نے مجلس علماء قایم کی تھی۔ آگرے میں آپ نے انقلابی عوام اور فوجوں کی کمان سنبھالی۔ اس کے بعد اپنے پرانے رفیق کار ڈاکٹر مولوی وزیر خاں کے ہمراہ دہلی آگئے اور مرزا مغل کے پیش کار رہے۔ دہلی کی شکست کے بعد لکھنؤ چلے گئے اور بیگم حضرت محل اور مولانا احمد اللہ کے ہمراہ معرکوں میں حصہ لیتے رہے محمدی میں مولانا احمد اللہ کی حکومت میں بھی شریک رہے۔ اپریل ۱۸۵۸ء میں بدایوں میں بھی جنگ کی اور شہزادہ فیروز کے ساتھ رہے۔ انقلابی عوام کی شکست کے بعد کچھ پتہ نہ چل سکا۔ مشہور ہے کہ آپ بھی نیپال کی طرف چلے گئے۔ ۲؎

مولانا سید عالم علی

نگینہ ضلع بجنور کے ساکن، متبحر عالم اور خطیب تھے تکمیل تعلیم کے بعد رام پور میں قیام رہا لیکن مرادآباد

۱؎ "سرگذشت مجاہدین" ۱/ ۲۲۵

۲؎ "الجمعیۃ" ۲۵ فروری ۱۹۵۷ء

کے باشندوں کی درخواست پر آپ یہاں آگئے اور امام شہر بنا دیے گئے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں نمایاں حصہ لیا اور دیگر علمار کی تحریک کی کامیابی کے لیے سرگرم کوشش کی تحریک کی ناکامی کے بعد آپ کو بھی "مجرموں" کی فہرست میں رکھا گیا لیکن سرسید احمد خاں کی کوششوں سے رہا کر دیے گئے اور پُرسکون زندگی گذارتے رہے۔ اسی وجہ سے آپ کا نام انقلابی سرگرمیوں میں نظر نہیں آتا۔ آپ کے پوتے مولانا سید قاسم علی مراد آباد کے امام شہر ہیں۔[۱]

مولوی علاؤالدین

علاقۂ دکن کے مشہور و معروف عالم تھے۔ اُن کے جدِ اعلیٰ مولوی حافظ شجاع الدین اپنی علمی قابلیت، روحانی تقدس اور تصوف کے لحاظ سے عالی مرتبت تھے۔ آج بھی ان کا مزار زیارت گاہِ عوام ہے۔ چناں چہ اسی طرح مولوی علاؤالدین بھی بڑے احترام اور عقیدت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے حیدرآباد کے عوام نے انھی کی رہ نمائی میں رزیڈنسی پر حملہ کیا تھا۔ ناکامی کے بعد مولوی علاؤالدین نے بھیس بدلا، داڑھی ترشوائی اور پوشیدہ طور پر منگل پلی چلے گئے جہاں دو سال بعد ہیضے کی وبا پھیلنے پر انھوں نے تعویذ دیے اور پتہ چل جانے پر گرفتار ہوگئے۔ مقدمہ چلا تو انھوں نے جرم بغاوت کا اقرار کیا اور کالے پانی بھیج دیے گئے۔ اس وقت اُن کی عمر پینتیس ۳۵ سال کے لگ بھگ تھی۔[۲]

مولانا مظہر اور مولانا منیر

جنھوں نے شاملی میں حضرت حاجی امداد اللہؒ کے ہمراہ جہاد میں حصہ لیا، حافظ لطف علی کے

---

[۱] یہ حالات مجھے محترم مولانا افتخار فریدی (مراد آبادی) کے ذریعے معلوم ہوئے

[۲] "آج کل" ستمبر ۱۹۵۷ء

فرزند اور قصبہ نانوتہ (سہارن پور) کے ساکن تھے۔ دونوں بھائیوں نے مولانا مملوک علی اور مولانا احمد علی محدّث اور مولانا شاہ عبدالغنی مجددی وغیرہ سے تکمیل تعلیم کی۔ مولانا مظہر اجمیر اور آگرے میں ملازم رہے ۱۸۵۷ء میں آپ نے تحریک آزادی میں حصہ لیا، شاملی کے میدان میں پیش پیش رہے اور زخمی ہوئے۔ امن ہو جانے کے بعد مدت تک روپوش رہے۔ سہارن پور کے مدرسہ مظاہر العلوم کی بنیاد آپ ہی نے رکھی اور شروع میں یہاں شیخ الحدیث اور مدرس اول بھی رہے ۱۳۰۵ھ میں انتقال کیا۔ مولانا محمد منیر نے بھی شاملی کے جہاد میں حصہ لیا تھا اور کچھ دن پوشیدہ رہ کر بریلی چلے گئے، کافی عرصے مذہبی کاموں میں مصروف رہے پھر دو سال تک دارالعلوم کا انتظام سنبھالا تصانیف میں "فوائد عربیہ" اور امام غزالیؒ کے رسالہ "منہاج العابدین" کا اردو ترجمہ "سراج السالکین" کے نام سے کئی بار چھپا، مولانا علوم روحانی سے بھی آراستہ تھے اور نقشبندیہ سلسلے میں بیعت تھے [۱]

مولانا جلیل

علی گڈھ کے امام شہر، خطیب اور مدرّس مولانا عبدالجلیل نے بھی مقامی طور پر جدوجہد آزادی میں دلیرانہ حصہ لیا ہے، ان کے والد بھی بڑے پائے کے عالم تھے۔ مولانا جلیل نے دہلی میں تکمیل تعلیم کے بعد جامع مسجد علی گڈھ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، نہایت متقی، پرہیزگار اور ولی صفت بزرگ تھے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں اپنے پانچ ہزار آدمیوں کو لے کر میدان میں آئے اور مردانہ وار جنگ کی۔ جولائی ۱۸۵۷ء میں جب آگرے کی جانب سے انگریزی فوجوں نے

۱؎ "الجمعیۃ" ۲۵ نومبر ۱۸۵۷ء

چڑھائی کی تو انھوں نے مڈراک کی سڑک پر مقابلہ کیا اور شہید ہوئے۔ ان کے ساتھیوں کی جرأت و ہمت کا انگریزوں نے اعتراف کیا ہے چناں چہ ملک کے مشہور مورخ ایس، بی چودھری اپنی تازہ انگریزی تصنیف میں سرکاری بیانات کے اقتباس میں لکھتے ہیں۔

"یہ ایک انتہائی حوصلہ مندانہ قسم کی دست بہ دست جنگ تھی۔۔۔۔۔ انھی میں علی گڑھ کا مولوی عبد الجلیل بھی تھا جو مسلمانوں کے مذہبی تعصب کو ہوا دینے میں سب سے زیادہ سرگرم تھا" [۱]

انگریزی قبضے کے بعد یہاں موتی مسجد کے سامنے چوراہا عبد الکریم اور پھول چوراہا پر پھانسیاں نصب کی گئیں اور قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ مولانا اور ان کے ساتھیوں کی قبریں جامع مسجد کے شمالی حصے "گنج شہیداں" میں واقع ہیں۔ آپ کے پوتے آج کل بھی علی گڑھ میں موجود ہیں، عالم باعمل ہیں"۔ [۲]

مولوی واعظ الحق

پٹنہ کے متبحر عالم تھے اور ولی اللہی تحریک کے خاص رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے۔ جب ملک میں عیسائی پادریوں اور مشنریوں نے اُدھم مچانا شروع کیا تو آپ اُن کے خلاف میدان میں آئے اور منھ توڑ جوابات دیے۔ چناں چہ اسی وقت سے انگریزی حکومت کی نظروں میں خار بن کر کھٹکنے لگے تھے۔ جب بغاوت شروع ہوئی تو بہار میں خطرے کے آثار دیکھ کر پٹنہ کے کمشنر ٹیلر نے اکثر معزز اہل شہر کو اپنے پاس طلب کیا اور تین علماء کو نظر بند کر دیا جن میں مولوی واعظ الحق بھی شامل تھے

---

[۱] چودھری / ۸۰

[۲] "الجمعیۃ" ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۷ء

جب ان کو جیل سے رہا کیا گیا تو ان کی باا ثر شخصیت اور حریت پسندانہ کردار سے خوف کھا کر حکومت نے معقول ملازمت کا لالچ دیا مگر انھوں نے حقارت سے ٹھکرا دیا اور ٹنک چلے گئے جہاں اپنی زندگی کے باقی دن گذارے۔ بہار میں بغاوت کی تمام خفیہ سازشوں میں وہ شریک اور پوری طرح باخبر تھے ۔[1]

مولوی عبدالقادر لدھیانوی

بن مولانا عبدالوارث کا خاندان علم وفضل میں ممتاز تھا، آپ نے دہلی میں تکمیل تعلیم کی انگریز حکام کی خواہش پر بھی کوئی عہدہ قبول نہ کیا، پنجاب میں انقلابی تحریک کو پروان چڑھایا۔ ۱۸۵۷ء میں مع بیٹوں کے عملی حصہ لیا، مع متعلقین دہلی آگئے اور مسجد فتح پوری میں قیام کیا۔ شکست دہلی کے بعد روپوش ہو گئے اور حکومت کی تلاش کے باوجود پتہ نہ چلا کانگریس کے قیام پر اس کی حمایت میں فتویٰ دیا۔ حضرت مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی مرحوم آپ ہی کے پوتے تھے۔ یہ خاندان اب دہلی میں آباد ہے ۔[2]

سید محمد امین غازی

امروہہ کے خانوادہ سادات (رضوی) کے فرد، سلسلہ نسب حضرت مخدوم سید آبن بدر چشتی رح کے توسل سے حضرت امام علی الرضا پر منتہی ہوتا ہے۔ سید احمد صاحب کے ساتھ رہے اور جہاد میں حصہ لیا۔ ایک طویل فارسی مثنوی میں اس دور کے حالات نظم کیے۔ دو شعر دن سے جذبہ حریت کا اندازہ ہوتا ہے۔

---

1. Datta pp. 77, 83

[2] شہابی: "کمپنی کے باغی علماء"

ہمی خواستم از درِ کبریا ، کہ از ہند بر قوم بد بے حیا
نصاریٰ دریں ملک گردد تباہ گرفتار وہم کشتہ و روسیاہ

عالم و فاضل اور نیک سیرت بزرگ تھے ، بغاوت ۱۸۵۷ء میں کافی عمر رسیدہ تھے ۔ جناب پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی تازہ پیش کش "۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ" میں (ص : ۲۴۶) لکھا ہے کہ انھوں نے ہنگامہ ۵۷ء میں شرکت کی اور مثنوی میں یہ حالات بھی درج کیے ہیں [1]

شاہ محمد امین کے پوتے مولانا سید احمد امین نیک مزاج عالم تھے جن کا گذشتہ سال انتقال ہو گیا ۔

---

[1] مذکورہ مثنوی کے چند شعر مجھے عزیزی مولانا نسیم احمد فریدی مدظلہٗ کی وساطت سے دیکھنے کا موقع ملا ۔ مفصل تذکرے کے لیے "تاریخ امروہہ" (تذکرۃ الکرام) دیکھی جا سکتی ہے ۔

ناکامی

اور

انتقام

"غدر سے متعلق تقریباً تمام دستاویزیں
زبانِ حال سے ہماری زیادتیوں کا
اعلان کرتی ہیں"۔

——— ایڈورڈ تھامپسن

———

"برطانیہ نے ہندوستان میں موت کا
اس قدر لرزہ خیز ڈھنگ ایجاد کیا ہے
جس کے تصور ہی سے انسانیت کانپ
اٹھتی ہے"۔

——— ارنسٹ جونس

———

"ہم نادر شاہ
سے بازی لے گئے"

——— جان لارنس وغیرہ

ہول ناک انتقام

جنگِ پلاسی کے بعد سے تحریکِ ۱۸۵۷ء تک یہ ملک سفید فاموں کے ہاتھوں جس درندگی اور لوٹ کھسوٹ کا شکار رہا، اس کا ہلکا سا خاکہ ہم اس کتاب کے اوراق پر پہلے پیش کر چکے ہیں۔ لیکن دنیا کی تاریخ میں ڈھونڈے سے نہ مل سکیں گی اُس ہول ناک ظلم وستم کی مثالیں جو اِس "مہذب" قوم نے انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ملک کے مظلوم مردوں، عورتوں اور بوڑھوں پر روا رکھا۔ یہ حالات اس وجہ سے بھی اہمیت رکھتے ہیں کہ انگریز مورخوں نے ہندوستانیوں کے مفروضہ مظالم اور سفاکیاں تو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کی ہیں اور اُنھیں کو بہانہ بنا کر نانا صاحب وغیرہ پر دل کھول کر لعن طعن کیا ہے مگر انگریزوں کے مظالم کو اکثر مورخ یا تو شیرِ مادر کی طرح پی گئے ہیں اور یا صرف اُن کی ہول ناکی پر ہلکا سا اشارہ کر کے چھوڑ دیا ہے۔ تاہم اُنھی کی یادداشتوں اور بعض پرائیویٹ خطوں سے اس یگانۂ روزگار بربریت کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔

دہلی میں قیامت

انبالے سے جب انگریز فوجیں دہلی کا محاصرہ کرنے کے لیے چلیں تو راہ میں مظلوم دیہاتیوں اور عام باشندوں پر

نت نئے مظالم بے جُرم و خطا ڈھائے گئے۔ اس کے بعد جب دہلی شکست ہوگئی اور انگریزی
اقتدار کا پرچم دوبارہ لہرانے لگا تو من مانی کرنے کا موقع ملا۔ لاکھوں انقلابی تو دہلی گیٹ
اور اجمیری گیٹ سے باہر نکل گئے لیکن جو بیمار اور زخمی بھاگ کر نہ جا سکے یا کسی اور وجہ سے
ٹھہرے رہے اُن پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹے۔ زخمی فوجیوں کا علاج تو فوراً بندوق کی گولیوں
سے کیا گیا۔ اس کے علاوہ شہر میں عام لوٹ مار شروع ہوگئی، فوجیں معصوم شہریوں پر
ٹوٹ پڑیں۔ گورے ہر شخص کے گھر میں گھس جاتے مال و اسباب لوٹتے، عورتوں، بچوں،
اور بوڑھوں کو قتل کرتے اور ـــــ کانپ اٹھیں گے زمین و آسمان ـــــ کہ یہ انسان نما
جانور عورتوں کی عصمت دری کرتے تھے، اُن کے گھر والوں کے سامنے۔!

جو بدقسمت زندہ بچ گئے ان کو مع اسباب کے اس طرح گرفتار کیا گیا کہ گھر کا تمام
سامان مردوں کے سر پر، اور عورتیں اور بچے روتے پیٹتے ان کے پیچھے، اس حالت میں ان کو
فوجی گورنر برن کے سامنے پیش کیا جاتا۔ "بے پردگی کی حالت میں بے چاریاں ٹھوکریں
کھا کھا کر گرتی تھیں، بچے گود سے گرے جاتے تھے اور سپاہی ناقابلِ بیان سختی سے ان کو
آگے چلنے کے لیے دھکے دیتے تھے" [1]

گورنر کے پاس پہنچ کر تمام قیمتی اسباب چھین لیا جاتا اور بے کار سامان اُن کے
حوالے کر کے لاہوری دروازے سے دھکے دے کر نکال دیے جاتے، یہ بے یار و مددگار
مارے مارے پھرتے تھے۔ سیکڑوں بچے بھوک اور پیاس سے مر گئے اور کتنے ہی بے کسوں
نے اِن مصیبتوں سے تنگ آ کر خودکشی کر لی، ہزاروں عورتوں نے کنوؤں میں ڈوب کر جان

---

[1] "دہلی کی جاں کنی" / ۶۰، ۶۴

دی اور بے شمار کنوئیں اِن زندہ اور مردہ لاشوں سے اُٹ گئے۔ یہ واقعات خود ایک انگریز افسر کی زبانی سنیے۔

"ہم نے اس قسم کی سیکڑوں عورتوں کو کنوؤں سے زندہ نکالا جو کنوؤں میں لاشوں کے سبب جگہ نہ ہونے سے ڈوبی نہ تھیں اور زندہ پڑی تھیں۔ جس وقت ہم نے ان کو نکالنا چاہا تو وہ چیخنے لگیں کہ برائے خدا ہم کو ہاتھ نہ لگاؤ اور گولی سے مار دو، ہم شریف بہو بیٹیاں ہیں ہماری آبرو خراب نہ کرو۔ اور جب ہم ان کو باہر نکالتے تو ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگتی تھیں اور بعض بے ہوش کر گر پڑتی تھیں۔" [۱]

ایک ایسی عورت کی لاش نکلی جو اپنی چھاتی سے دو ننھے بچوں کو چمٹائے ہوئے تھی، ایک اندھی جوان لڑکی پر جب بدمعاش گوروں نے حملہ کیا تو وہ اپنے گھر کے کنوئیں میں کود پڑی، ساتھ ہی اس کی ماں نے بھی چھلانگ دی جس کے جوان بیٹے کو اس کے سامنے کاٹ ڈالا گیا تھا۔

"ہم نادر شاہ سے بازی لے گئے"

چاندنی چوک میں پھانسیاں نصب تھیں روزانہ سیکڑوں بے گناہ گرفتار ہو کر آتے بغیر تحقیق و تفتیش کے پھانسی کا حکم ہوتا اور قطار میں کھڑا کر کے باری باری پھانسی دی جاتی باوجودیکہ یہ کام اتنی تیزی سے ہو رہا تھا کہ تین ماہ تک روزانہ آٹھ گاڑیاں لاشوں سے بھر کر روانہ کی جاتی تھیں اُس پر بھی مزید سختی کا مطالبہ زوروں پر تھا۔[۲] پھانسی پانے والوں اور گولیوں سے ہلاک کیے جانے والوں میں بے شمار عورتیں، بچے، بوڑھے، اپاہج اور معذور لوگ شامل تھے۔ ایک مغلیہ خاندان کے بزرگ میرزا قیصر کو، جن کے ہوش و حواس

---

[۱] "دہلی کی جانکنی" [۲] "تصویر کا دوسرا رخ" / ۲۹

بھی درست نہ رہے تھے، پھانسی دے دی گئی۔ اسی طرح ایک بیمار شہزادے میرزا محمود کو جو عرصہ دراز سے گٹھیا کے مریض تھے اور ہلنے سے بھی مجبور تھے پھانسی ہوئی۔ ذکاء اللہ دہلوی نے لکھا ہے کہ پھانسی کے بعد بھی ان کی لاش گولا لاٹھی بنی لٹکتی رہی جو شخص اس طرف دیکھتا تھا وہ بے اختیار رونے لگتا تھا۔[1] پھانسیوں کا نظارہ دیکھنے اور بے گناہوں کی تکلیف سے لطف اندوز ہونے کے لیے انگریز مرد اور عورتیں فوارے کے گرد کرسیاں بچھا کر بیٹھ جاتے تھے۔ پھانسی کے نظارے دیکھ دیکھ کر عورتیں تو اپنا منھ چھپا چھپا لیتی تھیں، اور مرد مسکرا کر سگرٹ کے کش لگاتے تھے۔ ہزاروں بدمعاش مخبری پر مقرر تھے جن کو اس کام پر انعام دیے جاتے تھے۔

دہلی کی شکست کے بعد سات دن تک شہر میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا در حقیقت میں یہ قتل و غارت گری نادر شاہ کے قتل عام سے ہزار گنا زیادہ تھی جس کا خود انگریزوں نے اقرار کیا ہے۔ مثلاً جان لارنس، الفنسٹن اور مال پول وغیرہ نے۔ لارنس کہتا ہے۔

"جہاں تک لوٹ مار کا تعلق ہے ہم درحقیقت نادر شاہ سے بازی لے گئے ہیں"[2]

وزیر اعظم انگلستان نے کہا تھا۔

"مجھے بتایا گیا ہے کہ ہماری بری اور بحری فوجیں ایسا شدید انتقام لے رہی ہیں جن کو دیکھنے کی تاب بھی کوئی انسان مشکل سے لا سکے گا"

1۔ "دہلی کی جانکنی" / ۴۹

2. Life of Lawrance., p 262

محلہ کوچہ چیلان کے تمام مرد گرفتار کر کے جمنا کے کنارے ریت میں لائے گئے اور گولیوں سے اڑا دیے گئے [1]

والیانِ ریاست

راجہ نوابوں کو نہایت حقارت سے ہاتھ پاؤں باندھ کر پھانسیاں دی گئیں۔ ان پھانسیوں کی وجہیں بھی مختصراً سُن لیجیے۔

نواب جھجر کو اس لیے پھانسی دی گئی کہ انھوں نے سر تھیوفلس مٹکاف کو پناہ نہیں دی تھی، راجہ داہر سنگھ والئی بلبھ گڈھ کو اس لیے پھانسی ہوئی کہ انھوں نے ایک انگریز کی جان نہیں بچائی تھی جس کو انقلابیوں نے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ والئی فرخ نگر کو اس لیے پھانسی ہوئی کہ انقلابی دستے جب ان کی ریاست سے گذرے تو انھوں نے امداد دی چناں چہ ریاست بہ مع مکانات ضبط کر کے خاندان کے بہتّر آدمیوں کو گولی مار دی گئی بہادر گڈھ کے نواب کو ۱۷ نومبر ۱۸۵۷ء کو پھانسی دی گئی۔ لوہارو کے نواب پر مقدمہ چلا گر جان لارنس کی کوششوں سے بچ گئے۔ نواب امیر خاں خلف نواب مرتضیٰ خاں جاگیردار پلول کو اس جرم میں پھانسی دی گئی کہ وہ میرزا عبداللہ کے دربار میں حاضر ہوئے تھے۔

مظالم کی انتہا

باغیوں پر نئے سے نئے ظلم ڈھائے گئے، درندگی اور حیوانیت کی انتہا کر دی گئی۔ اُن کو دہکتی ہوئی سلاخوں سے مارا گیا۔ برہنہ

---

[1] اس محلے کا قصور یہ تھا کہ یہاں کے ایک شخص نے ایک گورے کو زخمی کر دیا تھا جو اس کے زنانہ مکان میں بدنیتی سے داخل ہونا چاہتا تھا۔

[2] "غدر کا نتیجہ" / ۵۲

کر کے تمام جسم سلاخوں سے داغا گیا۔ سنگینوں سے چھید کر ہلکی آگ میں بھونا گیا۔ "ٹائمز" کا ایڈیٹر جون ڈی لین ایک مضمون میں لکھتا ہے۔

"زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سینا، یا پھانسی سے پہلے ان کے جسم پر سور کی چربی ملنا یا زندہ آگ میں جلا دینا یا ہندوستانیوں کو مجبور کرنا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کریں، ایسی مکروہ اور منتقمانہ حرکات عیسائیت کے نام پر بدنما دھبہ ہیں جس کا کفارہ یقیناً ہمیں ایک دن ادا کرنا پڑے گا" [1]

کچھ لوگوں کو اس لیے پھانسی ہوئی کہ وہ انگریزوں کو نصاریٰ کہتے تھے۔ کچھ کو اس جرم میں پھانسی ملی کہ جب انگریز فوج ان کے سامنے سے گزری تو ان کے منھ دوسری طرف کیوں تھے۔ کچھ اس "خطا" پر ہلاک ہوئے کہ ان کی کوئی خطا نہ تھی مگر وضع قطع سپاہیانہ تھی۔

ایک دن الور کے کچھ نوجوان پکڑے ہوئے آئے، اُن کی بوڑھی ماؤں سے نہ رہا گیا اور وہ بھی ان کے ساتھ آگئیں۔ ان نوجوانوں کو پھانسی دی گئی اور "جس وقت جلّاد نے ان کو تختے پر کھڑا کیا، ان کی بوڑھی ماؤں کا غم کے مارے برا حال تھا، وہ چیخیں مارتی تھیں، پچھاڑیں کھاتی تھیں اور کلیجہ پکڑ کر زمین پر لوٹتی تھیں۔ ان کے بیٹے دم بخود چپ چاپ اپنی بوڑھی ماؤں کی بے قراری دیکھ رہے تھے" [2]

---

[1] رئیس جعفری "بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد"۔ نیز ایک چشم دید بیان ہے کہ گوروں نے ایک انقلابی کے سنگین چبھو چبھو کر زندہ ہلکی آگ پر جلایا۔ ٹائمز آف لندن کے نامہ نگار نے بھی اپنی ڈائری میں اس کی تصدیق کی ہے کہ انھوں نے جلی ہوئی ہڈیاں چند دن بعد اس جگہ پر پڑی دیکھیں۔ (انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ" / ۴۴۴

[2] "دہلی کی جانکنی / ۷۵

پرائز ایجنسی

ایک محکمہ "پرائز ایجنسی" بنایا گیا اور لوٹ مار کے بعد جو کچھ گھروں کا سامان باقی بچا تھا وہ اس محکمے کے ذریعے نیلام کر کے انگریزی فوجیوں اور افسروں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس طریقے کے علاوہ "پرائز ایجنسی" نے اور طریقوں سے بھی روپیہ کھینچا یعنی امیروں سے لے کر ان کی جاں بخشی کی گئی یا جن لوگوں نے آباد ہونا چاہا اُن سے جرمانے وصول کر کے اجازت دی گئی چناں چہ کٹرہ نیل سے پچاس ہزار وصول ہوا بغاوت کا تمام الزام چوں کہ مسلمانوں پر لگایا گیا تھا لہٰذا اُن کو مارچ ۱۸۵۸ء تک آباد ہونے کی اجازت نہ ملی اور جب اجازت ملی تو سرکاری پاس جاری کیے گئے، جرمانے اور نذریں وصول کی گئیں اور پرائز ایجنسی کے پاس جو گھریلو سامان مثلاً پلنگ اور چکیاں وغیرہ تھیں وہ ان آباد ہونے والوں نے خریدیں۔ پرائز ایجنسی کی اس لوٹ مار نے جان لارنس کو مجبور کیا کہ وہ لارڈ کیننگ کو لکھے کہ

> "اگر جناب اس کو شہر کی حیثیت سے رکھنا چاہتے ہیں تو میرے نزدیک پرائز ایجنسی کی کارروائیوں کو روکنا چاہیے ..... جو لوٹ مار اس وقت ہو رہی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام ہندوستانی باشندے آشفتہ و برہم ہو جائیں گے"

یہی لارنس پھر لارڈ الفنسٹن کو لکھتا ہے

> "اگر دہلی میں مارشل لا اور پرائز ایجنسی موقوف کر دی جائے تو بہ خوبی اصلاح ہو سکتی ہے"[1]

ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ پرائز ایجنسی نے کیا ظلم ڈھایا اور وہ کس مقصد سے بنائی گئی تھی۔

---

[1] "دہلی کی جانکنی" / ۹۴

دہلی میں یہ مظالم مارچ ۱۸۵۸ء تک برابر جاری رہے چناں چہ جان لارنس نے ۲۸ فروری ۱۸۵۸ء کو یہاں آکر اس پر زور دیا کہ اب امن قایم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کا سکریٹری رچرڈ ٹیمپل اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے۔

”شہر میں بالکل امن وامان ہے خوف کی کوئی وجہ نہیں لیکن لوٹ مار اور خوں ریزی اب تک جاری ہے، ہندوستانیوں کے رنگ فق ہیں، وہ اب بھی کثرت سے گرفتار ہوتے ہیں اور اکثر پھانسی پاتے ہیں یا قید کرلیے جاتے ہیں“ [۱]

دہلی کے اس بے مثال قتل عام کا ”آنکھوں دیکھا حال“ بھی ایک انگریز لارڈ رابرٹس سے سنیے۔

”ہم صبح کو لاہوری دروازے سے چاندنی چوک میں گئے تو ہم کو شہر حقیقت میں مُردوں کا شہر نظر آیا، کوئی آواز سوائے ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں کے سنائی نہیں دیتی تھی کوئی زندہ آدمی نظر نہ آیا۔ سب طرف مُردوں کا بچھونا بچھا ہوا تھا جس میں بعض حالت نزع وجاں کنی میں مبتلا تھے...... اس بات کے دیکھنے سے کہ ایک طرف مُردوں کی لاشوں کو کتے کھا رہے ہیں اور دوسری طرف لاشوں کے آس پاس گدھ جمع ہیں جو اُن کے گوشت کو نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں اور ہماری آمد کی آواز سے اُڑ اُڑ کر تھوڑے فاصلے پر جا بیٹھتے ہیں، ہم کو بڑی عبرت ہوتی تھی...... بہت سے مُردے ایسے پڑے تھے گویا وہ زندہ ہیں۔ بعض کے ہاتھ اوپر کو اٹھے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں..... ان کے تعفن اور گندگی سے ہوا میں بیمار کرنے والی بدبو اٹھ رہی تھی“۔

---

[۱] ”دہلی کی جاں کنی“ / ۹۴

عمارتوں سے انتقام

عمارتوں کے در و دیوار بھی انتقام کا شکار بنے۔ لال قلعے کی اکثر عمارتیں مسمار کر دی گئیں جن میں جسل محل موتی محل وغیرہ شامل ہیں موتی مسجد کے شمال میں حیات بخش باغ برباد کر دیا گیا اس کے علاوہ اور بھی چھوٹی بڑی شاہی عمارتیں گرا دی گئیں۔ قلعے کے قیمتی پتھر اور سامان لوٹ لیا گیا۔ جامع مسجد اور قلعے کے درمیان بازار، پُر رونق مکانات اور محلے آباد تھے جن میں خانم کا بازار خاص بازار اور بازار چوک سعید وغیرہ تھے یہ سب کھود کر برابر کر دیے گئے۔ بعض عمارتیں ضبط کر کے اُن میں عیسائی تبلیغ و اشاعت کے مرکز بنائے گئے۔ لال قلعے میں فوجی بارکیں بنا دی گئیں۔ اندازہ ہے کہ دہلی میں ایک لاکھ سے زائد مکانات اور عالی شان محل مسمار کر دیے گئے تمام شہر ویران اور کھنڈر ہو گیا مگر انتقام کی آگ پھر بھی نہ بجھی چناں چہ او ٹرام کی رائے تھی کہ دہلی کو جلا دیا جائے۔ بہت سے انگریزوں کی رائے تھی کہ شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہیے۔

عبادت گاہوں کا حشر

مندروں اور مسجدوں میں انگریزی فوج کے گھوڑے بندھتے تھے اور گورے پیشاب پاخانہ کیا کرتے تھے کچھ مسجدوں کو فوجیوں کی بارکیں بنا دیا گیا۔ کئی مسجدوں کو مسمار کر دیا گیا جن میں قلعے کے نیچے ایک بڑی اور خوب صورت اکبر آبادی مسجد بھی شامل تھی۔ زینت المساجد (دریا گنج) کو گوروں کا بسکٹ گھر بنا دیا گیا اس کی قبریں اکھاڑی گئیں اور نقصان پہنچایا گیا۔ مسجد فتح پوری کی دوکانیں وغیرہ ضبط کر کے نیلام کر دی گئیں۔ پنجابی کٹرے کی مسجد گرا کر ریل نکالی گئی چھتہ چوک کی مسجد کو سپلائی کا گودام بنا دیا گیا۔ جامع مسجد کے بارے میں تمام انگریز اس پر متفق تھے کہ اس کو یا تو گرجا بنا دیا جائے۔ یا ڈھا کر برابر کر دیا جائے کیوں کہ یہ مسلمانانِ ہند کا

دل ہے اور اس کو گرانا گویا اُن کے دل پر چوٹ لگانا ہے۔ ان کا اصرار حد سے بڑھا
تھا مگر جان لارنس نے دور اندیشی کی بنا پر یہ مناسب نہ سمجھا، پھر بھی جامع مسجد کی
انتہائی بے حرمتی کی گئی، یہاں فوجیوں کے بارک بنائے گئے، پاخانہ اور پیشاب کیے
اور مسجد کے صحن میں سؤر کاٹ کر پکائے گئے۔ گھوڑے، کتے اور گدھے باندھے گئے، کئی
سال بعد جامع مسجد کو ۱۸۶۲ء میں بڑی مشکل اور کوششوں کے بعد کھولا گیا اور وہ بھی چند
شرائط کے ساتھ۔ مثلاً یہ کہ لوگ نماز پڑھ کر فوراً باہر چلے جایا کریں اور انگریز مسجد کے اندر
جاتے وقت جوتا نہ اتاریں گے۔

چارلس جان گرفتھ نے محاصرہ دہلی کے چشم دید حالات میں لکھا ہے کہ خزانوں کی
تلاش میں بے شمار مندروں کو کھودا گیا، ان کی مورتیاں توڑی گئیں اور قیمتی سامان نکال

مختلف مقامات پر

یہ مظالم تو دہلی کے باشندوں پر نازل تھے مگر دوسرے
علاقوں کے لوگ بھی ان "عنایات" سے محروم نہ
اودھ، روہیل کھنڈ، سی، پی، بندیل کھنڈ وغیرہ میں بھی یہی کچھ ہو رہا تھا، اس کی
کم تفصیلات محفوظ رہ سکی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

غازی آباد کے قریب موضع دھولانہ میں معزز لوگوں کو گرفتار کر کے اُن کے
گلوں میں مرے ہوئے کتے باندھے گئے اور پھر پھانسی دے دی گئی[۱]۔ بلند شہر،
دادری، ونکورہ وغیرہ کے اکثر بے گناہوں کو بلند شہر میں موجودہ کچہری کے متصل کے
آم کے درخت پر پھانسیاں ہوئیں۔ نواب ولی داد خاں کے مکانات گرا دیے گئے

۱؎ "الجمعیۃ" ۱۰ مئی ۱۹۵۷ء

روہیہ میں انقلابیوں کے ہاتھ کاٹ ڈالے گئے اور ان کو بڑے بازار کے تراہے پر
ر پھانسیاں دی گئیں، ان کے مکانات مسمار اور جائدادیں ضبط کر لی گئیں۔ رڑکی میں
ے شمار انقلابیوں کو برگد کے ایک درخت پر پھانسیاں دی گئیں، اس طرح تقریباً دو سَو
بیوں کو پھانسی دی گئی اور چھ گاؤں بالکل برباد کر دیے گئے۔ مراد آباد میں سیکڑوں
غیوں کو پھانسی دی گئی اور طرح طرح کی تکلیف دے کر ہلاک کیا گیا، چناں چہ نواب
و خاں کو ہاتھی کے پاؤں سے باندھ کر گھسیٹا گیا اور پکتے ہوئے چولے میں ڈال دیا گیا۔
کانات گرا کر برباد کر دیے گئے۔ بجنور میں متعدد انقلابی پھانسی پا گئے، بہتوں کو کالا پانی
ا۔ نواب محمود خاں کے مکانات بارود سے اڑا دیے گئے۔ نگینے کے باغوں میں چھپے ہوئے
یوں کا قتلِ عام کیا گیا، آس پاس کے بے شمار گاؤں غارت کر دیے گئے۔ بریلی میں جب
نگریزی فوجیں داخل ہوئیں تو انقلابی عوام نے شہر خالی کر دیا تھا جو باقی بچا وہ موت کے
ھاٹ اتارا گیا اور مکانات کو آگ لگا دی گئی۔ اسی طرح شاہ جہاں پور پر ہول ناک مصیبتیں
ٹیں۔ کان پور میں نانا صاحب، سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کو تہس نہس کرنے کا حکم تھا
بناں چہ ان کے محلات کو مسمار کیا گیا اور ساتھ ہی ان کی جوان بیٹی بھی اس میں بھسم ہو گئی۔

لکھنؤ میں انسانیت سوز مظالم کی انتہا کر دی گئی تھی جن میں نمونے کے طور پر چند
ی تاریخ کے صفحات پر اس لیے محفوظ رہ سکے کہ بعض انگریزوں نے خود دیکھ کر اپنی یادداشتوں
یں بیان کیے۔ ایک انگریز لکھتا ہے۔

> "لکھنؤ پر قبضے کے بعد قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا گیا چناں چہ ہر ہندوستانی کو
> قطع نظر اس کے کہ وہ سپاہی ہے یا اودھ کا دیہاتی بے دریغ تہہ تیغ کیا گیا یہاں تک
> نہ تو کوئی سوال ہی کیا جاتا نہ ہی کسی قسم کا تکلف روا رکھا جاتا بلکہ محض سیاہ رنگت ہی

اس کے مجرم ہونے کی کافی دلیل سمجھی جاتی تھی .... بے گناہ شہریوں کو جو ہاتھ جوڑ جوڑ کر رحم کی درخواست کرتے تھے گولی کا نشانہ بنایا گیا بلکہ عمر رسیدہ انسانوں کو حالانکہ اُن کے جسم رعشے سے کانپ رہے تھے کاٹ کر رکھ دیا گیا"۔[1]

لندن ٹائمز کا نامہ نگار اپنی ڈائری (ص ۳۸۴) میں لکھتا ہے۔

"جب محلات میں قتل عام ہو رہا تھا تو ایک چھوٹا بچہ ایک بوڑھے کی رہنمائی کرتا ہوا افسران کے سامنے آیا اور رو رو کر گڑگڑاتے ہوئے بوڑھے نے درخواست کی کہ اس کو نہ مارا جائے اس عاجزانہ اور رقت انگیز التجا کا جواب دینے کے لیے انگریز افسر نے اپنا پستول اٹھایا اور اس کی کنپٹی کا نشانہ لگا کر فائر کیا مگر نشانہ چوک گیا۔ اس نے پھر ٹریگر دبایا مگر پستول نے پھر معصوم بچے کو مارنے سے انکار کیا، چوتھی بار ——— جب اس کو پشیمان ہونے کے تین موقعے مل چکے تھے ——— یہ "بہادر" افسر کامیاب ہو گیا اور بچے کا خون اس کے قدموں پر بہہ گیا"

ایک شخص کو اس کے گھر سے کھینچ کر نیلے میدان میں لایا گیا جہاں اس کو لٹا کر اس کے جسم اور چہرے پر سپاہیوں نے سنگینیں بھونکیں، جب کہ کچھ دوسرے سپاہیوں نے ایندھن جمع کر کے آگ جلائی اور اس کو زندہ بھوننا شروع کیا۔ بہت سے انگریز افسر اس تماشے سے لطف اندوز ہو رہے تھے مگر کسی نے مداخلت نہ کی۔ اس واقعے کا تذکرہ کرتے ہوئے رسل صفحہ ۳۰۱ پر لکھتا ہے۔

"اس شیطانی ظلم کی دہشت ناکی اور بربریت اُس وقت اور بھی بڑھ گئی جب

1. Majendie p. 186,
Other side of the Medal

اُس پریشان حال بدنصیب نے آدھا جل چکنے کے بعد اس آگ سے بچ نکلنے کی بے اختیار کوشش کی، اُس نے اچانک طور پر تڑپ کر چھلانگ لگائی اور چند گز تک اس حالت میں بھاگا کہ اس کے جسم کا گوشت ہڈیوں سے لٹک رہا تھا، مگر وہ پکڑ لیا گیا، واپس لایا گیا اور پھر آگ پر رکھ دیا گیا اور وہاں سنگینوں سے اس کو روکا گیا، یہاں تک کہ جو کچھ باقی بچا تھا وہ جل گیا"۔

ایک اندازے کے مطابق لکھنؤ کی سرزمین پر ایک لاکھ سے زائد انسانوں کا خون بہایا گیا۔ شاہی محلات یعنی قیصر باغ وغیرہ کو نہایت بے دردی سے لوٹا گیا۔

الہ آباد کا ایک انگریز بہت سے دیسی سوداگروں کا قرض دار تھا جب بغاوت دبائی گئی تو اس نے ایک کمیشن مقرر کیا اور سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے تمام قرض خواہوں کو پھانسی دلوادی[1]۔ گورکھ پور کے موضع ہلوا میں ایک شخص مشرف خاں اور اس کے پچیس ساتھیوں کو بے دردی سے پھانسی دی گئی اور اس کے مکان کو مع خاندان کے آگ لگادی گئی۔ دو کھتری ہندو نوجوان اس آگ میں کود پڑے اور مشرف خاں کی دو چھوٹی بہنوں کو زندہ نکال لائے، ان دونوں کی پرورش کی اور اسلامی طریقے پر شادی کرادی[2]۔

مولانا فضل حق کی زبانی

مولانا فضل حق خیر آبادی جو اس ہنگامے میں موجود تھے انھوں نے یہ حالات عربی میں نظم کیے، اس دردناک داستان کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"........ پھر نصاریٰ نے شہر (دہلی) کے گرد و نواح کے رئیسوں کو قتل کرنا

---

[1] شاہ ورکر/ ۱۴۵   [2] "الجمعیۃ" ۲۶ راکتوبر ۱۹۵۶ء

اُن کی جائدادیں، عمارتیں، مویشی، مال و متاع، ہاتھی گھوڑے اونٹ اور ہتھیار ہیں وغیرہ کو لوٹنا شروع کیا۔ اسی پر اکتفانہ کیا بلکہ اُن کے اہل وعیال کو بھی قتل کر ڈالا۔ ۔ ۔ ۔ ان لوگوں کے پاس جو کچھ چاندی سونا نکلتا پہلے تو وہ چھین لیتے پھر چادر، تہہ بند قمیص، پاجامہ جو کچھ ہاتھ لگتا نہ چھوڑتے، اس کے بعد افسروں کے پاس پہنچا دیتے وہ ان کے لیے قتل یا پھانسی کا فیصلہ کرتے۔ جوان، بوڑھا، شریف، رذیل سب کے ساتھ یہی سلوک ہوتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان ظالموں نے سب کو مار ڈالا، نہ کوئی عالی خاندان فرد بچ سکا نہ کسی ادنیٰ انسان کو چھٹکارا نصیب ہوا۔ پھر اطراف و اکناف ملک میں لشکر بھیجے جنھوں نے قتل و غارت گری کی انتہا کر دی۔ بہت سی صبح کی سہاگن عورتیں شام کو بیوہ بن گئیں اور شب کو آغوشِ پدر میں سونے والے بچے صبح کو یتیم ہو کر اٹھے، کتنی ہی عورتیں اپنی اولاد وغیرہ کے غم میں گریہ وزاری کرتی تھیں اور کتنے مردوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا جاری تھا۔ شہر چٹیل میدان اور بے آب و گیاہ جنگل بن گیا۔ اس کے بعد نصاریٰ کی توجہ مشرقی شہروں اور دیہاتوں کی طرف مبذول ہوئی۔ وہاں بھی بڑا فساد مچایا، غارت گری اور پھانسی کا بازار گرم کر دیا، بے شمار مرد اور پردہ نشین عورتیں موت کے گھاٹ اتارے گئے، سیکڑوں، ہزاروں آدمی مارے گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ”[1]

نیل کا وحشیانہ حکم

۲۵ر جولائی ۱۸۵۷ء کو نیل نے حکم جاری کیا کہ ”بے گناہوں (انگریزوں) کے خون کا ہر دھبہ ان بدمعاشوں سے قبل از سزائے موت صاف کرایا اور دھلوایا جائے جو بغاوت میں سرگرم حصہ لینے

---

[1] الثورۃ الھندیۃ (باغی ہندوستان)

کی بنا پر گرفتار ہوں ..... اگر مجرم کام پورا نہ کرے تو فوجی کوتوال کوڑے لگوائے

اپنے حصّے کا کام پورا کرنے کے بعد مجرم کو پھانسی دے دی جائے۔"

پہلا مجرم ایک برہمن تھا جو فوج میں صوبے دار بھی تھا، جب اس نے دھبّے صاف کرنے پر اعتراض کیا تو کوڑے برسائے گئے اور بعد میں پھانسی دی گئی، ایک مسلمان کو جو عدالت میں سررشتہ دار کے عہدے پر تھا حکم ملا کہ دھبّے چاٹ کر صاف کردو۔[۱]

بے کس عورتیں

انگریز مورخ ہومز لکھتا ہے۔

"ان بوڑھوں نے ہمارا کچھ نہ بگاڑا تھا۔ بے کس عورتوں کو بھی جو اپنے سینوں سے ننّے ننّے بچوں کو چمٹائے ہوئے تھیں۔ اسی طرح ہمارے انتقام کا شکار ہونا پڑا جیسے کہ انتہائی بدمعاش مردوں کو ......" (۲۳۰)

ان مظالم کے باوجود بھی انگریز افسروں کے دماغ مطمئن نہ تھے، جنرل نکلسن نے ایڈورڈ کو لکھا۔

"ہمیں ایک ایسا قانون پاس کرانا چاہیے جس کی رو سے ہم انگریز عورتوں اور بچوں کے قاتلوں کو زندہ جلا سکیں یا اُن کی کھال اُتارلیں، یا گرم سلاخوں سے ہمارات کریں، پھانسی ایک معمولی سزا ہے" [۲]

بچّوں کو پھانسی

بچوں کو بھی نہ بخشا گیا۔ دیگر مقامات کے علاوہ اس واقعے کا تذکرہ کئی کتابوں میں ہے (مثلاً، ۱۸۵۷ ازمہر) کہ جب چند بچوں نے کھیل میں باغیوں کا سا جلوس بنا کر نکالا تو انگریز افسروں نے ان معصوم بچوں کو پھانسی کی سزا دی۔ اِلٹی میں سے ایک افسر نے بچوں کے لیے رحم کی درخواست کی جو ٹھکرا دی گئی۔

---

[۱] مہر، ۱۸۵۷ء / ۲۶۱ بحوالہ میلتن: جلد اول ص۳

[۲] شورش "سید عطاء اللہ بخاری" / ۱۲۷

کئی سال بعد

بغاوت ختم ہونے کے کئی سال بعد تک بھی یہ مظالم اسی طرح جاری رہے اور اندھا دھند پھانسیاں دی جاتی رہیں۔ مثلاً ایک شاہی ملازم مرزا مغل بیگ کو جنوری ۱۸۶۲ء میں پھانسی دی گئی۔ الزام یہ تھا کہ اس نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو چند انگریز مارے تھے۔ مقدمے میں گواہوں کے بیانات مختلف تھے اور جعلی معلوم ہوتے تھے مگر پھر بھی سزائے موت دی گئی۔ اسی طرح ایک شخص حاجی مہر گن پر بھی یہی الزام لگا کر ۱۸۶۸ء میں کسی واضح ثبوت کے بغیر پھانسی دی گئی ؎

آخر میں ایڈورڈ تھامپسن کی زبانی سنیے کہ۔

"لیکن اس سے بدرجہا زیادہ سنگین مظالم کے واقعات موجود ہیں جو ابھی تک پردۂ خفا میں ہیں اور ہم ان کو حق بجانب قرار دینے کے لیے اپنے پاس ایک لفظ بھی نہیں پاتے"؎

؎ مقدمہ بہادر شاہ طبع ۱۸۶۲ء بہ حوالہ مہر/ ۱۴۲ ؎ تھامپسن/ ۹۰

بغاوت کی ناکامی

عام مورخوں نے ناکامی کے اسباب پر مختلف رائیں اور نظریات پیش کیے ہیں
انگریز مورخوں کا کہنا ہے کہ انتشار اور بدنظمی ہی اس تحریک کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب ہے
باغی لیڈر پوری طرح کسی بات پر متحد نہ ہوسکے، اُن میں پھوٹ، اختلافات اور حسد ورقابت کی
گرم بازاری تھی، جب کہ دوسری طرف ان خصوصیات کا شائبہ بھی نہ تھا۔ بعض مورخ انقلابیوں
کے کردار کو ناکامی کا سبب قرار دیتے ہیں۔ جنھوں نے اپنے ذاتی مفاد کے پیش نظر بغاوت کی۔
یہ الزام لگانے کے باوجود انقلابی رہنماؤں کے بلند عزائم، جنگی قابلیت اور ہول ناک ترین
مصیبتوں میں ثابت قدمی، ایسی خوبیاں ہیں جن پر انگلی اٹھانے کی گنجائش نہیں، لیکن اس سلسلے
میں پوری تحریک پر ایک سرسری نظر ڈالنا ضروری ہوگا کیوں کہ کوئی واحد شخصیت یا واقعہ ناکامی
کا سبب قرار نہیں دیا جا سکتا اور واقعات کی کڑیاں ایک دوسرے سے اس طرح پیوست
ہیں کہ ان کو الگ کرنا دشوار ہے۔

بغاوت کی نوعیت

جس طرح بغاوت کو خالص "فوجی شورش" یا "غدر" قرار دینا واقعات کے آئینے میں بالکل غلط ہے اسی طرح

یہ کہنا بھی حقیقت میں رنگ آمیزی ہے کہ بغاوت کی تہہ میں دیش بھگتی کے قومی جذبات پوری طرح کارفرما تھے، یا یہ کہ وہ ملک کی سیاسی آزادی کے حصول کی مکمل اور ملک گیر پیمانے پر پوری طرح منظم جدوجہد تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ تحریک ۱۸۵۷ء کا ایک ملا جلا کردار پیش کرتی ہے اس میں مختلف اور متضاد کردار اور واقعات کچھ اس طرح ایک دوسرے سے پیوست اور خلط ملط ہیں کہ ہر ایک اپنے نقطۂ نظر سے نتائج برآمد کر سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تحریک کا ٹھیک ٹھیک کردار بعض حضرات کی نگاہ میں ابھی تک متعین نہ ہو سکا۔

یقیناً باغی سردار روس کے لینن یا امریکہ کے واشنگٹن جیسی شخصیت اور صلاحیت کے حامل نہ تھے اور وہ تحریک کو وسیع پیمانے پر صحیح طریقے سے منظم نہ کر سکے لیکن اس کا الزام قطعی طور پر اُن کو دینا غلط ہے کیوں کہ اول تو اُس دہشت انگیز دور میں کسی باغیانہ تحریک کو خفیہ اور ملک گیر پیمانے پر تنظیم دینا ہنسی دل لگی نہ تھی۔ پھر موجودہ زمانے کی سہولتیں انھیں کہاں میسّر تھیں۔ صرف حکومت ہی تار برقی وغیرہ سے فائدہ اٹھا سکتی تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بغاوت کی آگ بھڑکانے کے لیے جو کچھ کیا، غور کیجئے تو وہ اپنی جگہ پر بہت کچھ ہے۔ چپاتی اور کنول کی گردش، علما، فقیروں اور سادھوؤں کے دورے مختلف جگہوں پر اشتہارات کا چسپاں ہونا، سرکاری دفاتر میں آگ کی پُراسرار وارداتیں اور پھر مجرموں کا سراغ لگانے میں انگریز جیسی گرگ باراں دیدہ قوم کی ناکامی۔ یہ تمام حقائق انقلابی سرداروں کی جاں فشانیوں کا ہلکا سا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہیں۔ تاہم جاہل اور غنڈہ عنصر کو چھوڑ کر جس نے اس دور کی افراتفری سے فائدہ اٹھایا اور لوٹ مار کی، اگر ہم ذی شعور طبقے کے احساسات و جذبات جاننا چاہیں تو اس کا سب سے بڑا ذریعہ دورانِ بغاوت کا پریس یعنی اخبارات ہو سکتے ہیں۔ چناں چہ اخبارات کی تحریریں انقلابیوں کے جذبات کی

پوری ترجمان نظر آتی ہیں، مثلاً دہلی کے "اردو اخبار" مورخہ ۱۲ جون ۱۸۵۷ء میں ایک مضمون بہ عنوان "فرصت کو غنیمت سمجھنا چاہیے" شایع ہوا جس کا یہ اقتباس قابلِ غور ہے۔

"...... انگریزوں کے زمانے میں تمام عہدہ ہائے جلیل القدر کہ جن میں زیادہ کی انتہا نہ تھی کم سے کم صدہا روپے مہینہ ہوتا تھا سب آپس میں اپنے ہم رنگوں کو دیتے تھے بہ موجب مثل مشہور اندھا بانٹے ریوڑیاں اور پھر اپنوں کو دے۔ خرچ ان کا بھی ظاہر ہے کہ بہت بندوبست و تنگ چشمی و خشک مزاجی سے صرف کرتے تھے باقی ہزار ہا دکھا روپیہ بچاتے تھے اور اپنی ولایت کو لے جاتے تھے غرض ان کا روپیہ کسی طرح ہمارے ہندوستان میں نہیں پھیلتا تھا ان کے زر و مال سے ہم لوگوں کو کچھ فیض نہ تھا اور اہل ہند نوکر ہوتے تھے تو سیکڑوں آدمیوں میں چند آدمیوں کی نوبت سیکڑوں پر پہنچتی تھی ...." [1]

اسی زمانے میں دہلی سے ایک اور اخبار "پیام آزادی" نکلتا تھا جس کو مرزا بیدار بخت نکالتے تھے، عظیم اللہ خاں اور نانا صاحب اس کے سرپرست تھے۔ اس اخبار میں حُرّیت آموز مضامین شایع ہوتے تھے اور یہ عوام میں بے حد مقبول تھا۔ اس میں شایع شدہ ایک شاہی اعلان میں کہا گیا تھا کہ

"خدا نے انسان کو جتنی برکتیں عطا کی ہیں اُن میں سب سے قیمتی برکت آزادی کی ہے وہ ظالم جس نے دھوکا دے کر ہم سے یہ برکت چھین لی ہے کیا ہمیشہ کے لیے ہمیں اس سے محروم کر سکے گا ...... خدا کے فضل اور تم لوگوں کی بہادری سے

---

[1] اردو اخبار کے فائل نیشنل آرکائیوز میں موجود ہیں۔

انگریزوں کو جلد ہی اتنی کامل شکست ملے گی کہ ہمارے ملک میں ان کا ذرا بھی نشان نہیں رہے گا" ؎۱

اوپر کے اقتباس سے اگر کچھ آشکارا ہوتا ہے تو یہی کہ حساس طبقے کے دل میں دیش پریم، آزادی اور قومی تعمیر و ترقی کے جذبات ضرور جلوہ گر تھے یہ اور بات ہے کہ اُن پر موجودہ قومی نظریات کا پالش اور ملمع نہ تھا۔

سرسری جائزہ

بغاوت پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر علاقوں میں تحریک نے عوامی جنگ کی شکل اختیار کر لی تھی اور دیسی فوجیوں کے علاوہ شہری و دیہاتی عوام نے بہ کثرت حصہ لیا ہے۔ مثلاً سہارن پور میں جب میرٹھ کی خبر میں پہنچیں تو فوجی اور شہری عوام فوراً بغاوت پر تیار ہو گئے اگرچہ عام بغاوت اس وقت تک نہیں پھوٹی جب تک مظفر نگر نے ابتدا نہ کر دی مگر جب بغاوت شروع ہو گئی تو گوجروں، رنگاروں اور دوسرے فرقوں نے علی الاعلان حصہ لیا، ساتھ ہی مہاجنوں اور ساہوکاروں کو بھی لوٹا، قرب و جوار کے گاؤں فتح پور، سانپلا بکل، مانک پور، باپو پور، گوکل والا وغیرہ میں بغاوت پھیلی ہوئی تھی۔ ایک شخص امراؤ سنگھ باغیوں کا سردار تھا۔ دیوبند کے عوام نے انتہائی جرأت و استقلال سے مقابلہ کیا۔ مجموعی طور پر اس علاقے کے پانچ سو سے زائد لوگوں کو پھانسی ہوئی اور ستر۷۰ گاؤں جلائے گئے۔ مظفر نگر میں بھی اسی طرح عوام نے بغاوت کی اور فوج نے تقلید۔ مواضعات، بڑھانہ، شکار پور، بگھرا، چرتھاول، تھانہ بھون، کاندھلہ، جھنجھانہ اور شاملی وغیرہ خاص مرکز تھے۔ خیراتی خاں اور قاضی محبوب وغیرہ باغیوں کے رہنما تھے۔ شاملی کا زمین دار مہر سنگھ باغیوں کے

؎۱ "الجمعیۃ" ۶ جولائی ۱۹۵۲ء، سندرلال "بھارت میں انگریزی راج" (ہندی) و "سن ستاون"

کے ساتھ تھا۔ بغاوت دب جانے کے بعد بھی ایک شخص یہاں شاہ دہلی کے نام پر فوج جمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔[1]

علی گڈھ کے برہمن کی خبر ملنے پر اس علاقے کے تمام گاؤوں میں کافی عرصے تک سخت بغاوت ہوئی۔ باغیوں کے رہنما راؤ بھوپال سنگھ (ساکن کھیر) تھے۔ کوئل کے باغی غوث محمد خاں کی کمان میں تھے۔ جنھوں نے علی گڈھ کے معرکوں میں بھی قابل داد جرأت سے مقابلہ کیا۔ چناں چہ ۲۴ راگست کو بھی ایک خوں ریز معرکہ ہوا، سرکاری بیان کے بہ موجب۔

"یہ ایک انتہائی حوصلہ مندانہ قسم کی دست بہ دست جنگ تھی۔ تقریباً ساٹھ غازی جوش وغصے سے دیوانہ ہو کر تلواریں ہاتھوں میں لیے ہوئے جھپٹے مگر وہ سب کام آ گئے انھی میں علی گڈھ کا مولوی عبدالجلیل بھی تھا"[2]

بلند شہر میں جب ۲۲ رمئی کو بغاوت شروع ہوئی تو اس میں سپاہ کے ساتھ قریبی علاقوں کے گوجر بھی شامل تھے۔ پرگنہ دادری اور سکندر آباد کے گوجروں نے سکندر آباد پر دھاوا کیا۔ بلال کے تنوروں اور برگلوں نے بھی ان کا ساتھ دیا، مواضعات اہار، درام پور، سلیم پور، خالق پور وغیرہ کے زمین دار باغی تھے۔ پرگنہ دادری کے سادات نے باغیوں کی حمایت کی اور ان کے گاؤں ضبط ہوئے۔ جاٹ اکثر "وفادار" تھے[3]۔ ان علاقوں میں بھوپال سنگھ کے علاوہ

---

[1] سہارن پور کے انگریز حاکم اسپنکی کی رپورٹ اور ایف ولیم کا بیان بہ حوالہ چٹوپادھیا ص ۱۶۲، ص ۱۶۳
علاوہ ازیں ملاحظہ ہو ایس۔ بی۔ چودھری کی کتاب ص ۴۶

[2] تحریک ۱۸۵۷ء پر ایس۔ بی۔ چودھری کی کتاب ص ۸۰

[3] منگل سین:۔ تواریخ بلند شہر ص ۷۲، ص ۹۶، ص ۱۰۰، ص ۱۲۵

نسیم اللہ، محمد غوث، محبوب خاں، حسن خاں اور دو زمین دار مہتاب سنگھ اور منگل سنگھ باغی رہ نما تھے۔ بارہہ کے عبداللطیف خاں نے باغیوں کی ہر طرح مدد کی۔ منیر خاں اور رحیم علی خاں بھی نواب مالاگڈھ کے ہمراہی تھے۔

روہیل کھنڈ کے بڑے حصے پر خان بہادر خاں کی حکومت تسلیم کر لی گئی تھی، ٹھاکر جے مل سنگھ کے علاوہ پرگنہ کرور، موضع کھیرا، شیلوگڈھ، نگریا وغیرہ کے ٹھاکروں نے خان بہادر کی حمایت کا اعلان کیا۔ شاہ جہاں پور میں فوج اور عوام نے بہ یک وقت بغاوت کی۔ مولوی سرفراز علی (ساکن گورکھ پور) فوج داری کے سررشتہ دار قدرت علی اور نیاز علی وغیرہ نے بغاوت کو منظم کیا اور جب ۳۱ مئی کی صبح کو فوج نے بغاوت کی تو عوام نے، جن میں ہزارہا دیہاتی بھی تھے سرکاری بنگلوں اور دفتروں کو لوٹنا اور جلانا شروع کر دیا۔[1] آگرے میں شہری و دیہاتی عوام کی بڑی تعداد نے بغاوت میں حصہ لیا جس میں پولیس بھی شریک تھی۔ ۶ جولائی ۵۷ء کو ایک شان دار جلوس آزادی کی خوشی میں نکالا گیا جس کی رہ نمائی کوتوال شہر کر رہا تھا۔ دھول پور کے گوجر سردار دیوہنس نے تین ہزار فوج جمع کی اور ارادت نگر کے تحصیل و تھانے پر حملہ کیا۔ لکھن پورہ، اٹنگری، کھلوئی وغیرہ کے زمیں دار، کھیرا کے تحصیل دار بھوانی شنکر اور زمیں دار لچھمن سنگھ کے علاوہ ایک گورنمنٹ پنشنر جواہر سنگھ بھی انقلابیوں کے ساتھ تھے۔ اعتماد پور میں زور آور سنگھ باغیوں کے رہ نما تھے، متھرا میں تو جنوری ۵۷ء ہی سے بے چینی کے آثار تھے۔ جب ۳۰ مئی کو سپاہ نے بغاوت کی تو تمام علاقے میں بہ یک وقت بغاوت پھیل گئی اور شاہ دہلی کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا، باغی فوج

---

[1] انگریز حکام کے سرکاری بیان بہ حوالہ چٹوپادھیا ص ۱۶۵ و ص ۱۶۷

خزانہ لے کر دہلی روانہ ہوگئی، انگریزوں کے "وفادار" مہاجن اور ساہوکار بھی باغیوں کے جوش و غصے کا شکار بنے۔ قصبہ رایا کے باغی سردار دیبی سنگھ تھے جنھیں بعد میں پھانسی دی گئی۔ اکثر زمیں دار باغی تھے[1]۔ پولیس افسران مثلاً مراد علی کوتوال اور بشارت علی سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی باغیوں کی صف میں تھے۔

مین پوری کے قرب و جوار میں جون ۵۷ء کے شروع ہی سے زبردست بغاوت ہو رہی تھی۔ باغیوں کے خاص سردار راجہ تیج سنگھ تھے جو نواب فرخ آباد کے ساتھی تھے۔ ان کے علاوہ سکرولی کے رانا مہندر سنگھ، بارہیہ کے روپ سنگھ، سکندرا کے راجہ بھاؤ، چکر نگر کے نرنجن سنگھ وغیرہ بھی بغاوت کے رہنما تھے۔ ان لوگوں نے گوالیار کی باغی فوجوں سے رابطہ قایم کر لیا تھا اور اکتوبر ۵۷ء میں ان کی امداد بھی کی، نواب فرخ آباد کو مدعو کیا نواب کا ناظم ۳ر دسمبر کو پہنچا اور انگریزوں کے حلیف راجہ زہر سنگھ کو شکست دی۔ اٹاوہ اگرچہ ۶ر جنوری ۵۸ء کو انگریزی قبضے میں آگیا مگر باغی بڑی مشکل سے دب سکے۔ ۷ر فروری کو روپ سنگھ نے اور یہ پر سخت خوں ریز جنگ کی اور اسی طرح دوسری جگہوں پر معرکے ہوئے۔ مارچ میں بھی باغیوں نے برطانوی دستوں پر خوف ناک حملے کیے ۱۱ر اپریل کو پھر تصادم ہوا جس میں اس علاقے کی تمام باغی فوجیں یک جا ہو کر آئی تھیں۔ یہاں سے پسپا ہو کر نرنجن سنگھ نے جمنا پار علاقے میں پھر پوزیشن مضبوط کر لی۔ مئی میں پھر معرکے ہوئے اور باغیوں کی تعداد میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو گیا۔ کالپی کی شکست (۲۳ر مئی ۵۸ء) نے انقلابی سرگرمیوں کو کسی حد تک پست کر دیا لیکن روپ سنگھ اور نرنجن سنگھ کے ہمراہیوں کے

---

[1] فلپس کا سرکاری بیان بہ حوالہ چٹو پادھیا ص ۱۶۹

حوصلے بہ دستور بلند تھے وہ اکتوبر تک اپنی مہم چلاتے اور انگریزی کیمپوں پر حملے کرتے رہے۔ ۷ دسمبر ۱۸۵۷ء کو شاہ زادہ فیروز شاہ کی آمد پر بغاوت کی بجھتی ہوئی چنگاریاں پھر بھڑک اٹھیں۔ شاہ زادے کی کمان میں باغیوں نے ہراچندر پورہ میں ۸ دسمبر کو انگریزی فوجوں پر حملہ کیا، گھمسان کی جنگ ہوئی، دشمن کی پوزیشن کمزور پڑ گئی، ان کا افسر ڈوئل مارا گیا۔ اٹاوہ کے دیہات مثلاً شاہ پور، راج پور، رام نگر اور رویانہ کے عوام نے متفقہ طور پر ہتھیار سنبھال لیے تھے۔ فتح پور، فرخ آباد اور فتح گڈھ کے اکثر زمیں داروں نے اپنی خدمات نئی آزاد حکومت کو پیش کیں۔ امن سنگھ، قمر الدین، لکھا سنگھ، پولسندر سنگھ اور جبا سنگھ رہنمائی کر رہے تھے۔ ان علاقوں میں بخت خاں، فیروز شاہ اور ولی داد خاں نے دورے کر کے عوام کو سرفروشی پر آمادہ کیا۔ ۲ جنوری ۱۸۵۸ء کو نواب فرخ آباد سے آخری معرکے کے بعد انگریز ۳ جنوری کو فرخ آباد میں داخل ہوئے مگر انقلابی لیڈروں مثلاً ناظر علی، نیاز محمد اور معصوم علی وغیرہ سے ۱۸ جنوری تک تصادم ہوتے رہے [۱]

جون پور میں جب لدھیانہ رجمنٹ کے سکھوں نے بغاوت کی تو دیہات کے عوام نے ان کی مدد کی۔ اسی طرح اعظم گڈھ میں فوجی بغاوت کے وقت سناسی، نارہر پور، برھیاپا اور نگر کے راجاؤں نے ان کی حمایت کی اور ناظم محمد حسن سے مل گئے۔ بعض جاگیر دار وفادار رہے [۲]

الہ آباد کے ہندو مسلم عوام نے متحدہ بغاوت کی، پریاگ کے پجاری برہمن ہندو عوام

---

[۱] ایس۔ بی۔ چودھری: ص ۸۳-۸۴ و ڈسٹرکٹ گزیٹیر اٹاوہ ص ۱۶۰ و چٹوپادھیا ص ۱۸۲

[۲] ونگ فیلڈ کا سرکاری بیان بحوالہ چٹوپادھیا ص ۱۷۲ و ۱۷۳

کو جنگِ آزادی پر تیار کر رہے تھے اور بغاوت یہاں عوامی شکل میں تھی۔ حتیٰ کہ انگریزی قبضے کے بعد بھی نہ دب سکی چناں چہ سلطان پور کے مہدی حسن نے بھاپھامئو پر قبضہ کر لیا بہت سے زمیں دار، پناہ گزین اور مجاہدین اس کے ہمراہ تھے۔ سالون کے فضل عظیم نے سوراؤں پر قبضہ کیا جس کے ساتھ غلام مرتضیٰ، شیودت سنگھ، دگل سنگھ اور دیار حسن وغیرہ تھے جنوری ۱۸۵۸ء میں اس نے برطانوی فوج سے گوریلا جنگ کی۔ جولائی ۱۸۵۸ء میں دہائیں کے قلعے پر ایک ہزار سے زیادہ انقلابی جنگ کرتے ہوئے کام آئے۔ اس کے بعد بھی دھاکن سنگھ ہنومان سنگھ، ولایت حسین وغیرہ برابر جنگ آزما رہے۔ نصرت پور میں بینی بہادر سنگھ انتہائی بہادری اور استقلال سے لڑا۔ اس نے نئے ہتھیار جمع کر لیے تھے اور بڑے پیمانے پر اعلیٰ قسم کا سامانِ جنگ تیار کر رہا تھا۔ کان پور میں بغاوت ہونے پر چوہان، بند بلہ، چند بلہ، وغیرہ کے قبیلے اور ٹھور کے زمیں دار ہتھیار لے کر کھڑے ہو گئے تھے۔ نانامئو، کاکادیو، بانگی، کنگا گنج وغیرہ دیہات کے عوام نے اور شیوراج پور، ساچینیدی، نار، نروال، رسول پور کی تقریباً پوری آبادی نے بغاوت کی۔ تمام راج پوت زمیں دار باغی تھے [1]

ہمیر پور میں بھی فوج اور عوام نے یکساں حصہ لیا۔ راجہ چرکھاری نے پہلے تو اپنے کو انگریزوں کا وفادار ظاہر کیا لیکن جب صوبے دار علی بخش نے شاہِ دہلی کی بادشاہت کا اعلان کر کے خود بہ طور ناظم انتظام سنبھالا تو راجہ نے بھی اس کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ رہالی، سرولی، بزرگ اور سرولی خورد کے عوام باغیوں کے ہمراہ تھے۔ باندے میں بغاوت کی سازش پہلے سے ہو رہی تھی دکا اور سیندا نامی گاؤں میں خفیہ جلسے ہوتے تھے۔ بغاوت شروع ہونے پر شیوں نے

---

[1] چودھری ص ۹۴ دھٹو پادھیا ص ۱۱۷

مٹھائی تقسیم کی اور تمام گاؤں میں بغاوت پھیل گئی۔ فتح پور کی سپاہ نے جب ۹ر جون ۱۸۵۷ء کو بغاوت کی تو عوام نے پورا ساتھ دیا، زمیں دار اپنی چھوٹی چھوٹی فوجیں بنا کر مصروفِ جنگ تھے۔ باغیوں کے خاص سردار ڈپٹی مجسٹریٹ حکمت اللہ تھے جنھوں نے چکلے دار کا لقب اختیار کیا اور نانا صاحب کی حمایت کا اعلان کر دیا[1]

مرادآباد کے عوام کی کثیر تعداد نے حصہ لیا چناں چہ صرف امروہہ کے بارے میں ایک مقدمے کا سرکاری بیان ملاحظہ ہو۔

"سوائے امروہہ کے کوئی دوسرا مقام ایسا نہیں جہاں سرکار انگریزی کی نسبت اس قدر زیادہ دشمنی کا اظہار کیا گیا ہو یا رعایا اس قدر زیادہ رضامندی سے بغاوت کرنے کو مستعد ہوگئی ہو"۔

اسی طرح عدالت اسپیشل کمشنر مرادآباد مورخہ ۲ر جنوری ۱۸۵۹ء میں تحریر ہے کہ

"امروہہ کے سوائے کوئی جگہ ایسی نہیں جس میں ایسی زیادہ دشمنی اور زیادہ مستحکم تمرد نسبت عمل داری سرکار انگریزی ظہور میں آئی ہو" [2]

وسط ہند میں بھی تقریباً ہر جگہ فوج کے ساتھ عوام بغاوت پر اٹھے۔ مثلاً ساگر، جبل پور، اور موہ میں میرٹھ کی خبریں آنے پر تمام علاقوں میں ــــ جہاں چپاتیوں کی تقسیم اور ہڈیوں والے آٹے کی خبروں نے پہلے ہی عوام کو بغاوت پر کمربستہ کر دیا تھا ــــ شورش شروع ہوگئی گوالیار کنٹینمنٹ نے بغاوت کی۔ راجہ بان پور (ضلع للت پور) اور شاہ گڈھ (ضلع ساگر) کے راجہ بغاوت کی رہنمائی

---

[1] فتح پور اور باندہ کے انگریز حکام ماتن اور شیرر کے سرکاری بیانات۔ چٹوپادھیا ص۱۱۷ ص۱۱۸

[2] "تاریخ امروہہ" جلد اوّل: ص۳۲۳ و ص۳۲۴

کر رہے تھے۔ انھوں نے ساگر، نربدا حدود کے تمام راجاؤں کو پیغامات بھیجے اور اپنے ساتھ شامل ہونے کی اپیل کی۔ چند جگہوں سے کوئی جواب نہ ملا جب کہ کئی ضلعوں سے قابل اطمینان جواب ملے۔ منڈلہ اور دموہ کے تمام سردار شریک ہوئے۔ جبل پور اور ساگر کے سرداروں کی بڑی تعداد نے ساتھ دیا۔ اگست ۱۸۵۷ء میں ساگر اور نربدا کا تمام علاقہ باغی تھا البتہ جنوبی حصے میں امن تھا۔ ماہ ستمبر میں جبل پور باغیانہ سازش کا خاص مرکز تھا جس کے سرغنہ راجا شنکر شاہ اور اس کا بیٹا رگھوناتھ تھے۔ ہوشنگ آباد میں ایک مرہٹہ پنڈت نے کچھ علاقے پر قبضہ کر لیا۔ باغی پولس اس کے ساتھ ہوگئی تھی اور یہاں بغاوت کا سلسلہ ۱۸۵۸ء تک جاری رہا۔ چناں چہ مئی ۱۸۵۸ء میں نرسنگ پور کا باغی لیڈر ڈیلن شاہ گرفتار ہوا تب کہیں اس علاقے میں بغاوت دبائی جا سکی۔ علاقۂ جالون میں شہری آبادی پُرامن رہی صرف فوج نے بغاوت کی۔ اودھ کے تمام علاقوں میں بغاوت ایک انقلابی جنگ کے روپ میں تھی جس کا خود متعدد انگریزوں نے اعتراف کیا ہے۔ چھوٹا ناگ پور کا ایک افسر جے۔ ایس۔ ڈیویز اپنے خط مورخہ ۲۱ دسمبر ۱۸۵۷ء میں کمشنر کو لکھتا ہے۔

> "اس علاقے میں مزید مصیبت یہ ہے کہ کُل آبادی بلا استثنار، کھُلم کھُلا نہ سہی مگر باغیوں کے ساتھ ہم دردی رکھتی ہے۔ ان کو ہماری ہر نقل و حرکت کی اطلاع مل جاتی ہے جب کہ ہمیں اُن کا پتہ چلانے میں انتہائی مشکل کا سامنا ہوتا ہے" [۲]

اسی طرح بہار میں بڑے حصے پر بغاوت پھیلی اور کثیر تعداد میں عوام نے حصہ لیا جس کی مثالیں

---

[۱] ڈبلو۔ سی۔ آر سکاٹ کا سرکاری بیان۔ چٹوپادھیا/ ۱۰۳

2. Datta 126.

پیش کرنا غیر ضروری ہے لیکن ان تمام علاقوں میں یہ اندازہ لگانا اب دشوار نہیں کہ بغاوت کی بہ حیثیت مجموعی نوعیت کیا تھی۔

بقیہ علاقوں میں صرف فوجی بغاوتیں رونما ہوئیں مثلاً بنگال کے ضلعوں میں ۱۸۵۷ء ۵۹ء کے دوران میں فوج نے کئی بار شورش کی لیکن عوام خاموش رہے۔ اسی طرح ڈھاکے میں بھی عوام میں گڑبڑ پیدا نہ ہوئی جب کہ فوج نے بغاوت کی۔ راج شاہی ڈویژن کے بھی اکثر عوام غیر جانب دار رہے۔ دکھنی علاقے مجموعی طور پر خاموش رہے اور یہاں کوئی قابل ذکر عوامی بغاوت نہ ہوئی۔ مدراس میں عوام اور فوج دونوں پُرسکون رہے۔ بمبئی اگرچہ مدراس کی طرح پُرسکون نہیں رہا، تاہم بالکل خاموش بھی نہ تھا۔ یہاں ۱۸۵۷ء، ۵۹ء کے دوران میں اکثر رجمنٹوں نے بغاوت کی اور سازشیں بھی کی گئیں چناں چہ پونا اور بیلگام سے دو مولوی اسی الزام میں گرفتار ہوئے۔ حیدرآبادی عوام میں بے چینی اور بغاوت کے آثار تھے مگر نظام حیدرآباد اور سالار جنگ کی ”وفاداری“ نے نہ صرف ان کو کچل دیا بلکہ اور جگہوں پر بھی انقلابی تحریک کا گلا گھونٹا یقیناً اگر نظام کا یہ رویہ نہ ہوتا تو پورا دکھن بغاوت پر کھڑا ہو گیا ہوتا۔ لہٰذا دکھنی علاقوں میں ناکامی کی ذمہ داری بڑی حد تک نظام حیدرآباد کے سر ہے چناں چہ گورنر بمبئی نے حیدرآباد کے رزیڈنٹ کو ایک تار میں لکھا تھا۔

”اگر حیدرآباد باغی ہو گیا تو ہمارا خاتمہ ہے“[۱]

صوبہ سندھ میں فوجیوں کی بغاوتیں ہوئیں جو کہ جلد دبا دی گئیں۔ بنگال پیادہ رجمنٹ نمبر ۶ نے یہاں بلوچیوں سے مل کر سازش بھی کی تھی مگر عوام بغاوت میں شامل نہ ہوئے۔

---

[۱] یوسف الدین: تاریخ دکن/ ۱۸۹

پنجاب میں بھی اکثر مقامات مثلاً فیروز پور، لاہور، جھیلم، سیال کوٹ، پھلور، جالندھر، انبالہ وغیرہ میں فوجوں نے بغاوت کی جو جلد ہی دبا دی گئی اور عوام کی بہت کم تعداد شامل ہو سکی جس کی تفصیلات پنجاب کے حالات میں گذر چکی ہیں۔ راجپوتانہ میں سپاہ نے تقریباً ہر جگہ بغاوت کی یہاں تک کہ دیسی ریاستوں کی فوجیں بھی باغی ہوگئیں مگر راجے نہ صرف "وفادار" بلکہ مددگار بھی رہے اور اسی وجہ سے کامیابی دشوار ہوگئی۔ اکثر انگریزوں نے لکھا ہے کہ اگر یہ والیانِ ریاست باغیوں کے حامی ہو جاتے تو یہاں انگریزی اقتدار کا بجھا ہوا چراغ شاید پھر کبھی نہ جل پاتا۔

مختصراً یہ کہ تمام شمالی مغربی علاقوں، بندیل کھنڈ، حدود ساگر نربدا وغیرہ (یعنی وسط ہند) اودھ، روہیل کھنڈ، بہار اور چھوٹا ناگ پور میں تحریک ایک عوامی اور انقلابی جنگ کے روپ میں تھی۔ ان علاقوں میں اکثر جگہوں پر فوج اور عوام نے متحدہ طور پر بغاوت کی صرف چند جگہوں پر بغاوت فوج تک محدود رہی اور عوام نے حصہ نہیں لیا، لیکن جو لوگ بغاوت کی قومی نوعیت پر معترض ہیں وہ موجودہ دور کی انقلابی جدوجہد اور قومیت کے جدید نظریات کی عینک لگا کر آج سے سَو سال پہلے کی اس انقلابی جنگ کو دیکھنا چاہتے ہیں اور حسب نئے رجحانات ان کو اس میں نظر نہیں آتے تو وہ باغیوں کے جذبۂ حریت اور تحریک کی انقلابی نوعیت ہی سے انکار کر دیتے ہیں۔ ورنہ ہندوستانی عوام کی اتنی بڑی تعداد نے آج تک کسی تحریک میں حصہ نہیں لیا، کوئی تحریک اس قدر وسیع و عریض رقبے میں بہ یک وقت نہیں پھیلی جو برطانیہ، اٹلی، فرانس، ہالینڈ، بلجیم، اسپین وغیرہ کے مجموعی رقبے سے بھی زیادہ ہے۔

قومیت کا احساس ملک کے غیور عوام نے انگریزی اقتدار کو کبھی رضامندی سے

تسلیم نہیں کیا، ان کو غلامی کی اس لعنت کا ہمیشہ احساس رہا ہے لیکن زیادہ تر انگریز مؤرخوں نے تعصب اور جانب داری کی عینک لگا کر اپنی کتابیں لکھی ہیں اور غالباً اپنے "جی حضوری" طبقے کی رائے کو عام لوگوں کی رائے اور رجحان قرار دے دیا۔ کیوں کہ غیر متعصب انگریز پادری سی۔ ایف اینڈریوز کا یہ اعتراف قابلِ غور ہے کہ

"اگرچہ برطانوی حکومت کو چُپ چاپ مان لیا گیا تھا تاہم اس کی تہہ میں غیر ملکیوں کی ماتحتی کا ذلت آمیز جذبہ ہمیشہ شدت سے محسوس ہوتا رہا...... یہ جذبہ کبھی کلیتہً محو نہیں ہوا۔ غیر ملکی ہمیشہ غیر ملکی رہا"۔ [1]

اس سلسلے میں وہ اپنے ایک دوست کے بارے میں لکھتا ہے

"وہ خود بھی تھوڑی دیر پیشتر اس سرکاری تقریب (دربار) سے واپس آئے تھے .... اپنی روح کی بے چینی میں انھوں نے مجھ سے صاف کہہ دیا "اوہ! میں نے آج اس شاہی ہال میں ایک غیر ملکی کے سامنے اپنے آپ کو جھکا کر اپنی سخت تذلیل کی ہے"۔ اُن کا سر نیچے جُھک گیا...... اُن کی حالت یہ تھی کہ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ اُن کی روح کی عمیق ترین گہرائی سے ٹھنڈی آہ نکلی...."[2]

اس کے علاوہ باغی سرداروں کے اکثر اعلانات ملکی اور قومی احساسات کے ترجمان ہیں۔ اور اُن سے یہ جذبات پوری طرح آشکارا ہوتے ہیں۔ مثلاً خان بہادر خاں کا اعلان

"ہندوستان کے رہنے والو! سوراج کا پاک دن جس کا بہت عرصے سے انتظار تھا آپہنچا ہے۔ آپ اسے منظور کریں گے یا اس سے انکار کر دیں گے؟ آپ اس زبردست

---

[1][2] "ذکاء اللہ دہلوی"، ترجمہ ضیاء الدین

موقعے سے فائدہ اٹھائیں گے یا اسے ہاتھ سے جانے دیں گے؟ - ہندو اور مسلمان بھائیو! - آپ سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ اگر یہ انگریز ہندوستان میں رہ گئے تو ہم سب کو ختم کر دیں گے اور آپ کے مذہب کو مٹا دیں گے۔ ہندوستان کے باشندے اتنے دنوں تک انگریزوں کے دھوکے میں آتے رہے اور اپنی ہی تلواروں سے اپنا گلا کاٹتے رہے ہیں اس لیے اب ہمیں ملک فروشی کے اس گناہ کا پرائشچت (کفارہ) کرنا چاہیے۔ انگریز اب بھی اپنی پرانی دغابازی سے کام لیں گے۔ وہ ہندو اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف ابھاریں گے ...." [1]

دورانِ بغاوت کا عدیم المثال بھائی چارہ جس کو دشمنانِ وطن کی مسلسل کوششیں بھی ختم نہ کر سکیں قومی احساس کا نمایاں ترین مظاہرہ تھا اور اس کا معترف انڈریوز بھی ہے۔

"تاہم قدرت کے اس تمام انقلاب میں خواہ وہ مراہٹوں کے ماتحت ہو، خواہ انگریزوں کے ماتحت، دہلی کے لوگ — ہندو مسلمان یکساں طور پر — عقیدت مندانہ وفاداری کے ساتھ مغل شہنشاہوں سے چمٹے رہے۔ اس بارے میں بھی جو جو شہادت مجھے ملی وہ بالکل قطعی تھی۔ انھیں بہادر شاہ کے ساتھ جو محبت تھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ...... اُن (مغل بادشاہوں) کی سب سے بڑی خوبی اُن کی رواداری کی شریفانہ روایت تھی جسے وہ خصوصیت کے ساتھ اپنی ہندو رعایا کے ساتھ برتتے تھے .... نسل و مذہب کی بنا پر بہت کم امتیاز روا رکھا جاتا تھا" [2]

---

[1] "بھارت میں انگریزی راج" / ۱۴۱۸ (جلد سوم)
[2] "ذکاء اللہ دہلوی" / ۵۶

پٹنہ میں مولانا پیر علی اور وارث علی کی گرفتاری پر کاغذات برآمد ہوئے جن سے زبردست سازش کا سُراغ ملا۔ ترہٹ کے مجسٹریٹ کا خیال تھا کہ وارث علی جو دہلی کے شاہی خاندان سے تھا بہ طور جاسوس مقرر ہے۔ تمام خطوط سے جو دونوں کے پاس سے برآمد ہوئے، نتیجہ نکلتا تھا کہ حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے ہمہ گیر سازش موجود تھی چناں چہ ایک خط ریاست علی (کلکتہ) کے نام سے یوسف علی (پٹنہ) کو بھیجا گیا تھا۔ انھی خطوط سے معلوم ہوا کہ ۱۸۵۶ء کے آخر میں پیر علی اور مسیح الزماں کان پور سے لکھنؤ گئے تھے۔ شاہ اودھ جب کلکتے جاتے ہوئے پٹنہ سے گذرے تو یہاں مولوی مہدی (پٹرول داروغہ) وغیرہ سے ملاقاتیں کیں۔ بٹھور میں بھی پیر علی کے آدمی موجود تھے۔ اندازہ ہے کہ پٹنہ میں تحریک ولی اللٰہی کے وابستگان کے علاوہ دو اور بھی گروہ مصروف کار تھے۔ ایک لکھنؤ کے پیر علی اور ان کے ہمراہیوں کا تھا اور دوسرا وارث علی اور علی کریم وغیرہ کا، جو دہلی سے وابستہ تھے۔ اسی گروہ نے فوجیوں کی ہمدردیاں بھی جیت لی تھیں۔ ۱۸۵۶ء کے قریب اِن سب کو آپس میں متعارف اور متحد کرنے کی کوشش کی گئی، چناں چہ مولانا پیر علی کے نام مسیح الزماں نے اِس ضرورت کا اظہار بھی اپنے ایک خط میں کیا تھا۔ مظفر پور، آرہ، پٹنہ، صاحب گنج اور بھاگل پور وغیرہ کے زمیں داروں نے متحدہ جماعت بنالی تھی اور پٹیالہ کے راجہ، نیپال اور دہلی سے خط و کتابت کر رہے تھے۔[۱]
۱۸۴۵ء کی سازش کے کاغذات سے پتہ چلتا ہے کہ خواجہ حسین علی، کنور سنگھ اور اُن کے ساتھیوں نے پنجاب جانے کا ارادہ کیا تھا جہاں اُس زمانے میں انگریز فرزندانِ پنجاب کو بہ زورِ شمشیر غلام بنانے میں مصروف تھے۔ مذکورہ سازش میں ملک خادم علی، برکت اللہ

۱؎ : دتّہ / ۸۲ و ۸۱ - ۸۰ - ۷۷

اور رام پرشاد سنگھ وغیرہ بھی شریک تھے۔ کچھ خطوط جو انگریزوں کو خادم علی کے گھر سے ہاتھ لگے اور جن کا خلاصہ مسٹر کے۔ کے دتہ نے اپنی تازہ انگریزی تصنیف "کنور سنگھ اینڈ امر سنگھ" میں صفحہ ۱۹۲ پر دیا ہے، کنور سنگھ نے حسین علی وغیرہ کو لکھے تھے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاہور جانے کے لیے نہ صرف فوج تیار ہو رہی تھی اور روپیہ جمع کیا جا رہا تھا بلکہ کنور سنگھ خود راجہ نیپال سے ملے اور راجہ نے وعدہ کیا تھا کہ ملک سے انگریزوں کا نام و نشان مٹانے میں وہ ان کی پوری مدد کرے گا۔ دیسی مہاجن روپیہ دینے کو تیار تھے۔

اِن انکشافات کے بعد اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کون سا غیر محسوس جذبہ کنور سنگھ وغیرہ کو پنجاب لے جا رہا تھا اور کس غیر مرئی طاقت نے بنگال، بہار، یوپی، پنجاب وغیرہ کے باشندوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا تھا۔

انگریزوں کی رائیں

بہتر ہے کہ اس سلسلے میں **مشہور انگریز مورخوں** کے خیالات پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ لندن ٹائمز کا نامہ نگار رسل لکھتا ہے۔

"ہم ایک مذہبی جنگ سے دوچار تھے، پوری نسل کی جنگ سے، انتقامی جنگ سے جو کہ پُرامید قومی جذبات کے تحت اجنبی حکومت کا جوا اتار دینے اور مقامی والیانِ ریاست اور سرداروں کی پوری قوت پھر سے بحال کرنے کی جد و جہد تھی" [۱]

مشہور مورخ چارلس بال لکھتا ہے۔

"یہ عام بغاوت میں تبدیل ہو گئی تھی اور عوام کو خیالی مظالم اور مذہبی تعصبات کی وجہ

---

[۱] "My Diary" p. 164

سے اکسایا گیا تھا...... میرٹھ کی سپاہ کو ایک لمحے میں لیڈر مل گیا، ایک جھنڈا اور مقصد مل گیا اور بغاوت ایک انقلابی جنگ میں تبدیل ہو گئی " [۱]

جوسٹن مکارتھی کی رائے ہے کہ

"حقیقت یہ ہے کہ پورے شمالی اور شمالی مغربی صوبوں میں دیسی نسلوں نے انگریزی اقتدار کے خلاف بغاوت کی۔ صرف سپاہی بغاوت پر نہیں اٹھے، صرف ملٹری نے شورش نہیں کی، بلکہ یہ فوجی بے چینیوں، قومی تنفّر اور انگریزوں سے مذہبی تعصّبات کا ملا جلا مرکّب تھی۔ دیسی راج گان اور فوج بھی اس میں شامل تھی اور ہندو مسلمان اپنے اختلافات بھول کر عیسائیوں کے خلاف متحد ہو گئے تھے" [۲]

جی۔بی میلیسن نے جس کا نام اس سلسلے میں محتاجِ تعارف نہیں ہے، بغاوت پر تین جلدیں لکھی ہیں۔ کیوں کہ ہنگامہ ختم ہونے کے آٹھ سال بعد وہ دوبارہ ہندوستان آیا، لوگوں سے بات چیت کی اور اپنی تیسری مختصر جلد "دی انڈین میوٹنی آف ۱۸۵۷ء" (Indian Mutiny of 1857) میں، جو ۱۸۹۱ء میں چھپی تھی، بغاوت کی قومی نوعیت کو تسلیم کیا ہے۔

"حالات سے مجھے ثبوت مل گیا کہ کچھ اور بھی وجوہات تھیں جنھوں نے یہ جذبات پیدا کیے جو ذاتی نہیں بلکہ قومی تھے اور اُن لوگوں کے دلوں میں بھی جاگزیں تھے جو ہمارے وفادار ترین ملازم تھے"

---

[۱] جلد اول: ۶۴۲، ۶۴۴

[۲] ساورکر: ۱۲

اودھ میں بغاوت کی قومی اور عوامی نوعیت کا تو متعدد مؤرخوں نے اعتراف کیا ہے جن میں مکلاڈ انس بھی شامل ہے جو لکھتا ہے۔

"کم از کم اہلِ اودھ کی جد و جہد کو تو جنگِ آزادی کہنا پڑے گا"

گبنس (GUBBINS) نے لکھا۔

"پورے روہیل کھنڈ میں بغاوت تھی"۔

کے (KAYE) نے لکھا

"تقریباً تمام بندیل کھنڈ برطانیہ کے خلاف ہتھیار لے کر کھڑا ہو گیا تھا" [۱]

گورنر جنرل کیننگ نے اعتراف کیا کہ

"میں یہ سمجھ چکا تھا کہ وسط ہند ہاتھ سے نکل گیا اور اسے دوبارہ فتح کرنا ہے" [۲]

اسی طرح گورنر بنگال کی رپورٹ ظاہر کرتی ہے کہ بنگال، بہار، آسام اور اڑیسہ وغیرہ میں شاید ہی کوئی مقام بچا ہو جہاں بغاوت نہیں ہوئی۔ مختصر یہ کہ ۱۸۵۷ء کے حالات کو جس رُخ سے بھی جانچا جائے اور جس پہلو سے بھی دیکھا جائے آزادی پسندی اور حب الوطنی کے جذبات اُبلتے نظر آئیں گے اور اِن حقیقتوں سے انکار کی جرأت وہی شخص کر سکے گا جو اس سلسلے میں کوئی نئی اُپج "ایجادِ بندہ" کے طور پر نکال کر دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہو اور جس نے چند مخصوص انگریزی تاریخوں کو ہی رٹ کر دماغ پر تالے ڈال لیے ہوں ورنہ تحریک کی قومی حیثیت اور کامیابی کا کتنا بڑا ثبوت ہے کہ مختلف فرقے مذہب و ملت، ذات پات، رہن سہن اور

---

[۱] جلد دوم / ۴۱۱

[۲] جلد سمپوزیم / ۳۰

بول چال میں اختلاف کے باوجود کس قدر متحد اور متفق تھے کہ دشمنانِ وطن اپنی تمام کوششوں کے باوجود بھی اس بے مثال اتحاد اور ایکتا کو پارہ پارہ نہ کر سکے اور انھوں نے حیرت سے اس کا اعتراف کیا۔ مثلاً کمے نے لکھا۔

"ہندو مسلمان ہمارے خلاف مکمل طور پر متحد ہو گئے تھے"۔

ایک اور انگریز ایچیسن (AITCHISON.) اس طرح مایوسی کا اظہار کرتا ہے

"اس موقعے پر ہم مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف کھڑا نہ کر سکے" [1]

بمبئی کا انگریزی اخبار "پنجابی" (۲۰ جون ۱۸۵۷ء) محوِ حیرت ہے کہ

"اگر مسلمان تیموری خاندان کی حکومت بحال کرنے کے لیے مضطرب ہیں تو یہ بات کچھ حیرت انگیز نہیں، حیرت تو اس بات پر ہے کہ ہر ذات پات کے ہندو بھی اسی طرح دوڑے جارہے ہیں۔ یقیناً یہ دیکھ کر انسان سراپا تعجب کا پیکر بن جاتا ہے کہ ہندو اس مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے وقف ہو گئے ہیں" [2]

ناکامی کیوں؟

اِن تمام بلندیوں کے باوجود بغاوت کی ناکامی کے متعدد اسباب تھے۔ بعض جگہ تو مقامی افراتفری پھوٹ، حسد اور رقابت کی گرم بازاری نے تحریک کو ٹھنڈا کر دیا لیکن بعض حالات ایسے تھے جو پوری تحریک پر اثر انداز ہوئے مثلاً یہ کہ تحریک پوری طرح منظم نہ تھی، انقلابی صفوں میں انتشار تھا جب کہ

---

[1] Ashok Mehta: Great Rebellion, p. 42

[2] ۵ ستمبر: ۱۸۵۷

انگریز مکمل نظم وضبط کا مظاہرہ کر رہے تھے انگریزوں کے خلاف عام سطح پر کوئی پروپیگنڈا نہیں کیا گیا، انقلابیوں کے سامنے کوئی واضح اور مشترک تعمیری پروگرام نہ تھا صرف انگریزوں کی دشمنی کے جذبات پورے عروج پر تھے۔ ذرائع خبر رسانی اور نقل وحمل پر انگریزوں کا قبضہ تھا چناں چہ دہلی میں بغاوت کی اطلاع فوراً ایک انگریز نے جان پر کھیل کر انبالے کو دے دی اور وہاں سے تمام جگہوں پر پہنچا دی گئی جس کی وجہ سے انگریزی فوجوں نے تیاریاں شروع کر دیں اور دہلی پر ٹوٹ پڑیں۔ اسی وجہ سے رابرٹ منٹگمری نے کہا تھا کہ "ہندوستان کو تار برقی نے بچا لیا"۔

والیانِ ریاست انگریزوں کے "وفادار" رہے، خصوصاً پنجاب کی ریاستوں نے اپنی فوجیں اور روپیہ دہلی پر چڑھائی کے لیے حوالے کیا، بعض نے انگریزوں کا پلڑا بھاری ہونے کے بعد ساتھ دیا۔ چناں چہ انگریز اور ہندوستانی مورخوں کے قول اس سلسلے میں گذشتہ صفحات پر پیش کیے جا چکے ہیں۔ وسط ہند کے رجواڑوں نے بھی اپنے عوام اور فوجیوں کی خواہش کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا۔ میلسن کی رائے ہے کہ

"اگر راج پوتانہ اٹھ کھڑا ہوتا تو یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ آگرہ قابو میں آسکے گا اور یہ کہ کس طرح ہماری فوج دہلی سے پہلے جگہ بنا سکتی"[۱]

"ریڈ پمفلٹ" میں گوالیار کے متعلق لکھا ہے کہ

"اگر دھا اپنے آپ کو باغیوں کے ہاتھ میں دے دیتا تو نتائج ہمارے لیے انتہائی تباہ کن ہوتے وہ کم از کم بیس ہزار دستے ہمارے مقابلے میں ہماری کم زور پوزیشنوں پر لے آتا، آگرہ

---

[۱] جلد اول/ ۲۶۱

اور لکھنؤ فوراً ہاتھ سے نکل جاتے، ہیولاک الہ آباد میں بند ہو جاتا اور باغی یا تو قلعے کا محاصرہ کر لیتے یا بنارس کے راستے کلکتے پر حملہ آور ہو جاتے جہاں ان کو روکنے کا کوئی سامان نہ تھا" ؎۵

انس کی رائے ہے کہ "سندھیا کی وفاداری نے انگریزی حکومت کو بچا لیا"۔ اسی طرح رام پور کے نواب نے روہیل کھنڈ میں انگریزوں کے پاؤں جمائے، حیدر آباد نے دکھن کی سلگتی چنگاریاں بجھا دیں۔

کمپنی کی سَو سالہ لوٹ کھسوٹ نے ملک کو بے حد کنگال کر کے عوام میں بے غیرتی لالچ اور خود غرضی کی داغ بیل ڈال دی تھی چناں چہ ملک کے ہر گوشے میں ایسے افراد نے تحریک کی پیٹھ میں خنجر گھونپا۔ انگریزوں کے جاسوس ہر جگہ اپنی مذموم سرگرمیوں میں مصروف تھے اور ان کی کارروائیاں محبانِ وطن کی کوششوں پر پانی پھیر رہی تھیں۔ معین الدین اور جیون لال کی ڈائریاں گواہ ہیں کہ دہلی میں آئے دن انگریزی جاسوس پکڑے جاتے تھے۔ انگریزوں کا ایک پورا محکمہ ہڈسن کی رہنمائی میں یہ کام کر رہا تھا جس کا خاص ایجنٹ رجب علی تھا۔ لکھنؤ کے محصوروں کو قنوجی لال اور انگد وغیرہ نے ہر ممکن مدد پہنچائی ہے۔ بہار میں کبیر الدین اور دوسرے جاگیرداروں کی مثالیں بہ کثرت ہیں۔

باغیوں میں جرأت و ہمت کا فقدان نہ تھا، انھیں مدبر قافلہ سالاروں کی ضرورت تھی چناں چہ دہلی کے مغل شہزادوں نے فوج سنبھال کر جو گل کھلائے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، بخت خاں نہ ہوتا تو شاید چند دن بھی مقابلہ دشوار تھا۔ علاوہ ازیں افغانستان سے

؎۵ بہ حوالہ "سمپوزیم" / ۱۷۳

اسی زمانے میں معاہدہ ہو جانے کی وجہ سے انگریزوں کو روسی خطرے سے نجات مل چکی تھی، چین جانے والی فوجیں ہندوستان کی طرف مُڑ گئی تھیں اور ایران کی جنگ ختم ہو چکی تھی۔ پھر یہ کہ باغیوں کے پاس نئے ہتھیاروں کی کمی تھی اور بعض جگہ تو معمولی ہتھیار بھی نہ تھے۔ چارلس بال کہتا ہے۔

"اگر بنگالی فوج کے پاس چھوٹی رائفلیں بھی ہوتیں تو دہلی اب بھی مغلوں کے قبضے میں ہوتا اور تیمور کا وارث جیل کی ایک معمولی چارپائی کے بجائے آج بھی قلعے میں اپنے باپ دادا کے تخت پر بیٹھا نظر آتا" [۱]

ننگِ وطن مغل خاندان

دہلی ہندوستان کی راجدھانی اور مرکز تھی، چنانچہ یہاں کی بدنظمی کے باعث شکست نے تمام ملک پر اثر ڈالا اور انقلابی حلقوں میں مایوسی اور ہراس کی لہر دوڑا دی جب کہ دوسری طرف انگریزوں کے حوصلے ہر جگہ بلند ہو گئے۔ دہلی کی شکست کا سب سے بڑا سبب مغل خاندان کا ناقابلِ معافی کردار تھا، جہاں وزیر اعظم احسن اللہ اور ملکہ زینت محل کے دامن بھی سازباز سے پاک نہ تھے چنانچہ چنی لال نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ ۱۶ رمئی ۱۸۵۷ء کو باغیوں نے احسن اللہ کا ایک خط پکڑا جو انگریزی کیمپ میں جا رہا تھا اور اس شرط پر مدد کا یقین دلایا گیا تھا کہ جواں بخت کو ولی عہد مان لیا جائے، جواں بخت کی یہ شرط بتاتی ہے کہ خط زینت محل کے ایما سے لکھا گیا ہوگا۔ گرتیہاڈ اپنے ایک خط (۲۳ راگست ۱۸۵۷ء) میں لکھتا ہے۔

---

[۱] جلد دوم: ۹-۱۰۹ بہ حوالہ "سمپوزیم" / ۵۲

"بادشاہ کی چہیتی بیگم زینت محل کی طرف سے پیام آیا، اس میں شرائط اور معاہدے کے لیے بادشاہ پر اپنا اثر استعمال کرنے کی پیش کش کی تھی"۔

۱۹ اگست کو اُس نے ایک خط میں لکھا تھا۔

"میرے پاس شہزادوں کے خطوط آنا شروع ہو گئے ہیں کہ وہ ہمارے حامی ہیں اور یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے لیے کیا کر سکتے ہیں" [۱]

مغل خاندان میں ایسے "وفاداروں" کی کمی نہ تھی اور ان کا پروگرام یہ تھا کہ اگر ان کی پرانی پنشن جاری ہو جائے اور بہادر شاہ کو مراعات دی جائیں تو یہ لوگ تلنگیوں کا پل تباہ کرنے کی تدبیر کریں گے، سوار فوج پر قابو حاصل کریں گے اور ان کی مدد سے پیدل کو بے دست و پا کر کے انگریزوں کو شہر میں داخل ہو جانے دیں گے مگر چوں کہ انگریزوں کی پوزیشن اُس وقت تک کافی مضبوط ہو چکی تھی لہٰذا انھوں نے یہ تجویز ٹھکرا دی [۲]

بہادر شاہ کو تمام ملک بادشاہ مانتا تھا، اگر اُن میں بابر، ہمایوں اور اکبر جیسی اولوالعزمانہ صفات کا شائبہ بھی ہوتا تو شاید انقلاب ۱۸۵۷ء کی تاریخ دوسرے انداز میں لکھی جاتی لیکن کاہل مزاج، عیاش طبع اور ضعیف و ناتواں بادشاہ ایک کھلونا سا بن کر رہ گیا۔ حتیٰ کہ شکست کے بعد وہ یہ فیصلہ بھی نہ کر سکا کہ اسے بخت خاں کے ساتھ جانا چاہیے یا نہیں، اس تذبذب اور غیر مستقل مزاجی نے بھی تحریک کو زبردست نقصان پہنچایا۔

---

[۱] "سیپوزیم"/ ۱۷۲ [۲] سین/ ۹۵

نتائج

اور

اثرات

گرجے بہت سے قہر کے بادل، حق کی ہر آواز دبا دی
بجھ کر راکھ ہوئی چنگاری، راکھ میں لیکن آگ لگا دی
بربادی کی آندھی آئی ذرّوں کو پرواز سکھا دی
آغازِ ناکام کے قرباں، تقدیرِ انجام جگا دی

ایک شکستِ فتح بہ دامن
سن اٹھارہ سو ستاون

بیرونی دُنیا میں گونج[1]

انیسویں صدی کے وسطی دور میں تمام دنیا میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف مختلف جگہوں پر سخت جدوجہد ہوئی اور کئی ایشائی ملکوں میں بھی قومی آزادی کی جنگیں لڑی گئیں مثلاً چین کی ٹائپنگ بغاوت اور دوسری جنگِ افیون (OPIUM WAR) ہندوستان کی بغاوت، ایران میں بیلسٹوں کی شورش اور انگریزوں سے ایران کی جنگ، لبنان اور سیریا میں کسانوں کی بغاوت، بورنیو میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف جدوجہد وغیرہ تمام شورشیں مکروہ سامراجی طاقتوں کے خلاف تھیں۔ ہندوستانی عوام نے بھی اسی انقلاب آفریں دور میں کروٹ لی اور اپنی گردنوں سے غلامی کا جُوا اُتار پھینکنے کی زبردست جدوجہد کی جس کو انگریز نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے "فوجی بغاوت" اور "غدر" جیسے برعکس ناموں سے یاد کیا مگر اس بغاوت کی آواز تقریباً تمام دنیا میں گونجی۔

---

[1] زیادہ تر حالات سمپوزیم سے ماخوذ ہیں۔

فرانس

فرانس میں اُس زمانے میں شہنشاہیت قائم تھی اور پبلک جلسوں کی بھی اجازت نہ تھی۔ ہندوستان کے بارے میں اول تو معلومات اور خبریں بہت کم ملتی تھیں اور جو تھیں وہ انگریزی ذرائع یا ہندوستان میں مقیم فرانسیسیوں کی فراہم کردہ تھیں جو صحیح واقعات کی بہت کم نمایندگی کرتی تھیں۔ بغاوت کی خبریں آخر جون میں یہاں پہنچ سکیں، تاہم فرانس کے پریس نے بغاوت کو کافی اہمیت دی۔ مثلاً ایک آزاد خیال اخبار "LE SIECLE" نے ۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو اس مسئلے کو سب سے اہم اور پرکشش قرار دیا۔ یہ اخبار اگرچہ انگریزوں کا حامی تھا مگر، ار نومبر کی اشاعت میں لکھتا ہے۔

> "بدقسمتی سے یہ بات تصدیق ہوگئی ہے کہ دہلی پر تسلط کے بعد ہولناک کشت و خون کیا گیا .... ہم کو ان ظالمانہ حرکات کی مذمت میں ذرا بھی تامل نہیں جو سپاہیوں کے کسی بھی جرم کے بدلے میں انصاف پر مبنی نہیں کہی جاسکتیں"

ایک جمہوری طرزِ فکر رکھنے والے اخبار "L' ESTAFFETTA" نے ۲۹ اگست ۱۸۵۷ء کو لکھا۔

> "اگر انگریزوں کی یہی ظالمانہ اور متشددانہ پالیسی جاری رہی تو بڑی طاقتیں اور خصوصاً سب سے زیادہ فرانس مداخلت پر مجبور ہوگا تاکہ ہندوستانیوں کو ذلیل جانوروں کی طرح ذبح نہ کیا جاسکے"۔

فرانس کے پریس نے متفقہ طور پر کمپنی کی کارروائیوں کی مذمت کی، عیسائی مشنریوں (عیسائیت کا پرچار کرنے والی جماعتیں) اور عیسائیت کے پرچار پر اعتراض کرتے

ہوئے اس کو بغاوت کی ایک بڑی وجہ بتایا۔ اس اخبار نے ۳ر اکتوبر ۱۸۵۷ء کی اشاعت میں بغاوت کا سبب قومی احساسات کی بیداری قرار دیا۔

چند اخبارات انگریزوں کی حمایت میں تھے اور عجیب عجیب دلیلیں دیتے تھے مثلاً یہ کہ برطانوی تسلط ختم ہونے پر ہندوستانی آپس میں لڑنے لگیں گے یا یہ کہ ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ رہنے میں پورے یورپ کا فائدہ ہے مگر دوسرے خیال کے اخبار ان باتوں کی برابر تردید کرتے رہے۔

۱۸۵۸ء میں ایک مصنف (LEGOUET ما) نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی جس کے "تعارف" میں اس نے انگریزوں پر اپنے مفاد کی خاطر ہندوستان کی تہذیب و تمدن تباہ کرنے کا الزام لگایا۔

جمہوریت پسند اخبارات نے نانا صاحب کی شخصیت کو بہت بلند مقام دیا چناں چہ ستمبر ۱۸۵۷ء میں ایک اخبار "L. ESTAFFETTA," نے کئی بار نانا صاحب کی مدح سرائی کی، ان کو نہایت بہادر با ہمت اور ماہر جنگ جو قرار دیا۔ ایک بار اس نے لکھا۔

> "باغیوں کا سردار نانا صاحب جس کو بعض خوں خوار درندے کے روپ میں پیش کرتے ہیں اور بعض ایک مکمل طور پر شریف انسان کی صورت میں — ہم سمجھتے ہیں کہ حب الوطنی اور مذہبیت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کام کر رہا تھا اور یہی جذبات دراصل اچھے انسانی کاموں کے سب سے بڑے محرک ہیں"

ایک مراسلہ نگار تو سب سے بازی لے گیا، اس نے لکھا تھا۔

> "ہندوستانیوں کی حمایت میں مداخلت کی جائے سمندروں پر پہرہ لگا دیا

جائے، تمام ایشیا کے لوگوں سے اپیل کی جائے، ان کو مسلح کیا جائے اور ان کو ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف لڑنے بھیجا جائے ظالموں کا پیچھا کرو اور نکال دو۔! عظیم مغلوں کی حکومت دوبارہ قایم کرو۔ یہی ایک ایسی پالیسی ہے جو فرانس کی شان دار روایات کے شایان شان ہو سکتی ہے"۔

روس

تحریک شروع ہونے کی اطلاع روس میں، ۲۷ جون ۱۸۵۷ء کو پہنچی جب کہ لندن سے روسی سفیر نے بذریعہ ٹیلی گراف میرٹھ کی بغاوت اور دہلی پر باغیوں کے قبضے کی اطلاع دی اور وزیر خارجہ کو لندن کے اخبارات کے اقتباسات بھی ارسال کیے۔ روسی سفارت خانے کے ایک افسر اگ نیٹو نے واقعات کی تفصیل روانہ کی اس میں لکھا تھا کہ یہ بغاوت کمپنی کے خلاف چند دیسی رجمنٹوں کی اتفاقی شورش نہیں ہے بلکہ دراصل یہ اجنبی اقتدار سے آزادی حاصل کرنے کی خواہش کا پورے ملک کی طرف سے اظہار ہے اسباب بیان کرتے ہوئے اس نے "حکم راں جماعت کی بدانتظامی" اور "کمپنی کے بے تحاشا لالچ" کو اس کا سبب قرار دیا۔

روسی پریس نے ہندوستان کی خبروں کو بڑی اہمیت دی اور اخبارات نے نمایاں طور پر شائع کیں۔ چناں چہ ایک اخبار "OTECHESTVENNYE ZAPISKI" نے لکھا تھا۔

"آج کی سیاسی دنیا میں شاید ہی کوئی مسئلہ اتنا اہم، دل چسپ اور تشویش ناک ہو جتنا کہ ہندوستان کا۔ ہندوستان کی خبروں کا انتہائی بے صبری سے انتظار کیا جاتا ہے"۔

جمہوری طرز فکر رکھنے والا ایک مصنف ڈبرولائیبوف بھی تھا جس نے حالات کا مشاہدہ

کر کے صحیح اندازہ لگایا تھا۔ وہ اُن لوگوں سے جو اس بغاوت کو متعصب ہندوؤں (یہاں ہندوؤں سے مراد ہندوستانی ہیں) کی مذہبی بغاوت یا بے قابو سپاہ کا غدر کہتے تھے متفق نہ تھا۔ وہ اِس بغاوت کو اُن عوام کی تحریکِ آزادی سمجھتا تھا جو بے غرضانہ طور پر حملہ آوروں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے، اس کے خیال میں عوام کو برطانوی نظامِ حکومت کی خرابیوں کا احساس ہو گیا تھا۔ روس کے سرکاری آرگن "RUSSKY INVALID" نے ۱۳ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو ایک مضمون بہ عنوان "ایسٹ انڈیز کے مسائل" شائع کیا۔ مضمون نگار نے لکھا تھا کہ

"برطانوی شیر ہندوستان کی دیسی ریاستوں کو سیاسی طور پر نگل لینے کا عادی ہوتا چلا جا رہا تھا اور اس کی اس درندگی کو یقیناً روکنے کی ضرورت تھی"

بغاوت کے اسباب بیان کرتے ہوئے اس نے ہندوستانیوں سے وحشیانہ برتاؤ (خصوصاً ٹیکس جمع کرتے وقت) اور انسانی حقوق کی طرف سے مکمل بے نیازی کو اصل سبب قرار دیا۔ ایک اور اخبار نے انگریزی اخبارات کے اس دعوے کو محض بکواس بتایا کہ یہ بغاوت ہندوستانیوں کے مذہبی احساسات کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے۔ اس کے خیال میں ان علاقوں پر برطانوی تسلط اُن کو متمدن بنانے کے لیے نہیں بلکہ ان کو کھا جانے اور فنا کر دینے کے لیے تھا۔ روس کے محقق اسکالروں نے بھی تحریک کا بڑی دلچسپی اور غور و خوض سے مطالعہ کیا۔

اٹلی یہاں جمہوریت پسند طبقہ اقتدار حاصل کرنے کی جد و جہد کر رہا تھا اور اِسی سال بوربن حکومت کے خلاف انقلابی تحریک شروع ہوئی تھی۔ اس طبقے نے کھلے طور پر باغیوں کی حمایت کی، جب کہ دوسرا طبقہ انگریزوں کا حامی تھا۔ ایک مصنف کارلو کیٹینیو نے

جو قدیم و جدید ہندوستان کے موضوع پر ایک کتاب بھی لکھ چکا تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے گھناؤنے اخلاقی اصولوں پر سخت تنقید کی۔ مخالف طبقے کے ایک مصنّف جوزف مساری نے ان الفاظ میں خیالات کا اظہار کیا۔

"دراصل سپاہ کی یہ بغاوت خالص فوجی قسم کی بغاوت ہے جس کو برہمنوں کے مذہبی تعصب نے بھڑکایا ہے۔ آزادی اور انقلاب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں"

تاہم یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کیتھولک کیمپ میں ہندوستان کی بغاوت کو برطانیہ کے خلاف حجّت کے طور پر استعمال کیا گیا۔ کیتھولک ترجمان "سیوِیٹیا کیتھولکا"، نے ۱۲ جون ۱۸۵۷ء کو برطانوی مظالم کی مثال دے کر یہ دلیل پیش کی کہ اگر برطانیہ کے لیے ایک ایسی مملکت کی قومی تحریک کو دبا دینا جس پر وہ تسلط جمائے ہوئے ہیں حق بہ جانب ہو سکتا ہے تو اٹلی کی حکومت کے لیے اپنی ہی مملکت کے عوام کو دبانا یقیناً حق بہ جانب ہوگا۔

جینوا کے ایک اہم عوامی رسالے "ITALIA DEL POPOLO" نے ۸ جولائی ۱۸۵۷ء کو لکھا تھا کہ

"اپنے لیے آزادی اور دوسروں کے لیے غلامی کی برطانوی پالیسی کی بہ دولت گزشتہ صدی میں ان کو امریکی مقبوضات سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اور اب ہمیں دیکھنا ہے کہ ہندوستان میں کیا ہوتا ہے۔ غالباً حصولِ آزادی کے لیے بدقسمت ہندوستانیوں کی اس سب سے بڑی اور پہلی کوشش کو وہ ٹھنڈا کر کے خون میں بجھا دینے کے قابل ہو جائیں گے۔ لیکن ہوا چل چکی اور شعلہ بھڑک اٹھا ہے، اور جو کچھ بھی ہو، ہم جانتے ہیں کہ اس کا یہ انجام نہ ہوگا۔ مگر ہندوستان نکل جانے کے بعد انگلستان کا کیا بنے گا؟۔ اس بدقسمتی سے بچنے کے لیے انگلینڈ یقیناً

ایشیا میں ہر ممکن کوشش کرے گا"۔

اسی اخبار نے ۱۱ راگست کے ایڈیٹوریل میں انگلستان کے کارناموں پر سخت تنقید کرتے ہوئے لکھا۔

"خود انگریز مدبروں نے تسلیم کیا ہے کہ انگلینڈ نے ہندوستان میں انتہائی ظالمانہ طریقے اختیار کیے ہیں...... دغا بازی، دھوکے بازی اور تشدد سے اس نے اپنے دوست اور حلیف بادشاہوں کی ریاستوں پر قبضہ کر لیا، اُس نے قرضے بڑھائے تاکہ معاہدوں کی خلاف ورزی ہو۔ دوسروں کے علاقوں پر غاصبانہ طریقے پر تسلط کے لیے وہ بھائی بھائی، باپ بیٹے اور ماں بیٹے کے درمیان سخت دشمنی پیدا کرنے سے بھی باز نہ رہا۔ مختصر یہ کہ اس نے ڈیڑھ سو ملین (پندرہ کروڑ) انسانوں کی لعنتیں اور بددعائیں اپنے سر لے ہیں۔ جن کی آوازیں ایک دن خدا کے حضور میں پہنچ کر ضرور انتقام کا مطالبہ کریں گی"۔

امریکہ امریکہ کے عوام بھی ہندوستان میں انگریزی مظالم اور بربریت کو حیرت اور افسوس کی نظروں سے دیکھ رہے تھے، تفصیلی طور پر تو کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ اس موضوع پر ایک مشہور و معروف کتاب "The Other side of the Medal" "دی ادر سائڈ آف دی میڈل" امریکہ ہی کے ایک مصنف کی لکھی ہوئی ہے اور اسی کتاب کا ترجمہ اردو میں "انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رُخ" کے نام سے ہوا۔ اس کتاب میں تحریک ۱۸۵۷ء کے انگریزی مظالم کو نہایت دلیری سے بے نقاب کیا گیا ہے چناں چہ اس کے مصنف ایڈورڈ تھامپسن نے کتاب میں لکھا ہے

"ہندوستانی قوم کی دیوانگی ایسی بعید از قیاس نہیں ہے جو سمجھ میں نہ آسکے

کیوں کہ تلو سال تک مصائب اور تکلیفیں اٹھاتے اٹھاتے اس کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا
اور وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکی"۔

یہ کتاب سب سے پہلے ۱۹۳۱ء میں شایع ہوئی چناں چہ اس میں جلیانوالہ باغ کے حادثے کا بھی تذکرہ ہے۔

چین ۱۸۵۶ء میں چین کی دوسری جنگ افیون (OPIUM WAR) شروع ہوئی کیوں کہ انگریزوں نے کنٹون کے پُرامن باشندوں کا قتل عام کر ڈالا اور اُن پر انتہائی مظالم کیے (اکتوبر ۱۸۵۶ء)۔ چین کے باشندوں نے بہادری اور استقلال سے مقابلہ شروع کر دیا تو انگریز افسر جے۔ بورنگ نے ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ کیننگ کو لکھا کہ وہ انگریزی دستے چین روانہ کر دے اور اسی طرح انگلینڈ کو بھی امداد کے لیے لکھا ہندوستان اس وقت کوئی مدد کرنے کے قابل نہ تھا۔ البتہ مارچ میں انگلینڈ سے انگریزی دستے بھیجنا طے ہوا، ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو جب یہ برطانوی امدادی فوجیں مشرقی سمت میں روانہ ہوئیں تو اسی دن ہندوستان میں بغاوت شروع ہوگئی۔ چین جانے والی انگریزی فوجیں فوراً ہندوستان میں طلب کر لی گئیں اور ۳ جون کو کیننگ کا ایلگن کو خط ملا۔ اس نے یہ دستے بجائے چین کے ہندوستان کو کچلنے کے لیے بھیج دیے۔ کیننگ نے اپنے خط میں لکھا تھا

"یہ شعلہ جنگل کی آگ کی طرح بھڑکا اور قابو سے باہر ہو گیا ...... حالات بے حد خطرناک ہیں"۔

اس کے بعد کیننگ نے بار بار مزید دستے بھیجنے اور مدد کرنے کی درخواست کی۔ ایلگن جو ہانگ کانگ میں تھا جب اپنے تمام دستے بھیج چکا اور حواس باختہ کیننگ برابر مدد مانگتا رہا تو وہ خود کلکتے آ گیا
چینی عوام باغیوں سے ہم دردی رکھتے اور فتح کی خبریں سُن کر خوش ہوتے تھے

اُس زمانے میں چین کے اپنے اخبارات نہ تھے تاہم، برسراقتدار طبقے کی پرانی تحریروں سے یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ چینی عوام کا نظریہ کیا تھا۔ ایک چینی سیاست داں نوچنگ نے اپنے مضمون میں لکھا۔

> "کنٹون کے لوگ انگریزوں سے نفرت کرتے ہیں، افواہ ہے کہ برطانیہ کے مقبوضہ ہندوستان نے بغاوت کردی ہے۔ برطانوی فوجوں کو شکست ہوئی اور انھوں نے اپنے قابل کمانڈر کھو دیے"۔

باغیوں کی فتح پر صرف عوام ہی نہیں بلکہ حکمراں بھی خوش تھے اور ان خبروں کو بڑی دلچسپی سے سنتے تھے کہ ہندوستان میں ظالموں کا بیڑہ غرق ہونے والا ہے۔ یہاں تک کہ بعض چینی افسروں نے یہ تجویز بادشاہ کو پیش کی کہ ہندوستان اور چین کا متحدہ محاذ بنانے کے لیے ایک وفد بھیجا جائے اور وہ انقلابی عوام سے رابطہ قایم کرے تاکہ دونوں مل کر انگریزوں کو نکال سکیں۔ بادشاہ سے بار بار درخواست کی گئی کہ وہ اس تجویز کو منظور کرے۔ تفصیلی طور پر معلوم نہیں کہ ایسا کیوں نہیں ہو سکا۔

تحریک آزادی کی ناکامی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں نے یہاں سے فرصت پا کر چین پر پھر چڑھائی کی اور چین کو شکست ہو گئی۔

انگلینڈ

انگلینڈ کے عوام کی اکثریت دو طبقوں میں تقسیم تھی۔ ایک گروہ تو ایسٹ انڈیا کمپنی کا حامی تھا اور دوسرا اس کو ختم کر دینے اور اختیارات براہِ راست ملکہ کے ہاتھ میں رکھنے پر زور دے رہا تھا۔ کئی اخباروں مثلاً "ڈیلی ٹیلی گراف"، "دی اسٹینڈرڈ"۔ اور "دی نان کنفارمسٹ" وغیرہ نے کمپنی پر سخت نکتہ چینی کی۔ ایک معزز انگریز مسمی رچرڈ کوبڈن نے جان برائٹ کو پرائیویٹ خط میں لکھا۔

" بغاوت کے ابتدائی دور کے افسران کے خطوط سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک چھوٹے بڑے افسر کو یہ اختیار ہے کہ جتنے ہندوستانیوں کو چاہے پھانسی دے یا گولی مار دے اور انھوں نے یہ خونی کام اس قدر اوچھے پن سے انجام دیے جیسے وہ جنگلی جانوروں کا شکار کر رہے ہوں "۔

ایک اخبار مارننگ پوسٹ نے لکھا تھا۔

" ہر وہ انگلستانی جو اپنے سینے میں انسان کا دل رکھتا ہے اپنے ملک سے عہد کرتا ہے کہ برطانوی حکومت ہندوستان پر عزوجل قایم رہنا چاہیے۔ اگر کسی اور وجہ سے نہیں تو صرف اس وجہ سے کہ مسلمان اور برہمن شیطانوں کو نیست و نابود کر کے جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے جنھوں نے انگریز عورتوں کے ساتھ وہ سلوک کیا جو زبان پر بھی نہیں لایا جا سکتا " (۵ ر ستمبر ۱۸۵۷ء)

" نیوکیسل کرانیکل نے (۱۷ ر جولائی ۱۰ ر اگست اور ۲۳ ر اکتوبر ۱۸۵۷ء) کیننگ پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا تھا۔

" یہ وقت رحم کھانے کا نہیں ہے، ہمارا انتقام خوف ناک اور خونی ہونا چاہیے تاکہ آیندہ ہماری ہندوستانی رعایا دہلی کے نام ہی سے کانپ اٹھے ....
انھیں اس طرح نیست و نابود کرنا چاہیے جیسے کہ وہ جنگلی درندوں کا ایک گروہ ہوں "۔

تاہم بعض اخبارات ایسے بھی تھے جو حق و انصاف کی آواز بلند کیے بغیر نہ رہ سکے چناں چہ "رینالڈ نیوز پیپر" نے ۵ ر جولائی ۱۸۵۷ء کو کمپنی اور برطانوی حکومت کے ان جرایم کے خلاف سخت الفاظ میں تنقید کی جو ہندوستان میں ہو رہے تھے۔ اس اخبار نے

(۲۶ر جولائی ۱۸۵۷ء) کو لکھا تھا

"باغی سپاہ کی زیادتیوں کی مذمت کرتے وقت ہماری ہم دردیاں، جیساکہ ہمیشہ ہوا ہے، مضبوط کے مقابلے میں کم زور کے ساتھ ہیں، مظلوموں کے ساتھ ہیں جو ظالموں کے خلاف جدو جہد کر رہے ہیں، ستم رسیدہ، لٹے ہوئے بے عزت کیے ہوئے مظلوم ہندوستانیوں کے ساتھ ہیں جو اپنے بے درد، غارت گر، حریص اور مکار آقاؤں سے آزادی حاصل کرنے کی اَن تھک کوشش کر رہے ہیں...

ہماری ہم دردیاں باغیوں کے ساتھ ہیں"

انگلستان کا ایک اور شاعر اور مصنّف ارنسٹ جونس ہندوستانی معاملات میں دل چسپی رکھتا تھا اور اس سلسلے میں اس نے اخبارات میں متعدد مضامین اور نظمیں لکھیں۔ اُس نے انگریزوں کے مظالم پر سخت تنقید کرتے ہوئے باغیوں کی حمایت کی وہ جیل میں بھی (۱۸۵۱ء) ہندوستان کی حمایت میں نظمیں لکھ رہا تھا۔ یکم اگست ۱۸۵۷ء کو ایک مضمون میں اس نے لکھا۔

"اس بغاوت نے ــــ جیساکہ ہم نے ابتدا ہی میں اپنے ناظرین کو یقین دلایا تھا ــ فوجی شورش نہیں بلکہ قومی بغاوت کی شکل اختیار کر لی ہے... یہ عوامی جنگ ہے اور ہندوستان کی کسی بھی جنگ میں آج تک عوام کی اتنی کثیر تعداد نے حصہ نہیں لیا ہے...... ہو سکتا ہے کہ باغی آپس میں جھگڑیں، ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے پست کردار کا مظاہرہ کریں...... لیکن ایک بات کا ہمیں یقین ہے اور وہ یہ کہ خواہ بغاوت دبا دی جائے یا نہ دبائی جائے لیکن یہ بغاوت ہندوستان ہمارے ہاتھ سے نکل جانے کی پیش رو نقیب ہے... ہماری

رائے ہے کہ ہندوستانیوں کی آزادی کو تسلیم کر لیا جائے"۔

اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو قصوروار بتا کر ختم کرنے اور براہ راست حکومت کرنے کے حامیوں کی مخالفت کرتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کیا کہ "یہ تو ایک لٹیرے کو ہٹا کر دوسرے لٹیرے کو اس کی جگہ مقرر کرنا ہوا"۔ ۵ ر ستمبر ۱۸۵۷ء کے "پیوپلس پیپر" (Peoples Papers)" میں اس نے اس بغاوت کو تمام دنیا کی بغاوتوں سے زیادہ شریفانہ منصفانہ اور تاریخ عالم کی ایک ضروری جدوجہد قرار دیا۔ ۱۹ر اکتوبر ۱۸۵۸ء کو اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو قصوروار بتا کر، انگریزوں کے مظالم کے بارے میں لکھا تھا کہ

> "برطانیہ نے ہندوستان میں موت کا اس قدر لرزہ خیز ڈھنگ ایجاد کیا ہے جس کے تصور سے ہی انسانیت کانپ اٹھتی ہے۔ ان "رحم دل" عیسائیوں نے ...... زندہ آدمیوں کو توپ سے باندھنے کا انوکھا اور "مناسب" طریقہ نکالا ان کے توپ سے پرزے پرزے اڑا دیے، خون کی بارش ہوئی اور کانپتے ہوئے انسانی اعضاء اور گوشت کے ٹکڑے تماشائیوں پر گرے۔ کوئی نیرو بھی ان حرکات سے بازی نہیں لے جا سکا"۔

جونس نے صرف مضامین اور نظمیں ہی نہیں لکھیں بلکہ مختلف جلسوں میں تقریریں بھی کیں اور بہ بانگ دہل کہا کہ ہندوستان کو کمپنی کی ماتحتی سے نکال کر حکومت انگلستان کے ہاتھوں میں دے دینا گویا پہلے سے بھی بدتر لوگوں کے ہاتھ میں دینا ہے۔

ایران

تحریک ۱۸۵۷ء میں ایران کا جو حصہ رہا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں بعض انگریز مورخوں کا کہنا ہے کہ بغاوت کو بھڑکانے میں ایران نے

کافی حصّہ لیا اور اُن کو ایک اشتہار بھی ایرانی شہزادے کے خیمے سے ملا تھا جس میں ہندوستانیوں کو عیسائیوں کے نکال دینے پر آمادہ کیا گیا تھا۔ نیز دہلی میں اور خصوصاً جامع مسجد پر جو اشتہارات چسپاں ہوئے ان میں بھی یہ اشارہ موجود تھا کہ شاہ ایران انگریزوں پر چڑھائی کرے گا اور ہندوستان تک عن قریب پہنچے گا۔ بہت سے لوگ اس خیال میں تھے کہ شاہِ ایران ہی انگریزوں کو نکالے گا۔ ایران کی مسجدوں میں بغاوت کی کامیابی کے لیے دعائیں ہوتی تھیں اور باغیوں سے ہم دردی کا اظہار کیا جاتا تھا۔ چناں چہ اس سلسلے میں "محاربۂ عظیم" کی یہ عبارت ملاحظہ کیجیے۔

"جب خبر سرکشی کی ملک طہران میں پہنچی تھی تو عالم اور مؤذن شہر مذکور کے در بابِ صداقت اور راستی اس عزم سرکشی کے مساجد وغیرہ میں بیان کرتے اور دعا مانگتے تھے کہ اللہ تعالیٰ برکت اس مہم سرکشاں کو بخشے" (ص ۸)

مندرجہ بالا اقتباسات اور حالات سے ظاہر ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے تمام دنیا پر گہرے نقوش چھوڑے، آزادی پسندوں کو ایک نیا جذبہ اور جوش و خروش عطا کیا۔

بغاوت کے بعد

۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی ہندوستان کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے، یہ تاریخ کے ایک دَور کا خاتمہ اور دوسرے دَور کا آغاز ہے۔ اس انقلاب انگیز بغاوت نے ملک کی سماجی، سیاسی، ادبی اور عوامی زندگی پر زبردست اثرات چھوڑے ہیں۔ ایک طرف اس انقلاب نے ہندوستان کی باگ ڈور کمپنی کے ہاتھوں سے نکال کر براہِ راست انگلینڈ کو دے دی تو دوسری طرف فرزندانِ وطن کو ناکامی سے دوچار کر کے اُن کی آئندہ جدوجہد آزادی کے لیے تجربات مہیا کیے اور تحریک کو قومی بنیادوں پر چلانے کی صلاحیت پیدا کر دی۔ اس طرح دونوں فریقوں نے اس سے سبق لیا اور اس کو ذہن میں رکھ کر ہی آیندہ عمل کیا۔

وکٹوریہ کا پُرفریب اعلان

یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو وکٹوریہ نے ایک اعلان "میگنا چارٹا" کے نام سے جاری کیا، اس میں باغیوں کی عام معافی کا اعلان کر دیا گیا، "وفادار" ریاستوں کو خوب

چمکار اگیا اور اعلان ہوا کہ سرکاری ملازمتوں میں رنگ و نسل کا لحاظ نہ رکھا جائے گا مگر آنے والے واقعات نے بتایا کہ یہ اعلان ایک فریب تھا، عمل اس اعلان کے بالکل برعکس کیا گیا، باغیوں کی معافی کا اعلان تھا مگر اس کے بعد بھی ان کو برابر گرفتار کیا جاتا رہا (مثلاً تانتیا ٹوپی، مولانا فضل حق خیر آبادی وغیرہ) عہدوں کو بغیر نسل و رنگ بانٹنے کا اعلان تھا مگر ہوا یہ کہ "کالوں" سے تمام ذمہ دارانہ اور فوجی عہدے چھین لیے گئے اور ان سے انتہائی ذلیل برتاؤ روا رکھا گیا، حتیٰ کہ انگریزوں کے سب سے بڑے "وفادار" سرسید کو بھی ایک بار اس امتیازی برتاؤ پر احتجاج کرنا پڑا۔

فوج میں کاٹ چھانٹ

ہندوستانی فوج انگریزوں کے حق میں انتہائی خطرناک ثابت ہوئی تھی۔ لہذا ۵۸ء میں "پیل کمیشن" نے دیسی فوج کو کم کرنے کی تجویز پیش کی تو تقریباً دو لاکھ آدمی جس میں ملٹری پولس کے آدمی بھی شامل تھے کم کر دیے گئے۔ ان کے بجائے انگریز دستوں کی تعداد بڑھائی گئی۔ انگریز سپاہی کی تنخواہ ہندوستانی سے پانچ گنا زیادہ ہوتی تھی اس طرح اس غریب اور بے کس ملک پر سخت اقتصادی دباؤ پڑنے لگا، فوج کے اونچے عہدے صرف یورپین لوگوں کو دیے جانے لگے، ہندوستانی اب صرف ایک معمولی کلرک کا عہدہ پا سکتے تھے اور وہ بھی غیر فوجی دفتروں میں۔ توپ خانہ مکمل طور پر یورپین افسروں کو دیا گیا، خزانوں، میگزینوں اور اہم فوجی مقامات پر کافی تعداد میں گوروں کا پہرہ لگا دیا گیا۔ انگریز مصنف گنس نے لکھا ہے کہ

"پہلے ہم نے دیسی فوج کی امداد پر بھروسا کیا لیکن اب سے ہمیں اپنے ہم وطنوں

کی سنگینوں پر ہی زیادہ بھروسا کرنا چاہیے" (۴۳۶)

عام ہندوستانی جو فوجوں میں بھرتی کیے گئے وہ زیادہ تر سکھ اور گورکھے تھے کیوں کہ ان کی "وفاداری" کا کافی ثبوت مل چکا تھا۔

سماجی اور اقتصادی اثرات ملک کی سماجی زندگی انقلاب ۱۸۵۷ء سے ایک نئی ڈگر پر آگئی۔ انگریزی تعلیم اگرچہ انقلاب سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھی مگر ۱۸۵۷ء کے بعد اس کے اثرات تیزی سے نمایاں ہونے لگے مغربی تہذیب و تمدن نے اخلاقی طور پر ملک کو تباہی اور بربادی کی راہ دکھانا شروع کر دی جس کے اثرات آج بھی بڑی حد تک نمایاں ہیں۔ مگر انگریزی تعلیم نے ان نقصانات کے ساتھ ہی فائدہ بھی پہنچایا یعنی ہندوستان کو ایک ایسی زبان عطا کی جو ملک کے مختلف حصّوں میں ترجمانی کے کام آئی اور فرزندانِ وطن کو ایک دوسرے کے قریب لاکر کھڑا کر دیا۔ انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں نے غیر ممالک میں جاکر اُن کے تہذیب و تمدّن کو دیکھا، اُن کی آزادانہ معاشرتی زندگی کا جائزہ لیا اور آزادی کی قدر و قیمت محسوس کی۔ انگریزوں نے ملکی ترقی اور فارغ البالی کی تمام راہیں بند کر دیں۔ ذات پات کے جھگڑوں کو ہوا دی، مذہبی منافرت کو بھڑکایا، دوسری طرف اپنی تجارت کو اس ملک میں وسیع کر دیا جس سے یہاں کی مالی حالت کو سخت صدمہ پہنچا جیسا کہ ۱۸۶۱ء سے لے کر ۱۹۰۱ء تک مسلسل اور پے در پے قحطوں سے اندازہ ہوتا ہے۔ ان حالات میں بے ایمانی دغابازی، رشوت خوری اور چور بازاری وغیرہ پھیل جانا یقینی تھا چناں چہ وہ تلو سال سے، متواتر اس بدنصیب ملک میں اِس قدر رچ چکی ہیں کہ اب مٹائے نہیں مٹتیں۔

ادب اور لٹریچر انقلاب ۱۸۵۷ء نے ملک کی مختلف زبانوں کے ادب پر بھی

گہرے اثرات چھوڑے۔ ہر عہد کا ادب اس کے سیاسی سماجی اور تہذیبی رجحانات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ چناں چہ اردو کا ادبی سرمایہ بھی ہماری زوال آمادہ تاریخ کا منہ بولتا مرقع ہے تحریک کا اثر اگرچہ اردو شاعری نے مثبت انداز میں قبول کیا لیکن اس دور کی خارجی پابندیوں نے شاعروں کے لب دبے ہیں ماورائیت، شعر کی داخلی فضا میں گھٹن، زمانہ ماضی کی ماتم سرائی اور حال سے مایوسی کے ساتھ مستقبل سے ناامیدی پیدا کر دی ہے۔ ۱۸۵۷ء میں دہلی، لکھنؤ، کراچی، کلکتہ، بمبئی وغیرہ سے بے شمار اردو اخبارات نکلتے تھے، جن کی تفصیل گارساں دتاسی نے دی ہے[1]۔ اردو کے اکثر شاعر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی زد میں آئے، بعض نے عملی حصہ لیا اور انگریزوں کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ اکثر مشہور شعراء اُن دنوں دہلی میں موجود تھے مثلاً آرزو، صہبائی، شیفتہ، غالب وغیرہ۔ نوعمروں میں حالی، داغ، ثاقب، سالک، مجروح وغیرہ تھے۔ ان میں اکثر نے انقلاب پر نظمیں کہیں، دہلی کا درد انگیز ماتم کیا مثلاً غالب کے یہ شعر

بس کہ فعال ما یرید ہے آج — ہر سلح شور انگلستاں کا

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

تحریک کے بعد دلی جذبات دار و گیر کے خوف سے یاس انگیز اشاریت میں تبدیل ہو گئے تھے۔ ایسی غزلیں اُس دور کے ہر شاعر کے کلام میں مل سکتی ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے یہاں بھی ایسے اشعار

---

[1] خطبات گارساں (طبع انجمن)، "آفتاب ہند بنارس": مقالہ نثار فاروقی (اردو ادب، مارچ ۱۹۵۵ء)۔
ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں از محمد عتیق

کی کمی نہیں، وہ نظم بھی انھیں کی کہی جاتی ہے جس کا یہ مشہور شعر ہے:-

بہ رعایا ہند تبہ ہوئی، کہوں کیا جو ان پہ جفا ہوئی

جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے

منیر شکوہ آبادی اور نفیس بدایونی بھی آزادی پسند شعراء کی صف میں آتے ہیں، ظہیر دہلوی بھی گردشِ انقلاب کی زد میں آئے اور اپنی کہانی "داستان غدر" کی صورت میں بیان کی۔[۱] سرسید نے "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر انگریزی بربریت کے آڑے آنے کی ناکام کوشش کی۔ حالی نے بھی خود یہ ہنگامہ دیکھا تھا ان کا مسدس اس کی صدائے بازگشت ہے، دہلی کا مرثیہ بھی انھوں نے لکھا ہے۔

تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ

نہ سُنا جائے گا مجھ سے یہ فسانہ ہرگز

بعد کی سیاسی شاعری میں شبلی، چکبست، اقبال، اکبر الہ آبادی اور جوش کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اردو کی طرح ہندی لٹریچر بھی ۱۸۵۷ء سے متاثر ہوا۔ گذشتہ دور میں چوں کہ ہندی زیادہ ترقی یافتہ اور عوامی زبان نہ تھی اس لیے یہ اثرات زیادہ نمایاں نہیں تاہم ہندی کے لکھنے والوں میں بھارتیندو، پرتاپ نرائن مصرا، بدری نرائن چودھری قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے ملک کی بدحالی پر ڈرامے اور کویتائیں لکھیں۔ ان کویتاؤں میں تحریک ۵۷ء کا تذکرہ دورِ غلامی کے اثرات لیے ہوئے ملتا ہے البتہ ایک کوی رسراجہ بہاری سنگھ نے ۱۸۵۷ء کے انگریزی مظالم کا پردہ چاک کیا ہے اسی طرح چند دیگر تصانیف مثلاً "بھارت بھارتی" وغیرہ میں اور سمترانندن پنت، سبھدرا کماری چوہان وغیرہ کی کویتاؤں میں، راج پل

[۱] ۱۸۵۷ء اور اردو شعراء" مضمون گوپی چند نارنگ "نگار" ۔ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۷ء)

یش پال ناگ ارجن اور رینو کے ناولوں میں انقلاب ۱۸۵۷ء کی گونج سنائی دیتی ہے مثلاً سبھدرا چوہان کی ایک کویتا کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا جا سکتا ہے۔

"بادشاہوں کی اولادیں باغی ہو گئیں، تخت کانپ اٹھے ——— بوڑھا ہندوستان پھر جوان جذبات سے بھرپور تھا ——— عوام نے کھوئی ہوئی آزادی کی قدر پھر پہچانی ——— ہر شخص نے انگریزوں کو نکال دینے کا عہد کر لیا ———
۱۸۵۷ء میں پرانی تلوار ایک بار پھر بے نیام ہو گئی ——— ......" [۱]

ناول نگار ورنداون لال ورما نے رانی جھانسی ناول لکھا جو کافی مقبول ہوا ہے۔ بسلسلہ ۱۹۲۹ء میں پرنسپل منورنجن پرشاد کی کنور سنگھ پر ایک نظم پٹنہ کے اخبار یوک" (VUVAK) میں شایع ہوئی جس کو حکومت کی طرف سے فوراً ضبط کر لیا گیا اور اس پر پابندی لگی۔ منورنجن پرشاد کی چند اور نظمیں (کویتائیں) بھی بہت مقبول ہوئیں۔ حال ہی میں اس موضوع پر ہندی میں بھی بے شمار کتابیں، مضامین اور نظمیں لکھی گئی ہیں۔

لڑاؤ اور حکومت کرو

انگریزوں نے ایک اہم ترین سبق یہ سیکھا تھا کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں کا اتحاد اُن کے لیے خطرناک ہے لہٰذا اگر ان کو یہاں حکومت کرنا ہے تو مختلف مذہبوں اور فرقوں کو ذات پات، دین دھرم اور فرقہ پرستی کے دوسرے جذبات کو پوری قوت سے ہوا دے کر ابھارنا پڑے گا اور ہر ممکن طریقے سے یہ کوشش کرنی پڑے گی کہ غریب، جاہل اور بے کس ہندوستانی عوام اپنی غلامی کا احساس کرنے کی بجائے آپس ہی میں

---

[۱] "سمپوزیم" / ۲۳۱

دست و گریباں رہیں۔ بغاوت میں چوں کہ مسلمانوں نے زیادہ نمایاں حصّہ لیا تھا اور اکثر علاقوں میں انقلابی جد وجہد کی باگ ڈور انھی نے سنبھالی تھی اس لیے "مہذب" انگریز ہندوستان کے مسلمانوں کو کچّا چبا جانا بھی کم سمجھتا تھا۔ اکثر انگریز مؤرخوں مثلاً چارلس بال، النس، کیو براؤن وغیرہ نے ان جذبات کا اظہار کیا ہے۔ ریکس نے لکھا۔

"باغی کا دوسرا نام "مسلمان" تھا" ؎۱

چناں چہ ملک کے مختلف حصوں میں دشمنانِ وطن کا سب سے زیادہ عتاب "باغی مسلمان" پر تھا۔ اُن پر ہر طرح سے جو مصیبتیں توڑی گئیں اُن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ امن ہو جانے کے بعد دہلی میں ہندوؤں کو آباد ہونے کی اجازت دی گئی مگر مسلمانوں کو کئی سال تک اجازت نہیں ملی۔

سیاسی طور پر دونوں بڑے فرقوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کی ہر ممکن تدبیر عمل میں لائی گئی، زر خرید پٹھو چھوڑے گئے جو اپنے ہم مذہبوں کو انگریز سے تو وفاداری اور غلامانہ عجز و نیاز کا درس دیتے مگر دوسرے مذہب کے ہم وطن بھائیوں سے نفرت، حقارت اور علیحدگی برتنے کا پرچار کرتے تھے، سرکاری عہدوں میں مذہبی تفریق روا رکھی گئی، ہندوؤں کو اپنی خصوصی "نظرِ کرم" کا یقین دلایا گیا اور تقریباً چالیس سال تک سرپرستی کے بعد مسلمانوں پر "دستِ شفقت" دراز ہوا۔ اس طرزِ عمل کا انکشاف ڈبلو، ڈبلو ہنٹر نے بھی اپنی کتاب (ہمارے ہندوستانی مسلمان) میں کیا ہے۔

---

1. REVOLT OF N.W.P.—175

ترک

حال ہی میں شایع شدہ انگریزی کتاب "ہندوستان کی سیاست وحکومت" کے مصنف آر۔جی۔گپتا لکھتے ہیں۔

"برطانوی حکم رانوں نے یہ دیکھ کر کہ مسلمان (بغاوت ۱۸۵۷ء میں) مقابلے میں سب سے آگے تھے، لڑاؤ اور حکومت کرو کا طریقہ اختیار کیا، انھوں نے تقریباً چالیس سال تک ہندوؤں کی حمایت اور مسلمانوں کی مخالفت کی اور جب ہندو باغی ہونے لگے تو مسلمانوں کو اپنی حمایت میں لے کر ہندوؤں کے مقابل کر دیا" (صفحہ ۸)

اس طرح دونوں میں اختلاف اور علیحدگی کی بنیاد رکھ دی گئی۔ دوسری طرف انگریز کے کاسہ لیس پٹھو، مسلمانوں کو مذہب سے برگشتہ کرنے اور ہندوؤں سے لڑا کر حکومت کا احسان مند بنا دینے کی "عظیم خدمات" انجام دے رہے تھے، لیکن یہ داستان اس قدر طویل ہے کہ ہمارے دامن میں نہ تو اتنی گنجائش ہے اور نہ یہ ہمارا موضوع ہے۔

دارالعلوم دیوبند

انگریزوں نے اُن انقلابی جذبات اور احساسات کو یک سر فنا کرنے کا تہیہ کر لیا تھا جن کی بہ دولت ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی اس قدر مجاہدانہ انداز سے دو سال تک چلی تھی اس کے لیے ضروری تھا کہ کم از کم مسلمانوں کو علماء سے برگشتہ اور متنفر کیا جائے، اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم ایسی ہو، جو مذہبی جذبات فنا کر دے اور ان کو اگر مذہب چھوڑنے پر آمادہ نہ کر سکے تو اس سے بے گانہ و بے بہرہ ضرور بنا دے۔ چناں چہ ایک طرف پوری قوت سے ان تمام تجویزوں اور پلانوں پر عمل شروع ہو گیا اور دوسری طرف مجاہد صفت علماء نے تحریکِ آزادی میں ناکامی کے بعد دل شکستہ ہونے کے بجائے بگڑتے ہوئے حالات کا

مقابلہ کرنے اور انقلابی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے نیا میدان چن لیا یعنی دس سال بعد ۱۸۶۷ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھ دی گئی۔ دارالعلوم کے بانیوں میں حضرت مولانا محمد قاسم رح کا نام سرفہرست آتا ہے۔ اُن کے ساتھی علمار میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رح اور مولانا فضل الرحمٰن وغیرہ شامل ہیں)۔

سیاسی حالات

جنگ پلاسی سے لے کر ۱۸۵۷ء کی بغاوت تک برطانوی استبداد نے پورے ملک کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا تھا جس کی وجہ سے ملک میں سیاسی یک جہتی اور باہمی اشتراک کا جذبہ پیدا ہو گیا، تاربرقی اور ریلوے وغیرہ کی موجودگی نے اس دشوار کام کو اور بھی آسان کر دیا، ملک میں پہلی بار اس طرح اتحاد ہوا تھا۔ چناں چہ عام بیداری پیدا ہونے لگی، مسلمان علمار اگر ادھر عوام کے مذہبی رجحانات کو قایم رکھنے کی کوشش میں تھے تو اُدھر ہندو رہنماؤں میں سوامی دویکانند اور سوامی رام کرشن جیسے لوگ مذہبی جذبات کے ساتھ ہی ساتھ حب الوطنی کے احساسات کو بیدار کر رہے تھے۔ ملک کی اقتصادی حالت خراب تر ہونے لگی، صنعت و حرفت کی تباہی نے ملک میں بے انتہا بے چینی پیدا کر دی، اور پے در پے قحط پڑنے لگے، تعلیم یافتہ طبقے میں بے روزگاری بڑھنے لگی۔ کمپنی کی جانشین اب براہ راست ملکۂ انگلستان وکٹوریہ تھی جس کے کارندوں کی لوٹ کھسوٹ اور تباہ کن پالیسی کا سب سے زیادہ ملک کے عوام، کاشت کار اور کاریگر شکار تھے۔ ملکی ترقی اور خوش حالی کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا گیا چناں چہ جان برائٹ نے اس پالیسی کو "غیر ذمہ دارانہ" قرار دیا۔ ایک اور انگریز فاکٹ (Fawcett) کا قول ہے۔

"برطانوی پارلیمنٹ ہندوستانی عوام کی خوش حالی اور بھلائی کے مسئلوں کی
بہ نسبت کسی تصویر کی خریداری کے جھگڑے میں زیادہ دل چسپی لیتی تھی" [1]

بغاوت کے بعد انگریزوں کا تمام عمل ہندوستانیوں پر عدم اعتماد بلکہ دشمنی پر مبنی تھا۔

ان تمام حالات نے انقلابی جذبات کو پھر سے ہوا دینا شروع کر دی اور ملک کے مختلف زبانوں میں نکلنے والے اخبارات نے جن کی تعداد ۱۸۷۵ء تک چار سو اٹھتر ۴۷۸ ہو گئی تھی، حب الوطنی کے جذبات ابھارنے میں کافی حصہ لیا۔ ۱۸۷۴ء میں ایک اخبار "ہندو پیٹریوٹ" ("HINDU PATRIOT") نے لکھا تھا کہ "ہندوستان کے لیے ہوم رول ہمارا نعرہ ہونا چاہیے"۔ اس کے علاوہ ۱۸۶۰ء سے ۱۸۸۵ء تک جرمنی، اٹلی، رومانیہ وغیرہ نے آزادی حاصل کی۔ فرانس میں تیسری جمہوریت قائم ہوئی، اسپین میں آئینی شہنشاہیت کا قیام عمل میں آیا، روس، امریکہ اور انگلینڈ میں آئینی و جمہوری اصلاحات جاری ہوئیں۔ ان تمام تبدیلیوں نے ملک کے تعلیم یافتہ طبقے پر بڑا اثر ڈالا، قومی احساسات بیدار کیے اور ملک میں ایک مضبوط و منظم سیاسی تحریک کی ضرورت کا خیال پختہ ہو گیا، چناں چہ مختلف سیاسی جماعتیں وجود میں آئیں۔ ان میں "انڈین ایسوسی ایشن" قابلِ ذکر ہے جو جولائی ۱۸۷۶ء میں قایم ہوئی اور جس کا مقصد ہندوستان کو متحد کر کے ایک جماعت بنانا تھا۔

کانگریس کا قیام

قدرت کی کس قدر ستم ظریفی ہے کہ آنے والے زمانے میں آزادیٔ وطن کی علم بردار جماعت کانگریس کا قیام ایک

---

[1] گپتا: "انڈین پالٹکس اینڈ گورنمنٹ"/ ۲۰

انگریز مسٹر اے. او. ہیوم کے ہاتھوں ۱۸۸۵ء میں ہوا۔ اگرچہ کانگریس کا مقصد اس وقت حکومت کی مخالفت نہیں بلکہ ہندوستان کو ایک قوم بنانا اور ان کی ضروریات حکومت تک پہنچانا تھا مگر دوراندیش انگریزوں کو اُن کے مجرم ضمیر نے خطرے سے آگاہ کر دیا، چناں چہ انھوں نے اور اُن کے کاسہ لیسوں نے کانگریس کی مخالفت شروع کر دی۔ انھیں ڈر تھا کہ کہیں ہندوستان ایک قوم نہ بن جائے۔ لہٰذا "وفادار" طبقے سے آوازیں آنے لگیں کہ "ہندو مسلمان علیحدہ قوم ہیں"۔ یہ موجودہ دو قومی نظریے کی ابتدا تھی، مگر دوسری طرف علماء کرام کے انقلابی گروہ نے کانگریس کی حمایت کی، اگرچہ وہ آزادی پسندانہ نظریات میں اُس سے کہیں آگے تھے۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رح نے مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت کا مشورہ دیا اور اعلان کیا کہ ہندوستان "دارالحرب"[1] ہے۔

چنگاریاں سُلگ اُٹھیں

ملک میں سیاسی بیداری کی ابتدا ہوتے ہی دبی ہوئی انقلابی چنگاریاں پھر سلگنے لگیں۔ بمبئی میں بال گنگادھر تلک کا اخبار "کیسری" حب الوطنی کے جذبات جگا رہا تھا چناں چہ ۱۸۹۷ء میں دو انگریز افسر قتل کر دیے گئے۔ بنگال کے انقلابی سب سے زیادہ سرگرم تھے اور خفیہ کوششوں میں مصروف تھے کہ اس باغی گروہ کا زور توڑنے کے لیے وائسرائے کرزن نے تقسیم بنگال کا اعلان کیا (۱۹۰۵ء) جس سے باغیانہ تحریک اور بھی تیز ہو گئی، بنگالی عوام سر بہ کف ہو کر نکل آئے، بہار میں ۱۹۰۸ء میں مظفر پور کا انگریز جج قتل کر دیا گیا، آسام میں دہشت اور بے چینی پھیلی، سی، پی کے گرم جوش نوجوانوں نے کانگریس کا اجلاس

---

[1] وہ ملک جہاں مسلمان غلام ہوں اور اُن پر آزادی کے لیے جہاد فرض ہو۔

ناگ پور میں نہ ہونے دیا (کیوں کہ اس وقت اس کی پالیسی نرم تھی) مدراس میں شورش پھیل گئی، پنجاب کے فرزندوں نے آزادیٔ وطن کی جدوجہد شروع کر دی اور لالہ لاجپت رائے اجیت سنگھ اور بھائی پرمانند وغیرہ گرفتار ہوئے۔ دہلی میں لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکا گیا۔ یوپی میں خفیہ انقلابی سازشیں پکڑی گئیں۔

تحریک ۱۸۵۷ء کی جوبلی

ہندوستان کے کچھ انقلابیوں نے جن میں ونائک دامودر ساورکر بھی شامل تھے، لندن میں تحریک ۵۷ء کی پچاس سالہ سال گرہ منائی۔ ملک میں مختلف صوبوں میں باغیانہ سرگرمیاں جاری تھیں اور ہندوستان کی انگریزی حکومت انتہائی دہشت زدہ تھی۔ بہ قول گورنر پنجاب ــــ

"ہر جگہ لوگ کسی تبدیلی کے متوقع تھے۔ اُن کے دماغوں میں نئی ہوا بھری ہوئی تھی اور وہ منتظر تھے کہ دیکھیں اس تحریک کا کیا نتیجہ نکلتا ہے" [۱]

ایک اور انگریز جے. کے. ہارڈی نے، جو اس وقت ہندوستان میں تھا، اپنی کتاب "انڈیا" میں ان حالات کو بیان کیا ہے کہ اپریل، مئی ۱۹۰۷ء میں پلیگ پھیلا ہوا تھا اور اسی زمانے میں دہلی کے عوام میونسپلٹی کے نئے ٹیکسوں کے خلاف احتجاجی جلسے کر رہے تھے۔ وہ لکھتا ہے۔

"یہ اپریل کا مہینہ تھا اور چوں کہ ۱۰ مئی کو بغاوت کی پچاسویں سال گرہ تھی لہٰذا متعصب اخباری نامہ نگاروں اور بعض فوجی افسروں نے اس ایجی ٹیشن

---

[۱] رولٹ رپورٹ / ۱۳ و "علمائے حق" / ۱۱۸

کو بغاوت کی جوبلی سے ملا دیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ دوبارہ بغاوت ہونے والی ہے" ۔ (۵۸)

چناں چہ دس مئی ۱۹۰۷ء کو کیا ہوا؟ یہ بھی ہارڈی سے سنیے ۔

"ملٹری کے دستے دہلی کے دروازوں کی مضبوطی سے حفاظت کر رہے تھے اور کسی ہندوستانی کو اندھیرا ہونے کے بعد اندر یا باہر جانے کی اجازت نہ تھی ۔ توپیں اور بارود خاص مقامات پر شہر کا نشانہ باندھ کر رکھ دیے گئے جو کہ ایک لمحے کے نوٹس پر استعمال ہو سکتے تھے"۔

دہشت زدہ انگریز

اس زمانے میں ٹرام کی پٹریاں ڈالی جا رہی تھیں ۔ ۱۰ رمئی ۱۹۰۷ء کو ٹھیکے دار اور مزدوروں کے درمیان کچھ جھگڑا ہو گیا ۔ یہ لڑائی دیکھ کر ایک نیم شرابی بدحواس انگریز بھاگا ہوا یورپین کلب پہنچا اور اطلاع دی کہ بغاوت ہو گئی ، انگریز قتل ہوئے اور سڑکیں انگریزی خون سے شرابور ہیں ۔ یہ اطلاع سنتے ہی کلب سے چھاؤنی تک خطرے کی گھنٹی بج گئی ، بارہ گھنٹے تک انگریز آبادی پر دہشت اور خوف وہراس مسلط رہا اور انھوں نے اپنی حفاظت کے سامان شروع کر دیے ۔

ایسا ہی لطیفہ اٹاوہ کے ایک مجسٹریٹ نے بیان کیا جہاں انگریزوں کو قتل کرنے کی ایک سازش کے متعلق اطلاع پا کر خوف چھا گیا تھا مگر یہ اطلاع غلط نکلی[۵]۔ اس سے قبل بھی اس قسم کی افواہیں انگریزوں کو خوف زدہ کرتی رہی تھیں مثلاً ۱۸۶۱ء میں

---

[۵] جے ۔ کے ۔ ہارڈی / ۶۰

میرٹھ کے قریب پکے ہوئے چاول تقسیم ہونے کی اطلاع تھی اور مشہور تھا کہ لوگ خشکہ ایک سے دوسری جگہ پہنچا رہے ہیں یہ بھی سنا گیا تھا کہ ایک نجومی نے تین سال کے اندر انگریزوں کے غارت ہونے کی پیشین گوئی کی ہے۔ لطف یہ کہ یہ واقعہ بھی مئی کے مہینے میں پیش آیا چناں چہ یہ اطلاع بمبئی کے "کشف الاخبار" مورخہ ۳۱ رمئی ۱۸۶۱ء میں شایع ہوئی تھی۔ غرض یہ کہ انگریزی دماغ تحریک کے اثرات سے ہمیشہ خوف زدہ رہے۔ ایڈورڈ تھامپسن لکھتا ہے۔

"غدر کا نام آتے ہی یورپین اقوام کے تصور میں بے شمار وحشی انسانوں کے بھوت بے پناہ عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے کے لیے ہاتھ بڑھا بڑھا کر سامنے آجاتے ہیں" ؎

آزادی کی تحریکیں

تحریک ۱۸۵۷ء کے اس غدر کھیانک انجام کے بعد بھی ملک کے انقلابی چین سے نہ بیٹھے اور ایک طبقے نے تشدد آمیز طریقے بھی اختیار کیے چناں چہ رولٹ کمیٹی کی سرکاری رپورٹ بتاتی ہے کہ متعدد جگہوں پر بغاوت کے لیے ہتھیار اور آتش گیر مادے بنائے گئے، باغیانہ لٹریچر تقسیم کیا گیا، فوجیوں کو ملازمت چھوڑنے اور بغاوت کرنے کی ترغیب دی گئی۔ لاہور کے ایک شخص ہردیال (ایم۔اے) نے بیرونی ممالک میں اپنی سرگرمیاں شروع کیں، امریکہ میں "غدر پارٹی" قایم کی، "غدر" کے نام سے اخبار نکالا جو کثیر تعداد میں تقسیم ہوا اس اخبار میں خفیہ جماعتیں بنانے کی تلقین کی جاتی تھی، اشتعال انگیز نظموں کا مجموعہ "غدر"

؎ "انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ" ص/۸۰

کے نام سے شایع کیا، رام چند، برکت اللہ وغیرہ اس کے ساتھی تھے اور یہ پارٹی امریکہ، فلپائن، ملایا، ہانگ کانگ، سنگھاپور، چین، مصر، ترکی اور افغانستان وغیرہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اخبار میں اس قسم کے باغیانہ مضامین شایع ہوتے تھے مثلاً:

"بہادرو! جلدی کرو، غدر برپا کرکے ان تمام ٹیکسوں کو بند کردو جو ہم سے وصول کیے جاتے ہیں۔ ضرورت ہے ایسے بہادروں کی جو ہندوستان میں غدر پھیلائیں..... اٹھو، آنکھیں کھولو، غدر کے لیے روپوں کی تھیلیاں بھرو، ہندوستان پہنچ جاؤ اور آزادی کے لیے جانیں قربان کردو" [1]

ایک اور اخبار "جہانِ اسلام" قسطنطنیہ سے جاری کیا گیا جس کا کچھ حصہ ہر دیال بھی لکھتا تھا۔ ایک اشاعت میں انور پاشا کی تقریر درج کی گئی تھی کہ:

"ہندوستان میں غدر برپا کیا جائے، انگریزی اسلحہ خانوں کو برباد کرکے لوٹ لیا جائے اور انگریزوں کا قتل عام ہو...... اے ہندو مسلمانو تمھیں دونوں انگریزی فوجوں کے سپاہی ہو، تم آپس میں بھائی ہو اور کمینے انگریز تمھارے دشمن، تم جہاد کا اعلان کردو، انگریزوں کو قتل کرو، اور اپنے ملک کو نجات دلوادو"۔

دہلی میں جب ہارڈنگ پر بم پھینکا گیا (۱۹۱۲ء) تو پتا چلا کہ وہاں سازش پورے عروج پر تھی انقلابیوں نے ایک اشتہار بھی شایع کیا جس میں لکھا تھا۔

"قرآن، گیتا اور وید سب ہمیں ہدایت کرتے ہیں کہ ہم مادرِ وطن کے تمام

---

[1] رولٹ رپورٹ/ ۲۲،

دشمنوں کو مار ڈالیں"

اسی طرح یو پی میں بھی باغیانہ سازش پکڑی گئی اور بنارس کا مشہور مقدمہ چلا۔ مدراس میں چندر پال سازش کا سرغنہ تھا۔ برما میں بھی سازش کے دو مقدمے (بہ مقام مانڈلے) چلے جن میں انکشاف ہوا کہ ۱۹۱۲ء میں یہ جد و جہد شروع ہوئی اور اس کا مقصد ۱۸۵۷ء جیسی بغاوت کے ذریعے ملک کو آزاد کرانا تھا۔[1]

حکومت نے اپنی تمام کوششیں مختلف فرقوں میں علیحدگی پیدا کرنے میں صرف کر دیں۔ فرقہ وارانہ تنظیموں کا قیام لارڈ منٹو کے اشارۂ چشم پر عمل میں آگیا، جداگانہ انتخاب کا اصول رائج کر دیا گیا اور ۱۹۰۶ء میں قومی تحریک کے متبادل جوابی تحریکیں شروع کر دی گئیں۔ انگلستان کے ایک آزاد خیال انگریز لائنل کرٹس نے، جو اس زمانے میں ہندوستان آیا ہوا تھا، کہا تھا کہ

"جداگانہ انتخاب انگریزی حکومت کی سب سے بڑی غلطی تھی جو اس سے ہندوستان میں سرزد ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہندوستان میں جداگانہ انتخاب کا اصول مستقل طور پر قایم ہو گیا تو ہم یہاں ذات پات کا ایک نیا طریقہ جاری کرنے کے موجب ہوں گے۔ اور یہ وہ طریقہ ہوگا جو ہندوستان کو سال بہ سال گھن کی طرح کھاتا رہے۔ جب تک یہ طریقہ جاری رہے گا ہندوستان کبھی قومیت کے لحاظ سے متحد نہ ہو سکے گا اور جتنے عرصے یہ اصول قایم رہے گا اتنی ہی زیادہ مشکل اس کے ختم کرنے میں پیش آئے گی نتیجہ یہ ہوگا کہ آخر کار اندرونی خانہ جنگی اس کا خاتمہ کرے گی"۔[2]

اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ پیشن گوئی کس طرح حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ مگر انگریز قوم کے

---

[1] "تاریخ آزاد ہند فوج" / ۳۰ [2] "روح روشن مستقبل" / ۹۴

دماغ پر ۱۸۵۷ء کا جو بھوت مسلط تھا وہ کبھی نہ نکل سکا اور آزادی کی آیندہ تحریکیں بھی اس انقلابی جنگ سے متاثر رہیں۔ ۱۹۱۲ء میں حضرت مولانا آزادؒ کے اخبار "الہلال" اور "البلاغ" نے ملک میں بیداری کا صور پھونکا، حکومت نے اگرچہ یہ آواز فوراً ہی دبادی مگر اس کی گونج آج تک سنائی دے رہی ہے۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں ایک اندوہ ناک حادثہ پیش آیا یعنی جلیانوالہ باغ کی زمین شہیدانِ وطن کے خون سے لالہ زار بن گئی، درندگی اور بہیمیت کی انتہا کردی گئی۔ مگر انقلاب کے متوالوں کا یہ خون فوراً ہی رنگ لایا اور اسی واقعے نے تمام ملک کو متحد کرکے آزادیٔ وطن کے لیے سینہ سپر کردیا۔ ایڈورڈ تھامپسن کہتا ہے۔

> "غدر سے مغلوب شدہ دماغ کی پراگندگی کی تیسری مثال اپریل ۱۹۱۹ء کا حادثہ ہے..... جو کارروائی ہم نے جلیانوالہ باغ میں کی یا اس کے بعد جو شور و ہنگامہ انگریزوں نے برپا کیا اس کی تہہ میں وہی جذبۂ انتقام نظر آتا ہے اور ہمارے دماغوں پر وہی کیفیت طاری ہے جو حادثۂ کان پور کی خبر سُن کر یا باغیوں کے ہاتھوں انگریز مستورات کی بے حرمتی کی بے بنیاد اطلاعات پہنچنے کے بعد ہوئی تھی۔ یہ خبر بجلی کی طرح ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچی۔ یہاں تک کہ تیس کروڑ ہندوستانیوں کو تڑپا کر ایک متحدہ محاذ پر کھڑا کردیا" لے

اس سے قبل پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے ملک گیر بغاوت کی خفیہ اسکیم بنائی اور ٹرکی وغیرہ سے امداد کے لیے بات کرلی گئی تھی، یہاں تک کہ ایک آزاد متوازی حکومت بھی کابل میں راجہ مہندر پرتاپ اور مولانا عبیداللہ کی قیادت میں قایم ہوچکی

لے تصویر کا دوسرا رخ

تھی، کامیابی اس لیے نہ ہو سکی کہ حکومت پر یہ اسکیم قبل از وقت افشا ہو گئی لیکن جب جلیانوالہ باغ

کے واقعے پر کانگریس اور خلافت کمیٹی نے حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مہاتما گاندھی کی تجویز

"نان کوآپریشن" (ترک موالات) کی تحریک شروع کر دی، جس میں ہزار ہا آدمی جیل گئے، کھدر

کا استعمال شروع ہوا۔ ولایتی چیزیں جلا دی گئیں تو ملک میں ۵۷ء جیسا اتحاد پھر نظر آنے لگا

اور حکومت پر پھر بدحواسی طاری ہو گئی۔ کچھ عرصے بعد ۱۹۲۲ء میں چورا چوری کے واقعے سے گھبرا کر

مہاتما گاندھی نے تحریک بند کرنے کا اچانک اعلان کر دیا جب کہ وہ پورے عروج پر تھی۔ حکومت

کو بھی چین نصیب ہوا اور اس سے فائدہ اٹھا کر شدھی اور تبلیغ کی تحریکیں شروع کرا دی گئیں قومی

رہنماؤں نے لاکھ کوشش کی مگر سارا اتحاد خاک میں مل گیا۔ فرقہ پرستوں کو اپنے جوہر دکھانے کا

موقع ملا اور عام مسلمانوں کو ان حالات کا احساس دلا کر یہ سمجھایا جانے لگا کہ انھیں ہندستان

کی تنگ نظر اکثریت انگریز کے بعد چین سے نہ رہنے دے گی۔

۱۹۲۹ء میں کانگریس نے مکمل آزادی کو اپنا نصب العین قرار دیا، علمائے اسلام نے جمعیۃ علما

کے پلیٹ فارم سے اس کی پوری حمایت کی۔ نان کوآپریشن کی تحریک پھر شروع ہو گئی، مہاتما گاندھی نے

نمک کا قانون توڑا، انقلابی عوام سوراج کے گن گانے لگے، پشاور کے قصہ خوانی بازار میں غیور

پٹھانوں نے اپنی عزیز جانیں قوم و وطن پر نچھاور کر دیں۔ شجاعت، قربانی اور ایثار کی زندہ جاوید

مثالوں سے غیرت مند فرزندانِ وطن نے ثابت کر دیا کہ وہ آزادی کے لیے ہر قیمت ادا کرنے کو

تیار ہیں۔

انگریزی دماغوں میں بغاوت ۵۷ء کی یاد پھر تازہ ہونے لگی تھی، اور اس کا ثبوت

تھامپسن کے یہ الفاظ ہیں۔

"شمال میں دبا ہوا جوالامکھی پھر ابل پڑنے کو ہے اور شمال ہی سے اس زلزلے کے

جھگڑے تمام ملک میں پھیل رہے ہیں بہت سے ہندوستانیوں کے دماغ میں کسی انگریز سے مخاطب ہوتے وقت غدر کے مصائب کا خیال ایک ایسے بھوت کی طرح مسلط رہتا ہے جس نے اپنا بدلہ نہ لیا ہو اور جس کی تمنائیں تا حال پوری نہ ہوئی ہوں " [۱]

بغاوت کے اثرات بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے۔

" انگریزوں اور ہندوستانیوں کے دماغوں میں غدر کی یاد ابھی تک زندہ ہے جس کی وجہ سے ہر دو اقوام کے خیالات اور تعلقات پر گہرا اثر پڑتا ہے ...... غدر کا نام آتے ہی یورپین قوم کے تصور میں بے شمار وحشی انسانوں کے بھوت بے پناہ عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے کے لیے ہاتھ بڑھا بڑھا کر سامنے آجاتے ہیں جس سے وہ اس حد تک متاثر ہوتے ہیں کہ عقل و خرد کو کھو کر ایسی عجیب ناشائستہ حرکتیں کرنے لگ جاتے ہیں جس طرح ایک دیوانہ مریض بے قابو ہو جاتا ہے جیسے دماغ اور ہوش دونوں نے جواب دے دیا ہو" [۲]

بالآخر ۱۹۳۱ء کی تحریک کو " گاندھی اِروِن پیکٹ " کے ذریعے ختم کر دیا گیا۔ اب مسلم لیگ رفتہ رفتہ کانگریس کے مقابل آنے لگی تھی، وہ مسلم اقلیت کے مستقبل کی طرف سے مطمئن نہ تھی، اسے تنگ نظر اکثریت کا خوف راہِ آزادی سے روکے جا رہا تھا۔ دوسری طرف آزادی پسند مسلمان دس کروڑ کی آبادی کو اقلیت کہہ کر اکثریت سے ڈرانا اسلامی روح کے خلاف سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ غلاموں کے ایک طبقے کا اپنی ہی قسم کے غلاموں سے حقوق کی ضمانت طلب کرنا مضحکہ خیز ہے، وہ مسلمانوں کو اپنے حقوق کی " اُجرت " لے کر جنگِ آزادی میں شریک دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ اس دوران میں

---

[۱] " انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ " ص ۷۵

[۲] " انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رُخ " ص ۷۹، ۸۰، ۸۱

عام انتخابات کے ذریعے صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں بن گئیں بعض فرقہ پرست کانگریس کا لیبل لگا کر اپنا اصلی روپ دکھا رہے تھے جس سے مسلم لیگ مضبوط ہوتی گئی۔ اسی زمانے میں میرٹھ کے ڈسٹرکٹ جج ہیوٹن نے ایک خط میں اپنا یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ آیندہ ہندوستان میں انگریزوں کو ملازمتیں نہیں ملیں گی اس لیے شمالی ہند اور بنگال کے حصے علیحدہ کر کے کلکتہ اور کراچی کی بندرگاہوں کو مضبوط کیا جائے اسی اسکیم کو تراش خراش کے بعد اگلے سال کیمبرج کے طالب علم رحمت علی نے پیش کیا اور ۱۹۴۰ء میں یہ "پاکستان" کے نام سے مسلم لیگ کا نصب العین قرار پایا جس کا وجود کوئی مقصد نہ ہونے کی وجہ سے اب تک ایک ایسے شخص کے مصداق رہا تھا جو آستین چڑھا کر ہوا میں مکے گھمار رہا ہو۔ آزادی پسند مسلم جماعتوں میں مجلس احرار، مومن کانفرنس وغیرہ جماعتیں شامل تھیں۔ علمائے اسلام، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی رہنمائی میں جمعیۃ علماء ہند کے زیر سایہ تھے جو ۱۹۱۹ء میں قائم ہوئی اور اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ امروہہ (۱۹۳۰ء) میں کانگریس سے تعاون کا اعلان کر چکی تھی، دیگر رہنماؤں میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ دوسری طرف مسلم لیگ کے قائد اعظم مسٹر جناح تھے ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہونے پر چوں کہ حکومت نے آزادی دینے کا یقین نہیں دلایا لہٰذا کانگریس نے امداد دینے سے انکار کر دیا صوبوں کی کانگریسی وزارتوں نے استعفے دے دیے۔ ۱۹۴۰ء کے سالانہ اجلاس میں کانگریس کے صدر حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنے خطبۂ صدارت میں بہ بانگ دہل فرمایا۔

"ہم برطانوی سامراج کا چہرہ اس لڑائی کے اندر بھی اسی طرح صاف صاف دیکھ رہے ہیں جس طرح ہم نے پچھلی لڑائی میں دیکھا تھا۔ ہم تیار نہیں کہ اس چہرے کی فتح مندیوں کے لیے لڑائی میں حصہ لیں، ہمارا مقصد بالکل صاف ہے۔ ہم اپنی حکومت

کی عمر بڑھانے کے لیے برطانوی سامراج کو زیادہ طاقت ور اور زیادہ فتح مند نہیں دیکھنا

چاہتے، ہماری راہ بالکل اس کے مقابل سمت میں جارہی ہے۔"

نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس اور حکومت میں پھر کش مکش شروع ہوگئی، انقلابی عوام پھر بے قرار ہو اُٹھے۔ اگست ۱۹۴۲ء میں کانگریس کے لیڈر گرفتار کر لیے گئے اور ملک گیر تحریک شروع ہوگئی۔ اُدھر نیتاجی سبھاش چندر بوس نے جاپان میں آزاد ہند فوج منظم کرلی اور برما کی سرحدوں میں دشمنانِ وطن کو سرِ میدان للکارا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد غلام ہندوستان اور انگریزوں کے درمیان یہ دوسرا مسلح تصادم تھا اور اس تحریک کو ملک کی دوسری جنگِ آزادی کے نام سے یاد کیا جاسکتا ہے۔

آزاد ہند فوج کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تحریک بھی بغاوت ۵۷ء سے متاثر تھی چناں چہ نیتاجی سبھاش بوس نے کئی بار اپنی تقریروں میں فرمایا کہ "جب میں ۱۸۵۷ء کے حالات پڑھتا ہوں تو میرا خون کھولتا ہوا محسوس ہوتا ہے"۔ انھوں نے عورتوں کا دستہ رانی جھانسی رجمنٹ کے نام سے ترتیب دیا اور ستمبر ۱۹۴۳ء میں اپنے تمام فوجی اسٹاف کے ساتھ رنگون جاکر بہادر شاہ کے مقبرے پر سلامی دی، عہد کیا،

"ہم ہندوستان کے مظلوم شہنشاہ کے سامنے عہد کرتے ہیں کہ ہم اپنے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کریں گے اور جب تک ہمارے جسم میں خون کا آخری قطرہ بھی باقی ہے پیچھے نہیں ہٹیں گے"۔ ۱

یہ حالات ابھی بدلے، جنگ ختم ہوئی۔ انگریزوں کو ہندوستان پر قبضہ رکھنا دشوار نظر آنے لگا چناں چہ ۱۹۴۷ء میں اس بدنصیب سرزمین کو تقریباً دو سو سالہ غلامی کے بعد اجنبی اقتدار کے پُرعذاب پنجے سے

---

۱ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "تاریخ آزاد ہند فوج" مصنفہ اسرار احمد آزاد

نجات ملی، ملک تقسیم ہوگیا اور ساتھ ہی خوں ریز فسادات بھی ہوئے لیکن اس کے بعد آزاد ہندستان پنڈت جواہر لال نہرو کی رہ نمائی میں تعمیر و ترقی کی شاہ راہ پر بڑھنے لگا، اس نے دنیا کے آزادی خواہ ملکوں کی حمایت کی ظلم کے خلاف آواز بلند کی اور آج دنیا کی اہم طاقت تسلیم کیا جاتا ہے مگر اندرونی طور پر ابھی بہت سے مسائل حل طلب اور پیچیدہ ہیں۔ کشمیر کا مسئلہ دونوں مملکتوں کے تعلقات میں رخنہ ڈالے ہوئے ہے۔ تعمیر و ترقی کی راہ میں ابھی بہت سے مرحلے باقی ہیں۔

سو سال بعد

مئی ۱۹۵۷ء میں جب ۱۸۵۷ء کی انقلاب آفریں جنگ کو سو سال پورے ہوئے تو ہندوستان اور پاکستان میں یکساں جوش و خروش سے اس کی یاد منائی گئی، ۱۰ مئی کو عام تعطیل کا اعلان ہوا۔ ہر شہر اور قصبے کے عوام نے جلوس نکالے، جلسے اور ڈرامے کیے اور ۵۷ء کے شہیدوں کو خراج تحسین و عقیدت پیش کیا۔ حکومت ہند نے ایک مستند کتاب ڈاکٹر سین سے لکھوا کر شایع کی۔ اردو، ہندی اور انگریزی میں کتابیں لکھی گئیں، اخباروں اور رسالوں نے اپنے خاص نمبر نکالے، جنوری ۵۷ء میں کانگریس کے سالانہ اجلاس میں پنڈال کا نام رانی جھانسی کے نام پر "لکشمی بائی نگر" رکھا گیا۔ ۱۰ اگست کو حکومت ہند کی طرف سے تمام ملک میں ۱۸۵۷ء کی صد سالہ یادگار منائی گئی، چراغاں کیا گیا، رانی جھانسی، بیگم حضرت محل، تانتیا ٹوپی وغیرہ کے مجسّمے نصب کیے گئے میرٹھ کے بھینسالی گراؤنڈ میں جہاں سے بغاوت کی ابتدا ہوئی تھی ایک عظیم الشان ستون تعمیر کیا گیا۔ کراچی میں بھی اسی قسم کی ایک یادگار زیر تعمیر ہے۔ حکومت ہند نے ۱۸۵۷ء کے رہ نماؤں کی اولادوں کے وظیفے مقرر کیے۔

(تمام شد)

ضمیمہ ۱

دہلی کے انقلابی سپاہیوں کا اعلان

سب ہندو مسلمان رعایا اور ملازم ہندوستانیکو افسران فوج انگریزی مقیم دہلی اور میرٹھ کیطرف دریافت ہووی کہ اب سب فرنگیوں نے اسبات پر ایکا کیا ہے کہ اول سب فوج ہندوستانی کو بیدہرم کرکی پھر سب رعایا کو بزور تدبیر کرستان کر لین چنانچہ ہم سب نی فقط دین کیواسطے معہ رعایا اتفاق کرکے کافر زندہ نچھوڑا اور پادشاہت دہلی اس عہد پر قایم کیا کہ فوج اپنی فرنگیوں کو قتل کرکی اپنی اطاعت .... (کاغذ پھٹا ہوا ہے) .... اطاعت کرکی ہمیشہ تنخواہ پاتی رہی سیکڑوں توپ .... خزانہ ہاتھ آیا اب لازم یہ ہی کہ جس کو کرستان ہونا دشوار ہووی رعایا اور فوج ہر مقام کی ایک دل ہو کر ہمت کریں تخم نکافروں کا باقی نرکھیں اور جس قدر مصارف رسد رسانی فوج یان رعایا کا ہووی رسید اوسکی افسران فوج سی لیکر اپنی پاس رکھیں دو چند قیمت سرکار پادشاہی سے ملی گی اور جو لوگ اس وقت میں بھی نامردی کریں گی یا ان دغابازونکا فریب کہا کر انکی قول پر اعتماد کریں گی عنقریب اپنی کیی پر پشیمان ہوکر کف افسوس ملیں گی اور ثمرۂ اطاعت کا مثل رئیس لکھنؤ کے پائیں گی لازم یہ ہی کہ سب ہندو مسلمان اس معرکے میں ایکا کرکی چند ادمین معتبر کی تدبیر سی بندوبست اپنی محافظت کا کر لیں جسکا انتظام اچھا ہوگا اور جسکی رعایا راضی ہوگی وہی عہدہ جلیلہ پر سرفراز ہونگی اور جہاں تک ہوسکے نقل اس اشتہار کی کرکی ہر مقام پر روانہ کرنا لازم ہی تاکہ سب ہندو مسلمان خبردار ہوشیار ہو اور مقام نمود اسکو آویزاں کرنا چاہیئں

اور اشتہار کی شتہر کرنی میں بہت احتیاط لازم ہے —— تاکہ یہ کسی پر کُھل نہ جائے اس اشتہار کی اشاعت خدا کی راہ میں تلوار کا پہلا وار ہے اور سوار کی شرح تنخواہ تیس ۳۰ روپیہ اور پیدل کی دس روپیہ ہے۔ تقریباً سو ہزار آدمی لڑنے پر تیار ہیں اور برطانوی فوجوں کے جھنڈے اتار چکے ہیں۔ شہر کے تقریباً چودہ ۱۴ جھنڈوں نے اللہ ہو اکبر کی آواز بلند کر دی ہے، کانپور اور الہ آباد میں ان شیطانوں کا عنقریب خاتمہ ہونے والا ہے ......

(یہ اعلان بھوپال سے اگست ۱۸۵۷ء میں پکڑا گیا)

ضمیمہ ۲

ناناصاحب کا ایک خط

(مورخہ ۲۵ اپریل ۱۸۵۹ء)

مُہر۔ صاحب پیشوا بہادر۔

رچرڈسن صاحب کمان افسر کا لکھا ہوا تاریخ ۲۲ ماہ اپریل کو پہنچا حال معلوم ہوا ہماری طرف سے اشتہار جو لکھا گیا اس میں بہت سی باتیں تھیں لیکن اپنی ایک بات میں جواب دیا سو ہمکو منظور ہی لیکن اسطرح ہم نہیں اسکتے جو ملکہ شاہ کوین بادشاہ زادی کے طرف سے مہر دستخطی وخط فراسیس کے کمان افسر باسکن کمان افسر کے ہمراہ ہمارے پاس آوی تو ہم اونکی اوپر خاطرداری رکھ کر بیشک یہ بات کو منظور کرینگی ہم ملکے کیا کریں جب کہ اپنے اجتک ہندوستان میں دغابازی کی سو ہم خوب جانتے ہیں سو جو اپکی دلمیں فساد ملک سے نکال نا ہو تو بادشازادی کا خود لکھا ہوا مہری دستخطے خط ہمراہ فراسیس کے کمان افسر کے ہاتھ آوی تو ہم منظور کرینگی، ہماری پاس کوین بادشازادی کا لکھا ہوا مہری دستخطے ہم نے ایلچی ولایت لندن کو بھیجا تھا اس وقت اوسکی ہاتھ بادشازادی نے بھیجا تہا موجود ہے جو اپکو یہ بات کرنا ہو اس طرح ہوگا ہم حاضر ہیں نہیں تو جان یک روز کبھی جائیگی پر اس طرح عزت کھو کر کیوں مرنا ور اپسے اور ہمسے لڑائی وفساد جنگ ...... جبتک رہیگا ہم چاہی ماری جاین چاہے قید ہوں چاہے پھانسے جو لکھا ہوگا سو ہوگا اور ہم سے جو کچھ ہوگا سو تلوار سے ہوگا نہیں

تو دوسری جو کہ بادشاہزادی کا لکھا اوسکے موافق ادی تو ہو سکیگا اب جو مناسب دیکھیں۔"

(یہ خط کی بجنسہٖ نقل ہے)

ضمیمہ ــ ۳

قطعہ

وہ قطعہ جو "صادق الاخبار" دہلی مورخہ ۳ر اگست ۱۸۵۷ء میں محمد غلام علی مشتاق کے نام سے درج تھا۔

عید ہر سال تمھیں تہنیت آمیز رہے — غرقِ خوں جانِ عدو خنجر خوں ریز رہے

قتل کفار ہوں اور فتح مبارک ہو ظفرؔ — نام کو بھی نہ جہاں میں سر انگریز رہے

ضمیمہ ___۴

فرمان برجیس قدر والئی اودھ ۱۸۵۷ء

سب ہندو مسلمان یہ جانتے ہیں کہ چار چیزیں ہر ایک مانس کو بہت پیاری ہیں، اول
دین ودہرم دوسرے عزت وآبرو تیسرے جان اپنی واپنوں کی چوتھے مال واسباب۔ یہ چار
چیزیں عملداری ہندوستان میں بچے رہتی ہیں اس عملداری میں کوئی دین ودہرم کو نہیں روکتا ہے
ہر ایک مانس اپنے دین ودہرم پر رہتا ہی عزت وآبرو ہر ایک مانس کی موافق اوسکی درد کی رہتی ہے
اشراف کسی قوم کا ہو سید اور شیخ اور مغل اور پٹھان مسلمانوں میں اور برہمن اور چھتری اور بیس اور
کائستھ ہندو موافق اپنی اپنی رتبہ کی عزت آبرو رکھتی ہیں کوئی پاجی جیسے چوہڑے چمار اور دھانک
اور پاسی اونکی برابری نہیں کرسکتی اور کسی اشراف اور پاجی کی اس عملداری میں جان نہیں ماری
جاتی اور کسی کا مال واسباب بھی بی کسی جرم اور بڑے پاپ کی چھینا نہیں جاتا اور انگریز لوگ ان
چار چیزوں کی بیری ہیں دین اور دہرم ہندو مسلمان سب کا کھونا چاہتے ہیں۔ چاہتی ہیں کہ
سب لوگ کرسٹین ہوں نصرانی بنجائیں اونکی عمل میں ہزاروں آدمی کرسٹین ہوگئی اور ہوتی جاتی
ہیں۔ عزت آبرو ہر ایک اشراف کی اور چوہڑی چمار کی اونکی نزدیک برابر ہے بلکہ انگریز لوگ ہر اشراف
کو مقابلہ پر پاجی کے ذلیل وبیعزت کرتی ہیں، ایک چوہڑی اور ایک چمار کی کہنیسی (کہنے سے)
اشراف بلکہ نواب اور راجہ کو کھنچوا بلاتی ہیں اور بیعزت کرتی ہیں جہاں جاتی ہیں وہاں عزت دار
لوگوں کو پھانسی دیتی ہیں اور اونکی زن بچے مار ڈالتے ہیں اور عورتوں سے اونکی فوجی بدکام کرکی

سبکو بیحرمت کرتے ہیں اور سب مال و اسباب سب لوگونکا گھر ونکو کھود کر سب لے لیتی ہیں کچھ نہیں چھوڑتے - بنئی مہاجنوں کو جانسی نہیں مارتی اونکا مال لیکر اور اونکی عورتونکو بیعزت کرکی چھوڑ دیتی ہیں - جہاں جاتی ہیں وہاں کی سب لوگونسی ہتھیار لے لیتی ہیں جب وہ نہتی ہو جاتی ہیں جسکو چاہتی ہیں پھانسی سی یا گولی یا توپسی (توپ سے) باندہ کر مار ڈالتی ہیں جس کو چاہتی ہیں بیدم کرتی ہیں جسکو چاہتی ہیں بیعزت کرتی ہیں - بعض جگہ یہ فریب کرتی ہیں کہ زمینداروں سے وعدہ پیسا معاف کرنیکا کرتے ہیں یا جمع میں تخفیف دیتی ہیں اس مطلب سے کہ جب عملداری خوب بیٹھ جائیگی اور قابو میں سب آجائینگے پھر جو چاہیں گی انکا حال کرینگی یا کرسٹین کرینگی یا پھانسی دینگی یا بیعزت کرینگی بعض زمیندار احمق اونکی فریب میں آجاتی ہیں اور جو چترا و ہوشیار ہیں وہ فریب نہیں کھاتی ہیں اسواسطے سب ہندو مسلمانوں کو جتایا جاتا ہے کہ بچانا دین و دہرم اور عزت و آبرو و ناموس و جان اپنی اور اپنی لوگوں کی اور اپنی مال و اسباب کا جسکو منظور ہو وہ انگریزونسے لڑنی پر باتفاق فوج سرکار کی مستعد رہے اور ہرگز اونکی فریب میں نہ آئے سرکار سے اونکی پرورش اور تخفیف ہوگی ...."

(نقل بجنسہٖ)

(یہ اصل فرمان اردو اور ہندی رسم الخط میں ہے)

ضمیمہ ــــ ۵

جی. پی. منی (مجسٹریٹ شاہجہانپور) کا خط

(۱۷ر جون ۱۸۵۸ء)

ذیل میں مجسٹریٹ شاہ جہاں پور کے اس خط کا ترجمہ دیا جا رہا ہے جو اُس نے مولانا احمد اللہ شاہ کی شہادت کی خبر سن کر روہیل کھنڈ کے کمشنر کو لکھا۔ اس خط سے بعض امور پر روشنی پڑتی ہے۔

"میرے نیم سرکاری خطوط مورخہ ۱۵ر اور ۱۶ر جون سے آپ کو یہ اطلاع مل چکی ہو گی کہ مولوی احمد شاہ پوائن میں قتل کر دیا گیا۔

۲۔ اب میں آپکو مزید رپورٹ دینے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں کہ پوائن کا راجہ گذشتہ رات یہاں آیا اور اپنے ساتھ مولوی کا سر اور جسم لایا تھا۔ اور جبکہ میں .... دن بھر انتظار کرتا رہا۔ دوپہر کے بعد انکے نہ آنے سے مجھے بے قراری شروع ہوئی اور میں نے جنرل سے ملتانی کیولری کا ایک دستہ پوائن بھیجنے کی درخواست کی تاکہ اگر راجہ باغیوں کی طرف سے سر کو چھین لینے کی کوشش سے کسی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہو تو اسکی مدد کی جائے ......

۳۔ سر کو پوائن اور شاہجہانپور کے کئی آدمیوں سے شناخت کرا لیا گیا کہ یہ مولوی احمد اللہ شاہ کا ہے۔ اور اب شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ سر کو پبلک کے سامنے کوتوالی پر رکھا گیا اور جسم کو بر سر عام آج صبح جلا کر راکھ دریا میں بہادی گئی۔

۴۔ میں نے کل نیم سرکاری خط میں راجہ کے خط کی جو نقل روانہ کی ہے اس سے

آپ کو مولوی کی موت سے متعلق تفصیلات کا علم ہوا ہوگا، تاہم میرے پاس چند دوسرے ذرائع سے جو خبریں آئی ہیں انکے پیش نظر میں نہیں سمجھتا کہ واقعی کوئی سخت تصادم ہوا۔ ظاہر ہے کہ مولوی اپنے .... ہمراہیوں کے ساتھ "گڑھی" پر آیا تھا اور راجہ جگناتھ سنگھ سے بات چیت کی خواہش ظاہر کی جسنے اپنے بھائی بلدیو سنگھ کو سننے کے لیے بھیجا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ مولوی نے نائب تحصیلدار اور تھانہ دار کو حوالے کرنے کے لیے مطالبہ کیا۔ یہ مطالبہ نامنظور کر دیا گیا، تب اس نے اپنے ہمراہیوں سے قلعے کا دروازہ زبردستی ہاتھی کے ذریعے کھولنے کو کہا۔

۵ - یہ سنکر راجہ کے ساتھیوں نے فائرنگ کیا جس سے مولوی اور اس کے دو ساتھی مارے گئے۔ جیسے ہی مولوی گرا، بلدیو سنگھ نے اسکا سر تن سے جدا کرنیکا حکم دیا۔ راجہ کے تین آدمی مارے گئے اور تقریباً بیس شدید زخمی ہوئے یہ حادثہ اچانک میگزین اور بارود (Gun powder) پھٹنے سے ہوا۔

۶ - حکومت کی طرف سے پچاس ہزار روپیہ کا جو انعام باغی مولوی کی گرفتاری پر مقرر کیا گیا تھا اس میں یہ خصوصی شرط تھی کہ "اسکو کسی انگریزی کیمپ یا فوجی پوسٹ پر زندہ سپرد کیا جائے"۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ صورت میں پورا انعام راجہ کو ملنا چاہیے جسکی بدولت انتہائی مستقل مزاج اور بے حد با اثر باغی سرداروں میں سے ایک سے چھٹکارا ملا ہے۔

۷ - جب سے میں نے ضلع کا چارج لیا ہے میں برابر راجہ پر دباؤ ڈالتا رہا ہوں کہ اگر اس نے حکومت برطانیہ سے ہمیشہ کی طرح پھر وفاداری کا اظہار کیا تو اس کو فائدہ پہنچے گا .... اور جب مجھے یہ خبر ملی کہ محمدی کے باغیوں کی طرف سے پوائن پر حملہ ہونے کے امکانات ہیں تو میں نے اُسے لکھا کہ وہ مولوی کو گرفتار کرنے کا یہ موقع ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دے، مجھے خوشی ہے کہ انجام کار

اس میں کامیابی ہوئی۔ اور ایک ایسا باغی لیڈر جو اپنے پیروں پر حیرت انگیز اثر کی بنا پر انتہائی پریشان کن دشمن ثابت ہوا تھا، نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ .... (خط میں آگے چلکر ایک شخص کی تعریف کی گئی ہے جو راجہ کے پاس گیا تھا اور راجہ کو اپنے ساتھ ہی لیکر آیا ...)

ضمیمہ ۔ ۶

قطعہ تہنیت

وہ قطعہ جو بہادر شاہ نے بقر عید (یکم اگست ۱۸۵۷ء) کے موقعے پر لکھ کر جنرل بخت خاں سپہ سالار افواج کو بھیجا اور جس کا جیون لال نے بھی اپنی ڈائری میں ذکر کیا ہے۔

لشکر اعدا الٰہی آج سارا قتل ہو، گورکھا گورے سے تا گوجر نصاریٰ قتل ہو
آج کا دن عید قرباں کا جبھی جانیں گے ہم اے ظفر تہہ تیغ جب قاتل تمہارا قتل ہو

منقول از "صادق الاخبار" ۱۲ر ذی الحجہ ۱۲۷۳ھ
(مطابق ۳ر اگست ۱۸۵۷ء)

ضمیمہ ۷

بہادر شاہ کا فرمان

۲۶ر اگست ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ کا جاری کردہ شاہی فرمان وعدہ کرتا ہے۔

دفعہ ۱۔ **زمینداروں سے**:۔ "یہ ظاہر ہے کہ گورنمنٹ برطانیہ نے زمینداری کے بندوبست میں بے حد ٹیکس لگاکر اور انکی ریاستوں کے بقایا کرایہ کی وصولیابی کے لئے جائدادوں کو نیلام پر چڑھاکر سیکڑوں زمینداروں کو تباہ وبرباد کردیا ہے یہانتک کہ، عام رعایا سے، خواہ وہ کوئی ملازمہ ہو یا غلام، مقدمہ دائر کرنے پر، زمینداروں کو عدالت میں بلایا جاتا ہے۔ گرفتار کیا جاتا ہے۔ اور جیلوں میں رکھا جاتا ہے اور ان پر عتاب نازل ہوتا ہے۔ مقدمات میں اسٹامپ کی بہت زیادہ قیمت اور دیوانی عدالتوں کے غیر ضروری اخراجات اور مقدمات کو سالہا سال التوا میں رکھنا۔ ان سب کا مطلب مقدمہ بازوں کو مفلس بنانا ہے۔ اور انسے سالانہ چندے اسکولوں۔ ہسپتالوں اور سڑکوں وغیرہ کے لئے وصول کئے جاتے ہیں۔ اس قسم کے جبر وتشدد کا کوئی قاعدہ حکومت بادشاہی میں نہیں ہے۔ بلکہ اسکے برخلاف (Ju[illegible]nas) بہت ہلکے ہونگے۔ اور زمینداروں کی عزت وحرمت محفوظ ہوگی۔ اور ہر زمیندار کی مطلق حکومت اسکی زمینداری میں ہوگی......

...... جو زمیندار موجودہ جنگ میں اپنے آدمیوں اور اپنے روپیہ سے امداد کرینگے

وہ ہمیشہ کے لئے آدھی مالگزاری سے بری کر دیئے جائینگے۔ اور جو زمیندار صرف مالی امداد کرینگے انکو چوتھائی مالگزاری معاف ہو جائیگی۔

دفعہ ۲۔ تاجروں کے لیے:۔ انگریزوں نے تمام قیمتی اور عمدہ تجارتوں کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ مثلاً نیل۔ کپڑا اور دیگر اشیاء جو جہازوں کے ذریعہ برآمد کی جاتی ہیں عوام کے لئے صرف کم قیمت اشیاء کی تجارت کو چھوڑتے ہوئے۔ اسطرح عوام صرف برائے نام تجارت کے مالک ہیں اور اسکے علاوہ انپر ڈاک کے اخراجات۔ محصول اور اسکولوں کے لئے چندہ وغیرہ کا بار ڈالا جاتا ہے۔ وہ لوگ عتاب، اور قید کے سزاوار ہوتے ہیں (کسی بھی بے حقیقت آدمی کی شکایت پر۔) جب بادشاہی حکومت قائم ہوگی، یہ تمام مذکورہ بالا ظالمانہ و بے رحمانہ حرکات ختم کر دی جائینگی۔ اور ہر چیز کی تجارت بغیر استثنار کے، خشکی اور پانی کے ذریعہ، وطنی تاجروں کے لیے کھولدی جائینگی۔ جو کہ سرکاری پانی کے جہازوں اور دیگر سواریوں سے اپنا تجارتی مال لانے اور لیجانے کا پورا فائدہ اٹھائیں گے۔ اور جو تاجر اپنا سرمایہ نہ رکھتے ہوں انکو شاہی خزانے سے مدد دی جائیگی ۔ لہٰذا ہر تاجر کا فرض ہے کہ وہ اس جنگ میں حصہ لے اور انگریزوں کی اعانت نہ کرے۔

دفعہ ۳۔ ملازموں کے لیے:۔ انگریزوں کے ماتحت ہندوستانیوں کو کم عزت کم تنخواہ اور بے اختیار رکھا جاتا ہے۔ تمام باعزت عہدے اور آسائشیں جو انگریزوں کو بخشی جاتی ہیں۔ شاہی حکومت میں ان کو دی جائینگی۔ اور وہ ..... بہ دو سو بائیس سو روپیہ ماہوار تنخواہیں حاصل کرینگے اور مستقبل میں اونچی جگہوں کے حقدار ہونگے۔ پیدل سپاہیوں کو ۳ آنے روز اور سوار سپاہیوں کو ۸ ربا ۱۲ آنے فی آدمی

دیا جائیگا۔ اور آئندہ انکو دوگنا ادا کیا جائیگا جتنا کہ وہ انگریزوں کی ملازمت میں
پاتے ہیں۔ لہذا انگریزی حکومت کے ہندوستانی ملازموں کو چاہیئے کہ وہ اپنے مذہب
اور مفاد کو ملحوظ رکھیں، انگریزوں کی حمایت ترک کرکے بادشاہی حکومت کی اطاعت
کریں۔.... اگر وہ کسی سبب سے انگریزوں کی اعلانیہ مخالفت سے قاصر ہوں تو انکو
چاہیے کہ خاموشی سے تماشہ دیکھتے رہیں اور کوئی عملی حصہ نہ لیں۔

دفعہ ۴۔ **دستکاروں کے لیے**:۔ انگریزوں نے جولاہوں۔ کپڑا بننے والوں
بڑھیوں۔ لوہاروں، چماروں وغیرہ کو ملازمت سے نکال کر انکو فقیری تک
پہنچا دیا ہے۔ لیکن بادشاہی میں دیسی دستکار بادشاہوں۔ نوابوں اور
امراء کی ملازمت میں کافی تعداد میں رکھے جائیں گے اور بغیر کسی شک و شبہ کے
ان کو انکی خوشحالی کا یقین دلایا جائیگا۔

دفعہ ۵۔ **پنڈتوں فقیروں اور عالموں کے لیے**:۔ جو کہ اس مقدس جنگ میں
شریک ہونے کے لیے متحد ہوگئے ہیں شرع اور شاستروں کے مطابق اور جب
بادشاہی سرکار قائم ہوگی تو وہ مالگزاری سے معاف زمینیں پائیں گے"۔

(ترجمہ از انگریزی)

(۳، بھادوں ۱۲۶۵ فصلی کو جاری کیا گیا)

ترجمہ "دہلی گزٹ" میں شائع ہوا

Kaye s Mutiny Papers Holmes Series, p. 26

ضمیمہ ـ ۸

انقلابیوں کا انتظام

دہلی، لکھنؤ اور بریلی

میرٹھ سے بغاوت کا آغاز ہونے کے بعد باغی فوجوں نے دہلی آکر بہادر شاہ کو شہنشاہِ ہند بنا دیا تھا لیکن وہ صرف آئینی حکمراں کی حیثیت رکھتے تھے اور حکومت کے تمام انتظامات سنبھالنے کے لیے ایک ایڈمنسٹریٹو کورٹ (انتظامی عدالت) (Administrative Court) بنایا گیا تھا جو تمام انتظام اور قیام امن کا ذمہ دار تھا۔ اس کورٹ میں دس ممبر تھے جن میں پانچ حسب ذیل ہندو ممبران تھے۔

۱۔ جنرل گوری شنکر ۲۔ صوبہ دار میجر بہادر جیوارام ۳۔ شیورام مصر
۴۔ بیت رام ۵۔ بینی رام

مہاجنوں سے قرضے لینے، لگان وصول کرنے یا ماتحت ریاستوں سے رقمیں حاصل کرنے کی ذمہ داری بھی اسی انتظامی کورٹ کے سپرد تھی بادشاہ ان امور میں مداخلت نہیں کرسکتا تھا۔ کورٹ کے ممبران آپس میں ووٹوں کی اکثریت سے منتخب ہوتے تھے صرف انہی لوگوں کو چنا جاتا تھا جو تجربہ کار اور محنتی ہوں۔ دس میں سے ایک کو صدر منتخب کیا جاتا تھا جو صدرِ جلسہ کہلاتا تھا اور ایک نائب صدر ہوتا تھا۔ یہ سب کچھ ووٹوں کے

ذریعے ہوتا تھا۔ صدر کو دو ووٹوں کا اختیار حاصل تھا۔ ہر ممبر اُس محکمے کا انچارج اور ذمہ دار ہوتا تھا جہاں سے کہ وہ نمائندہ بن کر آیا ہے۔ اسکی مدد کے لئے کورٹ میں چار ممبروں کی ایک کمیٹی ہوتی تھی اور ہر کمیٹی حسب ضرورت سکریٹری رکھ سکتی تھی۔ جارج کیمبل کے قول کے مطابق حکومت دہلی آئینی شہنشاہیت کی ایک قسم تھی۔ بادشاہ کی شاہانہ طریقے پر عزت کی جاتی تھی لیکن پارلیمنٹ کی بجائے ایک کونسل بنی جو کہ سپاہیوں پر مشتمل تھی اور بادشاہ صرف ان کے بڑی کمانڈر کی حیثیت رکھتا تھا۔ عربی فارسی کے بجائے انگریزی اصطلاحیں اور طریقے استعمال کیے جاتے تھے[1] تمام معاملات بادشاہ کے سامنے پیش ہوتے تھے مگر اصل اختیارات کورٹ کو حاصل تھے جسکے اجلاس میں بادشاہ کو کو اختیار تھا۔ اگر بادشاہ کورٹ کی کسی قرارداد کو نامنظور کر دیتا تو وہ دوبارہ کورٹ میں غور کے لیے پیش ہوتی۔ اجلاس دو قسم کے تھے۔ معمولی اجلاس روزانہ پانچ گھنٹے لال قلعہ میں ہوتا تھا اور خصوصی اجلاس کسی بھی ضروری اور فوری کارروائی پر کسی وقت بھی ہو سکتا تھا۔ تمام معاملات میں کورٹ کے ممبران کی اکثریت پر فیصلہ ہوتا تھا۔ جلسہ بند کمرے میں کیا جاتا اور اسکی کارروائی کو افشا کر دینے والے ممبر کو خارج کر دیا جاتا تھا۔

۱۵ر اگست ۱۸۵۷ء کے ایک پروانے سے جو کہ اس سلسلے کا واحد دستیاب شدہ پروانہ ہے کورٹ کے طریقۂ کار پر روشنی پڑتی ہے یہ پروانہ ایک سمن کی صورت میں ہے جس میں

---

1. Campbell's "Memoirs of my Indian Career" II p. 356
Symposium p. 36

ممبروں کو خصوصی جلسے کے لیے بلایا گیا ہے اور ایجنڈے میں شہر کا بہتر انتظام، رسد رسانی کا نظام، فوج کی تنظیم، ڈاک کی تقسیم اور مہاجنوں سے قرضے کے مسائل شامل ہیں۔ یہ کورٹ کبھی کبھی فوج کے بہتر انتظامات کے لئے احکام اور گشتی چٹھیاں بھی جاری اور بدانتظامی روکنے کیلئے احکامات بھی دیتا تھا فوجی معاملات میں بادشاہ یا شاہزادوں کی کوئی آواز نہ تھی چنانچہ ۲۶ رجون کے خط میں بادشاہ مرزا مغل سے شکایت کرتا ہے کہ

"پہلے مہتاب باغ اور حیات باغ میں کچھ دستے آکر قیام پذیر ہو گئے تھے اور ہمارے حکم سے انکو ہٹا دیا گیا تھا لیکن اب پھر تقریباً دو ہزار سپاہی ٹھہرے ہوئے ہیں لہذا تمہیں ہدایت کی جاتی ہے کہ کورٹ کے ممبران سے انہیں ہٹانے کیلئے کہو"۔

اس کورٹ کو عدالتیں بنانے، جج مقرر کرنے، دیوانی و فوجداری قوانین وضع کرنے کا بھی اختیار تھا پولیس آفیسر اور حکام کو یہی کورٹ مقرر کرتا اور انکی برخاستگی کا ذمہ دار تھا۔ عام آدمی کورٹ میں اپیل کرکے اپنی فریاد پیش کر سکتا تھا۔ مالیات میں بھی کورٹ کو وسیع اختیارات تھے لگان کے آفیسر مقرر کرنا اور برخاست کرنا اسی کا کام تھا۔ ان افسران کو انتظامی کورٹ کے باقاعدہ سمن کے بغیر کسی ایسے شخص کو گرفتار کرنے کا حق نہ تھا جو لگان دینے سے انکاری ہو۔ کورٹ نے قیمتوں کو مقرر کیا۔ نئے ٹیکس صرف اُن لوگوں پر لگائے جو ادا کر سکتے تھے غریب عوام پر بوجھ نہیں ڈالا کاشتکار کا زمین پر حق تسلیم کرنے کیلئے قانون پاس کیا۔

لکھنؤ میں بھی ایسا ہی ایک انتظامی کورٹ بنایا گیا جس میں ممو خاں کے علاوہ کیپٹن رگھوناتھ، کیپٹن امراؤ سنگھ، کیپٹن امداد حسین اور داروغہ واجد علی شامل تھے۔ اس کورٹ کو بھی وسیع اختیارات تھے۔ انگریزوں کے خلاف جنگ کے تمام پلان اور اسکیمیں یہی کورٹ بناتا تھا۔ سپاہی اپنے افسر اور یہ افسر اپنے کمانڈر خود چنتے تھے۔ ۵

بریلی میں بھی خان بہادر خاں نے ایک کمیٹی بنائی تھی جس میں دو ہندو اور چھ مسلمان تھے۔ جب تک خان بہادر خاں حاکم رہے یہی کمیٹی تمام انتظامات سنبھالتی رہی ٹھاکر جے مل سنگھ اس کے ایک ممتاز ممبر تھے۔ سوبھا رام دیوان کے آدمی شہر میں انتظام کرتے لگان جمع کرتے اور ساہوکاروں سے چندے وصول کرتے تھے[1]

---

1. Symposium

ضمیمہ ۹

جہاد کا فتویٰ

(جو دہلی کی جامع مسجد میں مرتب ہوا)

نقل استفتاء از اخبار "الظفر" دہلی اردو۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دلی پر چڑھ آئے اور اہل اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں اسصورتمیں اب اس شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں، اور اگر فرض ہے تو وہ فرض عین یا نہیں اور اور پر لوگ جو اور شہروں اور بستیوں کی رہنے والی ہیں انکو بھی جہاد چاہیئے یا نہیں۔ بیان کرو اللہ تمکو اجر دے۔

جواب۔ درصورت مرقومہ فرض عین ہے اوپر تمام اس شہر کی لوگونکی اور استطاعت ضرور ہے اوسکی فرضیت کے واسطے چنانچہ اس شہر والونکو طاقت مقابلہ اور لڑائی کی ہے بسبب کثرت اجتماع افواج کی اور مہیا اور موجود ہونے آلات حرب کے تو فرض عین ہونے میں کیا شک رہا اور اطراف و حوالے کی لوگونپر جو دور ہیں باوجود خبر کی فرض کفایہ ہے ہاں اگر اس شہر کے لوگ باہر ہو جائیں مقابلہ سے یا سستی کریں اور مقابلہ نکریں تو اسصورتمیں اونپر سب پہ فرض عین ہو جائیگا اور اسیطرح اور اسی ترتیب سے ساری اہل زمین پر شرقاً و غرباً فرض عین ہوگا اور جو عدو اور بستیوں پر ہجوم اور قتل اور غارت کا ارادہ کریں تو اوس بستی والو نپر بھی فرض ہو جائیگا بشرطہ اونکی طاقت سے۔ دستخط

سید الحبیب احقر العباد نور جمال عفی عنہ۔ العبد محمد عبدالکریم۔ فقیر سکندر علی۔ سید محمد

نذیر حسین ۔ رحمت اللہ ۔ مفتی محمد صدر الدین ۔ مفتی اکرام الدین ۔ معروف سید رحمت علی ۔
محمد ضیاء الدین ۔ عبد القادر ۔ فقیر احمد ۔ سعید احمد ۔ محمد میر خان ۔ العبد مولوی عبد الغنی ۔ خادم العلما
محمد علی ۔ فرید الدین ۔ محمد سرفراز علی ۔ سید محبوب علی جعفری ۔ ابو احمد محمد حامی الدین ۔ العبد
سید احمد علی ۔ الٰہی بخش ۔ محمد کریم اللہ ۔ مولوی سعید الدین ۔ محمد مصطفیٰ خاں ولد حیدر شاہ نقشبندی
محمد انصار علی ۔ مولوی سعید الدین ۔ حفیظ اللہ خاں ۔ محمد نور الحق ۔ محمد ہاشم ۔ حیدر علی ۔ سید محمد ۔
محمد امداد علی عفی عنہ ۔ سید عبد الحمید عفی عنہ ۔ محمد رحمت علی خاں مفتی عدالت عالیہ سراج العلماء
ضیاء الفقہا ۔ محمد علی حسین رسول الثقلین قاضی القضاۃ خادم شرح شریف

حوالے

اس کتاب کی تیاری میں بہت سی کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔ اُن کی ایک نامکمل فہرس یہاں حروف تہجی کی ترتیب سے دی جارہی ہے۔ اس میں صرف وہی کتابیں شامل کی گئی ہیں جن سے "خاص طور پر" معلومات حاصل کی گئی ہیں۔

(۱) اردو: (الف) کتب:۔

۱۔ احمد اختر۔ (خلف دارا بخت، ولی عہد بہادر شاہ): سوانح دہلی

۲۔ ادارہ مطبوعات پاکستان (کراچی) — کوائف و صحائف، ۱۸۵۷ء — سنہ ۱۹۵۷ء

۳۔ ادبی اکیڈمی لکھنؤ — لکھنؤ اور جنگ آزادی — سنہ ۱۹۵۷ء

۴۔ ادبی پبلشرز (بمبئی) — نوائے آزادی — سنہ ۱۹۵۷ء

۵۔ باری (علیگ) — کمپنی کی حکومت

۶۔ بشیر الدین — واقعات دار الحکومت دہلی

۷۔ بنسل (رتن لال) — مسلم دیش بھگت — سنہ ۱۹۴۹ء

۸۔ تھامپسن (ایڈورڈ) — انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رُخ۔ مترجمہ حسام الدین — سنہ ۱۹۳۱ء

۹۔ جعفری (رئیس احمد) مرتب: بہادر شاہ ظفر اور اُن کا عہد — سنہ ۱۹۵۷ء

۱۰۔ حسین احمد مدنیؒ (مولانا سید) — نقش حیات — سنہ ۱۹۵۴ء

۱۱۔ رضوی (انیس الدین امروہوی) — تحریک پاکستان — سنہ ۱۹۴۰ء

نمبر	مصنف	کتاب	سنہ
۱۲ -	سعید مارہروی	مرقع اکبر آباد (تاریخ آگرہ)	سنہ ۱۹۳۱ء
۱۳ -	سندر لال (پنڈت)	بھارت میں انگریزی راج (ہندی)	سنہ ۱۹۲۸ء
۱۴ -	"	سن ستاون (اردو)	سنہ ۱۹۵۸ء
۱۵ -	سید احمد خاں (سر)	رسالہ اسباب بغاوت ہند	سنہ ۱۹۰۳ء
۱۶ -	شاد (سید محمد علی عظیم آبادی)	مراۃ الانظار تاریخ صوبہ بہار	سنہ ۱۸۷۸ء
۱۷ -	شورش کاشمیری	سید عطاء اللہ شاہ بخاری	سنہ ۱۹۵۶ء
۱۸ -	شہابی (انتظام اللہ)	ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء	
۱۹ -	"	علمائے حق اور اُن کی مظلومیت کی داستانیں	
۲۰ -	"	غدر کے چند علماء	
۲۱ -	طفیل احمد منگلوری (سید)	روح روشن مستقبل	سنہ ۱۹۴۵ء
۲۲ -	ظہیر دہلوی (راقم الدولہ)	داستان غدر	
۲۳ -	عباسی (محمود احمد)	تاریخ امروہہ جلد اوّل	
۲۴ -	"	تذکرۃ الکرام (جلد دوم تاریخ امروہہ)	
۲۵ -	علوی (امیر احمد)	بہادر شاہ ظفر	
۲۶ -	فصیح الدین بلخی	تاریخ مگدھ	سنہ ۱۹۴۴ء
۲۷ -	فضل حق خیر آبادی	باغی ہندوستان ترجمہ "الثورۃ الہندیہ" مترجم عبد الشاہد خاں شروانی	سنہ ۱۹۴۶ء
۲۸ -	قیصر مصطفیٰ	شیر میسور	
۲۹ -	کمال الدین حیدر	قیصر التواریخ	سنہ ۱۸۹۶ء

نمبر	مصنف	کتاب	سنہ
۳۰ -	کنہیالال	محاربۂ عظیم	سنہ ۱۸۸۹ء
۳۱ -	لچھمن سنگھ	کیفیتِ بلند شہر	
۳۲ -	محمد شفیع	۱۸۵۷ء	سنہ ۱۹۵۷ء
۳۳ -	محمد شفیع دہلوی (خواجہ)	دلی کا سنبھالا	
۳۴ -	محمد عمر نور الہٰی	سراج الدولہ	سنہ ۱۹۴۶ء
۳۵ -	محمد میاں (مولانا سید)	علمائے حق اور اُن کے مجاہدانہ کارنامے	سنہ ۱۹۴۷ء
۳۶ -	محمود بنگلوری	تاریخ جنوبی ہند	سنہ ۱۹۳۹ء
۳۷ -	"	تاریخ سلطنتِ خداداد	
۳۸ -	مکند لال	تاریخ بغاوت ہند	
۳۹ -	منگل سین	تواریخ بلند شہر	سنہ ۱۸۶۳ء
۴۰ -	مہر (غلام رسول)	۱۸۵۷ء	سنہ ۱۹۵۷ء
۴۱ -	" "	۱۸۵۷ء کے مجاہد	سنہ ۱۹۵۷ء
۴۲ -	" "	سرگذشت مجاہدین	سنہ ۱۹۵۷ء
۴۳ -	" "	سیرت سید احمد شہید	سنہ ۱۹۵۷ء
۴۴ -	نجم الغنی رامپوری	اخبار الصنادید جلد دوم	سنہ ۱۹۱۸ء
۴۵ -	" "	تاریخ اودھ (۵ جلدیں)	سنہ ۱۹۱۹ء
۴۶ -	نظامی (خلیق احمد) مرتب	۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ (مصنفہ عبداللطیف)	سنہ ۱۹۵۸ء
۴۷ -	نظامی (خواجہ حسن)	بہادر شاہ کا روزنامچہ	
۴۸ -	" "	بہادر شاہ کا مقدمہ	

۴۹ - نظامی (خواجہ حسن) بیگمات کے آنسو

۵۰ - " " دہلی کی آخری شمع (مصنفہ مرزا فرحت اللہ بیگ)

۵۱ - " " دہلی کی جاں کنی سنہ ۱۹۲۵ء

۵۲ - " " غدر دہلی کے اخبار

۵۳ - " " غدر کا نتیجہ سنہ ۱۹۳۰ء

۵۴ - " " غدر کی صبح و شام سنہ ۱۹۲۶ء

۵۵ - " " گرفتار شدہ خطوط (غدر کے فرمان)

۵۶ - ہاشمی فرید آبادی تاریخ ہند سنہ ۱۹۲۲ء

۵۷ - ہنٹر (ڈبلو۔ ڈبلو) ہمارے ہندوستانی مسلمان مترجمہ صادق حسین

۵۸ - ہورلسٹٹ انگلیسی (مسز) ایام غدر مترجمہ ظفر حسن عاصی سنہ ۱۹۲۳ء

۵۹ تذکرۂ غالب (مصور)

اردو (ب) : رسائل و جرائد

۱ - آج کل (ماہ نامہ) دہلی، اگست ۱۹۵۷ء

۲ - اردو ادب (سہ ماہی) علی گڑھ، مارچ ۱۹۵۷ء

مقالہ نثار احمد فاروقی: "آفتاب ہند بنارس"

۳ - الجمعیۃ (روز نامہ) دہلی: (۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۷ء تک مکمل فائل)

۴ - العلم (ماہ نامہ) کراچی: جنگ آزادی نمبر ۔ ۱۹۵۷ء

۵ - تحریک (ماہ نامہ) دہلی: اگست ۱۹۵۷ء - مقالہ امتیاز علی عرشی "فضل حق خیر آبادی اور فتوئ جہاد"

۶ - ماہِ نو (ماہ نامہ) کراچی: ۱۸۵۷ء نمبر

۷ - نگار (ماہ نامہ) لکھنؤ: اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۷ء

مقالہ: گوپی چند نارنگ۔ "۱۸۵۷ء اور اردو شعرا"

۸ - نیا دور (ماہ نامہ) لکھنؤ: جنگ آزادی نمبر

ENGLISH BOOKS

1. Bishop Heber. —"Mimoers and correspodence" 1830
2. Buckland. —" Bengal Under the Lt. Governors "
3. Charles Ball. —"Indian Mutiny"
4. Chattopdhyaya, H. —"The Sepoy Mutiny 1857"-1957
5. Chaudhri, S.B. —"Civil Rebellion During the Indian Mutinies" 1957
6. Chaudhri, S.B. —"Civil Disturbances During the British Rule in India." 1955
7. Dutt, R. C. —"The Economic History of India"
8. Dutta, K. K. —"Biography of Kunwar Singh & Amar Singh" 1957
9. "East India" (India Office London) —Copy of letters from Registrar of Nigamat Adalat to Secy. of Govt. of Bengal about Patna riot of 3rd July 1857. 1888
10. Fraser, R. W. —"British India" 1896
11. Grant, H. —"Incidents in the Sepoy War" 1898
12. Groom, W. T. —"With Havelock from Allahabad to Lucknow" (letters from a general to his wife.) 1894
13. Gupta R. S. and Sabharwal, H. N. —"Indian politics and Government" 1951

14. Holmes. —History of the Sepoy War
15. Innes, Lt. J. M. —The Sepoy Revolt 1897
16. Joshi, P. C. —"Rebellion 1857": A Symposium 1957
17. Kaye, J. W. —A "History of the Sepoy War" 1880
18. Majumdar R. C. —Sepoy Mutiny and Revolt of 1857" 1957
19. Malleson, G. B. —Red Pumphlet
20. Malleson, G. B. —"Mutiny of India 1857"
21. Marshman —"History of British India"
22. Palm Dutt, R. —"India To-day"
23. Reez, L. E —"A personal Narrative of the
24. Robert Stewart —"A Memoir" 1928
25. Russel, W.H. —"My Diary in India" 1860
Scige of Lucknow" 1858
26. Savarkar V. D. —"Indian War of Independece" 1947 (first Published in 1907)
27. Sen, S. N. —"Eighteen Fifty Seven" 1957
28. Smith, V. A. —"Oxford History"
29. Stark H. A. —"India Under Company and Crown".
30. Thornhill —"The Personal Adventures and experiences of a Magistrate during the Rise, Progress and Suppression of the Mutiny" 1884
31. Wadia, Merchant —Our Economic Problem
32. William Bolts —" Consideration on Indian Affairs ".
33. Young, K. —Delhi 1857, Siege, Assault and Capture 1902

قلعۂ دہلی کا تاریخی روزنامچہ

۱۸۵۷ء کے حالات سے متعلق

ایک نادر اور مستند و معتبر تاریخی دستاویز

۱۸۵۷ء کے واقعات پر ہندوستان و پاکستان میں متعدد کتابیں لکھی گئیں اور لکھی جارہی ہیں۔ لیکن یہ روزنامچہ اپنی مختلف خصوصیات کے لحاظ سے ایک عجیب تاریخی دستاویز ہے۔ روزنامچہ لکھنے والے عبداللطیف ہیں جنھوں نے قلعۂ دہلی کا آنکھوں دیکھا حال صاف شُستہ اور موثر انداز میں سپردِ قلم کیا ہے' مورّخ عبداللطیف کا ادبی ذوق نہایت اعلیٰ تھا اور اُن کو فارسی زبان پر بہت اچھی قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے تاریخی واقعات کی ترتیب میں بھی بہترین سلیقہ کا ثبوت دیا ہے، اس روزنامچے میں بعض ایسی معلومات بھی ملتی ہیں جو پہلی بار اسی روزنامچہ کے ذریعہ سامنے آئی ہیں۔ اس روزنامچہ کو پڑھ کر ۱۸۵۷ء کے سبق آموز اور عبرتناک تاریخی ہنگامہ کے چشم دید حالات و واقعات کا نقشہ ایک خاص ترتیب کے ساتھ سامنے آجاتا ہے۔

کتاب کے مرتّب مشہور فاضل اور مورّخ خلیق احمد صاحب نظامی ہیں جن کی تاریخی بصیرت مسلّمات کا درجہ رکھتی ہے۔ شروع میں ڈاکٹر یوسف حسین صاحب پرووائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے "پیش لفظ" کے علاوہ خلیق احمد صاحب کا نہایت جامع اور بصیرت افروز مقدمہ بھی ہے اس کے بعد اصل روزنامچہ کا فارسی متن اور پھر اس کا سہل و شگفتہ اُردو ترجمہ، صفحات ۲۱۶ تقطیع ۲۰ × ۲۶/۸ قیمت غیر مجلّد تین روپے پچاس نئے پیسے۔ مجلّد مع نفیس لطیف اور دیدہ زیب ڈسٹ کور، چار روپے پچاس نئے پیسے۔